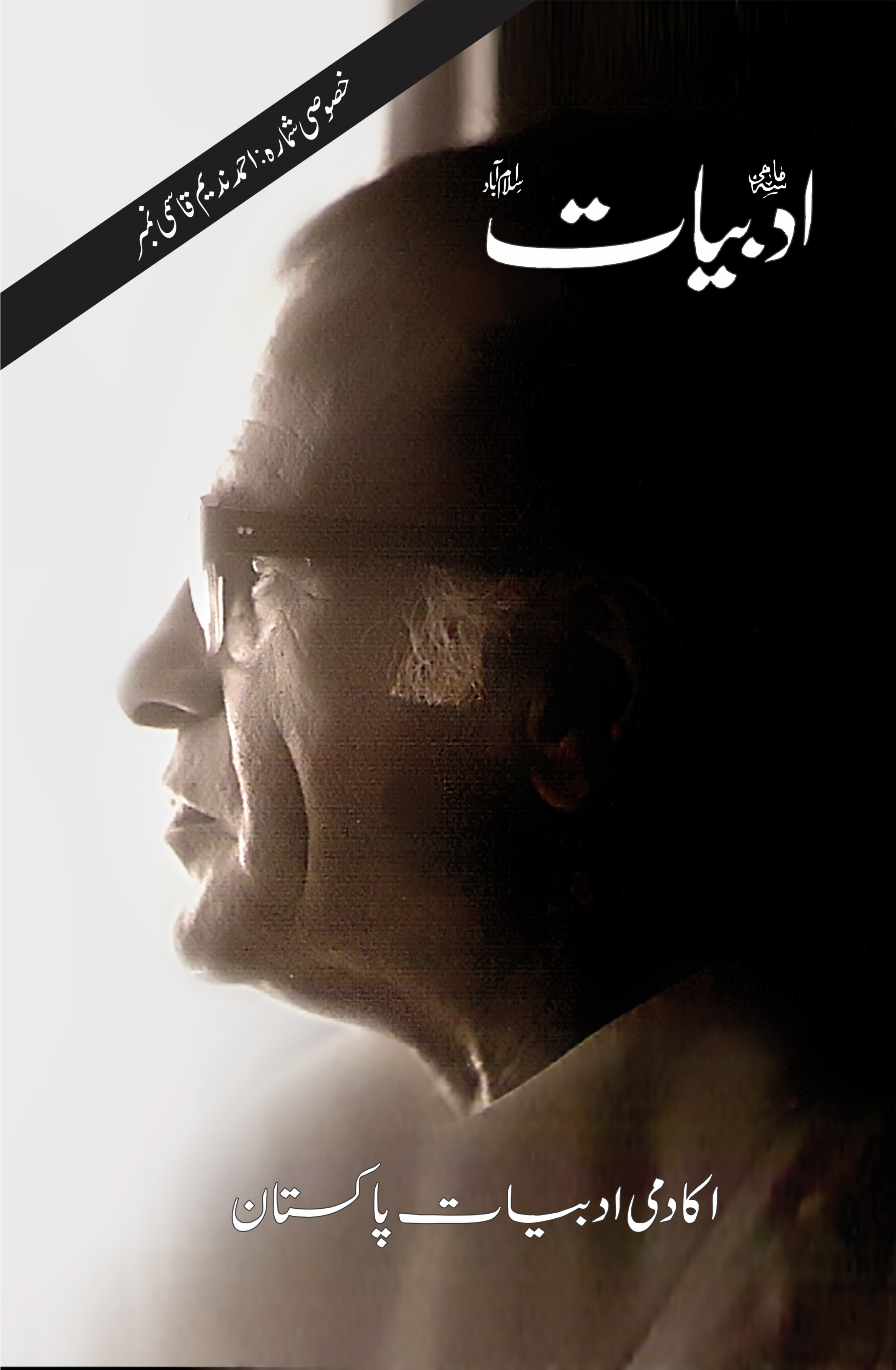

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

خصوصی شمارہ: احمد ندیم قاسمی نمبر

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

◆ ◆ ◆

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

ششماہی تحقیقی ادبیات

اکادمی ادبیات پاکستان، تحقیقی ادبیات کے نام سے ایک تحقیقی وتنقیدی جریدہ شائع کرنے کا اہتمام کررہی ہے۔ جس میں اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں اور اُن کے ادب کے حوالے سے ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کے قواعد وضوابط کے مطابق درج ذیل زمروں میں تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات شائع کیے جائیں گے:

۱۔ تحقیق: متنی / موضوعی
۲۔ مباحث: علمی / تنقیدی
۳۔ مطالعہ ادب: اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا فکشن / شاعری
۴۔ تنقید وتجزیہ: اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا فکشن / شاعری
۵۔ لسانیات
۶۔ مطالعۂ کتب

خواہش مند حضرات درج بالا موضوعات میں سے کسی بھی موضوع پر مقالہ ارسال کر سکتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں گزارش ہے کہ:

☆ مقالہ A4 جسامت کے کاغذ پر ایک جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے۔ جس کے متن کا مسطر ۵x۸ انچ میں ہونا چاہیے۔ حروف نوری نستعلیق میں ہوں جن کی جسامت '۱۲' پوائنٹ ہو۔ مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اس کا عنوان اور خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۲۰۰ الفاظ) بھی ارسال کیا جائے۔ مقالے کی ''ہارڈ'' اور ''سوفٹ'' کاپی دونوں ارسال کے جائیں۔

☆ مقالے کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے، موجودہ عہدہ اور مکمل پتہ بھی درج ہونا ضروری ہے۔

☆ ششماہی تحقیقی ادبیات میں اردو کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی مقالے شائع کیے جائیں گے، تاہم اردو کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی مقالے صرف اردو ہی میں شائع کیے جائیں گے۔ جن میں تحقیق: لسانیات، تدوین متن و تحقیق متن کے موضوعات، علمی وتنقیدی مباحث، مطالعہ ادب، تخلیقی ادب کے تنقیدی وتجزیاتی مباحث خاص طور پر شامل ہیں۔

برائے ترسیل مقالہ جات:

اختر رضا سلیمی (ایڈیٹر اردو)

Phone: +92-51-9269714
E.mail: ar.saleemipla@gmail.com

سہ ماہی

ادبیات اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی نمبر

شمارہ نمبر 108، جنوری تا جون 2016

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا صحیح نام، قلمی نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جاسکتی ہیں۔

قیمت موجودہ شمارہ: -/300 روپے (اندرون ملک)   40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)   160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	اختر رضا سلیمی	051-9269714
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269711

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

پیش نامہ ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو 9

میں تو دریا ہوں ---(زندگی نامہ)

احمد ندیم قاسمی خود نوشت 13
راشد حمید، ڈاکٹر سوانحی خاکہ 16

میری غزلیں ہوں کہ نظمیں ہوں کہ فسانے میرے (فن و شخصیت)

جمیل جالبی، ڈاکٹر احمد ندیم قاسمی 21
شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قاسمی صاحب 24
سلیم اختر، ڈاکٹر احمد ندیم قاسمی۔ سب اچھا کہیں جسے 31
ظفر اقبال ندیؔم صاحب 38
الطاف فاطمہ احمد ندیم قاسمی 42
محسن احسان محبتوں کا دیوتا 49
اکبر حمیدی احمد ندیم قاسمی---شخصیت 53
سلطان سکون بہت پیارے بہت شفیق نہایت عظیم انسان 58
آصف ثاقب یادِ ندیم 62
حسن عسکری کاظمی دور کی آہٹ تو آ پہنچی ہے اب سر پہ ندیم 64
ناہید قاسمی، ڈاکٹر اباجی 68
شمع خالد احمد ندیم قاسمی 73
شاہدہ حسن ابد کے ساحل پر 76
اعزاز احمد آذر احمد ندیم قاسمی۔ ایک شخص 81
ذوقی مظفر نگری اکیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت 85
سلمٰی اعوان احمد ندیم قاسمی 87
طاہرہ اقبال تاثرات 90

وجاہت مسعود	ابرِ بہار چل دیا۔۔۔۔	93
زاہد حسن	احمد ندیم قاسمی: شاعری اور شخصیت	96
ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر	بنیں گے مت نئے خاک کے مرے غبار سے بھی	108
خالد مصطفیٰ	ایک پوری اور چند ادھوری ملاقاتیں	119
نعمان منظور	ندیم صاحب کی محبت	123
اظہار اللہ اظہار، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی: تخلیقی جہتوں کے آسماں	127
محسن شکیل	تم نے ہمیں قابلِ فخر بنایا	134
امرت مراد	ندیم: ایک نقاش، اک مصور	136
ارشد نذیر ساحل	الوداع	140

کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا (احمد ندیم قاسمی بطور افسانہ نگار)

فتح محمد ملک، پروفیسر	اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام	141
منشا یاد	احمد ندیم قاسمی کے افسانے	177
ناہید قاسمی، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی: بطور افسانہ نگار	192
شاہین مفتی، ڈاکٹر	نشانِ راہ	216
محمد حمید شاہد	احمد ندیم قاسمی کا افسانہ: تخلیقی بنیادیں	223
روبینہ شاہین، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی مختلف جہتیں	231
حمیرا اشفاق، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے نسوانی کردار	235
سیمہ اویس اعوان، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات کی پیش کش	243
تحسین بی بی، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے تقسیم آزادی سے پہلے کے افسانوں میں سیاسی شعور	250
ساجد رضا خان	احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری	258
خالد فیاض	احمد ندیم قاسمی کے آخری عہد کے افسانے	261

فکر کا شاعر ہوں، لیکن حُسن کا گھائل بھی ہوں (احمد ندیم قاسمی بطور شاعر)

جلیل عالی	ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں	269
خاور نقوی	پورے قد سے میں کھڑا ہوں	289
خاور اعجاز	احمد ندیم قاسمی کی غزل	293
تسنیم رحمان، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کی تمثال کاری	302
سعدیہ طاہر، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے فروشیائی موضوعات	307
شاذیہ اکبر	ابھی کُس کہتے کہتے رہ گیا ہوں	319

نازیہ خلیل عباسی	''میں شب کا مسافر ہوں مگر شمعِ سحر ہوں''	323
اسد عباس خان	احمد ندیم قاسمی کی شاعری	331

انسان عظیم ہے خدایا (احمد ندیم قاسمی بطور ترقی پسند)

یوسف حسن	ندیم کی ترقی پسندی	335
صلاح الدین درویش، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند نظم: چند وضاحتیں	340
روش ندیم، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند نظم	347
طارق ہاشمی، ڈاکٹر	مثالی انسان کا آدرش اور احمد ندیم قاسمی کی نظم	352

ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل (احمد ندیم قاسمی بطور مدیر)

نصیر احمد ناصر	احمد ندیم قاسمی اور فنون کی نشاۃ ثانیہ	359
ابرار احمد، ڈاکٹر	احمد تیم قاسمی۔ایک مستقل مزاج مدیر	361

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط (یادیں)

سید ضیاالدین نعیم	بَین	371
جاوید صدیق بھٹی	ترے بعد رہا کچھ بھی نہیں	373
محمد ظہیر بدر	ندیم۔۔۔۔سب کا ندیم	376
رضوانہ سید علی	ادب کا ندیم۔۔۔۔احمد ندیم قاسمی	381
جیکب پال	خوشبو ابھی باقی ہے	385
اسد مصطفیٰ، ڈاکٹر	نقش پا تھے، دشت تھے، امکان تھے۔۔۔۔احمد ندیم	389

کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے (متفرق)

محسن مگھیانہ، ڈاکٹر	پہلا خط	395
نثار ترابی، ڈاکٹر	ندیم کا تنقیدی شعور	399
سلمیٰ افتخار احمد	لانجائنس (Longinus) اور ندیم	404
فضل کریم، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کی سائنسی علوم میں دلچسپی	415
محمد شعیب مرزا	بچوں کے احمد ندیم قاسمی	419

ہر غروب کے پیچھے تھیں طلوع کی کرنیں (تجزیے)

محمود احمد قاضی	سناٹا	425
گل عباس اعوان، ڈاکٹر	احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''ماممتا'' کا فنی و فکری تجزیہ	429
لبنیٰ انصاری	''سناٹا'' ہماری قومی انفعالیت کا استعارہ	434

اویس الحسن خان	کپاس کا پھول	442

نام لیتے ہیں سخن ور میرا (ایک واقعہ)

پریشان خٹک، پروفیسر	ایک واقعہ	449
منشا یاد	احمد ندیم قاسمی کی یادیں	451
اسد محمد خان	ایک واقعہ	456
سرفراز شاہد	ایک واقعہ	459
خاور نقوی	لوحِ دل پر نقش ایک واقعہ	461
سیف اللہ خالد، پروفیسر	ایک واقعہ	462
کرنل ناز سرحدی	ایک واقعہ	463

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام (منظوم عقیدت)

محسن احسان	نذرِ ندیم	465
غوث متھراوی	بحضور حضرت احمد ندیم قاسمی	466
ظفر اکبرآبادی	احمد ندیم قاسمی	467
ذوقی مظفرنگری	احمد ندیم قاسمی	468
ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر	سخن کدہ ترے طرزِ سخن کو ترسے گا	470
اسلم فیضی	قاسمی صاحب کی وفات پر لکھی گئی نظم	471
عزیز اعجاز	عہد ساز شخصیت	473
محمد آصف مرزا	یہاں سے اُڑ کے میں جب آسماں پہ جاؤں گا	474
سید ضیاالدین نعیم	امر جُملے	475
اکرم سحر فارانی	آ میرے غم گسار	477
نسیم سحر	تہذیبِ شہرِ دل کا نمائندہ کیا گیا	478
شاہین مفتی، ڈاکٹر	ندیم صاحب کے لیے	479
حکیم خان حکیم	بیادِ احمد ندیم قاسمی	480
جاوید احمد	رہو سدا سرِ محفل، بصد کمال جیو	481
احمد حسین مجاہد	بابا کے نام (احمد ندیم قاسمی کے لیے)	482
امتیاز الحق امتیاز	کاغذ فلک بنا دیا	483
سلطان کھاروی	نذرِ قاسمی	484
تابش کمال	خوش نظر	485

رانا سعید دوشی	سمندر	486
جاوید فیروز	ماتم کرتی نظم	488
شہزاد بیگ	نذر احمد ندیم قاسمی	489
علی یاسر	روشن ستارہ	490
اسد اعوان	فسردہ ہیں سبھی تیرے عقیدت مند گاؤں میں	491
ریاض ندیم نیازی	دکھ ہے کچھ اتنا زیادہ نہیں لکھا جاتا	492
سید توقیر نقوی	آہ احمد ندیم قاسمی	493
انیل چوہان	بے خواب قلم	494

میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا (پنجابی زبان سے تراجم)

محمد جنید اکرم	قاسمی صاحب اور پنجابی زبان و ادب	495
احمد ندیم قاسمی/سعدیہ سمن	وارث شاہ کا کمالِ فن	508
احمد ندیم قاسمی/زاہد حسن	کھواب کیا کریں	512

میں ترا حسن ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں (انتخاب)

بازیافت

احمد ندیم قاسمی	خطبہ	513

افسانے

احمد ندیم قاسمی	کنجری	515
	پرمیشر سنگھ	534
	کپاس کا پھول	551
	لارنس آف تھلیبیا	564

نعت

احمد ندیم قاسمی	ہر ایک پھول نے مجھ کو جھلک دکھائی تری	575
	کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا	575

غزلیں

احمد ندیم قاسمی	ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئنہ خانے میرے	577
	نہ سہی اور کہیں گھر میرا	578
	اندازہ ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا	578
	احساس میں پھول کھل رہے ہیں	579

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں 580
گُل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گُلزاروں میں 581
شام کو صبحِ چمن یاد آئی 582
مَیں کب سے گوش بر آواز ہُوں، پکارو بھی 582
بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سجاؤ 583

نظمیں

احمد ندیم قاسمی ۶ ستمبر 584
پتھر 586
مجرم 588
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ 589
رات کی بات 591
فن 593
انساں عظیم ہے! 594
مہاراج ادھیراج 596
آزادی کے بعد 597
پیکر 599

قطعات

احمد ندیم قاسمی قارئین سے 602
فرطِ گریہ 602
پرتو 602
پنگھٹ کی رانی 603
ساون کا سحر 603
سانولا سلونا 603
اُمید کی کونپل 603
برسات کے راز 604
ایک آرزو 604
لطفِ ناتمام 604

☆☆☆☆

پیش نامہ

غالب نے اپنے ایک معاصر شاعر کو لکھا تھا کہ تمھارا استاد شاعر تو اچھا ہے لیکن 'یک فنی' ہے۔ یعنی اسے شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور تخصیص کا ہے اور اب ایک رجحان چل پڑا ہے کہ کوئی فرد کسی ایک ہی شعبے میں بہتر خدمات سرانجام دے سکتا ہے ممکن ہے یہ بات ایک حد تک بجا بھی ہو لیکن جدید ترین تحقیق کے مطابق ان لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہیں جو ایک سے زائد شعبوں کا چناؤ کرتے ہیں۔ شاید احمد ندیم قاسمی کو اس کا احساس بہت پہلے ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ایک سے زائد شعبے منتخب کیے۔

اردو ادب میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو احمد ندیم قاسمی جتنے کثیر الاجہات ہوں گے۔ انھوں نے اگر شاعری کی تو اس کی دونوں بڑی اصناف؛ غزل اور نظم میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ، نعت، قطعات، گیت، ترانے وغیرہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ افسانے کی طرف آئے تو ایسا افسانہ لکھا، جس نے انھیں اردو کے بڑے افسانے نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا اور جب کالم نگاری کی طرف توجہ کی تو صاحب اسلوب کالم نگار قرار پائے۔ وہ اگرچہ ایک باقاعدہ نقاد اور محقق تو نہیں تھے لیکن انھوں نے جو تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے وہ آج بھی ہمیں ادب کو سمجھنے میں مدد فراہم کر رہے ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ انھوں نے قوم کے نونہالوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور نثر اور شاعری دونوں میں بچوں کے لیے بھی قابل ذکر کام کیا۔

بطور ایک صحافی اور مدیر کے، اگرچہ انھوں نے بے شمار ادبی پرچوں کی ادارت کے ساتھ

ساتھ کچھ اخبارات کی بھی ادارت کی لیکن اس باب میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ **فنون** ہے، جو اردو ادبی رسائل کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ پرچہ بازار میں آتا تھا تو اگلے کئی دنوں تک اسی کی نگارشات ادبی حلقوں کا موضوع بنی رہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت جتنی بھی بڑی ادبی شخصیات موجود ہیں ان میں سے نوے فی صد کی شہرت میں فنون ہی کا ہاتھ ہے۔ انھوں نے اس ادبی جریدے کے ذریعے کئی نسلوں کی آبیاری کی۔

احمد ندیم قاسمی کا اکادمی ادبیات کے ساتھ بھی ایک دیرینہ تعلق رہا ہے۔ وہ اکادمی کے اساسی رکن تھے اور مختلف اوقات میں اکادمی کی مجلس حاکمہ کے رکن کی حیثیت سے بھی وہ اہل ادب کی رہنمائی فرماتے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ انھیں ایک طرف جہاں پاکستان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ **نشان امتیاز** دیا گیا وہیں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز **کمال فن** بھی تفویض کیا گیا۔ ان اعزازات کے علاوہ بھی انھیں بے شمار ملکی و غیر ملکی ادبی اعزازات سے نوازا گیا، تاہم میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ان کا اصل اعزاز ان کی وہ تخلیقات ہیں، جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

اپنی وفات سے کچھ عرصے پہلے انھوں نے ہمارے اسی ادبی مجلّے 'ادبیات' کا ایک شمارہ بھی بطور مہمان مدیر کے مرتب کیا تھا، جو اکادمی کے لیے بلاشبہ ایک اعزاز کی بات ہے۔

ان کی وفات کے فوراً بعد اکادمی نے سہ ماہی ادبیات کا ایک خصوصی شمارہ ''احمد ندیم قاسمی نمبر'' شائع کیا تھا۔ جب کہ معمار ادب کے سلسلے کے تحت **احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن** ان کی زندگی ہی میں شائع کر دی گئی تھی۔

رواں سال احمد ندیم قاسمی کے سوویں یوم پیدائش کا سال ہے اور اس سلسلے کا آغاز اکادمی نے ان کی پیدائش کا سوواں سال شروع ہوتے ہی ان کے لیے ایک بڑی تقریب کر کے کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اداروں اور ادبی تنظیموں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

اسی مناسبت سے ہم اُسی نمبر کو جو 2006 میں شائع ہوا تھا جس کی ضخامت تین سو صفحات تھی اب اسے مزید اضافوں کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ موجودہ پرچے کی ضخامت اب اس سے تقریباً دوگنی ہے۔ علاوہ ازیں **احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن** کو بھی نئے اضافوں کے ساتھ شائع کرنے کے منصوبے پر بھی کام جاری ہے اور یہ کتاب بھی بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

میں ذاتی طور پر ان تمام اہلِ قلم کا شکرگزار ہوں جنھوں نے ہماری خصوصی درخواست پر اس خصوصی نمبر کے لیے نگارشات ہمیں ارسال فرمائیں۔

میں اپنے رفیق کار اور ادبیات کے مدیر اختر رضا سلیمی اور ادبیات کی مجلس مشاورت کے ارکین؛ جناب ڈاکٹر توصیف تبسم، ڈاکٹر اقبال آفاقی، محمد حمید شاہد اور ڈاکٹر وحید احمد کا بھی شکرگزار ہوں کہ انتہائی محنت، لگن اور عرق ریزی سے یہ خصوصی نمبر تیار کیا۔

مجھے امید ہے کہ ادبیات کا یہ خصوصی شمارہ **ندیم شناسی** میں بنیادی ماخذ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور مستقبل میں احمد ندیم قاسمی پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی مواد کے طور پر کام آئے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
(تمغۂ امتیاز، تمغۂ برائے حُسنِ کارکردگی)

انگریزی ادب کے لکھاری متوجہ ہوں

اکادمی ادبیات پاکستان کے شش ماہی انگریزی مجلّے ”پاکستانی لٹریچر“ کا تازہ شمارہ زیرِ ترتیب ہے۔ جس میں پاکستان کے انگریزی اہلِ قلم کی طبع زاد تخلیقات کے ساتھ ساتھ اردو سمیت دیگر تمام پاکستانی زبانوں سے منتخب تراجم بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔

تمام پاکستانی ادیبوں اور مترجمین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات، طبع زاد اور تراجم جلد از جلد اکادمی کو ارسال کریں۔

رابطہ مدیر
شش ماہی ”پاکستانی لٹریچر“
اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ،
سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی

خودنوشت

میری تاریخ پیدائش ۲۰ نومبر ۱۹۱۵ء ہے میرے گاؤں کا نام انگہ ہے جو ضلع سرگودھا میں کوہستان کی ایک حسین وجمیل وادی ”سون“ میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ میرے اسلاف عہد مغلیہ سے مل کہ اس سے بھی پیشتر علاقۂ سون میں تبلیغ اسلام کے مبارک کام میں مصروف رہے۔ اس لیے ان کے نام کے شروع میں ”پیر“ اور آخر میں ”شاہ“ کے القاب لوگوں نے احتراماً لگا دیے۔ اور اسی لیے میرا نام ’احمد شاہ“ رکھا گیا۔ بعد میں ”شاہ“ نے مجھے بہت پریشان کیا۔ کیوں کہ یہ لفظ سیدوں کے لیے مختص ہو چکا ہے اور میں اعوان ہوں۔ اب ادبی دنیا میں مجھے احمد ندیم قاسمی کہا جاتا ہے۔ اور میں مطمئن ہوں کہ مجھے خواہ مخواہ سید سمجھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اپنے گاؤں میں ہی میں نے چار ابتدائی جماعتیں پاس کیں اور وظیفہ حاصل کرتا رہا۔

میرے والد پیر غلام نبی شاہ مرحوم انھیں دنوں میں تقریباً پچھتر سال کی عمر میں وفات پا گئے اور میرے حقیقی چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم افسر مال کیمبل پور نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ انھیں کے ہمراہ میں دسویں جماعت میں شیخوپورہ چلا گیا۔ اور وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ چوں کہ مرحوم پیر صاحب پنشن پر جانے والے تھے اور ریاست بہاول پور میں انھیں عہدہ مشیر مالی پیش کیا گیا تھا اس لیے مجھے صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں بھیج دیا گیا۔ وہیں سے میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ جب میں بی اے کے پہلے سال میں تھا تو مرحوم پیر صاحب بہاول پور میں مشیر مالی مقرر ہو گئے۔ ایک ماہ کی رخصت پر گھر گئے اور وہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔

میرے پھپھیرے بھائی رسالدار میجر ملک میر حیدر خان انڈین آفیسر محکمہ آرمی ریمونٹ (منٹگمری) نے دستگیری فرمائی اور میں بی اے پاس کر کے تلاش روزگار کی الجھنوں میں گھر گیا۔ بی اے میں نے ۱۹۳۵ء میں پاس کیا۔ چند روز عارضی طور پر دارالاشاعت پنجاب میں تہذیب نسواں کے لیے کہانیاں ترجمہ کرتا رہا۔ ای۔ اے۔ سی تحصیل داری۔ نائب تحصیل داری اور ایکسائز کی سب انسپکٹری کے لیے رول بھجوائے لیکن چند ایسی وجوہات کی بنا پر ہر جگہ منہ کی کھانی پڑی جو میرے ایسے نوجوانوں کے تجربہ میں آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ آخر جولائی ۱۹۳۹ء میں مجھے انسپکٹر آبکاری کے عہدے پر ملتان میں مقرر کیا گیا۔

بچپن سے مجھے مشہور شعرا کا منتخب کلام جمع کرنے کا شوق تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ کئی بار میں نے شعر کہنے کی

بھی کوشش کی نگران کی نقل موجود نہیں۔ ساتویں جماعت میں میں نے اسی صفحات کا ایک ناول بھی لکھا تھا جس میں ایک نوجوان نے ایک دوشیزہ کو دریچے سے جھانکتے دیکھا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ دوشیزہ بھاگ کر آئی لخلخہ سنگھایا۔ محبت کی پینگیں بڑھیں لیکن لڑکی کے والدین کو سب راز معلوم ہو گیا اور دونوں سنکھیا پھانک کر قربان گاہ محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ مضمون وہی فرسودہ اور پامال تھا لیکن اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مجھے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں میرے ایک رشتہ دار (غلام جیلانی مرحوم جو پنجابی کے ایک آتش نوا شاعر تھے) کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کی والدہ اور ہمشیرہ کے جنازے ایک دن اور ایک وقت پر اٹھائے گئے۔ میں نے سوچا کہ اکثر عزیزوں کی وفات پر مرثیے کہے جاتے ہیں کیوں نہ میں بھی سعی کروں، سعی کی گئی اور ایک نظم جس کا کوئی مصرعہ وزن سے نہیں گرتا تھا (مگر جس میں قافیہ کا التزام ناپید تھا) تیار ہو گئی۔ نظم مرحوم پیر صاحب کو دکھائی گئی جنھوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور ارشاد کیا کہ تم اچھے شاعر بن سکتے ہو بشرطے کہ تمہارے مدنظر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود ہو۔ مرحوم فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور اگر وہ میری ہمت افزائی نہ کرتے تو شاید میں آج بھی مختلف شعرا کا کلام ہی انتخاب کرتا پھرتا۔ دوسری نظم میں نے مرحوم مولانا محمد علی کی وفات پر لکھی جو شاطر غزنوی کی وساطت سے روزنامہ سیاست کے صفحہ اول پر شائع ہو گئی۔ انھیں دنوں میں انٹرنس کا نتیجہ نکلا اور میں بہاول پور چلا گیا۔ وہاں کے چار برس کے قیام میں میں نے اس قدر نظمیں اور غزلیں کہیں کہ اگر میں ان کی تعداد لکھوں تو قارئین اسے مبالغہ سمجھنے لگیں۔ کالج کی بزم ادب کا وائس پریذیڈنٹ ہونے کی حیثیت میں میں نے اردو کی (اپنے محدود ماحول میں) کافی خدمت کی۔ کالج کے رسالہ ‘‘نخلستان’’ کے انگریزی اور اردو حصوں کا ایڈیٹر بھی رہا۔ ۱۹۳۵ء میں میرے ایک نہایت عزیز دوست محمد خالد (فرزند رشید مولوی اختر علی صاحب اسسٹنٹ کمشنر رحیم یار خان، ریاست بہاول پور) نے مجھے نثر میں لکھنے کی ترغیب دی۔ وہ خود بلا کے ذہین اور طباع نوجوان ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ انگریزی کی بجائے اردو میں لکھنے لگیں تو اردو ادیبوں کے سامنے ایک بالکل نرالی اور شاداب راہ کھل جائے۔ وہ آر۔ ایل۔ اسٹیونس اور رائڈر ہیگرڈ کے مہماتی ناولوں کے مداح تھے۔ مجھے اس رنگ میں لکھنے کا شوق دلایا اور اس اثر کے ماتحت میں نے جو افسانے لکھے وہ رسالہ ‘‘شاہکار’’ میں چھپتے رہے لیکن جلد ہی میں اس رنگ سے دلبرداشتہ ہو گیا اور اس کے بعد میں نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کی بستیاں جس سرزمین میں آباد کیں وہ میرے پڑھنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کالج کے دنوں میں لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کے پلندے میں نے ایک روز لاہور میں نذر آتش کر دیے اور میری ادبی زندگی کا روشن دور حقیقت میں ۱۹۳۸ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک

میں تقریباً اپنے گاؤں میں رہا اور دیہاتی زندگی کا اس شدت سے مطالعہ کیا کہ اب میرے نزدیک دنیا کا ہر گاؤں میرا وطن ہے۔ دیہات مجھے پیارے ہیں ان وجوہات کی بنا پر نہیں جو ہائی اسکول کے طلبا شہری اور دیہاتی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور جنھیں اساتذہ (سینہ بہ سینہ) نئی نسلوں کے بچوں کے دماغوں میں منتقل کرتے چلے آئے ہیں بل کہ صرف اس لیے کہ یہاں مجھے قانون اور مذہب اور معاشرت کی ایسی کھلی درسگاہیں ملی ہیں جو مشینوں کے دھوئیں میں لپٹے ہوئے شہروں میں صاف دکھائی نہیں دے سکتیں۔ یہاں میں نے انسانی دل کی دھڑکن کی آواز خوب غور سے سنی۔ میں نے حسن کو جنسی احساسات سے الگ کر کے ایک نئے زاویہ نگاہ سے پرکھا۔ میں نے یہاں کے ہر ذرے میں ہزاروں چیخیں سنیں۔ نیموں کے سایوں میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں مجھے اپنے شعر اور افسانہ کا محل کھڑا کرنا چاہیے۔ میں نے بنیاد رکھ دی ہے۔ ہر روز ایک نیا پتھر جماتا ہوں اور چار طرف نظریں دوڑاتا ہوں کہ شاید اس عظیم الشان کام میں میرا کوئی ساتھی آ نکلے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ دیہات کے مسائل پر لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن اکثریت ان کی ہے جو صنوبر کے بلند و بالا درختوں کو صحراؤں میں جھومتے دکھا دیتے ہیں اور کھجوروں کو سربفلک چوٹیوں پر۔

فن کی اصطلاحات سے میں بالکل نابلد ہوں۔ علم عروض کی ابجد تک نہیں جانتا۔ میرا مطالعہ بہت محدود ہے اور میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی خوش بھی ہوں کہ میری ساری تحریریں میری اپنی ہیں۔ ان پر کسی غیر کا سایہ تک نہیں پڑا۔ میری اب تک ۲۵۰ نظمیں، ۲۰۰ غزلیں، ۳۰۰ قطعات کا مجموعہ ‘‘دھڑکنیں’’ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اور افسانوں کے چار مجموعے چوپال، بگولے، گرداب اور طلوع وغروب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

شعر اور افسانہ میں میرا کوئی استاد نہیں، لیکن مولانا عبدالمجید سالک، حضرت اختر شیرانی، حضرت جوش ملیح آبادی، جناب سعادت حسن منٹو اور جناب کرشن چندر میرے مہربان بزرگ اور دوست ہیں اور غیر محسوس طور پر ان کی ذات اور صفات کا اثر میری روح پر پڑتا رہتا ہے۔

میری منزل بہت دور ہے اور راہ پرخطر ہے لیکن مجھے وہاں ضرور پہنچنا ہے۔ شعر میرا عصا ہے اور افسانہ میرا زادِ راہ۔ کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں صرف مخلص دلوں کی دعا چاہیے۔

نوٹ: یہ تحریر قاسمی صاحب نے بشیر ہندی کے اردو افسانوں کے انتخاب کے لیے لکھی تھی۔ ہمیں یہ تحریر پروفیسر سجاد شیخ مرحوم کی وساطت سے ملی تھی۔

ڈاکٹر راشد حمید

سوانحی خاکہ

اردو ادب کے بے بدل شاعر اور نثر نگار احمد ندیم قاسمی بیر ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو لاہور میں طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ قاسمی صاحب ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ یہ ضلع خوشاب تب ضلع سرگودھا میں شامل تھا۔ تاریخ پیدائش کے معاملے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر معین الرحمان مرحوم نے اپنی کسی کتاب میں خاصی دل چسپ بحث شامل کر رکھی ہے۔ قاسمی صاحب کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ ابتدا میں پیرزادہ احمد شاہ احمد کے نام سے لکھتے رہے۔ پیرزادہ ہونے کے سبب شاہ، نام کا حصہ بن گیا مگر اس سے سید ہونے کا اشتباہ پیدا ہوتا ضروری تھا لہٰذا نام تبدیل کر کے احمد ندیم قاسمی رکھ لیا۔

قاسمی ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ میرا گاؤں قسمال یعنی قا سے ماں کہلاتا ہے۔ دوسرے پردادا کا نام محمد قاسم تھا اس لیے قاسمی ہوں۔ والد کا نام پیر غلام نبی تھا، جو چن پیر کے نام سے معروف تھے۔ والد گرامی کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ مجذوب تھے۔ احمد ندیم قاسمی اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کہتے ہیں:

> ”بزرگوں سے سنا ہے کہ اسلاف اسلامی ممالک عربیہ سے ایران میں اور پھر افغانستان میں آ کر آباد ہوئے ہندوستان کے کسی مسلمان تاج دار کے دور میں وہ ہرات سے ملتان میں منتقل ہو گئے۔ یہ حضرات دینی علوم پر حاوی تھے اس لیے کسی مسلم بادشاہ کے دور میں انھیں ملتان سے سون سکیسر بھیجا گیا کہ وہاں اسلام کی تبلیغ کریں۔“

(براہ راست (حصہ اول): گلزار جاوید: راولپنڈی: ایریز پرنٹرز ۲۰۰۴ء: ص۔ ۲۷)

قرآن مجید گاؤں کی مسجد میں پڑھا۔ میٹرک ۱۹۳۱ء میں شیخوپورہ میں رہ کر جب کہ بی اے ۱۹۳۵ء بہاول پور قیام کے دوران میں کیا۔ قاسمی صاحب تعلیم آغاز کرنے کی کہانی کچھ یوں سناتے ہیں:

> ”میں چار برس کا ہوا تو انگہ کی اسی مسجد میں، جہاں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ نے میرے خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، قرآن مجید کے درس میں شامل ہوا۔ دسویں گیارہویں سیپارے تک پہنچا تو میرے سرپرست چچا پیر حیدر شاہ مرحوم نے یہ کہہ کر مجھے انگہ کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا کہ پرائمری پاس کرنے

کے بعد جب وہ مجھے اپنے پاس لے جائیں گے تو باقی قرآن مجید بھی پڑھا دیں گے
اور انھوں نے ایسا کیا ہی۔" (براہ راست (حصہ اول): ص ۔ ۴۸)

قاسمی صاحب برملا اعتراف کرتے رہتے تھے کہ ان کا بچپن غربی میں گزرا کیوں کہ والد صاحب حالت جذب میں چلے گئے تھے اور کمانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ چوتھی جماعت کے وظیفے کا امتحان دینے کے لیے پہلی مرتبہ خوشاب گئے تو سائیکل دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ دو پہیوں پر کیسے چلتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے تمغۂ حسن کارکردگی، ستارۂ امتیاز، نشانِ امتیاز اور ملک کے سب سے بڑے ادبی اعزاز کمال فن ایوارڈ کو اعتبار بخشا۔ کسی کو یہ کہنے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی کہ مرحوم احمد ندیم قاسمی دنیائے ادب کی عہد ساز شخصیت، صاحب طرز اور نامور شاعر، مایہ ناز افسانہ نگار، معتبر مدیر اور صاحبِ اسلوب کالم نگار تھے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھرپور اور مکمل ادبی زندگی بسر کی۔ نوے برس کی عمر میں بھی انتہائی متحرک ادبی رہنما کی حیثیت سے کاروان ادب کو سرگرم کار رکھا۔ انھیں مقبول عام اور ذی احترام ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ذیل میں اُن کی زندگی کا ایک مختصر سوانحی خاکہ پیشِ خدمت ہے:

حالات وکوائف احمد ندیم قاسمی

نام : احمد شاہ
ادبی نام : احمد ندیم قاسمی
والد کا نام : پیر غلام نبی عرف نبی چن (چن پیر) (وفات ۱۹۲۴ء)
والدہ : غلام بیوی (وفات ۱۹۵۶ء)
تاریخ پیدائش : ۲۰/نومبر ۱۹۱۶ء
جائے پیدائش : انگہ، ضلع سرگودھا (حال ضلع خوشاب)
تاریخ وفات : ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء، جائے وفات: لاہور
اولاد : دو بیٹیاں، ایک بیٹا ۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی (پیدائش ۱۹۴۹ء) نشاط خالد (پیدائش ۱۹۵۱ء ۔ وفات ۱۹۹۵ء) اور نعمان ندیم قاسمی (پیدائش ۱۹۵۶ء)
تعلیم : درس قرآن پاک (۲۱_۱۹۲۰ء)، پرائمری (انگہ سے ۱۹۲۵ء)، مڈل (کیمبل پور اٹک سے ۱۹۲۹ء)، میٹرک (شیخوپورہ سے ۱۹۳۱ء)، انٹرمیڈیٹ (بہاول پور سے ۱۹۳۳ء) اور گریجویشن (پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء)

ملازمتیں : ریفارمز کمشنر لاہور میں بطور محرر کلرک تقرر (۳۷_۱۹۳۶ء)
ٹیلی فون آپریٹر اوکاڑہ (۱۹۳۹ء)
ایکسائز سب انسپکٹر (۴۱_۱۹۳۹ء)
اسکرپٹ ایڈیٹر ریڈیو پاکستان پشاور (۴۸_۱۹۴۶ء)
بزم اقبال کے اعزازی سیکرٹری (۷۸_۱۹۷۷ء)
ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب_لاہور (۲۰۰۶ء_۱۹۷۴ء)

ادارتیں : کالج میگزین ''نخلستان'' بہاولپور (۳۵_۱۹۳۶)
ایڈیٹر ہفتہ وار پھول، تہذیب نسواں (۱۹۴۱ء_۱۹۴۵ء)
ایڈیٹر رسالہ ادب لطیف (۱۹۴۲ء_۱۹۴۶ء)
ایڈیٹر رسالہ سویرا (۱۹۴۷ء_۱۹۴۸ء)
ایڈیٹر رسالہ نقوش (۱۹۴۸ء_۱۹۴۹ء)
سیکرٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان (۱۹۴۸ء_۱۹۵۴ء)
ایڈیٹر روزنامہ امروز (۱۹۵۳ء_۱۹۵۹ء)
ایڈیٹر رسالہ فنون (۱۹۶۲ء تا وفات)

کالم : ۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۶ء تک آپ کے کالم روزنامہ ''امروز'' میں (حرف و حکایت، پنج دریا، عنقا، تہذیب و فن)، روزنامہ ''ہلال پاکستان'' میں (موج در موج) روزنامہ ''احسان'' میں (مطائبات) روزنامہ ''جنگ کراچی'' میں (لاہور لاہور ہے) روزنامہ ''حریت کراچی'' میں (موج در موج/لاہوریات) اور روزنامہ ''جنگ لاہور'' میں (رواں دواں) کے ناموں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

تصانیف:

(الف) شاعری

۱_دھڑکنیں (۱۹۴۱ء)
۲_رم جھم (۱۹۴۴ء)
۳_جلال و جمال (۱۹۴۶ء)
۴_شعلۂ گل (۱۹۵۳ء)
۵_دشتِ وفا (۱۹۶۳ء)
۶_محیط (۱۹۷۶ء)
۷_دوام (۱۹۸۰ء)
۸_لوحِ خاک: ۱۹۸۸ء
۹_جمال (نعتیہ مجموعہ) (۱۹۹۲ء)
۱۰_بسیط (۱۹۹۵ء)
۱۱_ارض و سما (۲۰۰۶ء)

(ب) افسانے

۱۔ چوپال (۱۹۳۹ء)　　۲۔ بگولے (۱۹۴۱ء)　　۳۔ سیلاب (۱۹۴۲ء)
۴۔ طلوع وغروب (۱۹۴۳ء)　　۵۔ گرداب (۱۹۴۳ء)　　۶۔ آنچل (۱۹۴۵ء)
۷۔ آبلے (۱۹۴۶ء)　　۸۔ آس پاس (۱۹۴۸ء)　　۹۔ درودیوار (۱۹۴۹ء)
۱۰۔ سناٹا (۱۹۵۲ء)　　۱۱۔ بازارِ حیات (۱۹۵۵ء)　　۱۲۔ برگِ حنا (۱۹۵۹ء)
۱۳۔ سیلاب وگرداب: انتخاب (۱۹۶۱)　　۱۴۔ گھر سے گھر تک (۱۹۶۳ء)
۱۵۔ کپاس کا پھول (۱۹۷۳ء)　　۱۶۔ نیلا پتھر: ۱۹۸۰ء　　۱۷۔ کوہ پیما (۱۹۹۵ء)
۱۸۔ پت جھڑ (۲۰۰۷ء)

(ج) تنقید

۱۔ تعلیم اورادب وفن کے رشتے (۱۹۷۴ء)　　۲۔ تہذیب وفن (۱۹۷۵ء)
۳۔ ''اقبال'' ایک محاکمہ (سوانحی کتابچہ (۱۹۷۷ء)　　۴۔ پس لفاظ ۲۰۰۴ء
۵۔ معنی کی تلاش ۲۰۰۴ء۔

(د) سوانحی خاکے

۱۔ میرے ہم سفر (۲۰۰۲ء)　　۲۔ میرے ہم قدم (۲۰۰۶ء)

(ر) متفرقات

۱۔ کیسر کیاری (۱۹۴۴ء)　(طبع زاد وماخوذ مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ)
۲۔ انگڑائیاں (۱۹۴۴ء)　(نامور افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے)
۳۔ نقوشِ لطیف (۱۹۴۴ء)　(نامور خواتین افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے)
۴۔ منٹو کے خطوط بنام ندیم (۱۹۶۶ء)　(ندیم کے نام سعادت حسن منٹو کے خطوط)
۵۔ پاکستان کی لوک کہانی: ترجمہ (۱۹۷۲ء)
۶۔ نذرِ حمید احمد خان (۱۹۸۰ء) (حمید احمد خان کے پسندیدہ موضوعات پر اہلِ فکر کے مقالات کا مجموعہ)
۷۔ فکاہی کالم کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' (۹۹_۲۰۰۹ء)

(ز) بچوں کے لیے

۱۔ آسمان کے گوشے میں: ڈرامے (۱۹۴۳ء)　　۲۔ دوستوں کی کہانیاں: ۱۹۴۳ء
۳۔ نئی نویلی کہانیاں: ۱۹۴۴ء　　۴۔ بچوں کے لیے نظمیں (زیرِ ترتیب)

قیدوبند

۱۔مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی
۲۔اکتوبر ۱۹۵۸ء سے فروری ۱۹۵۹ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی۔

اعزازات

یوں تو احمد ندیم قاسمی کو بے شمار ادبی اعزازات سے نوازا گیا ہے جن میں سے چند ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ آدم جی ادبی ایوارڈ (۱۹۶۴ء۔۱۹۷۶ء۔۱۹۷۹ء)
۲۔ تمغۂ حسنِ کارکردگی (۱۹۶۸ء)
۳۔ ستارۂ امتیاز (۱۹۸۰ء)
۴۔ نشانِ امتیاز (۱۹۹۹ء)
۵۔ کمالِ فن ایوارڈ (۱۹۹۷ء)
۶۔ پہلا عالمی فروغِ اردو ادب دوحہ ادبی ایوارڈ (۲۰۰۲ء)
۷۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ ایوارڈ (۲۰۰۷ء)

پہلی نظم

مولانا محمد علی جوہر: ۱۹۳۱ء (روزنامہ سیاست لاہور)

پہلا افسانہ

بدنصیب بت تراش: ۱۹۳۶ء (رسالہ رُومان لاہور)

☆☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی

احمد ندیم قاسمی

۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو اردو زبان و ادب کے عظیم شاعر و افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت ان کی عمر ۹۰ سال تھی۔ وفات سے چند دن پہلے تک وہ پوری طرح زندہ تھے۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ بات میں وہی مٹھاس، لہجے میں وہی شائستگی، وضع داری اور رکھ رکھاؤ میں وہی خلوص اور سلیقہ جو ساری عمر ان کی پہچان رہا، پوری طرح موجود تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کا وجود ان کے چاہنے والوں کے لیے ایک ایسا مینارۂ نور تھا جو نہ صرف ان کی زندگیوں کی رہنمائی کرتا تھا بل کہ ظلمتوں میں تیز اجلی روشنی بھی فراہم کرتا تھا۔ وہ سیاست کے نہیں پوری طرح ادب کے آدمی تھے۔ ساری عمر شعر و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ اس سطح پر انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انسان، انسان دوستی اور انسانیت کا احترام ساری عمر ان کا مسلک رہا۔ اسی اندازِ نظر نے انھیں ہمیشہ تازہ دم رکھا اور وہ اپنی تخلیقات سے اسی لیے انسان و انسانیت کا علم ہمیشہ بلند کیے رہے۔ ساری عمر ان کی شاعری اور ان کے افسانے نہ صرف اس کی گواہی دیتے رہے بل کہ آج بھی، جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں، وہ اس کے گواہ ہیں اور آئندہ بھی اس کی گواہی دیتے رہیں گے۔

احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی بڑے تھے اور شاعر بھی بڑے تھے۔ تخلیق ادب کا یہ ایسا کرشمہ ہے کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بھی بلند پایہ تھا اور تخلیقی شعور بھی کمال درجے کا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر احسن فاروقی نے قاسمی صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ قاسمی صاحب ''ان لوگوں'' میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں جن کی تخلیق تنقیدی شعور پر مبنی ہے اور جن کی تنقید تخلیقی عمل کا ثبوت دیتی ہے۔''

احمد ندیم قاسمی کی ایک سب سے بڑی اور نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ پاکستان کے محبِّ وطن با شعور اہل قلم تھے۔ پاکستان سے گہری وابستگی ان کی شاعری اور ان کی تنقیدی اور تخلیقی نثر میں نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ اپنی کتاب ''تہذیب و فن'' میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''جو شخص اپنے وطن اور قوم سے محبت نہیں کر سکتا وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا، اسے حسن و خیر اور عدل و توازن کا شعور بھی حاصل نہیں ہو سکتا'' اور پاکستان سے یہی

گہری محبت ان کی اس نظم میں بھی نظر آتی ہے جو ان کے شعری مجموعے ’’لوحِ خاک‘ میں وطن کے لیے ایک دعا‘‘ کے عنوان سے شامل ہے اور ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے:

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پہ اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

جس جرأت، حوصلہ مندی اور بے باکی سے احمد ندیم قاسمی نے چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں مضامین لکھے کسی اور ادیب و دانشور کے قلم سے نہیں نکلے اور یہ فی الحقیقت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس وقت اکثر ادیب و دانشور تذبذب اور عدم فیصلہ کا شکار تھے لیکن قاسمی صاحب ہی کی وہ آواز تھی جس نے سب کو تذبذب کی دلدل سے نکال کر پاکستانی ہونا سکھایا تھا۔ یہ مضامین ان کی کتاب ’’تہذیب و فن‘ میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس مسئلے پر ان کا ذہن کس قدر صاف اور شفاف ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی تھی کہ ترقی پسندی اور محبِّ وطن پاکستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اپنے مضمون ’’روحِ عصر کے تقاضے‘‘ میں قاسمی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ایک منچلے سے شاعر نے دعویٰ کیا تھا کہ میں شاعرِ اعظم ہوں اور فراق گورکھپوری نے اسے سمجھایا تھا کہ میاں پہلے ’’قدِ آدم‘‘ تو ہولو، جب تک ہم پاکستانی ادیب نہیں بنیں گے، عالمی نقطۂ نظر کا ادیب کہلانا ہمیں کیسے سجے گا اور عصر کی روح صرف واشنگٹن اور نیویارک، پیرس اور لندن، برلن اور روم ہی میں تو نہیں رہتی۔ تلاش کیجیے تو پنڈی اور کراچی میں بھی مل جائے گی اور درخت کی چوٹی تک پہنچنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ تنے کی طرف سے اوپر بڑھیے۔ زمین پر سے چھلانگ مار کر درخت کی پھننگ پر جا بیٹھنا تو صرف ٹارزنوں کا کام ہے اور ہم ٹارزن نہیں ہیں۔ ہم تو اہلِ قلم ہیں جن کا مٹی سے رشتہ بہت استوار ہوتا ہے‘‘۔ (ص ۲۲، تہذیب و فن)

یہ نقطۂ نظر اتنا واضح اور دوٹوک ہے کہ اس پر یقیناً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اب جب کہ احمد ندیم قاسمی

ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ ادب ان کے سارے تخلیقی وتنقیدی کاموں کا جائزہ لے کر معروضی انداز میں تاریخ ادب اردو میں ان کا مقام متعین کریں۔ احمد ندیم قاسمی بڑے ادیب، بڑے شاعر، بڑے افسانہ نگار تھے۔

انھوں نے اردو ادب کو زندہ رہنے والی کہانیاں دیں، انھوں نے شاعری میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، اب انھیں پھر سے دہرانے اور سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے کاموں ہی سے زندہ رہے ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔ اب ان کی شعری ونثری تخلیقات کو بھی بصورت کلیات دو یا تین جلدوں میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل ان کے ساتھ رہے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرے برسوں پرانے مراسم تھے۔ ان کے متعدد خطوط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میری "تاریخ اردو ادب" کی بقیہ ساری جلدیں ان کی زندگی میں ان کے ہاتھوں شائع ہوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی ایک جلد مکمل ہوگی میں اشاعت کے لیے انھیں دے دوں گا۔ اس عرصے میں کئی دوسرے ناشروں نے طرح طرح سے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں تاریخ کی بقیہ جلدیں ان کو اشاعت کے لیے دے دوں مگر میں نے ان سے معذرت کر لی اور کہا کہ میں قاسمی صاحب کو زبان دے چکا ہوں اور معاملات کی زبان ایک ہی ہوتی ہے وہ مجھے اکثر لاہور سے فون کرتے، خط لکھتے اور جلد سوم کو جلد بھیجنے کا تقاضا کرتے۔ ان کے تقاضوں سے مجھ میں ایک نئی روح بیدار ہوتی اور کام کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔ جب جلد سوم مکمل ہوئی تو میں اس کا مسودہ لے کر خود لاہور گیا، اسے قاسمی صاحب کے ہاتھ میں دیا اور انھوں نے احمد رضا صاحب کو بلا کر اس کی فوری اشاعت کے لیے کہا اور مجھے خوشی ہے "تاریخ اردو ادب" کی جلد سوم کے چھپے ہوئے ابتدائی فرمے وفات سے چند دن پہلے انھوں نے اپنی زندہ آنکھوں سے دیکھا اور ایسے خوش ہوئے کہ جیسے انھیں دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی اتنے بڑے انسان، اتنے بڑے شاعر، اتنے بڑے افسانہ نگار اور دانشور تھے کہ آج کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اردو ادب کے لیے ان کی وفات ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور فردوس بریں میں بلند درجات سے سرفراز کرے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

قاسمی صاحب

کئی سال کی بات ہے، ۱۹۴۸ء کا سال رہا ہوگا، یا شاید ۱۹۴۹ ہو۔ بہر حال پچاس سے بہت اوپر گزر گئے ہیں۔ میں نے ایک رسالے میں احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم پڑھی۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کے چرچے ہر طرف تھے۔ اس لیے میں بھی ان کے نام سے آشنا تھا لیکن ان کی شاعری کے توسط سے نہیں بلکہ ان کے افسانوں کے توسط سے۔ نظم کا آخری بند میرے دل پر کچھ ایسا نقش ہوا کہ آج تک دھندلایا نہیں ہے۔

زندگی کو سنوارنے کی مہم   کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ   آدمِ نو کے انتظار میں ہے

زمین کے لیے خلا کی رقاصہ کا استعارہ، مجھے بہت اچھا لگا۔ زمین کا حسن، اس کی وسعت، سیارے یا ستارے کی حیثیت سے محفلِ آفاق میں اس کا وجود، مسلسل رقص میں محو لیکن خلائے بسیط میں بالکل تنہا، گویا وہ سچے فنکاروں کی طرح سامع یا تماشائی سے بے نیاز ہو، حتیٰ کہ وقت سے بھی بے نیاز ہو، کہ خلا میں لامکانی ہے اور جہاں لامکانی ہے وہاں وقت بھی نہیں۔ یہ سب باتیں کچھ مبہم، کچھ بہت روشن میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔ آج بھی جب وہ شعر یاد آجاتے ہیں تو اسی طرح کی محویت، اسی طرح کی لگن اور زمان و مکان کے اسی سلسلے کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جس نے اس دن میرے نوآموز تخیل کو زندگی کی سی حرارت اور سرور عطا کیا تھا۔ پھر یہ خود اعتمادی کہ زندگی کو بنانے اور سدھارنے کے لیے ہم تقدیر پر نہیں بلکہ تدبیر اور عمل پر بھروسہ کرتے ہیں ”کب مقدر کے اختیار میں ہے“ کا آہنگ اور استفہام وجود انسانی کی افضلیت اور اشرفیت کے اعلان کی طرح تھا اور وہ ”آدمِ نو“ جس کے انتظار میں خلا کی رقاصہ نے اپنی محفل تنہا آباد کی تھی، کہانیوں کے پراسرار شہزادے، یا ققنس کی طرح اپنی خاکستر میں سے جی اٹھنے والے کسی مردِ تقدیر کی طرح تھا، جس کے نمودار ہوتے ہی ہماری زمین خود کو اس کے سپرد کر دی گئی۔

یہ سب از خود رومانی تو تھا بلکہ بڑی حد تک تعمیمی اور شاندار حل کی طرح کا تھا۔ ایسا حل جسے چادر کی طرح اوڑھا اڑھا کر بڑے پیچیدہ مسائل اور خوف اور خون سے بھری ہوئی حقیقتوں کو ڈھانپنے کا کام لیا گیا تھا

لیکن یہ دلکش پھر بھی تھا کہ انسان کا ذہن خاص کر انسانوں کے بچوں کا ذہن فریب کھانے کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔

اسے واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں، کی ایک صورت کہیے یا قول سے زیادہ عمل کو معتبر چاہے کی امید کا اظہار کہیے لیکن ہے یہ انسانی زندگی کی حقیقت اور احمد ندیم قاسمی کے یہ مصرعے اسی حقیقت کا دوسرا نام ہے۔

’’زندگی کو سنوارنے‘‘ کا فقرہ اس وقت تو نہیں، لیکن بعد میں کچھ کمزور لگنے لگا تھا، سنوارنا‘ تو شاید کسی اچھی چیز کو اور بہتر بنانے کو کہتے ہیں؟ شاید ’’سدھارنا‘‘ بہتر ہوتا؟ لیکن شاید اس زمانے میں یہی محاورہ مقبول تھا۔ نشور واحدی صاحب کا مصرع بھی ان دنوں بہت مشہور رہا تھا:

جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

یہ سب سہی ’’زندگی کو سنوارنا‘‘ مجھے اب کچھ بہت اچھا نہیں لگتا مگر یہ بات اس وقت میرے لیے کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے زور اور شباب کا تھا۔ اس وقت ہم لوگوں کو ترقی پسند ادیبوں کے حالات جاننے، ان کی کتابیں اور رسالے پڑھنے، ان کے بارے میں باتیں کرنے کا شوق تھا۔ زبان و بیان کی اہمیت اگر تھی تو ثانوی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں یہ معلومات میرے لیے زیادہ بامعنی تھیں کہ وہ ذات کے سید اور ایک صوفی خاندان کے فرد ہیں اور ان کا نام احمد شاہ تھا۔ معاشرے میں تمام سیدوں کی بڑی آؤ بھگت ہے۔ لوگ انھیں ’’شاہ صاحب‘‘ کہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے سرکاری نوکری چھوڑ کر شعر و شاعری اور صحافت اور سیاسی کاموں کا مشغلہ اختیار کر لیا ہے۔ اگرچہ اس میں فائدہ کچھ نہیں بل کہ نقصان ہی نقصان ہے۔ ہم جو گلشنِ ادب کے نوآموز اور نوپر تھے۔ ہمیں یہ سب باتیں بڑی دلکش، رومانی اور شاعر کے منصب کے عین مناسب معلوم ہوتی تھیں۔ ترقی پسند ادب نے ادب کو ہیرو کے طور پر پیش کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اور ہم سب کسی نہ کسی نہج سے اس بات کو درست سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کا یہ قول ہم میں سے اکثر کو بالکل بجا اور قابل یقین معلوم ہوتا تھا کہ برا شخص اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔

یہ انجمن ترقی اردو کے لیے بڑی تحسین اور افتخار کی بات ہے کہ نئے ادب کا دور شروع ہوتے ہی انجمن نے نئی شاعری کا ایک انتخاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ’’انتخاب جدید‘‘ کے نام سے یہ گلدستہ آل احمد سرور اور عزیز احمد نے مرتب کیا اور انجمن نے اسے 1943ء میں شائع کیا۔ اس انتخاب میں اکثر ترقی پسند شعرا نظر آتے ہیں لیکن احمد ندیم قاسمی ان میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس وقت تک قاسمی صاحب کا نام بطور

افسانہ نگار زیادہ مشہور تھا۔ اس وقت ترقی پسند شاعری کے دو رنگ رائج تھے اور شاید ہمیشہ رائج رہے۔ ایک تو فیض صاحب کا رومانی، کیفیت سے بھرپور، شائستہ، تھوڑی سی محزونیت لیے ہوئے، استعارہ و تشبیہ اور نئے نئے الفاظ و تراکیب سے جگمگاتا ہوا اسلوب، اور دوسرے سردار جعفری کا بلند آہنگ، خطیبانہ، برائے راست گفتگو کا انداز، جس کی انتہائی شکل سید مطلبی فرید آبادی کی نظم میں نظر آتی تھی۔ بعد میں مجروح صاحب نے کچھ غزلوں میں اور نیاز حیدر نے اپنی نظموں میں یہی اسلوب اختیار کیا۔ ''انتخاب جدید'' میں دونوں رنگوں کے محتاط نمونے ملتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا اسلوب شعر ان دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر لگی۔

اگرچہ احمد ندیم قاسمی کے اصل شاعرانہ جوہر ان کی نظم میں نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے غزل میں بھی کئی شعر ایسے کہے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ کم و بیش ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

یکساں ہیں فراق و وصال دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

جہاں تک نظم کا معاملہ ہے، ندیم صاحب کی بڑی صفت یہ تھی کہ ان کے تخیل میں کچھ اس طرح کی آسمان گیری ہے جو اقبال کی یاد دلاتی ہے اور اقبال ہی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اقبال جس آسانی اور بے تکلفی سے فلک، چاند، تاروں، سورج، خلائے بسیط اور زمان و مکان پر مبنی استعارے اور پیکر اپنی نظم اور غزل میں استعمال کرتے کچھ اس طرح کی آسمان گیری قاسمی صاحب کے یہاں بھی ہے۔ اگرچہ قاسمی صاحب کے یہاں اقبال جیسی تعقلاتی کیفیت اور ڈرامائی رنگا رنگی نہیں۔ قاسمی صاحب کی جس نظم کے دو شعر میں نے شروع میں

درج کیے ہیں۔ ان میں بھی یہی آسمان گیری نمایاں ہے، یہاں زمین صرف زمین نہیں ہے بل کہ کائنات میں گھومتا ہوا، رقص کرتا ہوا ایک ماورائے انسانی، خلائی وجد ہے۔ اب ایک اور نظم کے یہ مصرعے دیکھیے:

اگر وقت سورج کی زرکار بہلی کو صرف ایک پل کے لیے روک سکتا
اگر یہ جہاں دیدہ کاہن کبھی انقلابات کا راستہ ٹوک سکتا
لپکنا مگر اس کی تقدیر میں ہے پلٹنا بھی دشوار تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں ستا سکے گا ازل اس کی نگری ابد اس کی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں، یہ شام یہ شب، یہ پو، یہ سویرا
تو دہکے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھریرا   (ناگزیر)

پہلے یہ بات واضح کردوں کہ ''سرخ پہیوں'' سے مراد اشتراکی انقلاب وغیرہ کی سرخی نہیں بل کہ سورج کی ''زرنگار بہلی'' یعنی وقت کا سفر ہے، وقت وہ انقلابی آگ ہے جو اجنبی طاقت کے پھریرے کو جلا کر خاک کردے گی۔ نظم کو ہم مارکسی نقطۂ نظر سے تاریخ کی ناگزیریت کے نظریے پر مبنی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ تاریخ کی ناگزیریت کو بیان کرنے کے لیے احمد ندیم قاسمی نے آسمان، سورج، وقت کی شاہراہ، ابد، ازل جیسے الفاظ پر مبنی پیکر اور تصورات کا انتخاب کیا ہے۔ بعض الفاظ تو بالکل ہی اقبال کی تخلیقی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے قاسمی صاحب کے بہت سے افسانے اپنے زمانہ نوجوانی میں پڑھے۔ بعض مجھے بہت اچھے لگے۔ بعض نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ وہ اس روایتی خوبی سے معرا تھے جو احمد ندیم قاسمی کی خاص صفت بتائی جاتی ہے۔ یعنی پنجاب کے دیہات کی تصویر کشی، ویسے مجھے یہ بات ہمیشہ نامناسب لگی کہ افسانہ نگاروں کو اس طرح علاقوں میں بانٹ دیا جائے، کیوں کہ پھر ان کی شخصیت انہی علاقوں کے حوالے سے متعارف اور مذکر ہوتی ہے۔ بیدی صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار تو اس علاقائی پھندے سے بچ نکلتے ہیں اور بیدی صاحب یوں بھی اس قدر متنوع ہیں اور ان کے تنوع کا ہر رنگ اس قدر توجہ انگیز ہے کہ ان پر کوئی لیبل فٹ نہیں آتا لیکن بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی جیسے عمدہ لیکن نسبتاً محدود افسانہ نگار نقصان میں رہتے ہیں۔

بہر حال، وقت گزرنے کے ساتھ قاسمی صاحب کا تصور میرے ذہن میں ایک روشن خیال بزرگ اور وسیع الاخلاق مدیر کی صورت میں روشن ہوتا گیا۔ سن ساٹھ کی دہائی میں جب ترقی پسند تحریک اپنے معنی کھو چکی تھی (پاکستان میں اس کا حال ہندوستان سے بھی زیادہ ابتر تھا) اور ترقی پسند ادب صفحۂ ادب کے مرکز سے ہٹ کر

حاشیے پر آ گیا تھا اور فیض صاحب کے سوا تمام ترقی پسند ادیبوں کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگنے کی نوبت آ رہی تھی۔ قاسمی صاحب نے ۱۹۶۳ء میں ''فنون'' نکالا۔ اور وہ بہت جلد اردو کی ادبی دنیا میں ایک اہم شخصیت کے طور پر واپس آ گئے۔ ''فنون'' ترقی پسند رسالہ نہ تھا لیکن یہ جدید یا قدامت پسند رسالہ بھی نہ تھا ''فنون'' کے اوراق ہر طرح کے ادب کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ بس معیار کی بلندی اور انداز کی تازگی شرط تھی۔ قاسمی صاحب نے کوئی ترقی پسند گوشوارۂ عمل جاری کرنے کے بجائے تمام ترقی پسند ادب کو زمانے کا ہم قدم ہونے اور پھر بھی ترقی پسند رہنے کی ترغیب دی۔ ہر مکتبِ فکر اور اسلوبِ فن کے لکھنے والوں کو ''فنون'' کے صفحات پر جگہ دے کر انھوں نے اس اصول کی تصدیق و توثیق کی کہ اچھا ادب لازمی طور پر کسی جھنڈے یا لیبل کا محتاج نہیں ہوتا۔

۱۹۶۹ء میں ''فنون'' کا جدید غزل نمبر نکلا۔ اس میں کئی خواص ایسے تھے جو اسے ضخیم نمبروں کی عام ڈگر سے الگ راہ پر قائم کرتے تھے۔ لیکن اس میں ایک خوبی ایسی تھی جو اس طرح کے کسی نمبر کو نصیب نہ ہوئی، نہ پہلے نہ بعد میں۔ اور وہ خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر مکتبہ و منہاج کے اچھے شاعر شامل کیے گئے تھے اور ان شعرا کو بطور خاص جگہ دی گئی تھی جنھیں اس وقت کے ''فیشن'' کے مطابق ''جدید غزل'' کے کسی انتخاب میں شامل ہونے کا اتفاق نہ تھا۔ فہرست سے چند نام حسب ذیل ہیں:

آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، احتشام حسین، احسان دانش، اقبال عظیم، حفیظ جالندھری، شفقت مرزا، شیر افضل جعفری، صوفی تبسم، عابد علی عابد، ماجد الباقری، محمد نبی خان، جمال سویدا، منظور حسین شور اور بہت سے دوسرے، جن میں سے بعض کا کلام اس لیے محفوظ رہ گیا ہے کہ وہ ''فنون'' کے جدید غزل نمبر میں ہے۔ اور بہت سے شعرا ایسے ہیں آج جن کے بارے میں توصیفاً کہا جاتا ہے کہ وہ ''فنون'' کے جدید غزل نمبر میں شامل تھے۔ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کم ہی پرچے ایسے ہوں گے جن کا کوئی خاص نمبر تقریباً چالیس سال گزرنے کے باوجود تازہ اور قابل مطالعہ معلوم ہو۔ وجہ ظاہر ہے۔ قاسمی صاحب کا معیار انتخاب ذاتی یا نظریاتی تعصّبات سے بالاتر تھا۔

''فنون'' کے علاوہ اور بھی پرچے نکلتے تھے۔ (مثلاً ''سویرا'') جو نئے ادب کی نمائندگی کرتے تھے لیکن ''فنون'' جیسی وسعت نظر کسی میں نہ تھی۔

ایڈیٹر کی حیثیت سے قاسمی صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی جس پر میں نے ہمیشہ رشک کیا۔ قلمی معاونین کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ اخیر عمر تک ان کا سواد خط بہت پاکیزہ اور حروف کی نشست بہت پختہ تھی۔ خط

میں ازراہِ انکسار اپنا نام وہ ہمیشہ "ندیم" لکھتے تھے۔ اور جو تحریر انھیں پسند آتی اس کی تعریف کرتے تھے، خواہ وہ ان کے ادبی مؤقف کی حمایت میں ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بہترین دنوں میں "فنون" سے زیادہ تازہ کار، فکر انگیز مضامین اور عمدہ شعر و افسانہ چھاپنے والا کوئی رسالہ پاکستان میں نہ تھا۔ کراچی کے رسالے نئی تحریروں کے بارے میں بہت محتاط بلکہ قدامت پرست تھے لیکن قاسمی صاحب ہمیشہ نئی اور متنازعہ فیہ ہو جانے والی تخلیقات کے جویا رہتے تھے۔ انھوں نے محمد حسن عسکری اور محمد ارشاد اور امیر خسرو اور وزیر آغا پر رشید ملک کے طول طویل مضامین کئی قسطوں میں شائع کیے۔ ہر شخص ان کی ہر بات سے مطمئن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن ہر شخص متفق تھا کہ ساری قسطیں بہت خیال افروز اور اعلیٰ علمی کی مثال پیش کرتی تھیں۔

قاسمی صاحب نے کالم اور تنقیدیں بھی لکھیں۔ پاکستان کے کالم کے نام پر جس طرح لوگوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور جس طرح کالم نگاری کو ادبی سیاست کے مؤثر اور مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے سب اس سے واقف ہیں۔ قاسمی صاحب نے کالم نگاری کے پردے میں ذاتی حملے کا مشغلہ اختیار کرنے سے عموماً گریز کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاسمی صاحب کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی/اپنے تعصبات نہیں تھے۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے اختلافات، فیض صاحب کے بارے میں قاسمی صاحب کی رائے زنی، یہ سب جدید ادب کے جھگڑوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں قاسمی صاحب نے اپنے قلم یا زبان کو تکلیف دہ مذمتوں سے محفوظ رکھا۔ کئی سال ہوئے فراق صاحب پر میری کچھ تحریروں پر، اور خاص کر ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کو فراق صاحب پر تفوق دینے کی بات پر آشفتہ ہو کر قاسمی صاحب نے ایک کالم لکھا تھا جس میں من جملہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ فراق صاحب کی زندگی میں فاروقی صاحب کچھ بولے نہیں، جب فراق صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں تو وہ انھیں اپنا ہدف بنا رہے ہیں۔ میں نے وہ کالم دیکھا لیکن خاموش رہا کیوں کہ ایسے معاملات میں کچھ کہنا بے اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس کالم کی اشاعت کے کئی سال بعد جب ایک معزز معاصر رسالے نے قاسمی صاحب کا وہ کالم بڑے اہتمام سے یوں چھاپا گویا وہ کوئی تازہ تحریر ہو تو میں نے قاسمی صاحب کو لکھا کہ میں نے فراق صاحب کے بارے میں جو لکھا وہ ان کی زندگی میں لکھا تھا۔ لیکن آج آپ کا وہ پرانا کالم یوں شائع کیا جا رہا ہے گویا وہ آپ کی تازہ تحریر ہو۔

قاسمی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کالم کس نے چھاپا ہے میری اجازت تو کیا اشارہ بھی اس میں نہ تھا اور فراق صاحب کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی تحریریں ان کی عین

حیات میں شائع ہوئی تھیں، ورنہ میں ایسا کچھ بھی نہ لکھتا جو میں نے لکھا تھا۔ میں نے اس معاملے کو وہیں رفت گزشت کیا کیوں کہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔

میں پچھلی بار جب لاہور گیا تو میں نے قاسمی صاحب سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گزشتہ سے ایک سال پہلے میں لاہور میں اپنے بہت مختصر اور مصروف پروگرام کے باعث ان سے نہ مل سکا تھا۔ اگرچہ کوشش میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں واپس آیا تو قاسمی صاحب کا شکایت نامہ ملا کہ آپ مجھ سے بے ملے چلے گئے۔ اگر آپ کو فرصت نہ تھی تو کہلا دیتے۔ میں ہی آ جاتا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں نے فوراً معذرت نامہ لکھا۔ اس آخری ملاقات نے مجھے رنجیدہ کیا کیوں کہ قاسمی صاحب پر عمر رسیدگی کا اضمحلال نمایاں تھا۔ اگرچہ گفتگو میں پہلی جیسی شگفتگی تھی۔ واپس آ کر میں نے انھیں کچھ رباعیاں ان کے نام معنون کر کے بھیجیں۔ وہ انھوں نے شائع کر دیں لیکن جواب میں خط کے بجائے ایک دوست کے ذریعے شکریہ کہلا بھیجا۔

اب لاہور میں میرا کوئی بزرگ ایسا نہیں رہ گیا جس سے میں لاہور جا کر ملوں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شکایت نامہ لکھے کہ آپ مل کر نہیں گئے۔

یاران رفتہ آہ بڑی دور جا بسے
(مصحفیؔ)

☆☆☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر

احمد ندیم قاسمی۔ سب اچھا کہیں جسے

جس طرح آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود بھی تمام سیارے ایک مرکز یعنی شمس کے زیر اثر ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی شخصیت کی تشکیل کرنے والے رجحانات ومیلانات بھی کسی ایک اساسی رویے سے مشروط ہوتے ہیں، ہرچند کہ بادی النظر میں ایسا محسوس نہ ہو۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا خمیر محبت سے اٹھا تھا جبکہ ان کی تخلیقی شخصیت کی متعدد جہات ان کے اس معروف مصرع کی تفسیر ہیں:

انسان عظیم ہے خدایا!

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند ادب کی تحریک کے آخری بڑے قلم کار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں اس تحریک سے وابستہ قاسمی صاحب کی قامت کا کوئی بڑا سینئر اور فعال دانشور باقی نہیں رہا۔ انسان دوستی کا رویہ اس تحریک کے منشور کا حصہ تھا لیکن احمد ندیم قاسمی اور تحریک سے وابستہ دیگر اہل قلم میں اس امر سے امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ محبت اور انسان دوستی کا سرچشمہ قاسمی صاحب کی شخصیت سے پھوٹتا تھا۔ یہ ان کے لیے نظریے کی نہیں بلکہ آدرش کی بات تھی۔

میرا ان سے تقریباً چالیس برس تعلق رہا اور میں نے انھیں ہر آن میں دیکھا ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے انھیں کبھی غصے، ناراضگی یا عالم غیض میں دیکھا ہو۔ جب بھی ملا انھیں مسکراتے ہوئے پایا۔ مسکرانا اور مسکراہٹیں تقسیم کرنا آسان نہیں بالخصوص اس شخص کے لیے جسے بوجوہ متنازع بنا دیا گیا ہو۔

سارے لاہور میں ان کا دفتر ایسی جگہ تھی جہاں میں بلا وجہ، بلا مقصد اور بے وقت جا سکتا تھا، بلکہ اگر کچھ دنوں تک نہ جا پاتا تو ان کا فون آ جاتا کہ بھئی کیوں نہیں آئے؟

مجھے نہیں یاد میں نے انھیں کبھی پریشان، آزردہ، دل گرفتہ یا اعصابی تناؤ میں دیکھا ہو۔ انسان ادیب ہو، ادب کے مرکزی دھارے کا حصہ ہو، اس شہر غدار میں زیست کرتا ہو، حاسدوں کی غوغا آرائی بھی ہو اور ان سب کے باوجود وہ شانت رہے تو اس کے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہے، ایسا ظرف جو ہر کسی کو میسر نہیں۔

قاسمی صاحب کو دکھوں، پریشانیوں، آزردگیوں اور دل آزاریوں کا خاصا حصہ ملا تھا، لیکن انھوں نے ان سب کو اپنے باطن میں چھپائے رکھا، کسی دوست یا ملاقاتی کے سامنے کبھی بھی نہ شکوہ سنج ہوئے اور نہ ہی تلخ گفتار۔

ذاتی طور پر میں انھیں معلم کا درجہ دیتا ہوں۔ افسانے کا فن سمجھانے کے لیے نہیں، نہ ہی شاعری کے رموز سے آشنائی کے لیے بل کہ ان معنی میں معلم کہ بادِ مخالف کی تندی میں کیسے دستار کو گرنے نہ دیا جائے۔ دشنام کے ہنگام میں کیسے لبوں پر مسکراہٹ سجائی جائے اور کیسے اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے میں انھیں اپنا معلم سمجھتا ہوں کہ ان سے میں نے صبر اور استقامت جادۂ حیات پر گامزن رہنے کے درس کے ساتھ وقار سے خاموش رہنے کا علم بھی حاصل کیا۔ یہ آسان سبق نہیں لیکن قاسمی صاحب کی عملی زندگی نے یہ نکتہ روشن کر دیا کہ خودی سے زیست کرنا مشکل سہی مگر ناممکن نہیں۔

قاسمی صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ اگرچہ شاعری تو پہلے سے شروع کر رکھی تھی لیکن پہلی نظم مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر لکھی جو ۱۹۳۱ء میں روزنامہ سیاست کے پہلے صفحہ پر شائع ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میری پیدائش ۱۹۳۴ء کی ہے، گویا میری عمر سے زیادہ قاسمی صاحب کی شہرت کی عمر ہے۔ پون صدی تک ادب کی مختلف اصناف میں کام کرنا، خود کو تسلیم کرانا اور آخری وقت تک فعال رہنا آسان کام نہیں، مگر احمد ندیم قاسمی نے یہی دکھایا۔

وہ افسانہ نگاروں میں بڑے افسانہ نگار، شاعروں میں بڑی شاعر، صحافیوں میں بڑی صحافی تو تھے ہی مگر وہ ہم میں سے افضل بھی تھے اور اسی میں ان کی بزرگی مضمر ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی نے اس بلیغ شعر میں حیات پر موت کے غلبے کے تصور کی خوب صورت اسلوب میں نفی کی ہے۔ یہ ایسا شعر ہے جس سے تخلیق کار اور فنکار کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وقت کے بحرِ بیکراں میں حباب آسا ہوتے ہوئے بھی وہ تخلیق اور فن کے ذریعے سے جسمانی موت کے باوجود بھی فنا نہ ہوگا۔ اس کا نام خوبصورت تخلیق، زندہ تصورات اور پائیدار الفاظ کی صورت میں امر رہے گا۔ یہ تو ہوا اس شعر کو سمجھنے کا ایک انداز، لیکن اس شعر کو ذاتی واردات کا ثمر قرار دینے پر احمد ندیم قاسمی اس شعر میں اس ارفع مقام پر نظر آتے ہیں جو کبھی کبھی اور

کسی کسی تخلیقی فنکار کو نصیب ہوتا ہے۔ غالب نے ایسی ہی کیفیت کے زیرِ اثر کہا ہوگا:

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اقبال نے بھی اسی عالم میں ”یزداں بلند آورا ے ہمتِ مردانہ“ کا نعرہ لگایا تھا اور یہی کشف کا وہ منور اور شفاف لمحہ ہے جس میں احمد ندیم قاسمی نے اپنی تخلیقات سے حاصل ہونے والی جہات کا ادراک حاصل کر لیا۔

عوام تو خیر عوام ہیں، خواص کی اکثریت بھی کیلنڈر عمر بسر کرتی ہے، یعنی فلاں سن میں جنم لیا اور فلاں سن میں انتقال ہوا۔ دیکھا جائے تو فرد کی زندگی کی بس اتنی سی کہانی ہوتی ہے جو کلمہ اور تعزیتی شعر کے ساتھ قبر کے کتبے میں کہی جا سکتی ہے اور باقی جن حوادث اور واقعات سے وہ گزرتا رہا تو اس مختصر ترین کہانی میں طویل فٹ نوٹس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے افراد کی اکثریت بالآخر رزقِ خاک ثابت ہوتی اور ان کا تذکرہ اعداد و شمار میں صفر قرار پاتا ہے مگر تخلیق کار اور فن کار یا اقبال کے الفاظ میں ”مقاصدِ جلیل“ رکھنے والے افراد کیلنڈر عمر کے محدود دائرے کے ہو کر رہ جانے کے برعکس حلقۂ شام و سحر سے ماورا ہو جاتے ہیں، یوں ان کی تخلیق کا حسن، خوشبو اور کارناموں کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی ہے اور یہی عالم احمد ندیم قاسمی کا ہے۔

آج سے نوے برس پیشتر لاتعداد افراد نے جنم لیا ہوگا لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو تخلیق کار ثابت ہوئے اور پھر ان تخلیق کاروں میں بھی کتنے ہیں جو احمد ندیم قاسمی بنے، تخلیقات کے پھول کھلائے، محبت بانٹی اور محبت کی۔

دراصل یہ معاملہ ہے تخلیقی شخصیت کا۔ کیلنڈر عمر بسر کرنے والے افراد کے پاس نری شخصیت ہوتی ہے جب کہ تخلیق کار تخلیقی شخصیت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اعلیٰ تر تخلیقات اس تخلیقی شخصیت کا چمتکار ہوتی ہے۔ یہ تخلیقی شخصیت گراں قدر ہے مگر علم و دولت سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں ”میوز“ کی سرپرستی میسر ہو یا ”سرسوتی“ مہربان ہو جائے تو اور بات ہے یا پھر رحمٰن کا تلمذ نصیب ہو تو بات بنے! یہ شخصیت نہیں تخلیقی شخصیت ہے، جس سے قلم کار یا فن کار کی اہمیت طے پاتی ہے۔ جتنا بڑا تخلیق کار، اتنی ہی بڑی تخلیقی شخصیت، جتنی بڑی تخلیقی شخصیت ہوگی اسی نسبت سے ادیب وقت کی غارت گری کا بذریعہ تخلیق مقابلہ کر کے زندہ، توانا اور پائندہ تر رہے گا۔

بلاشبہ احمد ندیم قاسمی بھی ایسی ہی توانا، مستحکم اور پائیدار شخصیت کے حامل تھے ایسی تخلیقی شخصیت جس نے نہ صرف اوراقِ زماں پر اپنے نام اور کام کا نقش ثبت کر دیا بلکہ آنے والا زمانہ بھی اس نقش کی آب و تاب میں

کمی نہ کر سکے گا۔ کمی کیا اس کی چمک دمک میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

انگریزی میں ایک لفظ ملتا ہے Chrisma یہ شخصیت کی ایسی کشش ہے جو کسی کسی میں ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے اس کے حامل لوگوں سے بلاوجہ پیار ہو جاتا ہے، انھیں خوش کرنے کو جی چاہتا ہے انھیں خوش دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ''کرزما'' خداداد ہے، حسن و زیبائی سے اس کا تعلق نہیں، علم و دولت سے اس کا حصول ممکن نہیں، نہ گفتار کے اسلوب سے اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی سخاوت سے اس کے اثرات وسیع تر کیے جا سکتے ہیں۔ بس یوں سمجھیے ''کرزما'' کی پیدا کردہ کشش ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، یہ ''کرزما'' کا کرشمہ ہوتا ہے کہ اس کے حامل افراد کی بری باتیں بھی اچھی لگتی ہیں۔ بری کیا بعض اوقات تو ان کے سانچے میں ڈھل جانے کو جی چاہتا ہے۔ عالمی سطح کے تمام بڑے لیڈروں میں دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ ''کرزما'' بھی ہوتا ہے، روحانی شخصیت میں بھی یہ وصف خاص ہوتا ہے اسی طرح وہ شعرا اور اہل قلم جو عموماً دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز نظر آتے ہیں تو اس کا ایک باعث ''کرزما'' بھی ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی بھی ایسی ہی ''Chrismatic Personality'' ہیں کہ بلاوجہ ان سے پیار کر کے ان کی خوشی حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں گزشتہ ربع صدی سے قاسمی صاحب کا محفل نشین ہوں اور میں نے محبت، احترام اور عقیدت کے ایسے ایسے مظاہر دیکھے جن کا تذکرہ اگر چھیڑ دوں تو لوگ ان سے شعر سننا چھوڑ کر تعویذ لینے شروع کر دیتے۔

احمد ندیم قاسمی ایک شخص شاعر، افسانہ نگار، مدیر اور کالم نگار کا نام نہیں بل کہ احمد ندیم قاسمی ایک انجمن کا نام ہے، ایسی انجمن جس میں وہ نہیں ہے بل کہ ان سے محبت کرنے والے صدر نشین ہوتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ایک شاعر کا نام نہیں کہ شاعروں کی ہمارے ہاں کبھی بھی کمی نہیں رہی بل کہ میرے حساب سے تو شاعر ضرورت سے زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔ شاعری میں ایک تحریک کا نام ہے، وہ انسان دوستی کے آدرش کے شاعر تھے۔ ان کا فنی منشور ان کے ایک مصرع کے مطابق یوں قرار پاتا ہے۔

؎ انسان عظیم ہے خدایا!

کسی فنی نصب العین سے مستقل وابستگی رکھتے ہوئے ادب کی اقدار اور شعر کی جمالیات کو مجروح نہ ہونے دینا بہت مشکل کام ہے اور یہی مشکل کام احمد ندیم قاسمی نے بطریق احسن کر دکھایا۔

احمد ندیم قاسمی محض ایک افسانہ نگار کا نام نہیں بل کہ ایسے افسانہ نگار کا نام ہے جس نے افسانے میں

حقیقت نگاری کی روایت کو استحکام بخشا اور ساتھ ہی معاشرے کے جبر کے نتیجے میں افراد کے بدلتے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دیہات کے معاشرے کے حوالے سے جاگیردار، مزارع اور کمی کمین کی زندہ اور جان دار تصویریں پیش کیں۔ اس مختصر تحریر میں ان کے فن کی تمام جہات پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں تاہم اس امر پر یقیناً زور دوں گا کہ قاسمی صاحب نے تخلیقی اظہار کے لیے دو بہت بڑے میڈیم یعنی شاعری اور افسانے کا انتخاب کیا اور اپنی تخلیقی توانائی اور وژن سے ہر دو کا حق ادا کر دیا، یہ بہت بڑی بات ہے کہ لوگ تو لکھتے لکھتے عمریں صرف کر دیتے ہیں مگر زندہ تخلیق سے محروم رہتے ہیں حتیٰ کہ ان کی شخصیت کی طرح شاعری بھی زائد المعیاد ہو جاتی ہے۔ استعارے مرجھائے پھولوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جو ان کی تخلیقی لحد پر چڑھائے جاتے ہیں۔ لطیفہ یہ کہ ان کے تخلیقی انتقال کی خبر کا دنیا بھر میں چرچا ہو، مگر ان تک اس کی اطلاع نہیں پہنچ پاتی۔

احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی ایسی شخصیت کا نام ہے جو ستر برس تخلیقی لحاظ سے فعال رہی۔ اسی سے معاصرین میں ان کی سنیارٹی اور اسی نسبت سے اہمیت اور عزت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ عزت و اہمیت محض عمر ہی سے مشروط نہیں بل کہ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بھرپور اور متنوع اظہار سے اردو ادب پر گہرے اثرات ڈالے۔ شاعری اور افسانہ دونوں ہی ان کی تخلیقات کے باعث مال دار ہوئے۔ یہ جو بعض اوقات بحث ہوتی کہ قاسمی صاحب شاعر ہیں یا افسانہ نگار؟ تو یہ اس لحاظ سے بے سود ہے کہ شاعری اور افسانے کی پرکھ کے لیے تنقیدی معیارات جداگانہ ہیں۔ لہٰذا ایک حوالے سے دوسرے کی پرکھ اور فیصلہ غلط ہے میں تو اسے یوں سمجھتا ہوں کہ شاعری اور افسانہ احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی شخصیت کے سکے کے دو رخ ہیں اسی لیے آج یہ ناممکن ہے کہ اردو ادب میں جدید رجحانات کی بات ہو اور اس میں احمد ندیم قاسمی کا نام نہ آئے؟ بحیثیت ایک تخلیقی فن کار احمد ندیم قاسمی نہ صرف اپنے زمانے کا استعارہ بنے بل کہ یہ بھی کہ ان کی تحریروں اور شاعری نے اپنے لیے قارئین کا ایک ایسا وسیع حلقہ پیدا کر دیا جس کی وسعت میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں جب برصغیر غلامی کے اندھیرے میں سسک رہا تھا، اقتصادی کساد بازاری آخری حد کو چھو رہی تھی تو جبر و استبداد اور معاشی بدحالی کی اس فضا میں برصغیر میں جس نئے طرز احساس نے جنم لیا اس نے ایک طرف ملکی سیاست کو تصور پاکستان میں تموج آشنا کیا تو دوسری طرف ترقی پسند ادب کی تحریک نے ادب میں مقصدیت اور ادب برائے زندگی کی صورت میں جس نئے تصور ادب کو فروغ دیا اس کے نتیجے میں برصغیر میں جدید خیالات کی برقی رو دوڑ گئی۔ احمد ندیم قاسمی بھی اپنے انسان دوستی کے تصورات

کے باعث اس تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے نہ صرف اس تحریک کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کیا بل کہ پاکستان میں تنظیمی لحاظ سے بھی وہ بے حد فعال رہے حتیٰ کہ قید بھی کاٹی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک متنازعہ تھی جس کا بڑا سبب اس کا سیاسی مطمع نظر تھا چناں چہ اس دور کے بعض ادیبوں میں جو ایک خاص قسم کی انتہاپسندی یا ایسی نعرہ بازی ملتی تھی کہ استعارہ نعرہ اور شاعری جلسے جلوس کی چیز بن کر رہ گئی تو یہ دراصل سیاسی مقاصد کے باعث تھا لیکن احمد ندیم قاسمی میں جو تخلیقی اپج اور ان کی شخصیت میں جو میانہ روی تھی۔ اس کے باعث انھوں نے ہر طرح کی انتہاپسندی سے خود کو بچائے رکھا۔ اسی لیے بعض انتہاپسندوں کی "ترقی پسندی" کے معیار پر قاسمی صاحب کبھی بھی پورے نہ اتر سکے، اس پر مستزاد ان کی وطن دوستی اور پاکستانیت، لیکن انھوں نے آنکھیں بند کر کے خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا بھی نہیں سمجھا، اسی لیے وطن کے مالک "دیوتاؤں" کے مٹی کے پاؤں بھی دکھاتے رہے۔ وہ ہر سچے پاکستانی اور محبِّ وطن ادیب کی مانند اپنے وطن عزیز پر شادمانی اور خوشحالی کے سورج کو تابندہ دیکھنے کے خواہش مند تھے اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی بھی کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ اگر خوبصورت الفاظ اور دلآویز اسلوب میں مقصد کی پیشکش دیکھنی ہو تو احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ویسے بھی فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو جیسے ادبی جنوں کی موجودگی میں شاعری اور افسانے میں اپنی اہمیت تسلیم کرا کے قابل رشک مقام حاصل کر لینا آسان کام نہ تھا۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے پاس تخلیقی صلاحیتوں، نئے تصورات اور افکار نو کی صورت میں توانائی کا وافر ذخیرہ موجود تھا جب ہی تو پون صدی پر محیط تخلیقی کاوشوں کے باوجود خوب صورت اسلوب میں شعر کہتے رہے اور پر اثر کہانیاں لکھتے رہے۔ اور ان پر مستزاد ان کی کالم نگاری، ادبی تقریبات کے لیے مضامین، خاکے اور صدارتی خطبات، کتابوں کے دیباچے اور فلیپ نگاری۔ یقیناً احمد ندیم قاسمی کے قبضے میں کوئی جن تھا۔ جو وہ یہ سب کچھ بلا جبر و اکراہ خوش اسلوبی سے کر لیتے تھے۔ ساتھ ہی حلقہ یاراں میں بریشم بن کر خوش گفتاری، خوش گوئی اور خوش ادائی۔

احمد ندیم قاسمی نہ منافق تھے اور نہ ریاکار، اسی لیے اپنے فنی آدرش کو اپنے قول و فعل سے زندہ رکھا۔

حاسدین، مخالفین اور بدخواہوں نے جو طویل دشنامی مہم چلائے رکھی، وہ نہ تو ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین سکی اور نہ قلم کی روشنی خشک کر سکی کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ رہے۔

خورشید کو جب زوال آیا
ہر چیز نے قد بڑھا لیا ہے

احمد ندیم قاسمی نے جس طرح دوستوں سے ٹوٹ کر پیار کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے اگر چہ دوستوں نے بھی ان سے محبت کی لیکن بیشتر کا یہ عالم رہا کہ اس شجر سایہ دار کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹک بیٹھے، دل شاد کیا اور چل نکلے۔ بلاشبہ احمد ندیم قاسمی وہ شجر سایہ دار تھے جس کی شاخیں محبت کے پھل سے جھکی رہیں جس نے زندگی کی کڑی دھوپ کھائی مگر احباب پر آنچ نہ آنے دی، جو خود جلا مگر اپنی محبت کی چھاؤں سے کسی کو محروم نہیں کیا حتیٰ کہ انھیں بھی نہیں جو جڑیں کاٹنے کی فکر میں رہے اور یہ اس لیے کہ شجر لڑا نہیں کرتے احمد ندیم قاسمی کی تو سب کے لیے یہ پیش کش تھی:

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سر راہ گزر ہوں

احمد ندیم قاسمی فعال قلم کار تھے۔ چناں چہ شاعری، افسانہ، کالم، طنز و مزاح، سب میدانوں میں ان کا قلم رواں دواں رہا۔ مگر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ اتنے لکھنے کے باوجود بھی انھوں نے معیار کے گراف کا عمودی سفر برقرار رکھا۔ اس لحاظ سے تو ان کی تخلیقی شخصیت دریا سے مشابہ نظر آتی ہے۔ جس میں کبھی بھی پانی کا بہاؤ کم نہیں ہوتا اور یہی دریا ان کی شخصیت کا بھی استعارہ قرار پاتا ہے کہ لاتعداد دوستوں اور لوگوں نے ان سے شفقتیں، عنایتیں اور محبتیں حاصل کیں مگر دریا کی روانی میں کمی نہ ہوئی۔ اس لحاظ سے انھیں شجر سایہ دار بھی قرار دیا گیا تھا۔

بات ایک ہی ہے کہ شجر بھی بازو پھیلا کر اپنے سائے میں آنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ شجر سایہ فروش نہیں ہوتا بل کہ اس کا سایہ صدقہ جاریہ ہوتا ہے اور ایسے ہی شجر سایہ دار ہمارے قاسمی صاحب بھی تھے۔

آنے والی نسلیں تم پہ فخر کریں گی ہم عصرو
تم نے فراق سے باتیں کی ہیں تم نے فراق کو دیکھا ہے

سو ساتھیو! ہم بھی کل اس بات پر فخر کریں گے کہ ہم احمد ندیم قاسمی کے دوست تھے، ہمیں ان کی شفقت اور محبت حاصل رہی اور ہم نے بھی ان سے کسبِ فیض کیا!

☆☆☆☆

ظفر اقبال

ندیمؔ صاحب

ندیم صاحب کے ساتھ میرا پہلا رابطہ اس وقت ہوا جب وہ روزنامہ امروز کے ایڈیٹر تھے اور میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کا طالب علم۔ گورنمنٹ کالج کے میگزین راوی کے بعد میری غزلیں براہ راست امروز اور پھر ہفت روزہ لیل و نہار میں چھپنے لگی تھیں، البتہ انھی دنوں قیوم نظر اور امجد الطاف کی ادارات میں نکلنے والے مجلّہ ''نئی تحریریں'' میں بھی مختصر تعارف کے ساتھ میری چھ غزلیں ایک ساتھ شائع ہوئیں اور اسی دوران مجھے چندی گڑھ میں ہونے والے ایک مشاعرے میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا جس میں صوفی تبسم، انجم رومانی، منیر نیازی اور خود قیوم نظر سمیت دیگر کئی پاکستانی شعرا بھی شامل تھے، نیز ان میں شاد امرتسری بھی شریک و شامل تھے۔ البتہ کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے جب میں ابھی گورنمنٹ کالج میں ہی تھا اور میری منظومات راوی میں چھپا کرتیں۔

ندیم صاحب کے ساتھ امروز کے دفتر ہی میں اکثر ملاقات رہتی۔ تازہ غزل دینے کے لیے جانا ہوتا یا اس کا معاوضہ وصول کرنے کے لیے جو اس وقت ۲۰ روپے فی غزل کے حساب سے ملتا تھا۔ امروز کے علاوہ آفاق واحد اخبار تھا جو شعرا کو اسی حساب سے معاوضہ دیا کرتا تھا اور جس کے ادبی حصے کے انچارج انتظار حسین تھے جو شہر نامہ کے عنوان سے وہاں کالم بھی لکھا کرتے۔ سرکاری جریدوں میں ان دنوں ہفت روزہ استقلال تھا جو تحریروں کا معاوضہ دیا کرتا تھا اور جس کے ایڈیٹر ہوش ترمذی تھے ان دنوں ۲۰ روپے بھی آج کے کم و بیش دو سو کے برابر ہوا کرتے تھے۔

آج یاد آتا ہے کہ ندیم صاحب کی اکثر باتیں لائق تقلید ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک شاعر جس کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ آئے اور ندیم صاحب سے کہا کہ انھوں نے کوئی ایک ماہ پہلے ایک غزل برائے اشاعت بھیجی تھی لیکن وہ شائع نہیں ہوئی، شاید وہ آپ کو ملی ہی نہ ہو۔ اب اصل قصہ یہ تھا کہ غزل تو انھیں مل گئی تھی لیکن وہ ندیم صاحب یا امروز کے معیار کے مطابق نہیں تھی، چناں چہ ندیم صاحب نے انھیں جواب دیا کہ غزل تو مجھے مل گئی تھی لیکن وہ آپ کے معیار کے مطابق نہیں تھی، حالاں کہ وہ یہ بھی کہہ سکتے

تھے کہ ان کے اپنے معیار پر پوری نہ اترتی تھی۔ اس سے بھی اندازہ ہوا کہ ایک بڑا ادیب جب بولتا ہے تو کس درجے کی وضع داری سے بات کرتا ہے۔ ندیم صاحب کے دفتر ہی میں شکیب جلالی (مرحوم) سے بھی اکثر ملاقات ہو جاتی جولائی کالج ہاسٹل میں بھی مجھے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ جمیل ملک (مرحوم) سے بھی کبھی کبھار وہیں ملاقات ہو جاتی جنھیں ندیم صاحب بڑے اہتمام سے شائع کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھیں دنوں جمیل ملک سے پاک ٹی ہاؤس میں بھی ملاقات ہو گئی اور میں نے انھیں کہہ دیا کہ ملک صاحب آپ ایک سینئر شاعر ہیں لیکن آپ کی شاعری نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ اس وقت شاید نذیر ناجی بھی ہمارے ساتھ بیٹھے تھے، جمیل ملک چوں کہ خود ندیم صاحب کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے انھوں نے میری بات کا برا نہیں مانا بل کہ کہا کہ وہ کوشش کریں گے کہ آئندہ ایسی شاعری کریں جو مجھے بھی متاثر کر سکے۔

ندیم صاحب ان دنوں غالباً حرف و حکایت کے عنوان تلے پنج دریا کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے کیوں کہ اس وقت اپنے اصلی نام سے کالم لکھنے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ انتظار حسین البتہ اپنے نام ہی سے لکھا کرتے تھے۔ پی پی ایل میں غدر مچنے کے بعد جب کہ میں روزنامہ پاکستان میں لکھا کرتا تھا تو ایک دن کسی ہندوانہ سے فرضی نامی سے اسی اخبار میں ایک کالم نظر سے گزرا جو اعلیٰ درجے کے بھرپور مزاح کا حامل تھا۔ میں نے اس وقت کے ایڈیٹر حمید جہلمی صاحب سے پوچھا کہ فرضی نام سے یہ کالم کس کا لکھا ہوا ہے۔ جہلمی صاحب نے کافی لیت و لعل کے بعد بتایا کہ یہ کالم ندیم صاحب نے بھجوایا تھا! البتہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کالم جہلمی صاحب کی فرمائش پر لکھا گیا تھا یا انھوں نے از خود ایک چیلنج کے طور پر بھیجا تھا کہ دیکھو، کالم اس طرح لکھتے ہیں۔ بہر حال، اس کے بعد ان کا کوئی کالم اس اخبار میں نہیں چھپا، حالاں کہ وہ ان دنوں اور کہیں نہیں لکھتے تھے اور بوجوہ اس اخبار میں لکھنے کے لیے ان سے فرمائش نہ کی گئی تھی جس کا ذمہ دار کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اخبار کے وسائل کی کمی بھی اس کا سبب ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس وقت کرتا دھرتا عباس اطہر ہوا کرتے تھے جو خود بھی ندیم صاحب کے نیاز مند تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تک معاملہ پہنچا ہی نہ ہو۔

عرض کرنے کا مطلب ہے کہ ندیم صاحب فکاہی کالم ہی لکھتے تھے اور ان دنوں رواج بھی فکاہی کالموں ہی کا تھا، البتہ انتظار حسین، تب بھی اور اب بھی ادبی کالم ہی لکھتے ہیں جن میں بشاشت کی چاشنی بھی موجود ہوتی ہے۔ اس سے پہلے امروز میں جید صحافی چراغ حسن حسرت بھی فکاہی کالم ہی لکھا کرتے تھے جبکہ امروز ہی میں ندیم صاحب کے علاوہ فکاہی کالم منو بھائی کا ہوا کرتا تھا۔ ندیم صاحب کا کالم ان کی شگفتہ و شاداب اور ہنس مکھ

طبیعت کی پوری پوری آئندہ داری کا حامل ہوا کرتا تھا۔ البتہ بعد میں مثلاً جنگ میں آنے کے بعد انھوں نے سنجیدہ کالم ہی لکھے حالاں کہ ان کی شگفتہ گوئی آخر دم تک ان کے ساتھ رہی اور وہ مختلف وقتوں کے ادبی واقعات اکثر سناتے اور محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے۔ اور ایسے دلچسپ واقعات انھیں کثرت سے یاد تھے۔ ان کے دیگر نیازمندوں میں اگرچہ وقتاً فوقتاً کمی بیشی بھی ہوتی رہی لیکن منو بھائی اور عطاالحق قاسمی نے آخر وقت تک ان کا ساتھ نبھایا۔

میرے اور ندیم صاحب کے درمیان اختلافی رخنہ اس وقت پیدا ہوا جب ان کے بعض نیازمندوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ندیم کو فیض سے بڑا شاعر قرار دینے کی مہم چلائی حالاں کہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ بات کہ فلاں شاعر فلاں سے چھوٹا، یا فلاں شاعر فلاں سے بڑا ہے۔ اور اس قسم کے سرٹیفکیٹ جاری کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے کیوں کہ ہر جینوئن اور قابل ذکر شاعر اپنی دستیاب مہلت میں ایک کردار ادا کر کے رخصت ہو جاتا ہے جبکہ ان دونوں بڑے شاعروں نے بھی یہی کچھ کیا۔ دراصل بھائی لوگوں کا طرز استدلال درست نہیں تھا کیوں کہ شاعری ہی میں کئی لحاظ سے فیض ندیم سے زیادہ توانا اور البیلے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کیوں کہ شاعری کے علاوہ ندیم کے پلس پوائنٹ اتنے ہیں کہ فیض ان کی ہوا کو بھی نہیں پہنچتے۔

مثلاً ندیم نے لاتعداد افسانے لکھے ہیں جن میں متعدد یادگار اور شاہکار افسانے بھی شامل ہیں جبکہ فیض کے کریڈٹ میں یہ چیز شامل نہیں۔ پھر ندیم کی کالم نگاری اور تنقید۔ اگرچہ تنقید فیض نے بھی لکھی لیکن ندیم کے مقابلے میں بہت کم۔ علاوہ ازیں۔ ندیم کا سب سے نمایاں کارنامہ ''فنون'' کے ذریعے ادیبوں کی کئی نسلوں کی آبیاری ہے جبکہ ندیم کے مقابلے میں فیض کو کئی دیگر سہولتیں بھی حاصل رہیں، مثلاً وہ پی پی ایل پیپرز کے چیف ایڈیٹر رہے۔ مرکزی حکومت میں محکمہ تعلیم کے ایڈوائزر اور کراچی کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ لینن پرائز حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور ملک کے نامور گلوکاروں جن میں نور جہاں، مہدی حسن اور فریدہ خانم سے لے کر ٹینا ثانی وغیرہ تک شامل ہیں نے ان کا کلام کثرت سے گایا اور جو الیکٹرانک میڈیا سے نشر بھی ہوتا رہا، اور اب تک ہو رہا ہے۔ چناں چہ اس گائیکی نے بھی فیض کی شہرت کو چار چاند لگانے میں قابل ذکر کردار ادا کیا جبکہ ندیم صاحب کو یہ سہولت برائے نام ہی حاصل رہی۔

مزید برآں، ندیم فوری طور پر ری ایکٹ کرتے اور ترکی بہ ترکی، بل کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے

میں یقین رکھتے تھے جبکہ فیض ضرورت سے زیادہ بردبار اور متحمل مزاج تھے۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ ایک بار کسی نے انھیں کہا کہ حفیظ جالندھری نے فلاں جگہ ان کے خلاف لکھا ہے تو انھوں نے بات ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا، کوئی بات نہیں، وہ ہمارے دوست ہیں، انھوں نے دوستی کے رنگ میں ہی لکھا ہوگا، کوئی بات نہیں، فیض صاحب کے حوالے سے یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب کسی نے ان کے سامنے ان کی شاعری کی تعریف کی تو انھوں نے کہا کہ بھئی شاعر تو اقبال ہیں، ہم تو میڈیا کر ہیں۔ اب فیض جیسے مرتبے کے شاعر کا اپنے آپ کو میڈیا کر کہنے کے لیے جو حوصلہ اور ظرف درکار ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میرا اپنے سمیت تمام ندیم دوستوں کو مشورہ ہے کہ ندیم کے فن اور شخصیت کو عقیدے کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس موضوع کو بحث و تمحیص کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے کیوں کہ ایک ادیب اس وقت تک ہی زندہ رہتا ہے اور یاد رکھا جاتا ہے جب تک اس کا عیب و ہنر زیرِ بحث رہے۔ اور اگر ہم نے ان کے مزار پر خوش عقیدگی کی چادر چڑھا دی تو یہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا کیوں کہ اگر ہم نے ضرورت سے زیادہ لحاظ داری کا مظاہرہ کیا بھی، تو زمانہ ایسا نہیں کرے گا، اور یہ کام ساتھ ساتھ، اپنے آپ ہی سرانجام پاتا رہے گا۔ ہم سب گوشت پوست ہی کے انسان ہیں، غلطیاں بھی کرتے ہیں اور اپنے برے بھلے کے بھی خود ہی ذمہ دار ٹھہرتے ہیں، موضوعِ بحث رہنا تو ویسے بھی خوش نصیبی کی بات ہے۔

☆☆☆☆

الطاف فاطمہ

احمد ندیم قاسمی

اب سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ میں فنون کے دفتر گئی تو معلوم ہوا کہ فنون کا دفتر یہاں سے کہیں اور منتقل ہو رہا ہے۔ منصورہ بڑی مصروف نظر آ رہی تھی۔ کتابوں کا انبار تھا جس میں سے وہ کتابیں چھانٹ چھانٹ کر پیکٹ بنا رہی تھی۔ میں بھی منصورہ کے قریب بیٹھ کر ان کتابوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے کتابوں کے ڈھیر میں سے چند کتابیں اٹھا کر پوچھا۔ ”یہ میں لے جاؤں، پڑھ کر واپس کر دوں گی“ میں نے جو کتابیں اٹھائی تھیں ان میں قاسمی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ بھی تھا۔ منصورہ نے اپنے کام سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا پڑھ کر واپس کر دوں گی۔

”ہاں ضرور اور یہ بابا کے افسانوں کا مجموعہ ہے، اسے پڑھ کر اگر آپ کچھ لکھ دیں تو ہم اسے فنون میں چھاپ دیں گے ہاں بے خیالی میں میں نے کہہ تو دیا پر یہ خیال ہی نہ آیا کہ کیا میں ایسا کر سکوں گی۔ گھر آ کر کتابیں میں نے اپنی میز پر رکھ دیں اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ان کتابوں کے سب سے اوپر قاسمی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ آتے جاتے، چلتے پھرتے جب بھی اس پر نظر پڑی ایک عجیب سے فخر اور غرور کا احساس ہوتا۔ اچھا تو کیا ہم اس قابل ہیں کہ ایک عہد ساز ادیب اور ادیب گر کے افسانوں پر اپنی رائے اور تبصرہ کرنے کی جرأت کر سکیں۔ بات یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر اس کی انا کا کھوکھلا غبارہ چھپا ہوتا ہے اور اس کو پھیلانے کے لیے بس ایک پھونک درکار ہوتی ہے اور میرے اندر چھپے میری انا کے غبارے میں بھی منصورہ کے وہ الفاظ ایک پھونک کا کام کر گئے۔ اور خیال آیا کہ ہاں تو ایسی کیا بات ہے کہ ہم جو اتنے برس ہا برس تک اپنے طالب علموں کو ادب پڑھاتے اور افسانوی ادب پر لیکچر دیتے رہے تھے، افسانہ نگاروں کے فن پر تنقید اور تبصرے کرتے رہے ہیں تو ان میں قاسمی صاحب کے افسانے بھی زیر بحث آتے تھے۔ ایسی بھی کیا بات ہے کہ اب ان کے افسانوں پر اپنی رائے و تبصرہ کے دو چار صفحے بھی نہ تحریر کر سکوں۔ چناں چہ ایک روز بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں افسانوں کی یہ کتاب اٹھالی۔“

ایک کے بعد ایک اور پھر دوسرا تیسرا افسانہ پڑھتے پڑھتے کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ یہ

انسان بھی کتنا ظالم اور جاہل ہوتا ہے۔ ہر بار ایک کوہ گراں اپنے کمزور اور ناتواں کندھوں پر اٹھا لینے کے دعوے کر بیٹھتا ہے اور میں بھی اسی جاہل اور ظالم نوع بشر کا حصہ ہوں۔ بھلا بغیر سوچے سمجھے کا ہے کو حامی بھر لی کہ ہاں کیوں نہیں لکھوں گی، ضرور لکھوں گی، پر اب وہی افسانے پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ منصورہ کی زبان سے یہ سن کر کہ اگر آپ کچھ لکھ دیں گی تو اس کو فنون میں چھاپ دیں گے۔ ہماری انا کا غبارہ پھول گیا کہ آخر تو اس کو پھٹ ہی جانا تھا سو اب پھٹ کر ہی رہا...... بھلا کہاں ہم اور کہاں قاسمی صاحب اور ان کا فن۔ بھلا میں یہ کیوں بھول گئی کہ جب ہمارے لیے پھول اخبار آتا تھا تو اس کے ایڈیٹروں کے ناموں میں قاسمی صاحب کا نام ہوا کرتا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے پھول اخبار میں بچوں کے لیے قاسمی صاحب کی نظمیں بھی چھپا کرتی تھیں۔ اور اب ایسے وقت میں کہ ان کا نام ایک عہد ساز ادیب کے طور پر لیا جاتا ہے، ہم نے اپنی ادب شناسی کے زعم میں آ کر ان کے فن کا تجزیہ کرنے کی حامی اپنی سادگی اور حماقت کی وجہ سے بھر لی۔ سچ جانئے کہ اس وقت شرمندگی اور ندامت سے جیسے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ سو اسی دم کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور سوچ لیا کہ اگر منصورہ نے تقاضا کیا تو میں اس سے کہہ دوں گی۔ ”نہ بھائی یہ میرے بس کی بات نہیں“۔ پر منصورہ نے بھی یہ بات شاید بے خیالی ہی میں کہہ دی تھی۔ اس لیے اس بارے میں کبھی یاد دہانی نہ کرائی۔ کتاب ہاتھ سے رکھ کر میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا جو بوجھ اپنی نادانی سے میں نے اٹھا لیا تھا اس بارگراں کو میں نے اپنے کندھوں پر سے اتار کر رکھ دیا۔ بات گئی گزری ہو گئی۔ پر اب جب کہ قاسمی صاحب اس دنیا میں نہیں اور ادبیات کی طرف سے یہ مراسلہ ملا ہے تو ایک بار پھر میری انا کے خالی اور کھوکھلے غبارے نے سر اٹھایا ہے اور سوچتی ہوں اب شاید میں یہ جرأت کر سکتی ہوں کہ اس بزرگ اور بڑے افسانہ نگار کے فن پر اپنی ناچیز رائے قلمبند کر سکوں۔ سو آج پھر یہ جرأت رندانہ کرنے بیٹھ گئی ہوں۔ اور ان کے افسانوں کا مجموعہ ”سناٹا“ میرے سامنے ہے جس کے دس افسانوں میں سے ہر افسانہ میں نے پڑھا مگر کس طرح کہ ہر افسانے کے تار و پود میں چھپے ہوئے ان کے کمال فن موضوع اور اس کی جزئیات پر ان کی بھرپور گرفت اتنی معمولی بات نہیں کہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکوں۔ میں نے ان کے ہر افسانے کا آغاز سرسری طور پر کیا لیکن جوں جوں آگے بڑھتی گئی ان کے فن کی عظمت و مہابت کے سامنے خود کو اتنا حقیر اور بے وقعت محسوس کرتی رہی ہوں کہ میں نہیں سمجھتی کہ میں ان کے فن پر تنقید و تجزیے کا حق ادا کر سکوں گی۔ بہرحال جب اس کام کا ذمہ لیا ہے، کچھ تو کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

قاسمی صاحب کے افسانوں کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ پنجاب کی دیہی زندگی کے تناظر میں لکھے گئے ہیں اور پنجاب کی رومان پرور دیہی فضا اور دہقانی زندگی کے ترجمان ہیں۔ جس طرح منشی پریم چند کے افسانوی ادب کا خمیر اودھ کے دیہات اور کسان کے گوناگوں مسائل کے علاوہ دیہاتی زندگی، سادہ اور دکھ بھری زندگی کے المیے سے ماخوذ ہے۔ منشی پریم چند کے علاوہ اس زندگی اور ماحول کی عکاسی اور ترجمانی کرنے والے ایک اور افسانہ نگار اعظم کریوی ہیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ ان تینوں افسانہ نگاروں کا فن ایک ہی تناظر سے تحریک پاتا ہے یعنی برطانوی راج کے جاگیردارانہ نظام نے دیہات اور کسان کی زندگی ظلم اور جبر کی جس چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پسنے پر جس طرح مجبور کیا تھا وہ نہ صرف اودھ کے دیہی علاقوں بل کہ پورے ہندوستان کے کسان کا المیہ تھا۔ جس میں بنگال، مدارس اور دکن سے لے کر سندھ، پنجاب اور برصغیر کی دہقانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ فرق صرف علاقوں کی موسمی اور طبعی حالات کے اختلاف کا تھا۔ اور ان سب کے مقابلے میں پنجاب اپنے طبعی اور موسمی حالات کی بنا پر نسبتاً خوش نصیب کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرزمین زیادہ زرخیز تھی کہ گندم اور کپاس جیسی اہم اور قیمتی فصلیں اسی سرزمین سے اٹھائی جاتی تھیں۔ یہاں کا کسان جسمانی اور مالی اعتبار سے دوسرے علاقوں کے کسانوں کے مقابلے میں زیادہ آسودہ حال اور توانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی راج نے اس علاقے کی مین پاور کو اپنے بازوئے شمشیر زن کے طور پر (Reserve) میں رکھا ہوا تھا۔ اور وہ پنجاب کی اس خوش نصیبی کا خراج اس طرح لے رہا تھا کہ اس نے سندھ اور پنجاب کے علاقوں کو ہر قسم کی صنعتی ترقی سے محروم رکھا ہوا تھا۔

برصغیر کے دوسرے علاقوں میں جہاں صنعتی دور کا آغاز ہو چکا تھا وہاں سندھ اور پنجاب کے علاقوں کو اس سے یکسر محروم رکھا گیا اور اس محرومی کا سبب معمولی نہ تھا بل کہ انگریز کی دور اندیشی اور اسٹریٹیجک (Strategic) پالیسیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس نے انتہائی دوراندیشی اور چالاکی سے کسی بھی ممکنہ جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال سے نبٹنے کے لیے ہندوستان کی اس افرادی قوت کو اپنے بازوئے شمشیر زن کے طور پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک طرف تو پاکستان کے زرعی علاقوں کی پیداوار کو عسکری رسد کے لیے منتخب کیا تھا۔ دوسری جانب یہاں کے تنومند گبرو جوانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک کر اپنے استعمار کی بقاء کے تحفظ اور فتح کا وسیلہ بنایا گیا۔ اپنی سرزمین کی زرخیزی اور اپنے دست و بازو پر اٹھائی گئی سنہری فصلوں کے باوجود دہقان کی محرومی، لگان اور ٹیکس کا جبری نظام یہاں کے کسان کی گردن پر تلوار کی طرح لٹکتا رہتا ہے۔ نہ صرف

لگان اور ٹیکس کا جبر مل کہ یہاں کے دیہات بھی ان تمام سہولتوں سے محروم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی بنگال اور برصغیر کے بیشتر علاقوں کے دہقان دیہی زندگی کی صعوبتوں سے نکل کر صنعتی کارخانوں اور ملوں میں روزگار حاصل کرنے کی دھن میں بڑے صنعتی شہروں کا رخ تو کر رہے تھے مگر ان کی فلاکت زدہ زندگی کے مسائل میں دوچند اضافہ ہو رہا تھا اور جب ایک بار کسان اپنی زمین اور کھیتی باڑی کے جھنجھٹوں کو چھوڑ کر شہری زندگی کی سہولتوں کے مزے لوٹنے کی آس لگا کر مل مزدور کی حیثیت سے اس زندگی کا حصہ بن جاتا تو اس کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ ضرورتوں اور مسائل کے ایک اور جال میں پھنس کر رہ جاتا۔ اور یہی موضوع اور صورت حال تھی جو منشی پریم چند کے افسانوں میں فن کا محور بن کر رہ گئی مگر قاسمی صاحب کا افسانوی فن اس قید سے آزاد ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا آغاز منشی پریم چند سے بہت آگے کے زمانے سے ہوا۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے آس پاس ہی ہوا۔ اس جنگ کے اثرات اور ان سے ہونے والی تبدیلیوں سے سب سے زیادہ متاثر پنجاب کا جو حصہ اور جس طرح ہوا تھا۔ اس نے علاقے کی زندگی پر اتنی تبدیلیاں اور نت نئے رنگ بکھیر دیے تھے کہ لگتا تھا اس علاقے پر دھنک کے رنگوں کی برکھا ہو رہی ہے۔ جس نے یہاں کی زندگی خصوصاً دہقان اور دیہات کی زندگی کے سکوت اور جمود کو توڑ کر نئی زندگی کی لہر بہر سے آشنا کر دیا تھا۔ نئی زندگی کی لہر بہر اور دھنک کے رنگ ہی قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا موضوع ہے۔ ان کے افسانے کم و بیش تیرہ مجموعوں پر مشتمل ہیں اور ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان تمام مجموعوں کے ہر افسانے کا موضوع اپنی اپنی جگہ پر منفرد ہے۔ ان کا فن یکسانیت اور تکرار سے پاک ہے۔ پنجاب کے دیہات کی زندگی کے تمام مسائل سے ملتا ہے تو دوسری طرف برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر جنگ کی بھٹی میں دھکیل دیے جانے والے گبرو جوانوں کے اپنے ذاتی اور نفسیاتی مسائل کے علاوہ ان کی عدم موجودگی کے سبب ان کے گھرانوں میں جو خلا پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں نئے نئے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان سب کا ذکر انھوں نے جس مصورانہ جزئیات سے کیا ہے اس کے بارے میں میری کیا بساط کہ اس کا تجزیہ کروں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ انھوں نے اپنے عہد کو اس کی تمام تر سچائیوں اور ان سچائیوں کے اندر چھپے درد و کرب کو اس طرح محفوظ کر لیا ہے کہ جب ہم ان کا کوئی بھی افسانہ پڑھیں گے، اس کی وساطت سے اس مخصوص موضوع کا پورا ماحول اور پورا تاثر ایک جیسی وحدت بن کر قاری کے اندر اترتا ہے۔ جیسے وہ خود اس ماحول اور زمانے کے اندر موجود ہو اور اسی کا حصہ ہے۔ ان تمام مجموعوں میں شامل ان کے ہر افسانے کے بارے میں لکھنے بیٹھوں تو

اس کے لیے ایک دفتر ہی درکار ہوگا۔ سو اب میں وہی کروں گی جو لوگ دیگ کے ایک دانے سے ہی اس کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے ان کا چودھواں مجموعہ ''سناٹا'' موجود ہے۔ اس میں شامل ہر ہر افسانہ بڑی سرکار کے نام سے لے کر سناٹا تک میری نظر سے گزرا ہے، نہ صرف میری روح کے اندر اترا ہے بل کہ میں نے ہر ہر افسانہ اس طرح پڑھا گویا میں ان کے قدموں میں کھڑی اس کے قد و قامت کی پیمائش کرنے کی جسارت کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہر افسانے پر بات کرنے کا تو مجھ میں حوصلہ نہیں۔ میں اس مجموعے میں شامل صرف دو افسانوں ''ممتاز'' اور ''کنجری'' ہی پر بات کر لوں تو بڑی بات ہے۔ اب اگر ان کے افسانے ممتاز کی بات کریں تو یہ کہوں گی کہ دوسری جنگ عظیم کے تناظر میں لکھے گئے عالمی ادب کے افسانوں کے درمیان رکھ کر دیکھیے تو یہ نہ صرف ایک عظیم افسانہ ہے بل کہ حقیقت تو یہ ہے جس تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں اس کا مقصد، مقام اور اہم حیثیت ہے۔ ممتاز ایک افسانہ ہے جس کو لکھتے وقت ہر قسم کے غیر ضروری جذبات و الفاظ کو نظر انداز کر کے حقائق کا ایک ایسا مبصرانہ انداز اختیار کیا گیا جس میں کسی قسم کی لفاظی اور جذباتی تیکنیک یا اپنے فنکارانہ اسلوب کو اپنی رائے دیے بغیر سچائیوں کو ایک عجیب طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ واقعی ایک عجب انداز میں نہ تو منشی پریم چند کا وہ محاکمانہ اور ناصحانہ انداز ہے جس کی بنا پر وہ اپنے افسانے کے ہر موڑ اور موقعے پر خود نظر آتے ہیں۔ عبرت و نصیحت کے موقعے اور کرداروں کی اچھائی یا برائی کو خود اپنے الفاظ اور اپنی زبان سے دوسروں تک ہی پہنچاتے ہیں اس کے برعکس قاسمی صاحب نہ کسی کو اچھا کہتے ہیں اور نہ اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں بل کہ واقعات اور کردار کے قول و فعل کے حوالے سے ہی اس کو (Expose) کر دیتے ہیں۔ اس طرح جیسے بادام کا چھلکا اس پر سے اتار کر اس کے اندر چھپی گری کو سامنے رکھ دیں۔ آج ہمارے دور کا قاری قاسمی صاحب کے افسانے ممتا کو پڑھنے کے بعد جب جاپانیوں کے قول و فعل کے اس تضاد کا جو اس نے اس خبر کے سننے کے بعد کہ پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے۔ جس امن پسندی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہے تو طنزاً مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ یہ وہی قوم ہے جس کی ناقابلِ یقین بربریت ظلم اور جور کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان قاسمی صاحب کے اس افسانے سے ہمیں ملتی ہے۔ اس افسانے کی کئی (Dimensions) ہیں۔ ایک طرف تو ان جنگی قیدیوں کی ابتلا، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہے جو اس جنگ میں اپنی جنگ نہیں لڑ رہے تھے۔ بل کہ انگریزی سامراج کی برتری کو قائم رکھنے کے تناظر میں اس

جن کا اہم ترین حصہ ہے اور پھر جاپانیوں کے ظلم و جور کا نشانہ بن رہے تھے۔ پنجاب کے ان گبرو نوجوانوں نے برطانوی سامراج کے تحفظ کے لیے کسی نظریاتی جذبے کے تحت حصہ نہیں لیا تھا بل کہ یہ ان کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ خوشحالی اور آسودہ زندگی کی تلاش کے علاوہ انگریز کی غلامی کے جبر کی بنا پر اس جنگ کی بھٹی میں بے محابا خود کو جھونک دیا تھا۔ ممتا کی دوسری جہت وہ ہے جہاں ایک سنسان اور ویران بستی میں ہو کا عالم ہے۔ چند جھونپڑیوں میں ایسی خاموشی اور پر اسرار سناٹا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں نہ کوئی شخص موجود ہے نہ کوئی پرندہ۔ اور پھر جب جاپانیوں کے سفاکانہ احکامات کے خوف سے لرزاں وترساں ضعیف اور ناتواں بوڑھی عورتیں جھونپڑیوں سے باہر آکر مسمریزم کے معمول کی طرح ان کے لیے کھانا تیار کرنے میں جٹی ہوں۔ افسانے کا یہ حصہ ایک ایسا پر اسرار اور دہشت ناک قدیم داستان معلوم ہوتا ہے، جس کا تعلق حقیقت سے نہیں صرف طلسمات سے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ فرضی و خیالی داستان نہیں بل کہ بدھ مت کے پیروکار جاپانیوں کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس افسانے کا کلائمیکس وہ ہے جب یخ بستہ ہواؤں اور بخار کے لرزے سے کانپتے ہوئے ایک قیدی کے ٹوٹے ہوئے بٹن کو ٹانکنے کے لیے ایک بوڑھی غم زدہ چینی ماں اپنی جان پر کھیل کر ہر قسم کے جور اور ستم کو نظر انداز کر کے ایک ماں کی خالص ممتا سے مجبور ہو کر اس کا بٹن ٹانک دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے متعلق بے شمار فلمیں منظر عام پر صرف اس مقصد سے لائی گئی کہ نئی نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں اور امن کی نعمتوں کا احساس دلایا جا سکے۔ کاش کہ ہماری فلم انڈسٹری اگر اس افسانے کو فلمانے کا خیال کرتی تو یہ فلم جنگی فلموں میں ایک نمایاں مقام اور حیثیت کی حامل ہوتی۔ سناٹے میں شامل افسانوں میں یوں تو ہر افسانہ اپنی جگہ پر فرد ہے اور ان میں سے ہر افسانے کے موضوع اور صورت پر مصنف کی بھرپور گرفت حیرت ناک حد تک پڑھنے والے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر قاسمی اپنے ماحول اور اپنے تجربے کے ہر ہر طبقے کے کرداروں سے کس طرح اس حد تک قریب نظر آتے ہیں، نہ صرف اس ماحول اور صورت حال کا حصہ معلوم ہوتے ہیں بل کہ اپنے قاری کو بھی اس ماحول کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ پڑھنے والا اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر اسی ماحول اور اسی گرد و پیش میں ضم ہو جاتا ہے۔ اب نہ کوئی قید مکاں باقی رہتی ہے نہ قید زماں۔ اب افسانے کا ماحول مصنف اور قاری کی تثلیث ملا کر ایک اکائی کی تعمیر کرتا ہے۔

ان افسانوں میں کنجری کا بھی ایک نمایاں مقام ہے۔ کنجری کے نام سے ہمارے یہاں پیشہ ور کمانے والی مال دار عورت کا تصور ابھرتا ہے۔ لیکن اس افسانے کی تاج بی بی جو خود ایک کنجری ہے، ایک تو مفلوک الحال

اور فاقہ زدہ ہے۔ اس کے ساتھ نشے کی عادت نے اس کو اتنا منفعل اور مفلوج کر دیا ہے کہ اب اپنی ذات اور اپنے بیٹے سرور کی ذات کے امکانات سے اس حد تک مایوس ہو چکی ہے کہ اپنی اور سرور کی ذات کا کوئی خوش آئند تصور وابستہ کر ہی نہیں سکتی۔ بھوک اور فاقوں کی ماری ہوئی دادی نے اپنی پوتی کمال خاتون کے حسن ہی کو ٹارگٹ بنا لیا۔

افیون کی ایک گولی گٹک کر اپنے خوابوں، تمناؤں کا مرکز اور محور کمال خاتون کے حسن اور اداؤں کا ذکر ایک چٹخارے سے کرتی ہے اس کی ذہنی اور خیالی عیاشی ہے اور دیکھنے کی یہ بات ہے کہ ساری خوش خوابیوں کے سلسلے میں جو مخصوص الفاظ اور بازاری حسن فروشی کے پیشے سے متعلق اصطلاحیں اور روزمرہ محاورے ہیں کہ اتنے ثقہ ادیب اور خوش کلام شاعر کی نوک قلم سے ایسے الفاظ بھی ایسی روانی اور بے ساختگی سے ادا ہوئے، بس یہی تو کمالِ فن ہے۔

☆☆☆☆

محسن احسان

محبتوں کا دیوتا

یہ بات ۱۹۴۷ء کے اوائل کی ہے پاکستان کے حصول کے لیے تحریک پاکستان پورے عروج پہ تھی، فسادات ملک بھر میں ہو رہے تھے۔ مسلمان اپنے لیے ایک علیحدہ خطہ زمین کے حصول کے لیے سرگرم تگ و تاز تھے۔ جلوس جلسہ ہنگامے خون خرابہ، قتل و غارت گری روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ پشاور بھی اس کی زد میں تھا۔ انہی دنوں خبر سنی کہ پشاور ریڈیو سے احمد ندیم قاسمی بحیثیت سکرپٹ رائٹر وابستہ ہو گئے ہیں۔ ندیم صاحب کا نام و مقام اس زمانے میں بھی ملک بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ پشاور میں مختلف ادبی انجمنیں، ادبی نشستیں ترتیب دی گئی، ان ادبی انجمنوں میں باہمی چپقلش اور معاصرانہ چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک گروہ شوکت واسطی، حفیظ اثر، حسین کوثر اور دیگر لکھنے والوں پہ مشتمل تھا۔ دوسرا فارغ بخاری، رضا ہمدانی، ضیا جعفری، عبدالودود قمر، نذیر مرزا برلاس، خاطر غزنوی اور دیگر اہل قلم کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا۔ میں شوکت واسطی کے ساتھ دوسرے گروہ کے دائرہ ادبیہ کی ایک نشست میں شامل ہونے کے لیے گیا۔ یہ ۱۱ جنوری ۱۹۴۷ء کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ کونے میں میری ہی عمر کا ایک صورت آشنا نوجوان بیٹھا تھا۔ اس نے پہچان کر مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے کمبل میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ نوجوان احمد فراز تھا جو اس زمانے میں شرر برقی تھا۔ اور جو بہت سی ادبی صلاحیتوں سے بھرپور تھا۔ تھوڑی دیر میں احمد ندیم قاسمی آ گئے۔ تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور ندیم صاحب زمین پر درمیانی نشست پر بیٹھ گئے۔ کچھ جملے بازی کچھ لطیفے ہوئے۔ باقاعدہ نشست کا آغاز جمیل راز بنگش کے افسانے سے ہوا۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور اس کے بعد محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ میں بالکل نوآموز اور سب سے کم عمر شاعر تھا۔ اس لیے مجھے دوسرے نمبر پر اور شرر برقی کو تیسرے نمبر پر پڑھایا گیا۔ دیگر شعرا نے بھی حسب دستور کلام پیش کیا۔ مجھے فخر ہے کہ یہ میرا پہلا مشاعرہ تھا جس کی صدارت احمد ندیم قاسمی کر رہے تھے۔ ۱۴ اگست کی رات بارہ بجے ریڈیو سے اعلان ہوا۔ یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس، پشاور ہے۔ اب آپ جشن آزادی کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا لکھا ہوا ترانہ سنیں۔ ”پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو“ یہ پہلا قومی نغمہ تھا جو اس رات نشر ہوا۔ اس کے بعد ندیم

صاحب سے پشاور کے قیام کے دوران بڑی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پھر پتہ چلا وہ مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے ہیں۔ ''سویرا''۔ 'ادب لطیف' اور بعد میں ''نقوش'' کی ادارت سنبھال لی۔ یہ بھی ادبی رسالے ندیم صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں کا کھلا اظہار ہیں۔ ان کی جو تحریر جہاں کہیں چھپتی ہم بڑے شوق سے خریدتے۔ اس زمانے میں ''جلال و جمال'' کی اشاعت کی اطلاع ملی۔ اس کی قیمت سات روپے تھی۔ یہ بڑے خوبصورت کاغذ اور عبدالرحمٰن چغتائی کے سات رنگوں پر مشتمل سرورق کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ فراز اور میرے پاس رقم نہ تھی سو ہم نے آدھی آدھی رقم جمع کر کے یہ مجموعہ کلام خریدا اور اسے حرزِ جاں بنا کر رکھا۔ اس کے بعد بارہا قاسمی صاحب سے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لاہور جانا ہوتا تو امروز کے دفتر بھی حاضری دیتے اور ادبی گفتگو سے استفادہ کرتے۔ بعد میں فنون کا دفتر انارکلی سے منتقل ہو کر میکلوڈ روڈ پھر لوئر مال، پھر ٹمپل روڈ پھر مزنگ چوک میں منتقل ہو گیا۔ ہمارا آنا جانا لاہور رہتا تو ہم بطور خاص قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ پشاور میں جشن خیبر، کوئٹہ میں جشن بولان، لاہور میں پنجاب میلہ اور کراچی میں سندھ میلے کے حوالے سے ہفت روزہ پروگرام ترتیب دیے جاتے۔ جن میں موسیقی، قوالی، تصویریں، نمائشیں، مذاکرے اور مناظرے اور نوجوانوں کے لیے علمی ادبی اور تعلیمی نوعیت کے پروگرام ہوتے۔ مشاعرے ہر شہر میں ترتیب دیے جاتے۔ جن میں پاکستان بھر کے چیدہ چیدہ شعرا کو دعوت دی جاتی۔ ریڈیو پاکستان ان مشاعروں کو نشر کرنے کا خاص اہتمام کرتا کہ اردو کے تمام بڑے شعرا ان میں مدعو ہوتے۔ یہ زمانہ ایوب خان کی حکومت جشن دس سالہ منائے جانے کا زمانہ تھا۔ ان مشاعروں میں ندیم صاحب سینئر شاعر کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے ملتان کے ایک مشاعرے میں ندیم صاحب غزل ''میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں'' پڑھ رہے تھے جب اس شعر پر پہنچے کہ ''دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا'' تو کسی منچلے نے آواز لگائی عینک سمیت ....مشاعرہ ذرا دیر کے لیے نظم و ضبط سے نکلا تو سامعین نے ندیم صاحب کی شخصیت ان کی گھمبیر آواز اور شاعرانہ مرتبہ کا پاس کرتے ہوئے خاموش رہنے کی تلقین کی اور پھر مشاعرہ پوری سنجیدگی سے سننے لگے۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں جشن خیبر کے سلسلے میں مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے۔ انہی دنوں خاطر غزنوی نے اس مشاعرے کی تاریخ کچھ اس طرح رکھی کہ میری شادی میں بھی شریک ہو سکیں اور مشاعرہ میں بھی شامل ہو جائیں۔ سو مجھے یہ اعزاز ملا کہ بہت سے شعرا نے شادی میں شرکت کی۔ لاہور سے ندیم صاحب کے علاوہ خدیجہ مستور، ظہیر بابر، شہزاد احمد، بیگم شہزاد، کشور ناہید اور ان کے میاں یوسف کامران بھی شامل تھے۔

مشاعرے کے دوسرے دن محفل موسیقی تھی۔ خدیجہ اور ظہیر بابر میری نوبیاہتا بیگم کو بھی ہمراہ لے گئے۔ میرے گھر میں عشائیے کے بعد ندیم صاحب کے علاوہ فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، میاں سعید الرحمان کے علاوہ بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ لطیفہ گوئی اور شعر خوانی ہوتی رہی۔ دو بجے کے بعد میری والدہ مرحومہ بار بار پوچھتی رہیں۔ مہمان ابھی نہیں آئے۔ اس پر محفل میں قہقہہ پڑتا اور ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق چھیڑ خوانی کرتا رہا۔ صبح ساڑھے تین بجے محفل موسیقی سے ان کی آمد ہوئی تو والدہ کو تسلی ہوئی کہ مہمان دلہن کو اغواء کر کے نہیں لے گئے۔ اس زمانے میں قاسمی صاحب کے جو خطوط ملتے ان پر وہ ہمیشہ سید محسن احسان لکھتے۔ ایک دن مجھے بیگم نے کہا کہ تم سید نہیں ہو تو قاسمی صاحب تمہیں سید کیوں لکھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا ”اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اس شاعری میں عزت سادات مل گئی۔“

ندیم صاحب ایک طویل عرصہ تک مجلس ترقی ادب کے ناظمِ اعلیٰ بھی رہے۔ ان کا دفتر پاکستان کے تمام شاعروں، ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کا مرکز تھا۔ سبھی سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ عقیدت و احترام سے پیش آتے۔ جونیئر سینئر سبھی کی تواضع چائے سے کی جاتی۔ منہ بولی بیٹی منصورہ احمد نے جس اپنائیت، چاہت اور لگن سے گزشتہ بیس برسوں میں بابا کی خدمت کی شاید ہی کوئی کر سکتا۔ ندیم صاحب نے بھی بیٹیوں کی طرح منصورہ کی ادبی صلاحیتوں اور مدیرانہ خوبیوں کا خیال رکھا اور اس کی ذہنی اور ادبی نشوونما میں پوری توجہ سے رہنمائی کی۔ ندیم صاحب کی سگی بیٹی ناہید قاسمی شادی کے بعد اپنے گھر کے دھندوں اور بچوں کی نگرانی میں گرفتار ہو گئیں۔ لیکن اس نے اپنی تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور ندیم صاحب کی شخصیت ادبی مرتبہ اور افسانہ نگاری پر اپنا تھیسس مکمل کر کے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ یہ کام بھی مشکل تھا مگر ناہید نے بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ ناہید اور منصورہ نے شاعرانہ حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ندیم صاحب کی سگی اور منہ بولی بیٹی دونوں نے بابا کی سرپرستی اور تربیت کی لاج رکھ لی۔ اس سے پہلے پروین شاکر کی ذہنی تربیت شاعرانہ صلاحیتوں اور ادبی توانائیوں کو قاسمی صاحب نے شروع میں پرکھ لیا تھا اور نگرانی میں رکھ کر اس کی ادبی نشوونما میں بھرپور مدد کی۔ پروین انھیں محبت و احترام سے عمو جان کہتی تھیں۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اور ادا جعفری سے لے کر فہمیدہ ریاض اور منصورہ احمد تک کی ادبی صلاحیتوں کی پرورش کا یہ سفر اتنا مبارک ہے کہ ادبی تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ندیم صاحب کی توجہ اور محبت کا مرکز رہی۔ ”سویرا“۔ ”نقوش“۔ ”ادب

لطیف“ اور ”فنون“ کے صفحات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ نئی نسل کی ادبی تربیت میں انھوں نے کتنا بھر پور کردار ادا کیا۔ یہ تین نسلوں کی تخلیقی قوتوں کی تربیت نے ان سب کو حرف کی حرمت سکھانے اور قلم کا اعتماد بخشنے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ یہ ایک پوری کہکشاں ہے جو آسمان ادب پر جگمگا رہی ہے۔ اسی لیے تو ندیم نے بڑے فخریہ انداز میں یہ بات کی تھی:

ندیم میرے جلو میں تھی نسل مستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

ندیم صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ادبی افق پر ایسے روشن ستارے چھوڑ گئے جو ان کی محبت اور اخلاص کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے۔

☆☆☆☆

اکبر حمیدی

احمد ندیم قاسمی......شخصیت

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ندیم صاحب سے میری ملاقات گوجرانوالہ ٹاؤن ہال میں ہونے والے ایک مشاعرے میں ہوئی جو ۱۹۶۵ء کے آخر میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موضوع پر منعقد ہوا، جس میں لاہور سے ندیم صاحب، احسان دانش صاحب، قتیل شفائی صاحب اور طفیل ہوشیارپوری صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ زیادہ تعداد مقامی شعرا کی تھی۔ جونیئر مقامی شعرا میں میں نے بھی شرکت کی۔ سینئرز میں راسخ عرفانی صاحب، مائل کرنالی صاحب، شہید جالندھری صاحب، اثر لدھیانوی صاحب اور سلیم اختر فارانی صاحب زیادہ قابل ذکر ہیں۔ اس مشاعرے میں ندیم صاحب نے وہ نظم تحت اللفظ میں پڑھی جو انھوں نے خاص طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موضوع پر لکھی تھی اور غالباً گوجرانوالہ کے مشاعرے میں پڑھی جا رہی تھی۔ نظمیں تو اور بھی اچھی اچھی تھیں مگر ندیم صاحب کی نظم نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ ایک تو نظم جذبہ وفکر سے بھرپور اور اس پر ندیم صاحب کا تحت اللفظ، مشاعرہ الٹ گیا۔ ندیم صاحب کی آواز بچپن کے کسی حادثے کے اثر سے اور گلے کی نا حیات خرابی کے باعث بیٹھی ہوئی تھی۔ انھیں زور لگا کر پڑھنا پڑتا تھا مگر گلے کی خرابی سے انھوں نے تحت اللفظ کا ایسا گمبھیر اسلوب تخلیق کر لیا تھا کہ سننے والوں کو ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ ویسے بھی اس موضوع کے لیے ان کے لہجے کی گمبھیرتا جادو کا اثر رکھتی تھی۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں میں جو شعرا خصوصی اسلوب رکھتے ہیں ان میں ندیم صاحب، جوش صاحب اور افتخار عارف صاحب زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا اسلوب اور اپنا لہجہ ہے جو بے حد مؤثر اور پرکشش ہے۔

ندیم صاحب ۱۹۶۵ء میں ہی پاکستان اور بھارت کے بڑے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے جونہی سٹیج سیکرٹری ارشد میر نے ان کا نام لیا، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ندیم صاحب پینٹ کوٹ اور نکٹائی میں ملبوس تھے۔ انھوں نے نظم کا پہلا مصرع پڑھا اور ہال میں جنبش پیدا ہوئی۔ مصرع تھا:

چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود

مگر جب نظم اس شعر تک پہنچی

میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا قہر ہوں افلاک کی دہشت ہوں میں

تو ہال میں طوفان آ گیا۔ لوگ بازو اٹھا اٹھا کر داد دے رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ گو احسان دانش نے بعد میں نظمیں پڑھیں اور داد بھی پائی کہ ان کا اپنا اسلوب اور اپنا انداز بیان تھا مگر مشاعرہ ندیم صاحب جیت کر کے لے جا چکے تھے۔ مشاعرے کے بعد بہت سے دوسرے لوگوں کے ہجوم میں مَیں نے بھی ندیم صاحب سے ملاقات کی اور نظم پر داد دی۔ یہ ملاقات گو برائے ملاقات ہی تھی مگر ان کی شخصیت کی وجاہت اور تاثر ابھی تک میرے قلب و نظر پر قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

ندیم صاحب سے میرا باقاعدہ رابطہ ۱۹۶۹ء میں ہوا جب میں نے ''فنون'' کے لیے نظم بھیجی جس کا عنوان تھا ''مجھ کو شاعر بنانے والے'' کوئی ایک ہفتے بعد ندیم صاحب کا خط ملا۔ انھوں نے لکھا تھا ''نظم اچھی ہے'' ''فنون'' کے آئندہ شمارے میں چھپ جائے گی۔ تاہم اگر آپ اجازت دیں تو میں نظم کے مصرعے باہم جوڑ کر تین چار بند بنالوں تاکہ تنظیم کی ہیئت اور تاثر بہتر ہو جائیں۔ کوئی مصرع تبدیل نہیں کروں گا۔ میرے لیے تو ندیم صاحب کا خط ہی ایک اعزاز سے کم نہیں تھا کجا یہ کہ وہ مجھ سے نظم بہتر بنانے کی اجازت مانگیں۔ میں نے کہا کہ جیسے آپ مناسب سمجھیں تبدیل کر لیں، اس نظم کی پہلی دو لائنیں حسب ذیل تھیں:

مجھ کو شاعر بنانے والے میرے غم کو زبان دے دے

۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء تک مَیں ''فنون'' میں باقاعدہ چھپا۔ پھر میں اسلام آباد بسلسلہ ملازمت آ گیا اور چند سال کا تعطل پیدا ہو گیا۔ مگر ''فنون'' میں چھپنے کا سلسلہ پھر دوبارہ بحال ہو گیا۔ جو اب تک قائم ہے۔ ندیم صاحب کی ادبی شہرت اور ادارتی مہارت کے باعث رسالہ ''فنون'' کو بڑی شہرت اور مقبولیت ملی۔ ''فنون'' میں ہر مکتبہ فکر کے لکھنے والوں کو موقع دیا گیا جس سے ندیم صاحب کا ادارتی نقطہ نظر ظاہر ہوتا ہے اور شخصیت کی کشادگی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے گو اپنے خطوط میں بارہا ''اوراق'' میں چھپنے کا طعنہ دیتے رہے مگر بہر حال مجھے ہمیشہ چھاپتے رہے۔

ندیم صاحب کی شخصیت اور طبعی رجحان کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کو منہ بولی بہن بنایا اور تا حیات بھائیوں کی طرح محبت اور خدمت کا حسن سلوک کیا۔ گزشتہ سالوں میں انھوں نے منصورہ احمد کو منہ بولی بیٹی بنایا اور سانس کے آخری لمحے تک منصورہ احمد سے باپ کی شفقت کا

سلوک کیا۔ منصورہ احمد نے بھی بیٹی بن کر عزت و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں مگر باپ بیٹی کے باہمی تعلق میں کوئی کمی نہ آئی۔ ان باتوں سے ندیم صاحب کی طبعی محبت اور شفقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے پس پردہ ان کی مضبوط اور طاقتور شخصیت دیکھی جا سکتی ہے جو لوگوں کی باتوں کے باوجود متاثر نہ ہوئی۔ یہ ندیم صاحب کی شخصیت کا ایسا رخ ہے جو کسی بھی زمانے میں کم کم ہی نہیں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اس سے ندیم صاحب کی انسان دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ندیم صاحب کی شاعری اور ادب کی بنیادوں میں بھی انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ فرماتے ہیں:

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

آدمی شش جہات کا دولہا
وقت کی گردشیں بہ آتی ہیں

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

اس موضوع پر بہت بحثیں ہوئی ہیں کہ شاعری کو شخصیت کا پرتو ہونا چاہیے یا نہیں مل کہ شاعری شاعر کی شخصیت کا پرتو ہوتی ہے۔ بشرطیکہ شاعری سچی اور اور شاعر بھی سچا ہو منافق نہ ہو۔ ندیم صاحب کی شاعری ان کی شخصیت کا بھرپور پرتو ہے۔ اس سلسلے میں مَیں چند اشعار مزید درج کرتا ہوں جن سے ندیم صاحب کے طبعی اور فکری میلانات ظاہر ہوتے ہیں:

تیری رحمت تو مسلّم ہے مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانے کی

رکے ہوئے ہیں جو دریا انھیں رکا نہ سمجھ
کلیجہ کاٹ کے نکلیں گے کوہساروں کا

جس بھی فنکار کا شہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہی فن یاد آئی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

انداز ہو بہو تری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

انسان دوستی کا ذکر آیا تو ندیم صاحب کے افسانوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، جن میں سے دوسرے متعلقہ موضوعات کے علاوہ انسان دوستی کا موضوع بہت نمایاں ہے۔ اس موضوع پر میرے خیال میں ندیم صاحب نے کئی ایک کہانیاں لکھی ہیں مگر ان کی شاہکار کہانی پرمیشر سنگھ، جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کی پی ٹی وی کے لیے دو مرتبہ ڈرامائی تشکیل ہوئی۔ پہلی مرتبہ جناب شوکت صدیقی نے کی تو دوسری مرتبہ امجد اسلام امجد نے کی۔ دونوں نے کہانی کا حق ادا کر دیا۔ ندیم صاحب کے خاص خاص جملے من وعن رہنے دیے جس سے ڈراموں کا تاثر دوبالا ہو گیا۔

"منٹو کے خطوط" جو ندیم صاحب کے نام ہیں، خود ندیم صاحب نے چھپوائے۔ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے ندیم صاحب نے منٹو سے شراب وغیرہ ترک کرنے اور زندگی کو ڈھنگ سے بسر کرنے کے لیے کہا اور اس بات پر زور دیا جس کے جواب میں ندیم صاحب کو منٹو سے وہ زہر میں بجھا جملہ سننا پڑا کہ "میں نے تمھیں اپنے ضمیر

کا امام مقرر نہیں کیا'' یہ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سن کر ندیم صاحب نے منٹو جیسے لاابالی دوست سے دوستی نبھائی۔ اس اصلاحی کوشش میں صرف دوستی ہی کارفرما نہ تھی بلکہ ایک اچھے انسان کو اس کی خامیوں سے پاک کر کے ایک صاف ستھرا انسان بنانے کی کوشش بھی شامل تھی، جس سے ان کی انسان دوستی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ منٹو کو کس طرح کا صاف ستھرا انسان دیکھنا چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ منٹو کسی کی سننے والا آدمی نہیں تھا بلکہ سب کو سنانے والا شخص تھا۔ سو اس نے ندیم صاحب سے جہاں محبت کا سلوک کیا اور ان کی افسانہ نگاری کو سراہا وہاں ان کو کھری کھری بھی سنائیں، لیکن ندیم صاحب کی منٹو سے محبت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوا۔

ندیم صاحب نے فنون کے اداریئے میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کے دوستانہ تعلقات ان لوگوں سے بھی ہیں، جن سے ان کا نظریاتی اختلاف ہے۔ ایک مرتبہ مجھے بھی خط میں ایسا ہی لکھا جس کے جواب میں میں نے لکھا کہ میں ہیومنسٹ یعنی انسان دوست ہوں اور ہیومنزم پر میرا پختہ اعتقاد ہے۔ دراصل ڈاکٹر وزیر آغا سے میری دوستی اور اوراق میں مسلسل میرا چھپنا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف شکلوں میں دو تین مرتبہ خطوط میں کیا مگر مجھ سے تعلق قائم رکھا، قطع تعلق کبھی نہیں ہونے دی اور نہ ہی کبھی اشارہ دیا۔ سو میری ندیم صاحب سے دوستی تو نہیں ہو سکی مگر میری نیازمندی کا راستہ بھی انھوں نے کبھی بند نہیں کیا۔

ندیم صاحب کا تعلق ایک مڈل بلکہ لوئر مڈل گھرانے سے تھا۔ بی اے کر کے محکمہ آبکاری میں انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ ''امروز'' جیسے اخبار کی ادارت بھی کی۔ شاعری اور افسانے پر بڑا کام کیا اور ان سب باتوں کے علاوہ زندگی کی جنگ خود اپنے دست و بازو سے لڑی اور جیتی۔ وار خود روکے اور خود ہی ان کا جواب دیا۔ کونے کھدرے میں منہ نہیں چھپایا، جو کچھ درست سمجھا ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔ فیض صاحب پر مضمون لکھا اور حریفانہ لکھا مگر فیض صاحب کی موجودگی میں ایک ادبی جلسے میں پڑھا، یوں ایک بہادر آدمی کی زندگی بسر کی۔ ان کی شخصیت میں انسانی جذبے تھے...... مگر اعلیٰ درجے کے۔

انھوں نے زندگی کو بہادری، ہمت، اعتماد اور دانش مندی سے بسر کیا اور ایک وسیع و عریض جہان کو تخلیق بھی کیا اور اس پر اپنا پرچم لہرا دیا جو ہمیشہ لہراتا رہے گا۔

☆☆☆☆

سلطان سکون

بہت پیارے، بہت شفیق، نہایت عظیم انسان

جس زمانے میں مجھے شاعری کا شوق ہوئے دو تین برس ہوئے تھے اور میں کچی پکی غزلیں لکھا کرتا اور دوستوں کو سنایا کرتا، انہی محفلوں میں مجھے قاسمی صاحب کے حسب ذیل قطعات سننے کا اتفاق ہوا اور سنتے ہی میرے دل میں ترازو ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں:

گلی کے موڑ پہ بچوں کے ایک جمگھٹ میں
کسی نے درد بھری لے میں ماہیا گایا

مجھے کسی سے محبت نہیں مگر اے دل
یہ کیا ہوا کہ تو بے اختیار بھر آیا

دوسرا قطعہ ہے:

دیکھ ری تو پنگھٹ پہ جا کر ان کا ذکر نہ چھیڑا کر
میں کیا جانوں کون ہیں وہ اور کس کوچے میں رہتے ہیں

میں نے کب تعریفیں کی ہیں ان کے بانکے نینوں کی
وہ اچھے خوش باش جواں ہیں میرے بھیا کہتے ہیں

تیسرے قطعہ کا صرف ایک شعر یاد ہے:

ایک ہم ہیں کہ اپنا کاشانہ کندھوں پہ اٹھائے پھرتے ہیں
ایک وہ ہیں کہ جن کو دنیا میں جاگیریں سجدہ کرتی ہیں

پھر کبھی کبھی کہیں نہ کہیں دوستوں کی محفلوں میں قاسمی صاحب کی شاعری اور افسانوں کی تعریف اور تذکرہ سننے کو ملتا تو میرے دل میں قاسمی صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔

یہ اب سے کوئی چھالیس سال پہلے کی بات ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء کو گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کی بزم ادب نے ایک بڑے مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس مشاعرے میں قاسمی صاحب بھی آئیں گے تو میں بہت خوش ہوا کہ مجھے اپنی خواہش پوری ہونے کا امکان نظر آیا۔ چناں چہ میں وقت مقررہ سے بھی کچھ پہلے مشاعرہ گاہ (ہال) میں پہنچ گیا۔ کافی دیر بعد حاضرین میں ایک ہلچل ہوئی اور آوازیں آنے لگیں کہ شعرائے کرام تشریف لا رہے ہیں۔ کسی نے کہا قاسمی صاحب بھی ہیں اور سب سے آگے وہی ہیں۔ حاضرین ان کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ حاضرین آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ بھی کرنے لگے مگر میں کس شمار میں تھا کہ ان سے ملتا یا مصافحہ کرتا مگر قاسمی صاحب کو پہلی بار دیکھ کر دل خوش بھی ہوا اور اطمینان بھی حاصل ہوا کہ چلو قاسمی صاحب کو دیکھ تو لیا ہے۔ شعرا کے سٹیج پر تشریف رکھنے کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ میں بحیثیت سامع بیٹھا تھا۔ پہلے تو میں اطمینان سے دوسرے شعرا کو سنتا رہا مگر جب کافی دیر ہو گئی تو مجھے خیال آیا کہ مجھے کل صبح مردان بھی جانا ہے اور قاسمی صاحب کے پڑھنے کی باری آخر میں آئے گی۔ اب ٹھیک یاد نہیں غالباً صدارت بھی قاسمی صاحب فرما رہے تھے۔ مجھے قاسمی صاحب سے ملاقات کی توقع بھی نہیں تھی کہ میری حیثیت کیا تھی جو قاسمی صاحب سے براہ راست ملاقات کر سکتا لہٰذا میں اٹھ کر گھر آ گیا۔

دوسرے روز ناشتہ کے بعد میں مردان جانے کے لیے اڈہ پر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بسیں چلا کرتی تھیں۔ میرے اڈہ پر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد قاسمی صاحب مع احسان دانش، شوکت تھانوی اور حبیب جالب کچھ دوسرے حضرات کے ہمراہ اڈہ پر تشریف لے آئے۔، دوسرے چند لوگ انھیں الوداع کہنے آئے تھے۔ جب میں نے دیکھا قاسمی صاحب مع دوسرے شعرا کے ایک بس پر سوار ہو گئے غالباً لاہور جا رہی تھی۔ میں نے سوچا قاسمی صاحب سے ملاقات کا اس سے اچھا موقع پھر کب ملے گا۔ اسی بس میں حسن ابدال تک کا ٹکٹ لے لیا کہ حسن ابدال تک تو قاسمی صاحب کو دیکھنے اور شاید ملاقات کا موقع بھی مل جائے۔ حسن ابدال میں اتر کر دوسری بس پکڑ لوں گا۔ میں بھی اسی بس میں سوار ہو گیا اور قاسمی صاحب اور دوسرے شعرا کے قریب کی نشست پر جا بیٹھا اور جھجکتے ہوئے قاسمی صاحب اور دوسرا شعرا سے مصافحہ کیا۔ مجھے اپنی طرف بغور دیکھتے اور دلچسپی لیتے دیکھ کر قاسمی صاحب نے کچھ بھانپ کر پوچھا۔ آپ نے کہا جانا ہے تو میں نے عرض کیا کہ مجھے مردان جانا ہے اب قاسمی صاحب فرمانے لگے کہ کیا مردان کو بس نہیں جاتی۔ میں نے عرض کیا، جاتی تو ہے۔ کہنے لگے پھر آپ اس بس پر کیوں نہیں بیٹھے تو میں نے عرض کیا۔ مجھے آپ کو دیکھنا ور آپ

سے ملاقات کا شوق تھا۔ اب پوچھنے لگے کہ کیا آپ بھی شاعری کرتے ہیں، آپ کا نام کیا ہے اور تخلص کیا کرتے ہیں؟

دوسرے شعرا بھی ہماری طرف متوجہ تھے۔ میں نے عرض کیا میرا نام سلطان محمد ہے اور تخلص "بلاکش" ہے۔ اب یاد نہیں میرا نام اور تخلص سن کر ان میں سے کسی نے (شاید شوکت تھانوی نے) کہا بھئی یہ کیا تخلص ہوا کوئی اچھا سا تخلص شمیل و نبیل رکھتے۔ (شاید انھوں نے قتیل، شکیل کی مناسبت سے ازراہ مذاق یوں کہا) کچھ اور اسی طرح کی چند باتیں ہوتے ہوتے حسن ابدال آگیا۔ میں نے چائے کا بہت پوچھا مگر انھوں نے معذرت کر لی اور میں الوداعی سلام کر کے بس سے اتر گیا۔ یہ تھی قاسمی صاحب سے میری پہلی ملاقات۔ پھر دو اور ملاقاتیں دو مختلف مقامات پر منعقدہ مشاعروں میں ہوئیں اور آخری ملاقات مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ہوئی جہاں میں اور تین دوسرے دوست بطور خاص صرف قاسمی صاحب کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ یہ ملاقات ڈیڑھ دو گھنٹے رہی۔

قاسمی صاحب سے میری مراسلت کا سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے رہا۔ ان کے کئی خطوط ایسے ہیں جن کے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مجھے کوئی اور واقعہ لکھنے کی فرمائش ہوئی ہے مگر میں ان کے ایک خط کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا جو قاسمی صاحب کی محبت، شفقت اور اخلاقی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔

مجھے قاسمی صاحب کی شاعری اور افسانے پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ دو تین ماہ پہلے میں نے قاسمی صاحب ہی کی ایک کتاب میرے ہم سفر میں ان کی شاعری اور افسانوں کے مجموعوں کی فہرست پر نظر پڑی۔ جس میں ندیم کی منتخب غزلیں اور ندیم کے منتخب افسانے بھی شامل تھیں۔ میں نے سوچا سب کتابیں منگوانے کی استطاعت نہیں صرف مذکورہ دونوں کتابیں منگوا لیتا ہوں۔ اب میں نے قاسمی صاحب کو خط لکھا کہ مجھے منتخب غزلیں اور منتخب افسانوں کی دونوں کتابیں بذریعہ وی پی بھیج دیجیے۔ ایک اور کتاب گل پاشی کا بھی لکھا۔ میرے خط کے پانچویں روز مجھے ایک پارسل آن ملا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں دونوں کتابیں موجود تھیں مجھے خوشی تو بہت ہوئی مگر اپنی کج فہمی کے باعث یہ سمجھ لیا کہ شاید قاسمی صاحب نے مجھے وی پی چھڑانے کے تردد سے بچنے کے لیے یہ کتابیں بک پوسٹ پارسل بھیج دیا ہے۔ مجھے ان کی قیمت جو بارہ سو روپے بنتی تھی بذریعہ منی آرڈر بھیج دینی چاہیے مگر پھر خیال آیا کہیں قاسمی صاحب محسوس نہ کر لیں۔ پہلے ان سے خط لکھ کر پوچھ لوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کتابوں کی قیمت

بذریعہ منی آرڈر بھیج دوں۔ تیسرے یا چوتھے روز قاسمی صاحب نے جو خط مجھے لکھا، اسے یہاں نقل کرتا ہوں، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ”محبّ عزیز سلام مسنون! “ آپ کی سادگی پر پیار آرہا ہے۔ آپ نے ایک خط میں لکھا تھا کہ آپ نے میری شاعری کی ایک آدھ کتاب ہی پڑی ہے مگر آپ اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ میری سب کتابیں خریدیں۔ چناں چہ آپ نے یہ دو کتابیں بذریعہ وی پی بھجوانے کا کہا تھا۔ میرے پاس میری نظموں، غزلوں کے مجموعے رکھے تھے میں نے ان میں سے غزلوں اور افسانوں کے مجموعے نہایت پیار کے جذبے سے آپ کو تحفتاً نذر کر دیے اور آپ اس چکر میں پڑ گئے کہ قیمت کیسے ادا کی جائے۔ میرے عزیز بھلا تحفوں کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ میں نے دونوں کتابوں کے اندرونی صفحہ پر لکھ دیا تھا کہ آپ کی نذر ہیں۔ گل پاشی میں وہ نظمیں شامل ہیں جو جوش ملیح آبادی سے لے کر آج تک کے شعرا نے میری محبت میں لکھیں۔ یہ مجموعہ کہیں رکھا ہوگا۔ یہ بھی آپ کو تحفتاً بھجوادوں گا۔“

قاسمی صاحب جیسی عظیم شخصیت کا مجھ ناچیز سے اتنی محبت اور شفقت برتنا ان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت نہیں تو کیا ہے۔ قاسمی صاحب نے جو آخری خط مجھے لکھا وہ یکم جولائی کو لکھا جو مجھے ۵ جولائی کو موصول ہوا اور ۱۰ جولائی کو قاسمی صاحب رخصت ہو گئے۔ قاسمی صاحب جیسی شخصیت صدیوں میں ہی کہیں سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالٰی ان کو غریقِ رحمت فرمائے۔ اگر صرف ایک واقعہ لکھنے کی پابندی نہ ہوتی تو میں قاسمی صاحب سے متعلق کچھ اور واقعات بھی ضرور لکھتا۔

☆☆☆☆

آصف ثاقب

یادِ ندیم

اردو ادب کی درخشاں تاریخ کا آسمان آفتابوں، مہتابوں اور ستاروں سے جگمگا رہا ہے اور زمین خوش کناریوں، بے کناریوں اور ہم کناریوں سے سرشار ہے۔ اس کا ورق ورق بڑے ادبی کارناموں، اللہ کی قدرت کے کرشموں سے نور و نور ہے۔ مشاہیرِ ادب کے بڑے ناموں میں ایک نام احمد ندیم قاسمی بھی ہے۔ اقلیمِ سُخن کے جم وکے میں احمد ندیم قاسمی کا شمار بھی ہے۔ ندیم نے شبانہ روز محنت، لگن اور اخلاص مندی سے اپنی شعری اور نثری تحریروں کو اعتبار و معیار کی زیبائشیں عطا کیں۔ انھیں ہمہ گیر مقبولیت سے آشنا کیا۔ لڑکپن میں جب ندیم نے مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھی اور وہ ایک بڑے اخبار میں شائع ہوئی تو اس کی دھوم مچ گئیں۔ ان کا شروع شروع کا کلام دیکھ کر مولانا عبدالمجید سالک نے حکم لگایا تھا کہ ایک اور بڑا شاعر سامنے آ رہا ہے۔ انھی وقتوں میں ندیم کی تحریریں قابلِ پذیرائی ٹھہریں۔ انھیں مؤقر جرائد میں جگہ ملنے لگی۔

ہر چہ باداباد۔ ندیم مانگے ہوئے پروں پر خود نہیں بنے پھرے۔ انھوں نے شاعری، افسانہ، تحقیق، تنقید اور کالم میں حسن و خوبی کے کارخانے لگا دیے۔ پوجو تو دیوتا نہیں تو پتھر۔ حقائق کو خوب صورتی سے بیان کرنا ہی شاعری ہے۔ دیکھے سُنے واقعات گرد و پیش کے اثرات کو معاملہ گوئی کا رنگ دینا ہی افسانہ ہے۔ ادبی نشانات کا دروں بینی سے مطالعہ اور ارتقاحی انتقال تنقید اور تحقیق ہے۔ سرگزشت کا اخباری اظہار کالم ہے۔ ندیم نے جدتِ اسلوب اور مضمون آفرینی سے ان سب پیرایوں میں شانِ ادبیت پیدا کی۔ گویا اپنا جوہرا ختصاص ندیمیت متعین کر لیا۔ انھوں نے ہمیشہ اندیشۂ این و آں سے صرفِ نظر امکانِ آئندہ کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کا یہی ادبی رویہ انھیں انسان دوستی تک لے گیا۔ ان کا یہ مصرع ان کا ادبی رجحان قرار پایا۔

انسان عظیم ہے خدایا

ندیم نے انسان دوستی کو ادب کی ہر صنف میں جادو نگاری کا نقش دکھا کر پیش کیا ہے۔ اس باب میں فنونِ لطیفہ کی بھی ان کی نظر میں ایک اہم حیثیت تھی۔ ان کی نظم فنونِ لطیفہ کی آخری چند لائنیں ہیں:

وہی کرن ہے کرن ارتقاء کی نظروں میں
جو گُھل کے ریشۂ گل میں نفوذ کر جائے
جو رنگ بن کے سما جائے بند کلیوں میں

جو آگ بن کے رنگِ سنگ میں اُتر جائے
جو آبجو پہ گرے عکس بن کے تاروں کا
جو اوس بن کے لبِ آبجو بکھر جائے

احمد ندیم قاسمی کی امیجری، ڈکشن ان کی مخصوص حسیات، جذباتیت کی عکاس ہے۔ گویا ان کی ذاتی اور ادبی شخصیت کی یہ معراج ہو گئی ہے۔ ربط و ضبط اور متعلقات میں ان کی تغزلانہ ٹچ لائقِ مطالعہ ہے۔ ان کے یہ شعر دیکھیے:

تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی دنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

یاروں سے دلی وابستگی ندیمیت کا نمایاں جوہر ہے۔ اس ضمن میں ان کی تخصیصات تاثیروں بھری ہیں۔ اس کا پتہ اس شعر سے چلتا ہے۔

میری پہچان تو مشکل تھی مگر یاروں سے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے تجھے

ندیم نے قلم سے کنواں کھودا، پانی پیاسوں کو پلایا۔ انھوں نے رسالے "فنون" کے دم قدم سے "نئے پرانوں" کو شاد و آباد کیا۔ پہلے تو یہی کونسل ہوئی کہ فنون کو موضوعاتی بنایا جائے مگر ازاں بعد حالاتِ پیش آمدہ کے تحت اسے متنوع ادب کا آئینہ دار کر دیا گیا۔ پھر ندیم کا فنون اقبال کی یاوری سے شعر و نثر کی گوناگوئی کا مظہر العجائب ٹھہرا۔ اس میں لکھنے والوں کو ندیم نے آنکھوں کی پُتلیاں سمجھا۔ ان کو بعنوانِ شائستہ خوش آمدید کہا اور فنون میں عزت سے اٹھایا بٹھایا۔

محترمہ ناہید قاسمی اور جناب نیر حیات قاسمی میرِ کارواں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ فنون کی شان و شوکت ماشااللہ قائم دائم ہے۔ فنون کے اثرات بدستور ہیں۔ دیکھو تو کوئی نہ کوئی فی نکل ہی آتی ہے۔ مگر معیار بحیثیتِ مجموعی دیکھا جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی وفات پر آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کا تبصرہ اتنے احترام سے ہوا تھا کہ دیکھا سُننا چاہیے۔ ہمارے ندیم کی شہرت و عزت برصغیر کے چاروں کھونٹ تھی۔

☆☆☆☆

حسن عسکری کاظمی

دُور کی آہٹ تو آ پہنچی ہے اب سر پر ندیم

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ان کی زندگی میں جہاں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، وہاں اب ان کے رخصت ہو جانے کے بعد ان کی ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت اور ادبی فتوحات پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ احمد ندیم قاسمی نے جس سطح پر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا اور پایانِ عمر تک جتنا لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے منفرد اور بھرپور جوہرِ قابل تھے۔ ان کا تخلیقی اور تحقیقی کام اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے کسی ہم عصر سے کم نہیں، ان کے ہم عصر ادیبوں میں ڈاکٹر تاثیر سے لے کر ناصر کاظمی، کرشن چندر سے انتظار حسین تک شاعری اور افسانہ نویسی کے فن میں ان کا کام ان سب پر بھاری ہے۔ جہاں تک معیار فن کا تعلق ہے اس میں گنجائش رہے گی اور فیض احمد فیض کا پلہ وزنی دکھائی دے گا۔ اس کے علاوہ انھیں نقاد بھی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن شعبۂ نقد ونظر میں احمد ندیم قاسمی نئی نسل کی حوصلہ افزائی کے حوالے سے ہمیشہ توصیف اور تحسین کی ضرورت اور نئے لکھنے والوں کے دل میں گھر کرنے کی خاطر تنقید کی بجائے اپنی عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعریف کا پہلو نمایاں کرنا ضروری خیال کرتے۔ اس اعتبار سے ہم اسے تنقید سے زیادہ رسمی اظہار شفقت کا نام دے سکتے ہیں، البتہ ادب کی رفتار اور رجحان کے حوالے سے ان کا زاویہ نظر مخلصانہ ہونے کے علاوہ صحیح سمت کی رہنمائی میں مددگار ثابت ہوا۔ وہ اکثر فنون میں حرف اول کے عنوان سے جو کچھ لکھتے ان کی رائے نپی تلی ہوا کرتی۔ انھوں نے بے کم وکاست اپنی رائے کا اظہار کیا، ہمیشہ سچ کہنے کے حق میں تلخ باتیں بھی زبان پر آئیں۔ اسی طرح عہد موجود کی عالمی سیاست کو موضوع سخن بنا کر اپنی تجزیاتی تحریروں میں جو کچھ اظہار خیال کیا انھیں ایک مدبر کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ جھوٹ اور سچ کے سلسلے میں ان کا یہ کہنا کتنا درست ہے کہ میرے اندازے کے مطابق جب نوع انسان اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہوگی تو کسی کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ لوگ جھوٹ کے نام سے بھی ناواقف ہوں گے اور سچ اور صرف سچ بولتے ہوں گے۔ جھوٹ کا آغاز تب ہوا ہوگا جب انسان کو دوسرے انسان کے حقوق غصب کرنے کی سوجھی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ کسی لالچ یا ترغیب کی وجہ سے اسے سچ سے دست کش ہونا پڑا ہوگا .... آج کی عالمی

سیاست گواہ ہے کہ وہ سب جو ''بڑے'' کہلاتے ہیں، کتنی بے حیائی سے سچ کا لبادہ اوڑھ کر بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ سچ کی علمداری جھوٹ کے مقابلے میں اس لیے کم ہے۔

احمد ندیم قاسمی ادب میں سچائی اور صفائی کے نہ صرف قائل تھے بل کہ انھوں نے اپنی ادبی تخلیقات میں سچائی کی خاطر دکھ بھی جھیلے۔ پاکستان کے ابتدائی ایام میں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ادارت کے عہد کو خیر باد کہنا پڑا اور مختلف مراحل میں جتنے معاشی خسارے اٹھائے وہ سب سچ بولنے کے سبب اٹھانے پڑے۔ ان کا مؤقف یہ رہا کہ اگرچہ جھوٹ صدیوں سے بولا جا رہا ہے مگر آج تک جھوٹ کو تقدیس کا درجہ نہیں ملا۔ تقدیس صرف سچ کو حاصل رہی۔ اور اس لیے سب لوگ سچ ہی کے دعویدار ہوتے ہیں۔ رہی سچ کی حمایت تو عرض یہ ہے کہ سچ کا دعویدار جھوٹا بھی ہو سکتا ہے لیکن جب کوئی شخص سچ کی علی الاعلان حمایت کرتا ہے تو وہ ایک نیک کام کر رہا ہوتا ہے۔ انھی سچ کہنے والوں ہی کے دم سے آج سچ کی تھوڑی بہت آبرو باقی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے افسانوں میں جو کردار متعارف کرائے، وہ سبھی ہمارے گرد و پیش میں موجود رہے۔ انھوں نے اپنی ہر کہانی کی بنیاد سچائی پر رکھی ان کی کہانیاں اور ان کی بُنت ایسی ہے کہ ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے چاروں جانب بکھرے ہوئے واقعات کا مجموعہ ہیں۔ انھوں نے شدت سے منافقانہ رویوں کی تکذیب کی۔ یہی وہ خوبی ہے جو ان کے افسانوں کے علاوہ خود ان کی زندگی کا مجموعی انداز نظر رہا۔ ان کا فنی اور فکری ارتقا اور اس میں تسلسل کا عرصہ پون صدی پر محیط ہے۔ اس عرصہ ہنر میں انھوں نے شعر و ادب سے وابستگی کو ہر مشغلہ زندگی پر فوقیت دی۔ وہ ضلع خوشاب کے موضع انگہ اور اعوان خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود کبھی اپنے نام و نسب اور علاقائی نسبت پر احساس تفاخر میں مبتلا نہیں ہوئے۔ وہ اول و آخر پاکستانی ادیب ہونے پر مطمئن رہے اور اسی حوالے سے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ انھوں نے ایک دنیا دیکھی لیکن اپنی سرزمین سے عشق کیا، وہ پاکستان کی پہچان بن گئے اور اپنے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے نئے لکھنے والوں میں اپنے ہنر کی سوغات کے اعلیٰ نمونے پیش کرنا بل کہ تقسیم کرنا عادت بن چکے تھے۔ وہ بڑے قاسمی صاحب کہلائے اور ہمیشہ بڑوں کی طرح چھوٹے قاسمیوں پر شفقت کی نظر کی۔ یہی ان کا بڑا پن تھا کہ ان کا فن معراج کمال پر ہونے کے باوجود داد و تحسین سے بے نیاز رہا۔

احمد ندیم قاسمی فراخ دلی سے نئے لکھنے والوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے۔ وہ بساط ادب

پر قدم رکھنے والوں کو اپنا بناتے اور اپنے پاس بٹھاتے رہے، ان کے خطوط کا جواب دیتے۔ ایک غزل کہنے پر سال بھر کے لیے فنون کا اجراء کرتے۔ انھیں نوجوان شعرا کی غزلیں چھاپنے اور ان سے ملاقات کی صورت میں مسکرا کر تخلیقی سفر جاری رکھنے کی ہدایت کرتے تو ان کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ پاکستان کے بیشتر شہروں، قصبوں اور قریوں میں ان کے چاہنے والے ان کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کرتے۔ وہ سننے سے زیادہ سنانے والوں سے خوب سنتے اور اچھا شعر سنتے ہی کہنے والے کو فنون میں چھپنے کی ترغیب دیتے۔ مشرقی پاکستان کے المیے پر وہ اور ہم سبھی بہت غم زدہ ہوئے۔ سب نے اس سانحے پر اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ ہمارے شاگرد عزیز اور نوجوان شاعر نے اپنی غزل کا مطلع کیا جو بہت مشہور رہا۔ یقیناً ایسے شعر دل میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ کسی نے قاسمی صاحب کو یہ شعر سنا دیا۔ وہ آبدیدہ ہوئے اور جہلم کے اس نوجوان شاعر کو پیغام بھجوایا کہ وہ فنون میں لکھے اور پہلی فرصت میں یہ غزل بھیجے جس کا مطلع یہ ہے:

ہمارا گھر بھی گیا اور بھی گھرانے گئے
چھتوں کے ساتھ ہی چڑیوں کے آشیانے گئے (محسن شیخ)

قاسمی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایک ہی بات کہی جو سو باتوں پر بھاری ہے کہ تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ ہم عصر ادیبوں میں چشمک ہونا فطری امر ہے، جیسے مولانا شبلی نے مولانا حالی کے لیے کچھ کہا یا مولانا ظفر علی خان نے علامہ اقبال کے لیے کوئی فقرہ اچھال دیا۔ لیکن ان کی عظمتِ فن سے انکار ممکن نہیں، اسی طرح قاسمی صاحب کے ہم عصر ادیبوں میں یہی رویہ پایا جانا فطری سی بات ہے۔ دراصل چاہنے والے اور محبت کرنے والے جس طرح غلو سے کام لیتے ہیں، اسی طرح ہم عصر قلم کار مقام و مرتبہ جاننے کے باوجود کمزور نبض پر ہاتھ رکھنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ قاسمی صاحب کو فیض احمد فیض سے تعلق خاص رہا۔ امروز اور پاکستان ٹائمز ایک ہی ادارے کے دو روزنامے تھے۔ امروز کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے۔ دونوں ایک ہی جگہ صبح و شام اکھٹے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مقام سے آگاہ تھے۔ اس لیے ان میں ذہنی مطابقت کے علاوہ طریق کار بھی ایک جیسا تھا۔ ان دونوں کا مقصد بھی ایک تھا کہ پاکستان میں غریب اور مفلس کی دادرسی ہو۔ نظام جاگیرداری کا خاتمہ ہو، ایسا انقلاب برپا ہو کہ ہر شخص اپنی محنت کا ثمر پائے۔ دونوں کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کی مقصدیت غالب رہی۔ البتہ فیض احمد فیض کا وژن مطالعے کی وسعت کی بنا پر احمد ندیم قاسمی سے زیادہ آفاق گیر تھا، جب کہ احمد

ندیم قاسمی کے ہاں ایسا کربِ آگہی موجود ہے جو صدیوں پر محیط ہے۔ اس میں ذات کا دکھ بھی ہے اور ایسی بے نام کسک جس میں لا حاصلی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ہم نہیں ہوں گے تو پھر کس کام کی تحسینِ شعر
روشنی اک روز ان لفظوں سے پھوٹے گی تو کیا

فیض کے ہاں بھی معاشرے کی بے حسی اور درد وغم کا اظہار بہ رنگ دگر دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی شاعری سے اعلیٰ اقدار کی فروغ پذیری کی توقع رکھنے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے یہ لعل و گہر جائیں گے

بہر حال دونوں ہم عصر شعرا کے پرستار خوش نصیب ہیں کہ وہ ایسے عہد خوش اطوار میں پیدا ہوئے کہ عظیم قلمکاروں اور فنکاروں کی کہکشاؤں، آسمان ادب پر جگمگاتی رہی اور اب صورت احوال یہ ہے کہ چھوٹی لکیریں بھی بڑی کہلانے پر مصر ہیں۔ لیکن بڑوں نے خود کو کبھی بڑا نہیں کہا اور ان میں احمد ندیم قاسمی سرِفہرست ہیں۔ انھوں نے بڑی عمر پائی۔ وہ کتنے باہمت اور صاحب مروت تھے کہ مرنے سے چند روز پیشتر حلقۂ ارباب ندیم کی دعوت پر جہلم گئے اور شہزاد قمر کے نئے مجموعے ”آنکھوں کے خیموں میں“ کی تقریب رونمائی کی صدارت کی۔ منہ بولی بیٹی منصورہ احمد ان کے ہمراہ تھیں۔ واپسی ہوئی تو ہمارے میزبان شیخ مختار جاوید نے مجھے بھی ان کے ہم سفر ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس سفر میں ان سے بہت کچھ سنا، وہ جس سفر پر روانہ ہو چکے ان کی تیاری روزِ اول سے کی جاتی ہے۔ یہی قاسمی صاحب کا آخری شعر کہنا چاہیے:

کوچ کے حکم کا امکان ہے ہر ہر لحہ
روزِ اول سے بندھا رکھا ہے بستر اپنا

☆☆☆☆

ڈاکٹر ناہید قاسمی

ابّا جی

سوموار ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لاہور میں میرے ابا جی کو سی سی یو سے اوپر کی منزل میں آئی سی سی یو لے جانے کے لیے جب ان کے پہیوں والے بیڈ کو ہسپتال کی بڑی سی نیم قوس بناتی سلائیڈ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو مَیں شیشوں کے اس پار کھڑی رہ گئی۔ دھیرے دھیرے پکار رہی تھی: ’’ابا جی! مینڈے آپڑیں ابا جی!‘‘ تب میں نے ایک انوکھا منظر دیکھا، جو میری یاد میں ہمیشہ کے لیے جم کر رہ گیا۔ میں نے صبح کی ہلکی گلابی سی روشنی میں دیکھا کہ بڑے سے صاف ستھرے سفید بیڈ پر میرے ابا جی اپنے نیلے سے گرے رنگ کے نفیس لباس میں سیدھے لیٹے تھے۔ اس کا سنجیدہ پرسکون چہرہ میرے سامنے تھا۔ ان کے سنورے ہوئے سفید بال آہستہ سے لہرا رہے تھے۔ وہ اس وقت بہت خوب صورت، بڑے مطمئن اور بے حد پروقار دِکھ رہے تھے۔ ایک فاتح کی مانند جیسے پرسکون نیند میں...... دو تین گھنٹے پہلے کی دھیمی دھیمی ہلچل کے اب آثار تک نہ تھے۔ ہسپتال کا عملہ ان کے بیڈ کو سلائیڈ پر اوپر کی طرف ہموار رفتار سے دھکیل رہا تھا اور ندیم کا وجود اس زمین سے اٹھتا، بلندی کی طرف اس نیلے آسمان پر قوس بناتا ہوا اوپر ہی اوپر، اونچے بڑے دروازے کے پار لے جایا جا رہا تھا۔ میرا دل تو نہیں مانا لیکن میں سمجھ گئی تھی کہ اس لمحے میرے اپنے ہی پیارے ابا جی، سکون اور اطمینان کی کیفیت میں اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں۔ اب ڈاکٹرز صرف اپنے پیشے کا آخری تقاضا پورا کریں۔ اور بس!...... اسی پل اپنے ابا جی سے جدائی کے شدید دکھ کی ٹیسیں میرے دل میں کھب گئیں۔ وہ ابھی تک وہیں کھبی ہیں۔ زخم تازہ ہے، ذرا مندمل ہو لے، تھوڑا سنبھل جاؤں تو انشاءاللہ میں اپنے اور آپ کے ندیم کی زندگی کے ان شب و روز کے بارے میں، جو میں نے دیکھے ہیں، ضرور لکھوں گی۔ اس وقت آپ سے ان کے آخری دنوں کی تھوڑی سی یادیں شیئر کروں گی۔

اب کے برس ماہ جون نے احمد ندیم قاسمی جیسے عظیم کہسار کو زیادہ تر زلزلے کی حالت میں رکھا۔ سخت گرمی اور بار بار کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ابا جی کی سانس کی تکلیف کا دورانیہ ذرا زیادہ اور ٹھیک رہنے کا وقفہ کچھ کم ہوتا گیا۔ ڈاکٹر محمود ناصر ملک، ہسپتال، گھر ایک دائرہ سا بن گیا۔ اس دائرے کا ایک اہم سٹاپ دفتر بھی تھا۔

وہاں کے معمولات میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ کام، کام اور کام ساتھ ساتھ مسلسل جاری رہا۔ اس دوران انھیں اپنوں کے سکھ دکھ کا بھی احساس رہا۔ سال گرہوں پر مبارک دینا بھی یاد رہا اور وہ عزیزوں دوستوں کی مزاج پرسی بھی کرتے رہے۔ وہ کلینک میں تھے پر اپنی طبیعت کے پورے ٹھیک نہ ہونے کے باوجود اپنی بھابھی (ہماری تائی صاحبہ) کی تدفین میں شرکت کے لیے میرے بھائی نعمان اور مجھے ۲۹ جون کو وادیٔ سون سکیسر کے دوردراز گاؤں انگہ بھیجا۔ ہم اسی روز واپس آ گئے تو ابا جی کو بہت بہتر پا کر تسلی ہوئی۔ اس سارے ماہ میں جب بھی وہ بہتر محسوس کرتے دفتر چلے جاتے اور اپنے کاموں میں لگ جاتے۔ لیکن جمعرات ۶ جولائی کو وہ دفتر سے خلاف معمول جلد لوٹ آئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ گھر پر آکسیجن اور نیبولائیزر کا انتظام تھا۔ اس کے استعمال سے افاقہ محسوس کیا۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے جمعہ اور ہفتہ کی چھٹی کر لینے کا ارادہ تو کر لیا لیکن کہا۔ ”میں گھر پر بھلا کیا کام کروں گا؟“ میں نے کہا کہ ابا جی مجھے کالج سے چھٹیاں ہیں۔ آپ کی میز اور شیلف میں بہت سے کاغذ اور خطوط وغیرہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ہم باپ بیٹی آپ کے کاغذات ترتیب دے لیں گے۔ دراصل ابا جی جیسے ہمہ جہت فنکار کے کاموں کے بہت سے سیکشن تھے۔ جبکہ بے ترتیبی انھیں پسند نہیں تھی۔ جمعے کو ابا جی نے اپنے نئے مجموعہ کلام اور اپنی نئی کتاب (”میرے ہم سفر“ کی دوسری جلد) کے مسودے اپنے بیگ سے نکالے۔ ان کے پروف چیک کیے۔ فہرستیں بنوائیں اور کہا: ”اب یہ پرنٹنگ کے لیے تیار ہیں۔ صرف دیکھنا باقی ہے کہ میرا کوئی کلام یا اہم مضمون شامل ہونے سے رہ تو نہیں گیا“۔ دن بھر ان کی قابل رشک اور قابل فخر قوتِ ارادی نے ان کا بہت ساتھ دیا لیکن رات کو سانس کی تکلیف پھر شروع گئی۔ جو دیر تک رہی اور کنٹرول نہ ہو سکی۔ ہم ان کے ڈاکٹر سے موبائل فون پر رابطے کی کوشش کرتے رہے۔ تب ہفتے کو ہم پہلے کی طرح، ان کے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ”پی آئی سی“ لے گئے۔ وہ خود چل کر کار تک گئے۔ نعمان نے سہارا دینے کے لیے ہاتھ تھامنا چاہا تو منع کر دیا اور کہا: ”میں ٹھیک ہوں بیٹا! فکر مت کرو“۔ اپنی عمر کے نوے ویں برس میں بھی ان کی ہمت لاجواب تھی۔

ہسپتال میں ڈاکٹرز کی بھرپور توجہ سے اتوار کو ابا جی خاصے سنبھل گئے۔ مجھے بس یہ لگا کہ انھیں بولتے وقت جیسے کچھ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ورنہ ان کے کسی بھی عمل سے کمزوری ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے دوست احباب ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے رہے اور وہ ان سے بھرپور انداز میں نہ صرف ہاتھ ملاتے رہے مل کر مختلف موضوعات پر گفتگو میں بھی شامل رہے۔ (ان کے پاس ایک وقت میں دو افراد کے رکنے کی اجازت تھی

اور جو باہر انتظار کر رہا ہوتا اس کی بھی انھیں فکر ہوتی)۔ وہ رات تک ہمیں ہنسانے کے لیے پر لطف باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے گھر سے آیا کھانا بھی رغبت کے ساتھ کھایا۔ ہمیں تسلی تھی کہ بس ایک آدھ دن میں وہ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گے اور حسبِ معمول ہم انھیں ہنستا بولتا ہوا، گھر لے جائیں گے۔ لیکن...... لیکن ہم اب کی بار جیتے جاگتے ندیم کو گھر نہ لا سکے۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے لکھی ہے تا کہ آپ کو بتا سکوں کہ تکلیف کے باوجود آخر تک ان کا شعور پوری طرح توانا، ان کا احساس مکمل طور پر زندہ اور ان کا دل اچھی طرح دھڑک رہا تھا۔ انھوں نے برداشت کی انتہا کو چھو لیا۔ دبلے پتلے وجود میں ہمت، حوصلے اور حقیقت کا بہادری سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نے قوتیں بھر رکھی تھیں۔ ایک بار بھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ نہ ہی محسوس ہونے دیا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ، سانس بہ سانس ہم سے دور جا رہے ہیں۔ میں ان کے صرف ایک جملے سے ذرا چونکی لیکن اس وقت تو خود کو تسلی دے لی کہ شاید میں نے ٹھیک طرح سے سنا نہیں...... دراصل اتوار کی صبح میری بیٹی نفیسہ اور میرا بیٹا نیّر ان کے لیے ناشتہ لے کر آئے۔ نیّر اخبار خرید لایا تو ابا جی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کا چشمہ انھیں دیا۔ تب انھوں نے اخبار کے سبھی صفحات پر ٹھیک ٹھاک، ٹِک ٹھہر کر نظر دوڑائی۔ اپنے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر کو بھی دیکھا۔ اخبار رکھ کر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر نفیسہ کو جسے وہ ہمیشہ ‘‘میری آرٹسٹ بیٹی’’ کہتے، اپنے پاس بلایا اور کہا ‘‘کیسی ہو؟’’ وہ بولی ‘‘ٹھیک ہوں بابا!’’ تو کہا ‘‘جیتی رہو’’۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ اس وقت زیادہ باتیں نہ کریں کیوں کہ ابھی الفاظ ان کے مخصوص بھرپور انداز میں ادا نہیں ہو پا رہے تھے لیکن اس وقت وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھے...... اچانک بغیر کسی تمہید کے ایک دم سے انھوں نے اپنا ایک مصرعہ سنایا۔ اس لمحے ان کے لہجے میں انوکھی سی گہرائی تھی:

کہ زخمِ دل نہ بھرا ------ کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی

پھر شعر مکمل کیا:

ندیمؔ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی

خوب گہرا سانس لے کر اپنی اسی غزل کا یہ شعر سنایا:

سحر کی کتنی دعائیں خدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

پھر ذرا سے وقفے کے بعد کہا:

عجیب حشر محبت کا سامنا ہے کہ وہ
خفا خفا ہے مگر دیکھتا ہے پیار سے بھی

اس کے بعد سوچتا ہوا ذرا طویل وقفہ...... جس کے بعد انھوں نے جو کہا وہ میرے نزدیک نہایت اہم بات ہے۔ یہ ابا جی کی آپ سب کے لیے وہ امانت ہے جو مجھے آپ کے سپرد کرنا ہے...... وہ یہ کہ اسی اتوار کی صبح ہمیں یہ اشعار سنانے کے بعد انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ میں نفیسہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے چند لمحے پیار سے دیکھتے رہے۔ پھر اس نے جو حال ہی میں ندیم کے اشعار کے افکار سے متاثر ہو کر اپنا ایم اے پینٹنگز کا تھیسز مکمل کیا تھا، اس کا ایک معنی خیز بہت کچھ کہتا اور سمجھاتا ہوا شعر سنایا:

مجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نت نئے ارض و سما، ارض و سما سے آگے

پھر فیصلہ کن انداز میں مجھ سے کہا۔ ''بیٹی! میں نے اپنے نئے مجموعے کا عنوان رکھ دیا ہے! ......''ارض و سما'' کیسا ہے؟ اس میں بیٹی نفیسہ نے میری رہنمائی کی ہے!'' میں نے مسکرا کر کہا ''ابا جی! اے شعر تاں تسڈا اپنا وے'' (ہم باپ بیٹی آپس میں ہمیشہ اپنی علاقائی پنجابی میں ہی باتیں کرتے تھے)۔ تب ابا جی نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''ہاں ...... شعر تو میرا ہے ...... میرا ہی ہے ......'' یہ کہہ کر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے نفیسہ کی طرف اشارہ کر کے دوبارہ زور دے کر کہا: لیکن رہنمائی تو اس نے کی ہے''۔ اس کے بعد میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''کتاب کے شروع میں اس شعر کو درج کر دینا''۔ میں نے سر ہلانے سے پہلے لحہ بھر سوچا کہ ابا جی نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ''میں درج کر دوں گا''۔ انھوں نے یہ کیوں کہا ہے کہ ''درج کر دینا''۔ ابا جی تو اپنے لکھنے کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے آئے ہیں۔ یہ کام میرے سپرد کیوں کیا؟ ...... یہ تو میں اگلے روز سوموار کو سمجھ پائی کہ انھیں معلوم تھا کہ وہ جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود گھبرانے یا ہمت ہارنے یا سب کچھ جوں کا توں چھوڑ دینے کی بجائے وہ آخری لمحوں میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آخری مجموعہ کلام کو فائنل ٹچ دے رہے تھے اور نہایت بہادری سے موت جیسی اٹل حقیقت کا سامنا کر رہے تھے۔ اللہ اکبر! ان کے چلے جانے کے بعد میں نے ندیم کے مجموعۂ کلام ''لوحِ خاک'' میں سے ان کی اس روز سنائی غزل دیکھی تو اس شعر نے (جو انھوں نے شاید اس وقت ہمیں اداس ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے سنایا نہیں) تڑپا دیا:

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں

آخر میں یہ کہوں گی کہ ان سے جدا ہونے کا دکھ تو بے انتہا ہے لیکن ہم سب گواہ ہیں کہ وہ بہت ہی اچھے انداز میں بہادری اور خوبصورتی سے جیے ہیں۔ مجھے ان کی دس گیارہ برس پہلے کہی ہوئی فکر انگیز نظم: آؤ جینے کی کوشش کریں” یاد آرہی ہے۔ یہ نظم ندیم کے زیرِ طبع نئے مجموعۂ کلام ”ارض و سما“ میں شامل ہے۔ اس کے کچھ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

آؤ جینے کی کوشش کریں
زندگی ہموت کی طرح ایک بار ملتی ہے
ایک بار جی بھر کے جی لیں ....
..........موت آئے تو ہم زندگی کا سفر ختم کرنے کو تیار بیٹھے ہوں
کوئی تمنا ادھوری نہ ہو
یعنی کچھ اور جینا ضروری نہ ہو!!

☆☆☆☆

(یہ مضمون ۱۷ جولائی کو الحمرا آرٹس کونسل لاہور کے تعزیتی ریفرنس میں پڑھا گیا)

شمع خالد

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی سے میری ملاقات ۷۰ کی دہائی کے آخر میں ہوئی۔ لیکن ان سے ایڈیٹر اور ادیب کا رشتہ اسی دن قائم ہو گیا جب میں نے پہلا افسانہ بھجوایا۔ جب بندہ نیا نیا قلم پکڑتا ہے تو اپنی چیز بھجوانے کے بعد ہفتوں کا انتظار کتنا جاں گسل ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے سب ہی گزرتے ہیں۔ افسانے کے پوسٹ ہونے کے تیسرے یا چوتھے روز ایک لفافہ میرا منتظر تھا۔ ڈرتے ڈرتے کھولا تو وہ خط میرے لیے ایک ایسا خزانہ تھا جس کا لفظ ہیرے سے بھی قیمتی تھا۔ قاسمی صاحب نے نہ صرف افسانے کی تعریف کی تھی بلکہ اور افسانے بھجوانے کا مشورہ بھی تھا، یوں یہ سفر چل نکلا۔ میں نے ایک افسانہ 'ہونی'' بھیجا۔ جس کا بعد میں ٹیلی پلے بھی بنا تھا۔ میں منتظر تھی کہ اس دفعہ بھی قاسمی صاحب تعریفوں سے نوازیں گے۔ لیکن خط کھولتے ہی یوں لگا جیسے وہ لفافے سے نکل کر خود پوچھ رہے ہوں، یہ افسانہ لکھا ہے؟ اتنے خوبصورت افسانے کا فلمی خاتمہ.......... میں نے اس افسانے کے ہیرو کی الیکٹرک شاک لگنے سے موت لکھی تھی تو قاسمی صاحب نے ڈانٹتے ہوئے لکھا، اگر اس کردار کا ہارٹ فیل دکھایا جاتا تو زیادہ Logical ہوتا۔

چند افسانوں کے بعد قاسمی صاحب نے مجھے لکھا یہ تم ہر وقت اتنی عجلت میں کیوں رہتی ہو۔ اتنی اچھی کہانی تمہاری جلد بازی سے خراب ہو جاتی ہے۔ میں آج بھی ایک ایک کہانی ایک ایک لفظ کو کئی کئی مرتبہ لکھتا ہوں۔ جانے میرے اندر اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تو میں نے جواب میں کہا۔ اس طرح کہانی کی اوریجنل شکل نہیں رہتی وہ تو کرافٹ مین شپ بن جاتی ہے۔ جس پر آپ نے مسکراتے ہوئے جواب میں لکھا تمہارا کہنا بھی درست ہے لیکن اپنی قدرتی شکل کو تھوڑا بہت سنوارتی تو ہو۔ اس کے بعد میں نے کبھی کوئی ایسی کہانی نہیں لکھی جس کے لیے میں نے باقاعدہ ریسرچ اور ہوم ورک نہ کیا ہو۔ اور دوسری دفعہ لکھنے کی عادت ڈالنے کے بعد اس کی شین کاف خالد سے درست کرواتی رہی۔ ۱۹۸۰ء کے آغاز یا ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہی ایک دفعہ ایک ادبی تقریب میں دعوت نامے میں پتہ چلا کہ اس تقریب میں قاسمی صاحب اور ڈاکٹر وزیر آغا بھی آ رہے ہیں۔ خالد نے مجھے دو پیکٹ دیے جس میں ایک پر قاسمی صاحب کا نام تھا اور دوسرے پر ڈاکٹر وزیر آغا کا نام۔ میں اسٹیج پر

گئی اور پہلا پیکٹ قاسمی صاحب کو دیتے ہوئے کہا سر یہ میری کہانیاں ہیں، ان پر کچھ لکھ دیجیے گا۔ دوسرا پیکٹ آغا صاحب کو دیا۔ آغا صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے کہا آپ نے غلط ایڈریس پر غلط خط دیا ہے۔ میں سمجھی شاید انھوں نے برا مانا ہے۔ لیکن دیکھا تو قاسمی صاحب والا لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے معذرت کر کے دونوں کو الگ الگ ان کے نام کے لفافے دیے۔

میرے اکثر دوست کہنے لگے تم نے غلط کام کیا ہے۔ آغا صاحب اور قاسمی صاحب کبھی یکجا نہیں ہوں گے۔ لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ چند دنوں میں دونوں بڑے نقادوں نے اپنی اپنی رائے بھجوا دی۔ جو میں نے اپنی کتاب ''پتھریلے چہرے'' ۱۹۸۶ء میں آمنے سامنے لگوائی اور دونوں بزرگوں کو کتاب بھجوائی۔ دونوں بڑوں نے اس بات کا ذرا برا نہ منایا۔ ان ہی دنوں خالد کو ایک ورکشاپ کے سلسلے میں لاہور مال پر سریز ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ خالد صاحب اپنے کورس کے لیے چلے جاتے اور میں قاسمی صاحب سے ملنے کے لیے ان کے آفس چلی جاتی۔ جہاں میں نے قاسمی صاحب کا تفصیلی انٹرویو ریڈیو کے لیے ریکارڈ کیا۔ جس میں میرا ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ اور وزیر آغا اس عہد کے دو بڑے دانشور ہیں تو پھر یہ گروپ بندی اور ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا کیا جواز ہے۔ تو قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، میرا ان سے کوئی اختلاف نہیں، وہ بیمار ہوئے تھے، میں عیادت کے لیے گیا تھا۔ پھر کب اور کیسے دونوں کے درمیان اختلاف پڑے ہیں، میں سمجھ گئی۔ آغا صاحب پنڈی آتے تو مجھ سے کبھی ریڈیو کبھی میرے گھر ملاقات ہوتی۔ وہ بھی یہی فرماتے پھر میں دونوں رسالوں میں چھپتی رہی، جانے یہ سب کیا تھا۔

میری کتاب چھپنے کے بعد قاسمی صاحب نے مجھے لکھا کہ میں اپنی کتاب پر تبصرہ لکھوا کر بھجوا دوں تو عرفان صدیقی نے میری کتاب پر تبصرہ کیا جو فنون میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ جب بھی کوئی کتاب چھپتی قاسمی صاحب نے باقاعدہ لکھا کہ تبصرہ کسی اچھے ادیب سے لکھوا کر بھجوا دو، جسے وہ بڑے اہتمام سے چھپواتے رہے۔

ایک دفعہ خالد صاحب اور میں قاسمی صاحب کے گھر پہنچے، شام کا وقت تھا وہ شاید اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مصروف تھے لیکن ہمیں انھوں نے اتنا وقت دیا کہ میں ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔ میں ان کے قیمتی وقت کا احساس کر کے اٹھنے لگتی تو خالد کوئی بات چھیڑ دیتے۔ قاسمی صاحب مجھے پوچھنے لگے تمھیں کوئی جلدی ہے۔ میں شرمندہ ہو گئی۔ کافی وقت گزرنے کے بعد جب ہم گھر سے نکلے تو وہ ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے اور جب تک گاڑی رخصت نہیں ہوئی، کھڑے رہے۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک افسانہ بھجوایا، جس کا جواب نہ آیا تو میں ناراض ہو گئی۔ دو تین مہینے بعد خود بخود دل صاف ہو گیا تو میں نے گلہ کے انداز میں خط لکھا اور انھیں لکھا کہ آپ جس پودے کو لگاتے ہیں اسے خود ہی کاٹ دیتے ہیں، جس پر ان کا شفقت سے بھرپور خط آیا جس میں انھوں نے خرابی صحت کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا ہو سکتا ہے افسانہ نہ ملا ہو۔ میں نے عجلت میں ایک دوسرا افسانہ بھجوا دیا۔ چار دن بعد خط آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ میں نے ابھی پچھلے دنوں آنکھیں بنوائی ہیں، تمہارا افسانہ پڑھنا بے حد دشوار ہے، اسے کمپوز کروا کے بھجوا دو۔ میں نے افسانہ کمپوز کروا کر بھجوا دیا۔ کمپوزر نے اتنی غلطیاں کی تھیں کہ قاسمی صاحب نے دوبارہ لکھا کہ میں تمہارا لکھا ہوا افسانہ شائع کر رہا ہوں۔ ان کا آخری خط مجھے پچھلے سال ملا۔ اس کے چند دن بعد خالد صاحب کے بچھڑنے کے صدمے میں سب چیزوں سے سال بھر بے نیاز رہی۔ بس ان کا آخری خط میرے لیے ان کی طرف سے آیا تھا۔

☆☆☆☆

شاہدہ حسن

ابد کے ساحل پر

۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح ہمیلٹن کینیڈا میں اپنی قیام گاہ سے متصل ایک سرسبز رستے پر، بادلوں سے گھرے آسمان تلے، میں ایک مختصر چہل قدمی کا آغاز کرنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کراچی سے اپنے گھر سے آنے والے فون کی معرفت مجھے دو بدترین خبروں کو سہنا پڑا۔ پہلی خبر پی آئی اے کے ایک فوکر طیارے کے ساتھ بہت سی جانوں کی تباہی کی تھی اور دوسری دنیائے ادب میں در آنے والے اس تازہ خلا کی، جو احمد ندیم قاسمی جیسی دل نشیں ہستی کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ غم انگیزی بھی کیسی عجیب کیفیت ہے۔ پل بھر میں انسانی ذہن کو تہ وبالا کر دیتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے خوشگوار موسم کی ساری ہریالی وتازگی موت کے سرد اور بے جان ہاتھوں میں دم توڑ گئی ہو۔ تو کیا اب قاسمی صاحب بھی ہم میں نہ ہوں گے۔ کیا وہ بھی ابد کے ساحل پر اتر جانے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر ایک ایسی حیات کا آغاز کر بیٹھے ہیں، جہاں سے اب وہ ہمیں کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے دفتر کی کرسی پر بیٹھا ان کا وہ مہربان وجود یاد آ گیا جب وہ اور منصورہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ میری شاعری، میری بچوں، میری زندگی اور میرے گھربار کے بارے میں ان کے سوالات کیسی اپنائیت سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر ایک اور دوپہر یاد آئی جب وہ غالباً مسقط سے کسی مشاعرے سے واپسی کے بعد کراچی رکے تھے اور خود بخود مجھ سے رابطہ کر کے میرے گھر تشریف لے آئے تھے۔ میں کتنی خوش ہوئی تھی۔ منصورہ بھی ساتھ تھیں۔ ہم نے بہت دیر تک دنیا جہان کی باتیں کیں۔ قاسمی صاحب جو اپنے خدا سے مکالمہ کرتے وقت کہتے تھے:

انسان عظیم ہے خدایا
وہ تجھ کو زمیں پر کھینچ لایا
تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے
تو آگ ہے اور وہ اجالا
تو نم ہے نمو کا پاسباں وہ
تو دشت ہے وہ چراغ لالہ
انساں نے تجھے حسین بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو عین حیات ہے مگر وہ
تزئین حیات کر رہا ہے
اس پہ ہے غلط فنا کا الزام
سامان ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھنگ سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا

قاسمی صاحب واقعی جینے کا ہنر جانتے تھے۔ محبتوں اور اخلاص کے رشتوں کو نبھانا جانتے تھے۔ وہ پھل دار درخت کی جھکی ہوئی ڈالیوں کی طرح ہر چھوٹے بڑے سے جھک کر ملتے تھے اس دور کے دوزخ میں چلتے ہوئے بھی وہ راکھ نہیں ہوئے تھے۔ جبھی تو اپنے خدا سے اپنا حق یہ کہہ کر مانگ رہے تھے:

اے خدا اب تیری فردوس پہ حق ہے میرا
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

مجھے ان کی ایک اور نظم یاد آنے لگی ۔۔۔۔۔ ’’ایک اداس لمحے کی نظم‘‘

میں نے کل رات کے سناٹے میں
ایک دل دوز مسافت طے کی
میں سمجھتا ہوں ابد کا کوئی ساحل ہی نہیں
اور مرے سامنے ساحل تھا
جہاں وقت کے قدموں کے نشاں تک بھی نہ تھے
کچھ بھی موجود نہ تھا
میں بھی موجود نہ تھا

پھر ایک اور شعر یاد آیا:

یہاں سے اُڑ کر جب آسماں پہ جاؤں گا
بہت عجیب نظر آئے گی زمین مجھے

پھر ان کے ان مشہور اشعار میں بھی میرے بوجھل دل نے زندگی کی کسی نئی معنویت کی تلاش شروع کر دی:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

حسنِ فطرت سے عشق کرنے والے قاسمی صاحب کی دعا تھی کہ

الٰہی جب بھی مروں میں تو اس ادا سے مروں
کرن کی طرح گلوں میں نفوذ کر جاؤں

وجود وعدم اور فنا اور بقا کے حوالے سے انھوں نے اپنے دل کی گدازی کا یہ کیسا اثر انگیز اظہار کیا ہے جیسے ہمارے محسوسات اور جذبوں سے ہم آہنگ ہو کر وہ ہمیں بھی زندگی کی سچائیوں کو سمجھنے اور زندگی کی ماہیت پر غور کرنے کا اشارہ کر رہے ہوں۔ اپنے تخلیقی لمحوں کی سپردگی کے عالم میں گویا وہ حیات کے ایک ابدی سفر پر نکل پڑے تھے۔

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم کاش! یہی ایک کام کر جاؤں
یہ دشتِ ترکِ محبت یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں
کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں
یہ جی میں آتا ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

تو یہ تھا ان کی زندگی کا منشور...... ان کا ضابطہ حیات، جس کا بھرم انھوں نے آخری دم تک قائم رکھا۔ حسن وصداقت کے خوبصورت معیارات سے معمور زندگی پر یقین رکھنے والے قاسمی صاحب شاید اس دنیا کی روز افزوں بدصورتیوں سے نڈھال ہو چکے تھے۔ انسانی معاشرے کی قابیلی سرشت کے بھیانک مظاہروں نے انھیں حد درجہ ملول کر رکھا تھا۔ ایک صدی سے صرف ایک دہائی کم عرصہ حیات پر محیط، اپنی کٹھن زندگی کے دوران، انھوں نے بہت کچھ دیکھا، محسوس کیا، برتا اور جھیلا تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو اپنے وجود کی اولین سانسوں سے لے کر ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح اپنی بجھی ہوئی آنکھوں اور بے جان بدن کے ساتھ، پکی ٹھٹھی سمن آباد کے حضرت بابا شاہ مشائخ کے قبرستان میں خاک کی چادر اوڑھ لینے تک، ان کا تخلیقی وجود اپنی گواہی دیتا رہا تھا۔ وہ مسلسل لکھ رہے تھے، سوچ رہے تھے، کلام کر رہے تھے۔ ان کا ایک کالم روزنامہ جنگ کے صفحات میں ۲ جولائی ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ شاید یہی ان کا آخری کالم تھا۔ جس میں انھوں نے ہماری قومی تاریخ کے ایک انتہائی حساس موضوع یعنی آئین پاکستان کے حوالے سے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے

وطن کے لیے یہ سوچ بچار، اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کے مسائل حیات سے گہری وابستگی یہی تو ان کے باطنی وجود کے زندہ ہونے کی علامت تھی۔

شاعری، افسانہ نگاری، کالم نگاری، تحقیق و تعلیم، ریڈیو ٹی وی فلم کے لیے ان کی خدمات، مجلس ترقی ادب لاہور سے وابستگی، ان سارے شعبوں میں ان کی مخلصانہ کاوشیں اور تقریباً نصف صدی سے جاری ادبی رسالہ 'فنون' کے ذریعے اردو کے نئے اور پرانے تخلیق کاروں کی پیہم پذیرائی ۔۔۔۔ یہ سب اردو زبان و ادب کی ترویج کے ضمن میں ان کا ایک ایسا فیضان تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے صفحات میں موضوعات کے بھرپور تنوع کے ساتھ، ان کی تخلیقی فکر کے ان گنت رنگ بکھرے ہیں۔ ان کا سماجی شعور بہت گہرا تھا۔ ایک انسان کے دوسرے انسان سے بھرپور اور سچے رشتے پر اصرار کے ساتھ ساتھ، وہ حسن فطرت سے ہم انسانوں کی ہم آہنگی اور قربت کو مسرتوں اور شادمانیوں کی اصل گردانتے تھے۔ ان کے غزلیہ اور نظمیہ اظہار کے موضوعات، اسالیب زبان و بیاں، استعاروں اور علامتوں میں زندگی کے دائمی حسن پر ان کے یقین کی بہت سی جہتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ۱۵ سے زائد افسانوی مجموعوں میں انھوں نے بہت سے سماجی موضوعات کے ساتھ بطور خاص پنجاب کی دیہی زندگی کے استحصالی عناصر کی عمدہ تصویریں پیش کی ہیں اور معاشرے کی تصویریں پیش کی ہیں اور معاشرے کے بے شمار کچلے ہوئے لوگوں کے دکھوں پر آنسو بہائے ہیں اور ان کی کہانیاں رقم کی ہیں۔ آج انہی لوگوں کے درمیان، پنجاب کی سرزمین میں وہ خود بھی کہانی بن کر دفن ہو چکے ہیں۔

قاسمی صاحب پہلی جنگ عظیم کے وسطی زمانے کی ہولناکیوں کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور ان دنوں ایک بالکل بدلی ہوئی دنیا کے لحہ بہ لحہ بدلتے مناظر پر فکر مند تھے۔ جہاں گلوبل ولیج کی صورت میں ڈھلا ہوا آج کا یہ انسانی معاشرہ، طاقت کے توازن کے ہیجان میں مبتلا ہر لحہ ایک نئے تصادم کی خبر نشر کر رہا ہے۔ قاسمی صاحب اسی معاشرے کو ایک پر امن، خوشحال اور بقائے باہمی پر یقین رکھنے والے معاشرے کی شکل میں بدلتا دیکھنے کے آرزومند تھے۔ جبھی تو کہہ رہے تھے:

ذکر مریخ و مشتری کے ساتھ اپنی دھرتی کی بات بھی تو کرو
موت کا احترام برحق ہے احترام حیات بھی تو کرو

ان کا یہ خیال کتنا سچا ہے کہ:

ذہنوں میں خیال جل رہے ہیں
سوچوں کے الاؤ سے لگے ہیں
دنیا کی گرفت میں ہیں سائے
ہم اپنا وجود ڈھونڈتے ہیں
اب بھوک سے کوئی کیا مرے گا

منڈی میں ضمیر بک رہے ہیں
ماضی میں تو صرف دل دکھا تھا
اس دور میں ذہن بھی دکھے ہیں
سر کاٹتا تھا کبھی شہنشاہ
اب لوگ زبان کاٹتے ہیں
لاشوں کے ہجوم میں بھی ہنس دیں
اب ایسے بھی حوصلے کہاں ہیں

بلاشبہ انھوں نے بہت دیر تک اپنے دل کی روشنی سے کام لیا۔ اس معرکہ حیات میں ان کا وجود اگرچہ بیشتر افسردہ و اداس رہا مگر پھر بھی مایوس نہ ہوا کہ وہ صرف اور صرف محبتوں کے گنہگار تھے

مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

اس قدر قحط وفا ہے مری دنیا میں ندیم
گر کوئی ہنس کے ملے، اس کو مسیحا جانو

آج جبکہ ہمارے اور آپ کے پیارے قاسمی صاحب اپنے ظاہری وجود کی ایک انتہا پر پہنچ کر، ایک اور جاوداں سفرِ حیات کا آغاز کر چکے ہیں جس کے بارے میں کبھی انھوں نے کہا تھا:

کیا جانے کس سفر پہ رواں ہوں ازل سے میں
ہر انتہا کو ایک نئی ابتدا کہوں

تو آیئے انھیں اپنی بے شمار دعاؤں کے ساتھ یاد کریں کہ کبھی انھوں نے بہت دکھے ہوئے دل کے ساتھ یہ شکوہ بھی کیا تھا:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

میری دعا ہے کہ اپنے لفظوں، اپنے شعروں، اپنی تحریروں کے حوالے سے دنیائے ادب میں سدا اپنے وجود کی گواہی دیتے رہیں کہ ایک سچے قلم کار کی حیثیت سے ان کا یہ یقین تھا:

مر کر بھی نہ ہوں کے رائیگاں ہم
بن جائیں گے گردِ کارواں ہم
نکلیں گے لحد کے پھول بن کر
پل بھر کے نہیں ہیں مہماں ہم

اعزاز احمد آذر

احمد ندیم قاسمی۔ ایک شخص

احمد ندیم قاسمی صاحب کی فنی جہتوں اور ان کے معیار و اہمیت کے بارے میں تو جو تاریخ اور وقت فیصلہ دے چکا ہے۔ اہل نقد و نظر نے دفتر کے دفتر لکھ دیے ہیں اور ابھی تا دیر لکھا جاتا رہے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ شعر و ادب اور صحافت میں ان کے مقام کے تعین کا کام آئندہ مورخ پر یا ثقہ نقادوں پر چھوڑ دینا بہتر ہے۔ جبکہ قاسمی کی شخصیت کے کبھی حوالے اس قدر وقیع اور روشن ہیں کہ ان میں سے ہر ایک الگ سے ایک موضوع ہے۔

مجھے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں قاسمی صاحب سے قریبی تعلق اور ملاقات کا موقع ملا۔ یہ عرصہ چالیس سال (کم و بیش) پر محیط ہے۔ ان گنت مواقع پر ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ مشاعرے ملک بھر کے دور دراز شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعرے تھے جن کے لیے بذریعہ سڑک بھی سفر کرنے کے کئی مواقع آئے۔ اس دوران ہم سفری میں یا ہم مجلسی کے حوالے سے ندیم صاحب کے ذاتی اور شخصی اوصاف بہت واضح طور پر منکشف ہوتے رہے۔ ان اوصاف میں جو بہت بنیادی اور سب سے اہم چیز رہی ہے وہ ان کی ذات کا سب سے مضبوط .... ''محبت'' .... کا حوالہ ہے ان کے مزاج کا دوستانہ پن ایسے مواقع پر ابھر کر سامنے آتا تھا۔ شگفتگی اور شگفتہ بیانی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ سفر کے دوران اور ادیبوں، شاعروں کی مجلس میں وہ اس پہلو پر کبھی اپنے تحفظات کا اظہار بل کہ اشارہ تک نہ کرتے تھے کہ ان کے اردگرد جونیئر یا کم تر شاعر ادیب لوگ بیٹھے ہیں۔ جو موضوع چھڑ گیا، ندیم صاحب اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اسی موضوع کو آگے بڑھانے والے واقعات اور لطیفے اس قدر انہماک سے سناتے کہ وہاں موجود ہر شخص لطف اٹھاتا اور ندیم صاحب کی شخصیت کے ساتھ اس کی محبت عقیدت میں بدلتی چلی جاتی۔ ظاہر ہے وہ ایک اہم علمی، ادبی شخصیت جس نے میدانِ ادب و صحافت میں ستر برس کا عرصہ گزارا اور ستر برس ہی اس راجدھانی پر حکمرانی کی۔ اسے کن کن نامی گرامی اہل علم و ادب اور صاحبان قلم کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع نہیں ملا ہوگا اور آپس کے اس میل ملاپ کے دوران جو دلچسپ یادگار واقعات چٹکلے، فقرے بازیاں اور ''حیلہ سازیاں'' ہوتی رہی ہوں گی، ندیم صاحب ان سب کے چشم دید بل کہ موقع کے گواہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ چناں چہ وہ بہت سے دلچسپ واقعات ایک عجیب طرح کی سرشاری کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اچھے

لطیفے سے محظوظ ہونا اور خود اپنے پاس یادداشت میں اچھے سے اچھے لطیفے محفوظ رکھنا اور اسی طرح کی (دوستوں اور ادیبوں شاعروں کی) محفلوں میں بہت پرتاثیر انداز میں سنانا احمد ندیم قاسمی صاحب کی شخصیت کا ایک خاص حوالہ تھا۔ ان سب باتوں کا مقصود دراصل یہ کہنا تھا کہ تصنع، بناوٹ، خود پسندی اور خواہ مخواہ بن بن کے بیٹھنا یا لیے دیے رہنا ان کے قریب سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ وہ اپنے ملنے اور چاہنے والوں اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کو ہمیشہ اپنے برابر کی سطح پر رکھ کر مخاطب ہوتے تھے۔ جونیئرز کو کبھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ’’تم عمر میں یا کام کے لحاظ سے چھوٹے ہو‘‘۔

ان گنت مرتبہ یہ ہوا کہ دور دراز کے علاقوں میں دوست احباب نے مشاعرے کی تاریخ طے کی۔ قاسمی صاحب سے گزارش کی اور اگر انھوں نے وعدہ کر لیا تو بس کر لیا۔ مجھے دوستوں نے لاہور سے قافلہ کی صورت میں بذریعہ فلائنگ کوچ سب شاعر دوستوں کو ساتھ لے کر آنے کی ذمہ داری سونپی۔ ان حوالوں سے مجھے ان گنت مرتبہ ندیم صاحب کی معیت میں آٹھ آٹھ گھنٹوں کا سفر بھی کرنے کا موقع ملا ہے۔ جس کے ساتھ واپسی کا سفر بھی طے کر لیں تو 16 گھنٹے کے اس سفر میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ندیم صاحب نے کوچ کے معیار، سفر کی تکان، سفر کے آرام دہ نہ ہونے، راستے میں کھانے پینے کے ضمن میں کبھی نہ کوئی فرمائش کی اور نہ کبھی کوئی شکایت۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں پوچھتے تھے۔ ’’کون کون شاعر ہم سفر ہوگا؟‘‘ حالاں کہ ہمارے بعض سینئر دوسرے شاعروں کے ساتھ سفر کرنا سخت ناپسند کرتے ہیں اور صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ’’میرے لیے الگ سے کار کا انتظام کیا جائے-----‘‘ مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا------ کبھی نہیں سنا، کہ ندیم صاحب نے کبھی کوئی ایسی کوئی شرط رکھی ہو۔

۱۹۶۶ء میں مجلس احباب ادب شاہدرہ کے پلیٹ فارم سے شاہدرہ جیسی ادبی لحاظ سے (اس وقت) بے آب و گیاہ بستی جو لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن کا حصہ ہونے کے باوجود شہری سہولتوں سے اب بھی قطعی محروم اور پسماندہ بستی ہے وہاں احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ شام منانے کا پروگرام بنا تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پسماندہ بستی میں ادبی حوالے سے ان کے تعاون و سرپرستی کا طلب گار رہا۔ مجلس احباب ادب میرے مرحوم دوست، افسانہ نگار سہراب اسلم، محمد اسلم عصیم (آج کل دبئی میں مقیم) اور میرے اپنے حوالے سے بننے والی ایک تکون کا نام تھا۔ یہ وہی ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، تنویر نقوی، احمد راہی، اشفاق احمد، استاد دامن، سعید جعفری، سید قاسم محمود، عارف عبدالمتین، احمد فراز، انور مسعود، قمر یورش جیسی اہم شخصیات کے ساتھ شامیں منائی گئیں۔ جن میں سے اکثر ایسے ادیب و شاعر ہیں جن کے ساتھ منائی گئی شام پر ان کی زندگی کی پہلی شام تھی بل کہ بعض کی تو پہلی اور آخری بھی تھی۔

مجلس احباب ادب کے زیر اہتمام احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ جو شام منائی گئی وہ اپنی نوعیت کی

ایک منفرد اور یادگار شام تھی جس کا ذکر قاسمی صاحب نے ہمیشہ بہت محبت سے کیا مل کہ اس شام کے بعد ایک بار ایک ادبی تقریب مرحوم رفیق احمد باجوہ (ایڈووکیٹ) کی رہائش گاہ واقع شادباغ لاہور میں منعقد ہوئی جس کی صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب کر رہے تھے۔ وہاں انھوں نے جو تحریر پڑھی اس میں شاعروں کے ساتھ منعقد ہونے والی ادبی شاموں کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

> “خود میری پینتیس سالہ (اس وقت تک) ادبی زندگی میں حال ہی میں ایک شام منائی گئی ہے ----”

جہاں یہ اعتراف کہ ان کی زندگی کی یہ پہلی ادبی شام تھی احمد ندیم قاسمی صاحب کے اعلیٰ ظرف کا اظہار ہے وہاں یہ میرے لیے ایک بڑی بات بھی ہے کہ وہ شام منعقد کرنے کا اعزاز میرے حصے میں آیا۔ (ان کی وہ تحریر میرے پاس اب بھی اصل حالت میں موجود ہے)۔

قاسمی صاحب اپنے جونیئرز مل کہ بہت جونیئرز کی حوصلہ افزائی بہت فیاضانہ انداز میں کرتے تھے اور اس ضمن میں کبھی اپنے مقام و مرتبہ کو درمیان میں رکاوٹ یا ہچکچاہٹ کا سبب نہیں بننے دیتے تھے۔ نوجوان شاعر ایم آر شاہد کے ہاں ہر سال ماہ رمضان میں منعقد نعتیہ مشاعرے میں (بطور مہمان خصوصی) شرکت ایک واضح حوالہ ہے۔ میرے بیٹے حسن اعزاز کا مجموعۂ کلام “تو کیا میں آیاد آتا ہوں” شائع ہوا تو بیٹے کی خواہش پر کہ صدارت کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب سے گزارش کی جائے میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں حاضر ہوا اور بیٹے کے شاعری کرنے، کتاب چھپنے اور تقریب وغیرہ وغیرہ کا سب احوال بیان کر کے ان سے صدارت کی خواہش کی ندیم صاحب نے ٹیبل ڈائری میری طرف سرکا دی کہ جو تاریخ چاہو اس پر درج کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ ۲۲ نومبر کو حسن کی سالگرہ کا دن ہے اور اسی برس (یعنی ۲۰۰۰ء) کی بائیس نومبر کو وہ بائیس سال کا ہو جائے گا۔ یہی تاریخ اگر رکھ لی جائے تو مناسب ہوگا۔ منصورہ احمد پاس بیٹھی تھیں۔ جھٹ سے بولیں “بابا آپ کی تو اپنی سالگرہ دو دن بعد ہوگی۔ مہمان آنے والے ہوں گے۔ آپ کیسے ۲۲ تاریخ کو اس تقریب میں جا سکتے ہیں” قاسمی صاحب نے کہا، ہاں ہاں! مجھے علم ہے” اور مجھے ڈائری پر پروگرام درج کرنے کو کہا۔ منصورہ نے پھر بچے کی تقریب ہے کہہ کر منع کرنے کی کوشش کی۔ مگر قاسمی صاحب نے اب کے براہ راست منصورہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ “تمھیں نہیں علم کہ تاریخ مانگ کون رہا ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ آذر صاحب کا بیٹا مجھے اسی طرح عزیز ہے”۔ اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ ۲۲ نومبر ۲۰۰۰ء کو لاہور پریس کلب ہال میں حسن اعزاز کے شعری مجموعہ “تو کیا میں یاد آتا ہوں” کی تقریب رونمائی ہوئی اور قاسمی صاحب کی موجودگی کے سبب اس کا اعتبار و وقار بڑھا۔

بہت برسوں کی بات ہے لاہور جم خانہ کلب نے کل پاکستان محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ مجھے کمپیئرنگ کے فرائض سونپے گئے۔ صدارت کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب کو اسٹیج پر آنے کی درخواست کرتے ہوئے میں نے (تاریخی طور پر پہلی مرتبہ) کہا کہ ہم خوش نصیب لوگ ہیں جو ادب کے عہدِ ندیم میں زندہ ہیں۔ کراچی کے شاعروں کا گروپ ایک جانب اکٹھا ہی بیٹھا تھا۔ وہ لوگ بے ساختہ تڑپ اٹھے اور باآوازِ بلند کہا گیا ”ارے بھئی اس بندے کو روکو یہ کیا کہہ رہا ہے“ .... اس کے کچھ عرصہ بعد گاف کلب فیصل آباد کے مشاعرہ کے موقع پر ہال میں بیٹھے قاسمی صاحب نے آواز دے کر مجھے بلایا اور دیگر مہمانوں کو وہ سارا واقعہ ہنس ہنس کے سناتے رہے۔ میری خوش قسمتی ہے ”عہدِ ندیم“ والا میرا فقرہ چل نکلا اب تو لوگ اس کے دعوے دار بن بیٹھے ہیں۔ بعض تو اپنے دیگر ممدوحین کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرنے لگے ہیں۔

ندیم صاحب کی ایک مستقل عادت یہ تھی کہ وہ کسی چھوٹی سے چھوٹی تقریب میں بھی شریک ہوں تو زبانی کلامی دو چار فقرے بول کر ٹرخانے کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا خطاب لکھ کر لے جاتے۔ خواہ چار سطروں پر مشتمل مختصر سا پیراگراف ہوتا مگر وہ لکھ کر لے جاتے تھے۔ اب اس پر غور کیجیے تو کھلے گا کہ وہ ذہنی طور پر مکمل ہم آہنگی کے ساتھ تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ باقاعدہ تیاری کے ساتھ وہاں جاتے تھے اور پوری طرح پروگرام کو شیئر کرتے تھے۔ نہ تقریب کی طوالت کا شکوہ، نہ جلد فارغ کر دیے جانے کا مطالبہ اور نہ تقریب کے ڈسپلن اور معیار کو سوال بناتے۔ بس وہ آجاتے اور پھر تقریب کے ہو جاتے۔۔۔۔

شخصی اور ذاتی تعلقات کا احترام قاسمی صاحب کے کردار کا خاصا تھا۔ انھیں علم تھا کہ لوگ ان کے علمی ادبی مقام کے حوالے سے ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جس مقام و مرتبہ پر سرفراز کیا تھا وہ اپنے مشفقانہ انداز سے گویا اس حوالے سے اظہارِ تشکر کرتے تھے۔ میری بیٹی آمنہ نے مجھے ایک بار کہا کہ آپ تو علمی مجلسوں، مشاعروں اور ذاتی نشستوں میں قاسمی صاحب سے ملتے جلتے رہتے ہیں مگر ہم جو عموماً ایسی محفلوں میں شریک نہیں ہو سکتے ہم ان کی ملاقات کی آرزو کیسے پوری کریں؟ میں نے ایک روز یہ بات من و عن قاسمی صاحب سے کہہ دی۔ سن کر مسکرائے اور بولے ”میں کل شام بیٹی سے ملنے آپ کے گھر آؤں گا“ اور اگلی شام وہ میری بیٹی کے ساتھ میرے گھر میں موجود تھے۔ اس موقع کی کچھ تصاویر بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ میری تقریباً چالیس سالہ نیازمندی کے ان گنت واقعات ایسے ہیں کہ وقت ملا تو جو کچھ اور جتنا بھی سامنے لا سکا۔ فرض ضرور ادا کروں گا کہ شخصی اور ذاتی رویے ہی شاعر و ادیب احمد ندیم قاسمی کی زندگی کی تصویر مکمل کرتے ہیں اور بشری کمزوریوں سے صرفِ نظر اس لیے ضروری ہے کہ ان سے کون مبرا ہے۔

☆☆☆☆

ذوقی مظفر نگری

اکیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت

ماضی کے دھندلکوں میں بکھری ہوئی یادوں کے نقوش تلاش کرنا غیر ممکن تو نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاہم اپنی ضعیف آنکھوں سے اکیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت احمد ندیم قاسمی کی ذاتِ گرامی کے متعلق کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا کے موضع انگہ میں ۱۹۱۶ء میں قاسمی مرحوم کی ولادت ہوئی۔ ان کا ذاتی نام احمد شاہ ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے موصوف کو ادبی ذوق تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز نثری تخلیقات سے ہوا۔ مرحوم نے بڑے بڑے پرتاثیر مفید افسانے تحریر کیے۔ ان میں معاشرے کے رستے ہوئے ناسور کے علاوہ اخلاقیات اور ادبیات کے تابندہ درخشندہ جواہر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نثر لکھتے لکھتے انھوں نے منظومات پر بھی مشقِ سخن فرمائی۔ ان کی غزلوں میں قدیم وجدید کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔ وہ دور جدید کے عصری تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں جدت کے بانکپن سے آراستہ ہیں۔ جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے۔ کرشن چندر، منشی پریم چند کے افسانوں سے کسی حالت میں کم نہیں۔ احمد ندیم قاسمی انسانیت نواز اور غریب پرور شخصیت کے مالک تھے۔

مرحوم نے حتی الامکان پریشان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ادبی خدمات کے علاوہ ذاتی تعاون سے بھی کبھی گریز نہیں کیا۔ احمد ندیم قاسمی کو ان کی ادبی خدمات اور انسانیت نوازی کے پیشِ نظر حکومت کے اربابِ اختیار نے حسن کارکردگی کا اعلیٰ ترین اعزاز عطا فرمایا۔

راقم الحروف آج سے بائیس سال پیشتر ان کے بدترین مخالفین میں تھا لیکن جب ان سے میرا اخلاقی رابطہ ہوا تو مجھ پر ان کے خلوص اور محبت کا دروازہ کھلا، میں نے جب کبھی کوئی کام سپرد کیا وہ انھوں نے نہایت فراخدلانہ طور پر انجام دیا۔ وہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی جائز خدمت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ ان کی اخلاقی بلندی مرحوم کے موجود ادبی فن پاروں میں بھی نمایاں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے بعض ادبی مخالفین نے ذاتی مخالفت برائے مخالفت سے بھی گریز نہیں کیا۔ راقم نہایت سچائی کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنے کسی مخالف کو بھی انتقاماً برا نہیں کہا۔ وہ ہمیشہ ہر ادیب

اور شاعری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ اخلاق بندی انھیں اکیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ آج ناچیز مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہے۔ دنیا درد و غم تو دیتی ہے، غم گساری نہیں کرتی ہے، یہ مصرعہ کہنے پر مجبور ہوں:

یہ دنیا غم تو دیتی ہے شریکِ غم نہیں ہوتی

اس کے برعکس احمد ندیم قاسمی مرحوم غم زدہ اور پریشان حال ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ہمیشہ غم گساری فرماتے رہے۔ ان کے بعد مرحوم کے ورثاء میں ایک بیٹا نعمان قاسمی اور دو بیٹیاں ناہید قاسمی اور منصورہ احمد ان کی یاد میں دعائے نجات کے ساتھ اپنی مغموم آنکھوں سے درد و غم سے لبریز آنسو بہانے میں مصروف ہیں۔

مرحوم قاسمی کے انتقال پر ملال کے بعد ادب میں جو خلا پیدا ہوا، اس کو پر کرنے والی کوئی متبادل شخصیت نظر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆☆

سلمیٰ اعوان

احمد ندیم قاسمی

یقین ہی نہیں آتا کہ وہ نرم خو، بے حد مہربان شفقت و محبت کی گرمی سے لب لب بھرا شخص اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ بظاہر ایک فرد مگر اپنی ذات میں ایک انجمن۔

بلا سے دنوں نہ ملو، ہفتوں صورت نہ دکھاؤ، مہینوں پر دورانیہ چلا جائے مگر کسی کے ہونے کا بھرپور احساس رہتا تھا۔ کوئی بیٹھا ہے اور لاہور بھرا بھرا ہے۔ اب سوچو تو ٹپ سے آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں اور شہر کے خالی ہونے کا احساس ابھرتا ہے۔

یادوں کا ایک ذخیرہ ہے۔ جس کی ہر ہر ڈھیری محبت اور پیار کے شیر سے لتھڑی پڑی ہے۔ جس کو اٹھاتی ہوں اس پر اس خلوص اور محبت کی روشنی میں جگمگاتا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ چہرہ جس کی آنکھوں نے ہمیشہ مہربان نظروں سے دیکھا، جس کے ہونٹوں نے پیار بھرے بولوں سے استقبال کیا۔

میرا تو کوئی ادبی پس منظر نہ تھا۔ ادیب اور خصوصاً بڑے ادیب ہمیشہ آسمان پر بکھرے چاند تاروں کی مانند ہی نظر آئے۔ بڑی اونچی اور ماورائی شے۔ جن سے قربت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

چھوٹا موٹا الٹا سیدھا لکھتی تھی۔ الٹے سیدھے چند ناول بھی لکھ لیے اور چھپوا بھی لیے پر انھیں ان ہستیوں کو پیش کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکی جو بڑی محبوب اور آئیڈیل تھیں۔

اسی کی دہائی کے وسط میں مشرقی پاکستان پر لکھی گئی کتاب 'تنہا' ہاتھ میں پکڑے مجلس ترقی اردو ادب کے کمرے میں گھبرائی صورت کے ساتھ کھڑی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے بھاری دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ تھوڑے شگاف میں سے ایک رومانی اور طلسماتی ماحول دکھائی دیا۔ میں اندر داخل ہوگئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ایک بڑی سی میز پر رکھے لیمپ کی روشنی میں خاکستری بالوں والا تصویری چہرہ مجسم صورت میں کاغذات کے پلندے پر جھکا مکمل انہماک سے اس کے مطالعے میں غرق میرے سامنے تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا ایک عہد کمرے میں سانس لے رہا ہے۔ سامنے دروازے کی بند جالیوں سے سبزہ کی طراوت اور تازگی آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر ابھرتی تھی۔ اور چھت کی اونچائی کو دیکھنے کے لیے چہرہ اوپر کرنا پڑتا تھا۔

پھر دو آنکھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ فوراً آگے بڑھ کر میں نے کتاب پیش کی۔ کتاب پر نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں میرے قیام کے بارے میں پوچھا۔

اس موضوع پر جتنا لکھنا چاہیے تھا نہیں لکھا گیا۔ انھوں نے کتاب کی پھولا پھرولی کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران ملحقہ کمرے سے ایک لڑکی اندر آئی ’’بیٹی‘‘ کہتے ہوئے انھوں نے میرا اور میری کتاب کا تعارف کروا دیا۔ یہ منصورہ احمد تھیں۔

> ’’میں گاؤں جا رہا ہوں۔ کتاب ساتھ لے کر جاؤں گا۔ واپسی پر اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔‘‘

رائے کا جس انداز میں اظہار ہوا وہ میرے لیے باعث تقویت تو خیر تھا پر باعث حیرت زیادہ تھا۔ اتنا بڑی ادیب کتاب کو جس طرح سراہ رہا تھا کیا یہ میری دلجوئی تھی یا مجھے حوصلہ دینے کی کاوش تھی۔ پر ان کا یہ کہنا کہ تم نے بہت مہارت سے ایک گھمبیر اور مشکل موضوع سے انصاف کیا ہے میرے لیے فی الواقع بہت قیمتی تھا۔

کتاب کی رونمائی کا اہتمام اردو ڈائجسٹ کی طرف سے تھا کہ ناشر وہ تھے۔ میری خواہش پر صدارت کے لیے قاسمی صاحب منتخب ہوئے۔ بقیہ ناموں کا انتخاب ان کا تھا۔

اس زمانے میں بڑی بونگی تھی۔ ایسی ادیب تقریب کے مؤثر انعقاد کا بھلا مجھے کیا تجربہ تھا۔ نہ کبھی بڑے ادیبوں کی صحبت میں بیٹھی اور نہ ہی طور طریقوں سے کچھ آشنائی حاصل تھی۔ معلوم نہیں کہاں غلطی ہوئی۔ تقریب کے دن سارا ہال قاسمی صاحب کا منتظر اور وہ موجود نہیں۔ میں رونکھی ہونقوں جیسی صورت لیے بھاگم بھاگ مجلس ترقی اردو ادب پہنچی۔ انھوں نے وہاں کچھ ایسی بات کی جس نے میرے پاؤں تلے سے تو زمین نکال دی۔ اب آنکھوں میں آنسو چہرے پر شرمندگی و ندامت کے رنگ لیے کیسے ہال پہنچی، خدا ہی جانتا ہے۔ بہر حال قریشی برادران نے صورت حال کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ تقریب تو اختتام پذیر ہوگئی پر جیسے میرے دل میں گھاؤ پڑ گئے۔ زخم ہو گئے۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

کوئی بے کلی تھی، کوئی اضطراب سا اضطراب تھا اور پھر اسی اضطراب نے مجھ سے ایک خط لکھوایا مجھے اب یاد نہیں میں نے کیا کیا لکھا پر اتنا یاد ہے کہ اپنے غصے کا اظہار بھی میں نے کیا۔ وہ آگ جو میرے اندر جل رہی تھی شاید اس کی کہیں زیادہ تپش خط میں تھی۔ بس تو دو دن بعد ہی کی بات ہے جھٹپٹے کا وقت تھا۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اور میں بازار سے لالٹین جیسی بے حد ضروری چیز خرید کر ابھی گھر کے گیٹ پر پہنچی تھی۔ جب میرے پاس ایک رکشا آ کر رکا۔ اس میں دونوں باپ بیٹی اترے جنھیں دیکھ کر میں گنگ سی رہ گئی۔ میرے گھر کی دہلیز پر ادب کا ایک عہد کھڑا تھا۔ میں تو ساری پگھل گئی تھی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہنے لگیں۔

پھر آہستہ آہستہ محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔ تعلق میں پیار آیا۔ جب جاتی تو مسکراتے ہوئے کھڑے ہوتے، محبت سے گلے لگاتے۔

وہ ذات پات برادری ان سب چیزوں سے بہت بالا تھے۔ وہ انسانیت کے پرستار تھے۔ انسانوں سے محبت ان کا ایمان تھا۔ بایں ہمہ ایک دو بار انھوں نے مجھے خالصتاً اعوان ہونے کے ناطے یہ خوشگوار احساس دیا کہ میں ان کے قبیلے سے ہوں۔

کبھی کبھی میں کھیر لے کر جاتی تو خوش ہو کر کھاتے اور سراہتے۔ بھئی بہت مزے کی ہے۔ منصورہ ساتھ میں لقمہ دیتی۔

"سلمٰی نے اس میں اپنی محبت ڈالی ہے"۔

منصورہ کی یہ بات سچ تھی۔ جب میں کھیر پکانے لگتی تو میں اس کی ایک ایک چیز کے بارے میں محتاط ہوتی۔ کتنے چاول ڈالنے ہیں، چینی کیسی رکھنی ہے۔

کس کس بات کو یاد کروں۔

مجلس ترقی اردو ادب کا کمرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

علم و ادب کے شیداؤں کا ایک مجمع ہوتا۔ بحث مباحثہ کا سیشن چل رہا ہے۔ لطیفے ہو رہے ہیں۔ نفیس برتنوں میں خوشبو اڑاتا قہوہ پیالیوں میں انڈیلا جا رہا ہے۔ چار آ رہے ہیں دو جا رہے ہیں۔ بیرون ملک کالز کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری ہے۔ جنھیں زیادہ تر منصورہ سنبھالے ہوئے ہے۔

مجلس ترقی اردو ادب کا وہی کمرہ ویران حالت میں آنکھوں کے سامنے ہے۔

وہ کرسی خالی ہے جہاں دروازے کھلنے کے ساتھ ہی دو مہربان آنکھیں دکھتی تھیں۔ وہ آنکھیں ہونٹوں پر پیدا ہونے والی مسکراہٹ سب کہیں کھو گئی ہے۔

وہ کمرہ بھی کتنا سنسان ہو گا جسے اس کے کمزور سے وجود نے بھرا بھرا رکھا تھا۔ ایک فیض جاری تھا۔ دینے کا، سیکھنے اور سکھانے کا، علم بانٹنے کا۔

قاسمی صاحب آپکو دیکھ کر اللہ میاں نے ضرور کہا ہو گا۔

آئیے آئیے قاسمی صاحب ادھر آئیے۔ اس مسند پر بیٹھے۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیجیے تا کہ دائیں بائیں نظاروں میں سہولت رہے۔ آپ نے جس مان اور جس زور سے جنت کو طلب کیا تھا مجھے آپ کا وہ انداز بہت پسند آیا تھا۔

☆☆☆☆

طاہرہ اقبال

تاثرات

احمد ندیم قاسمی نے عمر بھر میں جو کچھ لکھا اس میں سے کہیں بڑھ کر وقت ریاضت اور اک ذہنی و ادبی افق کی کشادگی ان کے لکھے پر لکھنے کے لیے درکار ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے فن پر کچھ کہنا بھی اک عمر کی ریاضت مانگتا ہے۔ ان کا ہر جملہ ہر سطر ایک مضمون کی گنجائش چاہتا ہے۔ ان کی لکھی ہر کہانی کے اندر اک اَن لکھی کتاب موجود ہے اور ہر کتاب کے اندر وہ جہانِ حیرت فن جس کی سیاحی کے لیے نقد عمر کم پڑتی دکھائی دیتی ہے۔

جب کبھی بچپنے میں یہ جملے پڑھے تو لگا شاید کلمہ کن کی تفسیر ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ ”اس قدر چونکا دینے والا رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے ذرے جُھت کر انگلیوں میں چلے جائیں گے۔“ (آتشِ گل)

یہ لفظ نہ تھے، سونے کے تار تھے، جن کی بھا آنکھوں کو چندھیا گئی تھی اور ذہن کو کندن سا دہکا گئی۔ قاسمی تحریر اسلوب کی کوئی الہامی طرز ہے کہ منظر کشی کی کوئی الوہی تصویر، کہ ہر کہانی فن افسانہ کا معیار ٹھہری ہے اور قاری اساتذہ افسانہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرتا ہے۔ ”سناٹا“ کپاس کا پھول، گھر سے گھر تک، ہر کتاب دبستان افسانہ کی کلید کھولتی ہے، جن سے فیض یاب ہو کر بہت سوں نے قلم سنبھالنا سیکھا۔ وہ اپنی بات کسی پیرائیہ اظہار کی انتہائی سہولت واقعاتی اختصار اور فن کی انتہائی کار سادگی سے کہہ جاتے۔ پڑھنے والا دانتوں میں انگلی دابے رہ جاتا ہے۔ ہر منظر کی وہ جزئیات جو اس کی رگِ جاں ہیں ہر کیفیت کا وہ بیان جو اس کا اسمِ اعظم ہے، ہر تصویر کے وہ نقوش جو اس کی دھڑکن ہیں۔ ہر واقعے کے وہ مندرجات جو اس کے جزوِ لاینفک ہیں اور ان سب کا وہ بیان کہ اس کے علاوہ کوئی اور طرز بیان فن کا طلسم گم کر بیٹھے۔ تب قاری جامد و مبہوت ہو کر سوچتا ہے کہ شاید پیشہ ازپیغمبری اسی کو کہتے ہیں۔

میں خود کو اس پلیٹ فارم پر نہیں دیکھتی کہ قاسمی صاحب کے فن کے سمندر کی موجوں کے سامنے سینہ سپر ہو سکوں۔ ہاں میرا شدت سے جی چاہ رہا ہے کہ اس صفحے پر سیاہ حرف بنانے کی بجائے آنسوؤں کی وہ روشنائی بکھیروں جو دس جولائی سے پلکوں پر لرزاں ہے۔ میں اپنے بیٹے صہیب کو دیکھ کر کہتی ہوں (جو دس جولائی کو

دس سال کا ہوا ہے) تو نے کیسی تاریخ منتخب کی تھی پیدا ہونے کے لیے، تمہاری ہر سالگرہ کے موقع پر مجھے ادبی دنیا کا یہ کربناک واقعہ یاد آجایا کرے گا، جس طرح بلند عمارت کی نچلی سیڑھیوں پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ بسیط فضاؤں میں چلتی ہواؤں کو چھونا بھلا لگتا ہے۔ آسمانوں کی رفعتوں سے گرتے شبنم اور بارش کے قطروں کا گھونٹ بھر لینے کو جی چاہتا ہے کہ یہ سب کرنے سے ان بلندیوں سے ناطہ جوڑنے کا تفاخر حاصل ہوتا ہے، اسی طرح مجھے بس قاسمی صاحب کو پڑھنا اچھا لگتا ہے ان پر کچھ کہنا شاید میری بساط سے باہر ہے البتہ وہ چند خطوط جو انھوں نے میرے نام لکھے، بالخصوص ۲۲ جون کا لکھا ہوا درج ذیل خط میرے لیے سرمایہ حیات ہے۔

محترمہ و مکرمہ طاہرہ صاحبہ۔ تسلیم

افسانہ مل گیا۔ انتہا درجے کا لرزہ خیز افسانہ ہے۔ میں نے اسے کمپوز کرا لیا ہے مگر پروف پڑھتے ہوئے بھی مجھ پر عجیب خوف طاری رہا۔ نجانے آپ نے ایک مظلوم ماں کے جذبات کو کیسے گرفت میں رکھا۔

میری صحت بس ڈانواں ڈول ہی ہے گزشتہ ایک ہفتے سے بہتر ہے، اسی لیے تو یہ چند سطور لکھنے کی قابل ہوا ہوں۔

منصورہ بیٹی اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ اس کی امی کی صحت بہت گر گئی ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کئی روز سے اپنے بھائی کے ہاں مقیم ہے۔

اقبال صاحب کی خدمت میں سلام مسنون!

مخلص

احمد ندیم قاسمی

فنون کے لیے بھیجی گئی میری کہانیوں کے جواب میں وہ ہمیشہ یہی لکھتے، کہانی کمپوز کروالی ہے، کبھی یہ نہ لکھا کہانی فنون کے لیے منتخب کر لی ہے۔ اس ایک مفہوم کو کہنے کے لیے وہ جو پیرایہ اختیار کرتے وہ ان کی عالی ظرفی اور بلند خلقی کا ثبوت ہے کہ وہ اس بلندی سے نیچے والے پر جھک کر نظر نہ ڈالتے کہ کہیں اسے کمتری کا احساس نہ ہو۔

مجھے اس خط کو پڑھ کر حیرت اس بات پر ہوئی کہ ۲۲ جون یعنی وفات سے محض اٹھارہ دن پہلے اس بیماری اور کمزوری کے عالم میں ان ناہموار سانسوں کے ساتھ بذات خود وہ پروف پڑھنے کا کام کر رہے تھے۔ آج نئے چھپنے والے رسالے میں اغلاط کی بھرمار ہوتی ہے کیوں کہ نئے نئے ایڈیٹروں کے پاس پروف پڑھنے کا وقت

نہیں ہوا کرتا ہے لیکن فرض کی لگن، فن کی محبت اور وابستگی اسی ریاضت، اسی استقامت کو کہتے ہیں، جس کا نام احمد ندیم قاسمی ہے۔

میں جب اپنے چھوٹے سے گاؤں میں دنیا سے کٹ کر رہتی تھی تو ان دنوں حسن اتفاق سے میرے ہاتھ ''کپاس کا پھول'' کہیں سے آ گئی۔ اس زمانے میں میرے پاس ادب کا یہ واحد رابطہ اور سرمایہ تھا جس نے مجھے لکھنا سکھایا۔ اس کی خواندگی میں روزانہ کیا کرتی۔ یوں کہ اس کا ہر حرف مجھے منتر کی طرح ازبر ہو گیا تھا۔ اس کے تخلیق کار سے تعارف تو بہت بعد میں ملا جب انھوں نے میری پہلی کتاب ''سنگ بستہ'' پر تبصرہ لکھا اور یوں کہ ادبی دنیا میں میرا اعتبار بن گیا۔ قاسمی صاحب! اعتبار تھے، نئے لکھنے والوں کا، انسانیت کا، ادب کا، فن کا جو پائے علم و فن اس شیش محل میں صدیوں محو سفر رہیں گے تو کہیں اس کے روزن وا کر پائیں گے۔

☆☆☆☆

وجاہت مسعود

ابرِ بہار چل دیا۔۔۔۔

۱۹۵۳ء کا موسم گرما تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے اسیر فیض احمد فیض کی کتاب دستِ صبا چھپ کر آئی، جس کے اس موسم میں لاہور کے زندہ دلوں نے آگے بڑھ کر دستِ صبا تھام لیا۔ لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی، ان گنت ادیبوں اور سیاسی کارکنوں سے سجی اس محفل کا حاصل احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر رہا:

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

احمد ندیم قاسمی کی طویل تخلیقی زندگی اسی بے ساختہ پن کے بیش و کم سے عبارت تھی۔

نوے برس پہلے ہندوستان میں پنجاب کو ایک دور افتادہ، نیم مہذب خطہ سمجھا جاتا تھا۔ جہاں شمال وسطی ہند سے محمد حسین آزاد اور تاجور نجیب آبادی یوں وارد ہوئے تھے جیسے الطاف گوہر کے لفظوں میں لندن پہ مرغابیاں اور مولوی اترتے ہیں۔ جہاں سر فضل حسین مسلمانوں کی تعلیم کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ وادی سون سکیسر کے موضع انگہ کا کیا ذکر، خوشاب کا قصبہ بھی کہیں سرگودھا کے مضافات میں گنا جاتا تھا۔

اونچے اونچے پہاڑی ٹیلوں کی زمین میں فوجی بھرتی کا خام مال پیدا ہوتا تھا یا بارانی قطعوں میں ہل جوتنے والے گھبرو کسان۔ سیاسی اقتدار کا منبع گھوڑی پال دیہہ خداؤں کے پاس تھا اور علم کا سرچشمہ درگاہوں کے سجادہ نشین تھے۔ موضع انگہ کے ایک ایسے مذہبی خانوادے میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پیرزادہ احمد شاہ قاسمی پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کی لام بندی ہوا میں سسک رہی تھی۔ چار برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

پہاڑی راستے پتھریلے ہوتے ہیں، سایہ نہ ہو تو اور کٹھن ہو جاتے ہیں۔

پنجاب کے دوسرے سرے پر ریاست بہاولپور کے صادق ایجرٹن کالج میں مشائخ کے صاحبزادوں کے لیے ایک نشست موجود تھی۔ پیرزادہ احمد شاہ قاسمی نے ۱۹۳۵ء میں یہاں سے گریجویشن کی۔ یہ کساد بازاری کے برس تھے۔ گورنمنٹ کالج سے ایم اے کرنے والا ن م راشد ۴۲ روپے پر کلرکی کر رہا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی لاہور کے ڈاکخانے میں مہریں لگا رہا تھا۔ پیرزادہ قاسمی کو محکمہ آبکاری میں ۲۵ روپے کی کلرکی میسر آئی۔ شعر کی دہلیز پر دستک دیتے نازک مزاج احمد ندیم قاسمی کو جعلی شراب کی خانہ ساز بھٹیوں پر چھاپے مارنا پسند نہیں آیا۔

ادھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے نقارے پر چوٹ لگ چکی تھی۔ علی گڑھ سے افتاں و خیزاں رخصت

ہونے والے منٹو کا طوطی بھی دلی میں رُک رُک کے بولنے لگا تھا۔ دونوں میں کچھ خط و کتابت ہوئی اور احمد ندیم قاسمی منٹو کے پاس دلی پہنچ گئے علم اور فنی مہارت میں دونوں کھانڈے کی چوٹ مگر ایک حکیم فرزانہ تو دوسرا در کوچہ بار سوا شدیم۔ ایک اقبال کا عاشق اور دوسرا غالب پر لہلوٹ۔ ایک کا لباسِ مجاز بے شکن اور دوسرے کے بھیتر رُواں رُواں پریشان تھا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کی یہ خط و کتابت مکتبہ نقوش سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ آج بھی اسے پڑھیے تو رنگِ گل اور بوئے گل دونوں کے ہوا ہونے کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے طویل فنی اور تخلیقی سفر میں شاید ہی کسی کا دل دکھایا ہو لیکن عبدالمجید سالک اور منٹو کے لیے تو وہ خصوصیت سے سراپا نیاز رہے۔ ایک نے شاعری اور صحافت میں ان کی انگلی تھامی اور دوسرے نے افسانے کی راہیں دکھائیں۔ مطبوعہ حرف میں احتیاط اور رسم و راہ میں حفظ مراتب احمد ندیم قاسمی نے مولانا صلاح الدین احمد سے سیکھا اور اس کی داد انھیں راشد جیسے طناز اور ساقی فاروقی جیسے بگڑے دل سے بھی ملی۔

قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے اور اس درجے سے شامل ہوئے کہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکرٹری جنرل چنے گئے۔ اقبال پر ایک دو تیز مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کے پبلک سیفٹی ایکٹ سے مونڈے گئے۔ ایوب خانی جبروت میں بھی جیل کی ہوا کھائی۔

قاسمی صاحب نے استعمار دشمنی کا درس مولانا غلام مرشد سے لیا تھا، جو یوں تو بادشاہی مسجد کے خطیب تھے لیکن زرعی اصلاحات کی تائید میں ان کی آواز مولانا غلام رسول مہر سے بھی پہلے بلند ہوئی۔ قومی آزادی کی تحریکیں چالیس برس ہوئے انجام کو پہنچیں۔ قاسمی صاحب نے یورپ دشمنی کا سبق بھلا کے نہیں دیا۔ کہیں کہیں تو یوں لگا کہ انھوں نے اس تلخی میں مقامی چیرہ دستیوں سے بھی نظر پوشی کر لی۔ قومی ریاست سے وفاداری بشرط استواری قاسمی صاحب کی شرط ایمان ٹھہری۔ گو یہ دیکھیے تو یہ کوئی بالذات خامی تو نہیں، خوبی ہی ہے۔ جوانی کی شیفتگی پر غالب آنا اور نئی زمینی حقیقتوں کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے پریم چند سے فیض اٹھایا۔ قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے کھیتوں میں پھولی سرسوں ہی نظر نہیں آتی، مکئی کی روٹی پر دھرے مکھن کی خوشبو بھی آتی ہے۔ تقسیمِ ہند پر قاسمی صاحب کے افسانوں پر انتظار حسین نے اپنا بلیغ تبصرہ کیا جو انہی کا حصہ ہے۔ "قاسمی کے افسانوں میں فضا یہ ہے کہ محلے میں کوئی واردات ہو گئی ہے اور قاسمی صاحب گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں۔ ندیم صاحب نے شہری زندگی پر بھی قلم اٹھایا لیکن ان تحریروں میں حکایتِ دروں کی بجائے اکتساب کی سی کیفیت ہے، جیسے کوئی بارلیش دیندار فلمی دنیا پر تبصرہ لکھے۔"

قاسمی صاحب نے غزل لکھی، غزل وارفتگی کے جس درجے کا تقاضا کرتی ہے وہ قاسمی صاحب کے شخصی خاکے کا حصہ نہیں تھا۔ مگر یہ ہے کہ نقاہت کی پیوست کے علی الرغم احمد ندیم قاسمی نے غزل میں جو پیکر تراشے وہ اردو ادب کی تاریخ میں انہی کے ہو رہے۔ ایک بھلے مانس کا عشق ہے۔ دل میں اٹھتی لہر افق کے پار بھی پہنچتی ہے اور کسی کے لہجے کی تھکن بھی یاد رہتی ہے۔

۶۰ کی دہائی کے ابتدائی دنوں میں احمد ندیم قاسمی نے فنون کا آغاز کیا۔ انہی دنوں ادبی دنیا کے ارتحال کے بعد وزیر آغا نے اوراق شروع کیا۔ اب فنون اور اوراق دونوں نصف صدی کا قصہ ہیں۔ وزیر آغا چھوٹے ہیں نہ قاسمی صاحب گھٹ کے تھے۔ دونوں کے قلم اور زبان سے ایک دوسرے کے لیے کوئی ناشائستہ لفظ سرزد نہیں ہوا۔ مگر رسالے کی صفوں میں پیادے بھی تو آن گھستے ہیں۔ چائے کی پیالی میں اس طوفان سے احمد ندیم قاسمی کے قد میں اضافہ نہیں ہوا۔

قاسمی صاحب نے پچاس کی دہائی میں کہیں ذہنی طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان کی انسان دوستی مسلم رہی اور معروف معنوں میں وہ کبھی رجعت پسند بھی نہیں رہے۔ یوں دیکھیے کہ اگر قاسمی صاحب کو ترقی پسند احباب کی یک رخی خوش نہیں آئی تو انھیں غلام عباس جیسے صاحب ہنر پر زبان دشنام دراز کرنے والے بے تہہ نمونے کیوں کر راس آتے۔ احمد ندیم قاسمی قسطنطنیہ اور اندلس کی فرضی داستانیں نہیں لکھتے تھے۔ عشروں کی ریاضت کا حاصل ایک مقام تعزز تھا۔ سو وہ اس پر رونق افروز ہو گئے۔ جہاں ادب میں یہ گوشہ کبھی بھی بہت روشن نہیں رہا۔ یہاں اگر کچھ چاندنی چھٹکی تو وہ احمد ندیم قاسمی ہی کے دم سے تھی۔ مختار صدیقی، اختر حسین جعفری اور شکیب جلالی جیسے خورشید ستاروں سے قطع نظر یہ ادب کے اہل حرفہ کا ہجوم تھا، اب یہاں روشنی نہیں ہو گی۔

کوئی تیس برس ہوئے، پاکستان میں عرض اظہار کے لیے میسر ادب کی بساط ہی لپٹ گئی۔ احمد ندیم قاسمی کو عمرِ رواں کی آخری ربع صدی میں صحبتِ سخن شناس میسر نہیں رہی بگٹٹ دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی گرد میں بیچ دریا کے کالم بھی چُھپ گئے ان کا افسانہ دھندلا گیا اور غزل کجلا گئی۔

احمد ندیم قاسمی اب وہاں ہیں جہاں مولانا حامد علی خان، صلاح الدین احمد اور عبدالمجید سالک کی شفقتِ بے پایاں ہے۔ منٹو اور فیض جام بدست ہیں۔ چراغ حسن حسرت کی آنکھ میں چمک ہے۔ ایم ڈی تاثیر کے فقرے میں کاٹ ہے۔ احمد ندیم قاسمی اب کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں نہیں ہیں۔ آج ایک اور دنیا میں ان کی رونمائی ہے۔ تھوڑی گرد چھٹ لے ان کا افسانہ بھی چمکے گا۔ ان کی غزل کی رسائی بھی ہو گی۔ ان کا بے ساختہ پن اردو ادب کے قاری پر قرض ہے۔ خلقِ خدا جلد یا بدیر یہ قرض لوٹا دے گی۔

زاہد حسن

احمد ندیم قاسمی: شاعری اور شخصیت

یوں تو سیکڑوں ہی لکھنے والے ہیں جو یہاں کی قومی زبانوں، اردو اور انگریزی میں پاکستان کی سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کی صورت گری کرنے، اس کو یہاں آباد لوگوں کی آنکھوں میں ست رنگے خوابوں سمان بھرنے کا جتن کیے جا رہے ہیں، اور یہ بتانے اور جتلانے میں مصروفِ کار ہیں کہ کون ہیں وہ مُٹھی بھر لوگ جو انسانوں کی زندگیوں میں زہر بھر رہے ہیں جسے وہ ہنس ہنس کے پیے جا رہے ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ لوگوں کو اپنے فن، فکر اور شخصی انفرادیت کے سبب اختصاص حاصل ہے کہ ان کی آواز دوسری آوازوں سے بلند ہوتی ہے اور ان کا لہجہ دوسرے لہجوں سے یکسر منفرد ہوتا ہے۔ سو ان آوازوں اور لہجوں میں سے بلند اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ۔۔۔ جنھوں نے لاتعداد کہانیاں لکھیں، باکمال شاعری کی، مضامین لکھے اور بے شمار ادبی، علمی اور تہذیبی رسائل و جرائد کی ادارت کی۔ نصف صدی سے اوپر تک کی متحرک اور فعال ادبی زندگی میں کم و بیش دو نسلوں کی ادبی تربیت کی۔ پاکستان میں روشن خیالی، علم و فن اور تہذیب و تمدن کے فروغ کے لیے کام کیا۔ جس کے اثرات معاصر ادبی اور تہذیبی فنون پر مرتب ہوئے۔

پاکستان میں 2016ء کو احمد ندیم قاسمی کے لیے مختص سال کے طور پر منائے جانے کا اعلان کیا گیا ہے اور محض پاکستان ہی کی سطح پر ہی موقوف نہیں بل کہ جہاں جہاں بھی اردو زبان بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے اور جس جس خطے میں ''مُحبانِ ندیم'' موجود ہیں، وہ پاکستان کے اس نامور شاعر، صاحبِ طرز افسانہ نگار، نقاد، مدیر اور دانش ور کی یاد میں محفلیں برپا کریں گے۔ اُن کے علمی و ادبی کام کی ازسرِ نو تشریحات کریں گے اور قاسمی صاحب نے محبت، امن اور بھائی چارے اور رواداری کا جو درس اپنے افکار میں دیا ہے اس کو پھیلانے کی سعی کریں گے کیوں کہ موجودہ عہد میں قاسمی صاحب کے فلسفۂ امن کو دنیا بھر میں جنگوں اور دہشت گردی کے شکار ہونے والوں اور شکار کرنے والوں، دونوں تک یہ پیغام پہنچانے کی ازحد ضرورت ہے کہ قاسمی صاحب نے ظلم و جبر اور اندھیرے اور تاریکی کی دبیز چادر سے ہی نئے سورج کے طلوع ہونے کی نوید دی تھی:

رات ایسی بھی جابر نہیں ہے

وہ آئی ہے
لیکن تمھارے لیے
کچھ نہ کچھ ساتھ لائی ہے
اس کے سیہ پیرہن پر نہ جاؤ
کہ دامانِ ظلمت میں اس کے
ستارے بھی ہیں
صبحِ نو کے اشارے بھی ہیں (طلوع)

اردو نظم و غزل اور افسانے میں نئے تجربات اور نئے خیالات لانے اور ادب میں زندگی کے ترقی پسندانہ نظریات کو فروغ دینے والے احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک انٹرویو میں، ادب میں داخل ہونے سے متعلق واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۔۔۔۔ ”میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ مولانا محمد علی جوہر میرے آئیڈیل تھے اور میں نے سنا بھی تھا اور پڑھا بھی تھا کہ بڑے لوگوں کے مرنے پر نوحے اور مرثیے لکھے جاتے ہیں، سو میں نے بھی مولانا کا مرثیہ لکھا اور جب میرے سرپرست چچا نے یہ مرثیہ پڑھا تو اسے نِک سُک سے درست پا کر بے حد خوش ہوئے۔ اس مرثیے کو سید حبیب نے اپنے روزنامہ ”سیاست“ میں پورے صفحہ اول پر درج کیا اور یوں پندرہ (15) برس کی عمر میں میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔“ یوں قاسمی صاحب 10 جولائی 2004ء تک 90 برس کی عمر میں وفات پانے تک ادب سے گہرے طور پر وابستہ رہے۔ ستر برس پر محیط ان کا ادبی سفر اردو زبان اور پاکستان کے تہذیبی، ثقافتی اور ادبی منظرنامے پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی مسلسل روشنی کی مثال رکھتا ہے۔ جس دوران انھوں نے ادبی دنیا، سویرا، نقوش اور فنون جیسے اعلیٰ پائے کے ادبی مجلوں کو ترتیب دیا۔ ”مجلس ترقی ادب“ میں رہ کر سیکڑوں کتب کی ادارت کی۔ ساتھ ہی ساتھ کئی دیگر علمی و ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ روزنامہ ”امروز“ کے زمانۂ ادارت میں ادبی صفحات کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قاسمی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔

قاسمی صاحب کی ذات کی تکمیل اور افکار کی تشکیل میں کئی ایک رویّوں اور رُجحانات نے اہم کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر ذاتی محفلوں میں وہ بارہا اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اُن کے ترقی پسندانہ نظریات اور انسان دوست رویئے کے پیچھے اُن کے گھریلو ماحول اور تہذیبی روایات کو اہم عمل دخل تھا۔ مثال کے طور پر اُن کا سادات گھرانہ اپنے علاقے میں احترام کے گہرے رشتے میں بندھا تھا اور پشتوں سے پیری، مُریدی کے سلسلے سے جُڑا تھا۔ اس سلسلے کو انھوں نے اختیار کرنے کے بجائے زندگی کی تبدیل ہوتی ہوئی

حقیقتوں کو نہ صرف یہ کہ خود قبول کیا بل کہ دیگر کو بھی ان حقائق کو قبول کرنے پر مائل کیا۔ ”فنون“ کے دفتر میں بیٹھے ہوئے وہ بارہا اس بات کا اظہار کرتے کہ ابھی تک ہمارے خاندان کے کچھ لوگ اس سلسلے کو آگے بڑھائے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس کے برخلاف وہ انسان کی عظمت، اس کی سربلندی کے اس درجہ قائل تھے کہ انھوں نے اپنے اس نعرے کو بارہا دُہرایا: ”انسان عظیم ہے خدایا!“

قاسمی صاحب نے کچھ عرصہ تک محکمۂ آب کاری میں بھی کام کیا لیکن جلد ہی اُسے خلافِ طبع جانتے ہوئے چھوڑ دیا، لاہور آئے تو یہاں علمی و ادبی رسائل و جرائد کے ساتھ ایسا ناطہ قائم کیا کہ امتیاز علی تاج کے اشاعتی ادارے سے ”مجلس ترقی ادب“ تک مختلف پڑاؤ طے کرتے ہوئے اہم ادبی جرائد کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے جو بالآخر اُن کے اپنے جریدے ”فنون“ کی ادارت پر آن منتج ہوئے۔ اس بیچ انھوں نے روزنامہ ”امروز“ اور دیگر اخبارات میں بھی اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ وہ ریڈیو سے پروگرام کرتے رہے۔ انھوں نے افسانے لکھے، شاعری کی، علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین لکھے اور کئی ایک نسلوں کی تربیت کی۔ حرف اور لفظ کی حُرمت سے آگاہ تھے۔ سو حرفوں اور لفظوں نے اُن کے نام، کام اور اُن کی ذات کو لازوال حُرمت عطا کی۔

ان کی ذات کی یہ سچائیاں ہمیں ان کی کہانیوں اور شاعری میں ہی نہیں بل کہ ان کی فکر اور عمل میں بھی جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔ اور وہ جا بجا ان سچائیوں کو زندگی کا جزو لازم بتاتے ہیں اور برملا اعتراف کرتے ہیں کہ میں اخلاقی اور روحانی اقدار کا منکر نہیں ہوں، میں داڑھی مونچھیں منڈوا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حُرمتی نہیں سمجھتا لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف برسرِ بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں۔ اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے اور انسانی سرخوشی کا درست تعین ہی وہی فن کار کر سکتا ہے جس کا وجود سراپا محبت ہو، کہ محبت انسان کو جرأت اور ہمت عطا کرتی ہے۔ اسی انسانی محبت کی بقا کے مسئلے پر ہی سچ کہنے اور سچ لکھنے کی پاداش میں انھیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ اس کے باوجود انھوں نے انسان اور انسانیت کی بقا کے حوالے سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انسانی عظمت کا موضوع ان کی شاعری کا بنیادی موضوع رہا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں، اپنے افسانوں میں، اپنی تنقید میں اور صحافت میں اس موضوع کو حرزِ جاں بنائے رکھا اور یہی کہا:

مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں بھی شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

انسان کا وجود اور اس کے عدم وجود میں داخل ہو جانے کا فلسفہ بھی ان کی شاعری کا جز ولاینفک نظر آتا ہے۔

میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح
ابھی وجود ہے میرا فصیلِ جان میں اسیر
بکھر تو جاؤں گا لیکن اُجڑ نہ جاؤں گا میں
حیات کھو کے بھری کائنات پاؤں گا میں

اور یہ کہ:

مار ڈالے گا اسے جرم کا احساس ندیمؔ
قتل کر کے جسے مقتول پہ سبقت نہ ملی

بقا اسی کو تو کہتے ہیں جب کوئی انسان
برائے عظمتِ انسانیت فنا ہو جائے

یہ اور اس طرح کے دیگر سیکڑوں اشعار انسان کی عظمت کی دلیل بن کر سامنے آتے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ ندیم صاحب کی غزلوں اور نظموں میں محض انسانی عظمت کے گیت ہی گائے گئے ہوں بل کہ یوں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ ہے نہ کائنات کا کوئی چھپا کونا، جس پر ہمیں اُن کی نگاہ پڑتی نہ دکھائی دیتی ہو۔ بل کہ ان کی ایک مختصری نظم ”مہذب“ میں تو دورِ جدید کی تہذیبی اساس اور معیار پر گہرا طنز ملتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے:

مجھے کل مرا ایک ساتھی ملا
جس نے یہ راز کھولا
کہ ”اب جذبہ و شوق کی وحشتوں کے زمانے گئے!“
پھر وہ آہستہ آہستہ، چاروں طرف دیکھتا
مجھ سے کہنے لگا:
اب بساطِ محبت لپیٹو
جہاں سے بھی مل جائے دولت، سمیٹو
غرض کچھ تو تہذیب سیکھو!

وطن اور اہلِ وطن سے اُن کی محبت اُن کی شاعری، اُن کے افکار سے واضح ہے محولہ بالا نظم ’مہذب‘ میں

بھی دراصل انھوں نے ''نام نہاد محبانِ وطن'' کا گریبان چاک کیا ہے جو اندر ہی اندر سے تو وطن کی بنیادوں کو گھن کی طرح چاٹتے چلے جاتے ہیں اور اوپر اوپر سے وطن سے محبت کا خالی راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ یوں تو قاسمی صاحب کے اشعار میں جا بجا ہمیں وطن سے محبت کی مثالیں ملتی ہیں لیکن اُن کی ایک نظم کا تو کوئی نعم البدل ہی نہیں ملتا۔

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھِلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حُسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

نظم کے یوں تو سبھی اشعار اپنے اندر شعری خوش سلیقگی کے ساتھ، فکری ہم آہنگی اور دردمندی کا گہرا رنگ لیے ہیں تاہم آخری شعر میں اہلِ وطن کی زندگیوں سے وابستگی اور دردمندی کا لہجہ تو حقیقی سچائی کی مجسم تصویر نظر آتا ہے۔ کس خوب صورت طریقے سے کہہ رہے ہیں:

خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جُرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

یہ وہ قاسمی صاحب ہیں جنھوں نے اپنا تخلص ''ندیم'' اپنایا۔ اس تخلص کی اپنائیت انسان کے بارے میں اُن کے رویے سے لفظ لفظ اظہار پاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اک محبت کے عوض ارض و سما دے دوں گا۔''

ان کی ذاتی زندگی پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ مسلسل جدوجہد اور ان تھک محنت کے مرہونِ نظر آتی ہے۔ اس دوران قدم قدم ان کا واسطہ اپنے جیسے عام ضروریات زندگی کے لیے تجل ہوتے انسانوں سے پڑا۔ انھیں اُن کی محرومیوں، اداسیوں اور دکھوں کا احساس گہرے طور پر ہوا اور انھیں زندگی کے ہر موڑ پر جن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سب معاملات نے اُن کے افسانوں اور شاعری میں موضوعاتی اور فکری ہر سطح پر جگہ پائی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے سفرِ زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میں 20 نومبر 1916ء کو پنجاب کے ضلع خوشاب کے ایک گاؤں ''انگہ'' میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد کیمبل پور، شیخو پورہ اور بہاول پور میں زیرِ تعلیم رہا۔ 1935ء میں گریجویشن کی۔ ریفارم کمشنر کے دفتر میں محرری اور دارالاشاعت پنجاب میں مترجم کے بعد 1939ء میں محکمہ آب کاری (اب محکمہ ایکسائز) میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ مگر دو سال بعد مستعفی ہو کر لاہور میں ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت سنبھالی۔ اس دوران میں ''ادبِ لطیف'' کی بھی ادارت کی۔ 1945ء میں علیل ہو کر گاؤں چلا گیا۔ صحت یاب ہو کر 1946ء میں آل انڈیا ریڈیو، پشاور میں سکرپٹ رائیٹر کا کام کیا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو پشاور ہی میں رسالہ ''سویرا'' کے ابتدائی تین شمارے مرتب کیے۔ 1948ء میں یہ ملازمت ترک کر کے لاہور آ گیا اور تب سے یہیں ہوں۔ اسی سال یعنی جولائی 1948ء میں میری شادی ہوئی۔ میری بیوی رابعہ میرے خاندان ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرا ایک بیٹا نعمان ہے۔ دو بیٹیاں (ناہید، نشاط) ہیں۔ میں منصورہ احمد کو بھی اپنی سگی بیٹیوں میں شمار کرتا ہوں۔۔۔۔ لاہور میں رسالہ ''نقوش'' جاری کیا مگر 1949ء میں اس سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اس دوران میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا اور 1951ء میں نظر بند کر دیا گیا۔ رہائی کے ڈیڑھ برس بعد روزنامہ ''امروز'' کا مدیر مقرر رہا۔ 1958ء میں پھر نظر بند کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد ادارت سنبھالی مگر ایوب خاں نے مارشل لا کے تحت اخبار پر قبضہ کر لیا تو میں اس کی ادارت سے مستعفی ہو گیا۔ 1961ء

> میں ایک اشاعتی ادارہ ''کتاب نما'' قائم کیا مگر کاروباری ذہنیت سے محروم ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ چل نہ سکا اور 1963ء میں رسالہ ''فنون'' جاری کیا۔ مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں 1963ء میں ''فنون'' جاری نہ کرتا تو وہ لوگ جو آج میرے خلاف دریدہ دہنی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور جن کا آغاز میرے ہی ہاتھوں ہوا تھا، مجھ پر یوں ٹوٹ ٹوٹ کر نہ برستے۔ کاش انھیں بھی ''فنون'' کا سا معیاری رسالہ نکالنے کی توفیق ہوتی۔''

اگرچہ اپنی ایک گفت گو کے دوران میں انھوں نے اس امر کا اعتراف بھی کیا کہ ''دنیا کو خوابوں کے مطابق ڈھالنے میں ناکام رہا۔'' ان کے اس اعتراف کو دراصل ان کی ناکامی نہیں قرار دیا جا سکتا بل کہ یہ ناکامی تو اس نظام کی ہے جس نے انسانی خواہشوں اور آرزوؤں کو سبوتاژ کرنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ وہ لوگ جو انسانی بھلائی، فلاح، بھائی چارے اور رواداری کے خواب دیکھتے ہیں۔ طاغوتی قوتیں قدم قدم پر ان کے لیے ناکامیوں اور نامرادیوں اور شکستوں کا جال پھیلائے انھیں پھانسنے اور ناکام کرنے کے ہتھکنڈے پھیلائے رکھتی ہیں۔ تو جب احمد ندیم قاسمی صاحب یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''دنیا کو خوابوں کے مطابق ڈھالنے میں ناکام رہا۔'' تو اس بات پر قطعی حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ خیر اور شر کی اس جنگ میں خیر ہی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی، یہی دکھاتی اور بہت حد تک یہی سکھاتی ہے لیکن یہ انسانی عظمت ہے اور یہ انسان کی خصلت ہے کہ وہ بار بار نیکی، اخلاقیات اور خیر کی جانب لپک لپک کر جاتا ہے اور ہر بار تبدیلی، مثبت تبدیلی، انسانی اقدار کی حامل تبدیلی کی خواہش لیے آگے بڑھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، اپنے قول و فعل، اپنے عمل، اپنے افکار اور اشعار میں خیر کی قوت کے حامی نظر آتے ہیں اور یہی زندگی بھر اُن کا وطیرہ بھی رہا۔

یہ 1992ء کے اریب قریب کا زمانہ رہا ہوگا کہ جب میں پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، پرانچارج پبلی کیشن کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ادارے کے کرتا دھرتا طاہر اسلم گورا، نکھرتی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ پارہ صفت، گورا کا دماغ، ہر وقت کسی مثبت اور جدید خطوط کے حامل منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سوچتا رہتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے پبلی کیشن کی دنیا میں ایک نیا اسلوب وضع کیا۔ پاکستان بکس پر ہر وقت نامور ادیب، شاعر موجود رہتے۔ ادبی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا اور نئے نئے موضوعات پر بحث مباحثہ کا اہتمام بھی رہتا، دیگر اہم لکھنے والوں کی طرح یونس بٹ بھی یہیں آتے۔ ابھی وہ پڑھ رہے تھے اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ میں گاہے بگاہے اُن کے پاس آتا جاتا تھا۔ ایک روز وہ مجھے ''فنون''

کے دفتر لے گئے جو اس ہاسٹل کی پشت پر واقع تھا اور جہاں جانے کے لیے میکلوڈ روڈ کی طرف واقع گھاٹی کے ذریعے پہنچنا پڑتا تھا۔ وہاں بہت سے ایسے سینئر لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی جو اکثر و بیشتر وہاں آتے۔ ان میں رشید ملک، محمد کاظم صاحب اور دیگر نامور شعرا، ادبا اور دانش ور شامل تھے۔ بعد میں بہت عرصہ تک وہاں جانا نہیں ہوا۔ لیکن وہاں سے ''فنون'' کا دفتر جب لوئر مال، کسان ہال اور ''میاں چیمبرز'' میں تبدیل ہوکے جاتا رہا اور جب یارِ عزیز اعجاز رضوی باقاعدہ طور پر ''فنون'' کے ساتھ منسلک ہوگئے تو وہاں آنا جانا زندگی کے معمولات میں شامل ہوگیا۔ ''فنون'' میں میرے کچھ خطوط اور تبصرے وغیرہ بھی شائع ہوئے۔ اُن سے عقیدت مندانہ تعلق اب تک قائم ہے۔ ان کی نثری اور شعری تحریریں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہمارے سامنے موجود ہوں اور اپنی زبان سے ہمیں سُنا رہے ہوں۔ قاسمی صاحب کی ایک خاصیت یہ تھی کہ جس سے اُن کا تعلق قائم ہوجایا کرتا اُسے دل و جان سے نباہتے۔ جن دنوں میری شادی ہوئی، یہ دسمبر 2003ء کی بات ہے۔ تو میں نے اور بہت سے بزرگ لکھنے والوں کی طرح اُن کو بھی دعوت نامہ پیش کیا۔ وہ اُن دنوں بیمار رہتے۔ مجھے اُن کی جانب سے ایک خط موصول ہوا کہ ''بیٹی منصورہ اور میرا، آپ کی شادی میں شرکت کا پختہ ارادہ تھا، تاہم صحت ساتھ نہیں دے رہی، اس لیے معذرت خواہ ہوں۔'' اُن کا ایک اور خط مجھے ''حلقہ اربابِ ذوق، لاہور'' کے سیکرٹری جنرل منتخب ہونے پر بھی ملا۔ جس میں انھوں نے مبارک باد اور نیک تمنائیں بھیجی تھیں۔ ان خطوط کی میری زندگی میں خاص اہمیت ہے۔ جو قاسمی صاحب کی ذات کی عظمت پر دال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، میری ہی طرح وہ ہر اُس لکھنے والے سے اس گہرے تعلق اور نسبت کو دائم و قائم رکھنے کے لیے مقدور بھر کوشش کرتے۔ ایک انسان اپنی زندگی میں اپنی مصروفیات اور معاملات کو جس خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی کے ساتھ نباہتا ہے، قاسمی صاحب اس سے بڑھ کر نباہتے تھے۔ اُن کے تخلیقی کام کے علاوہ ان کے عملی طور پر کیے گئے کام بھی ہمیں تا دیر یاد رہیں گے۔

یہاں ہم احمد ندیم قاسمی کے اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب درج کرتے ہیں جس سے ہماری پیچھے کی گئی بات کی توثیق ہوگی کہ قاسمی صاحب حقائق، سچائی اور انسانی اقدار کا اظہار کس جرأت اور دلیری کے ساتھ کرتے ہیں اور اس شعری اظہار میں تفکر اور تدبر بھی بات بات میں اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان اشعار میں انسانی کم مائیگی کے ساتھ ساتھ جدید تشکیل پا رہی معاشرت اور اس معاشرت میں انسان کی مزید بے توقیری نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔

لوگ اشیا کی طرح بک گئے اشیا کے لیے   سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں مگر اس کے ساتھ سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو ظلم ہے ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار ندیم ہم جو ٹھہرے تو اُفق دور نکل جائے گا

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نَو دیکھا ہے مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

جانے کہاں تھے اور چلے تھے کہاں سے ہم بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم
اے نو بہارِ ناز تری نکہتوں کی خیر دامن جھٹک کے نکلے تیرے گلستاں سے ہم

اور یہ کہ:

ہر رات دعا کروں سحر کی ہر صبح نیا فریب کھاؤں

قاسمی صاحب کے حوالے سے اپنا ایک اور مضمون میں مَیں نے لکھا۔ ”عمر بھر سچائی ان کا شیوہ رہی اور بعد از مرگ بھی اپنے حوالے سے جو بعض سچائیاں وہ بیان کر گئے، ان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ان کے شعری تفسیر کرتا ہوا ایک حقیقی ثبوت تو ان کے جنازے پر دیکھنے کو ملا اور ان کا یہ شعر ذہن میں گونجتا رہا:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ان کی موت پر اردو ادب کی قد آور شخصیت ڈاکٹر وزیر کو دیکھ کر اور منیر نیازی کے یہ تعزیتی کلمات پڑھ کر ایک طرف جہاں اس امر کا ادراک ہوا کہ ایک دانش ور کا کردار ہر طرح انسانی عظمت کا ترجمان ہوتا ہے تو دوسری طرف قاسمی صاحب کی شخصیت میں موجود اُن اعلیٰ اخلاقی اقدار، رواداری اور رتہذیب و شرافت کا بار دگر مظاہرہ دیکھنے کو ملا جو عمر بھر ان کی ذات کا حصہ رہی۔ منیر نیازی نے ان کی موت پر کہا:

”معاشرے سے ایک عقل مند اور عالم کا گزر جانا بہت افسوس کی بات ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی وفات نے مجھے روح تک کھوکھلا کر دیا ہے۔ خدا اُن پر رحمت کرے۔ ان کی

وفات کی خبر سُنی تو بے اختیار ان کا کہا ہوا شعر ذہن میں گونجنے لگا:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

قاسمی صاحب کی ذات اور فکر اگر کسی شے پر مرتکز نظر آتی ہے تو وہ ہے انسان اور ان کا وطن، وطن پاکستان سے اُن کی محبت جہاں شاعری اور دیگر اصنافِ سخن میں موجزن دکھائی دیتی ہے تو وہاں پر ہی اُن کی نجی محفلوں میں کی گئی گفتگو اور انٹرویوز میں بھی اس کا برملا اظہار ملتا ہے۔ وطن سے عقیدت کا اظہار انھوں نے اپنی ایک تحریر میں کچھ یوں کیا ہے:

> ”مجھے زندگی میں سب سے بڑی مسرت 13 اگست 1947ء کی رات کو بارہ بجے حاصل ہوئی۔“

اور یہ وہ وقت تھا جب احمد ندیم قاسمی صاحب نے ریڈیو اسٹیشن سے قیامِ پاکستان کی نوید سنائی تھی۔

ایک اور جگہ پر اصناف اور نظریے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ”غزل کی ہیئت بدلنے کے تجربوں کا حامی نہیں ہوں۔ اس کی معینہ ہیئت ہی میں موضوعات کے پھیلاؤ کی بے شمار گنجائشیں ہیں۔ ہر عہد میں مثبت ادبی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے تخلیقی ادبی اصناف میں تازہ خون پیدا ہوتا ہے۔ مزاحمتی ادب ہر دور میں تخلیق ہوا ہے۔ قدیم شعرا کے ہاں شہر آشوب مزاحمتی شاعری کے زمرے میں بھی آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس دور کی زیادتیوں کے خلاف مزاحمت کا جذبہ موجود ہے۔ بیسویں صدی میں سب سے بڑے مزاحمتی شاعر مولانا ظفر علی خان تھے۔ ان کا سا جوش وجذبہ پھر کسی مزاحمتی شاعر میں نظر نہیں آیا۔ ترقی پسند تحریک کے تحت جو ادب لکھا گیا وہ بیشتر مزاحمتی تھا۔ غیر ملکی سامراج اس کا ہدف تھا یا پھر مروجہ فیوڈل نظام ۔۔۔۔ مزاحمت، بہر حال آج کے لکھنے والے کے یہاں بھی موجود ہے۔ صحیح معنوں میں مزاحمتی شاعری احمد فراز نے کی۔“

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بذاتِ خود احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی دھرتی کے انسان کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے اس کے حالات بدلنے کی بات کی۔ طبقاتی نظام اور انسانی تفریق کو ختم کرنے، روئے زمین پر آباد انسانوں کو مساوی اور یکساں حقوق مہیا کرنے کی بات کی۔ حالات تبدیل نہیں ہونا تھے نہ ہوئے لیکن قاسمی صاحب مسلسل لکھتے رہے۔ آج بھی اُن کی تحریریں ان کا افسانوی اور شعری کام ہمارے لیے تبدیلی اور

انقلاب آفرین جذبات بیدار کرنے کا کام کر رہا ہے اور وہ جو انھوں نے ایک نعرہ بلند کیا تھا۔ ''انسان، عظیم ہے خُدایا!'' ہمیں آج بھی انسانی حقوق کے لیے کوشاں انسانوں کے یہاں اس کی تکرار ملتی ہے اور اس طرح کے اشعار ہمارے لیے تقویت کا باعث بنتے ہیں:

حضورِ شاہ بس اتنا ہی عرض کرنا ہے
جو اختیار تمہارے تھے، حق ہمارے تھے

اسی طرح اُن کی شاعری میں محبت اور رومان پرور اشعار کی کمی نہیں بل کہ بعض اشعار تو زبانِ زدِ عام ملتے ہیں:

جب ترا حکم ملا ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی
میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تُو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی
مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تری الفت نے، محبت مری عادت کر دی

اور اس غزل کے تو یہ تینوں اشعار ہی ہمیں آج کی صورتِ حال اور اپنے ہم وطنوں کے حالات پر پورے طور پر منطبق نظر آتے ہیں۔ خُدا نہ کرے کہ یہ آنے والے دنوں کی گواہی بن کر بھی ہمارے سامنے ہوں۔

قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے
نیا منشور لکھا جا رہا ہے
میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہم راہ دریا جا رہا ہے
مسافر ہی مسافر ہر طرف ہیں
مگر ہر فرد تنہا جا رہا ہے

قاسمی صاحب کے زندگی بھر کے رویّوں، رجحانات، افکار اور میلانات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات برملا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہماری قومی اور تہذیبی زندگی میں اُن کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ زندگی کی تدوین و ترتیب میں انھوں نے مقدور بھر حصہ ڈالا اور ریاستِ پاکستان کے گرے پڑے انسانوں اور طبقاتی تقسیم کا شکار عوام کو روشن راہوں کا پتہ اور نوید دی۔ وطنِ عزیز کی ہمیشگی اور دائمی روشنی کے لیے نغمے لکھے۔ رسائل و جرائد کے

ذریعے دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں کے پیغام کو عام کیا۔ اُن کا نام یقیناً سنہری حروف کے ساتھ پتھر کی سِل پر کندہ ہے جو ہماری آیندہ نسلوں کے لیے نیکی، خیر، برابری، رواداری اور تہذیب و شائستگی کا ضامن ہوگا۔

قاسمی صاحب کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان جو مجبورِ محض نظر آتا ہے، اپنی فطرت اور خصلت میں اسے اس قدر مجبور اور مقہور پیدا نہیں کیا گیا۔ قدرت نے اسے تقدّس اور عظمت سے متصف کر کے بھیجا تاہم انسان نے انسان اور دوسری مخلوقِ خدا کو اپنے تابع اور زیرِ نگیں کرنے کے لیے وہ وہ حربے اور حیلے استعمال کیے ہیں کہ جس کے باعث خود انسان شرمندہ اور نادم دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں یہ صورتِ حال کچھ اس طرح سے سامنے آئی ہے، کہتے ہیں:

خورشید کو جب زوال آیا
ہر چیز نے قد بڑھا لیا ہے
بندوں نے خدا کی جستجو میں
بندوں کو خدا بنا لیا ہے

یہ حقیقت ہے قاسمی صاحب کے حوالے سے گفت گو کرتے وقت زیادہ تر اُن کی شاعری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ تاہم اُن کے افسانوں اور مضامین کے حوالے سے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔ پنجاب کا دیہاتی پس منظر، طبقاتی سماج، تہذیبی و تمدنی معاملات اور ثقافتی اقدار کا بیانیہ جیسا اُن کی کہانیوں میں نظر آتا ہے، بہت کم ایسے لکھنے والے ہوں گے جن کے یہاں پنجاب کی یہ شکل و صورت نظر آتی ہوگی۔ ایسے ہی انھوں نے اپنے مضامین میں بھی پاکستان کی ثقافتی رنگارنگی اور بوقلمونی کو بیان کیا ہے اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ پاکستان مختلف نسلی، لسانی، ثقافتی اور سماجی اکائیاں رکھنے والا مجموعہ ہے۔ اس کا حُسن اور خوب صورتی یہی ہے کہ جب ہم ان کثیر جہتی تقاضوں کو نہ صرف یہ کہ بھرپور نمایندگی دیں بل کہ دنیا کے سامنے بھی اس کی درست اور صحیح صورت پیش کریں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

(احمد ندیم قاسمی: کُچھ باتیں، کُچھ خط)

(۱)

احمد ندیم قاسمی [۱۹۱۶ تا ۲۰۰۶ء] کا شمار بیسویں صدی کی اکابر علمی و ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع [خوشاب] کے ایک چھوٹے سے قصبے [انگہ] میں جنم لیا۔ گھر پر فقر اور درویشی سایہ فگن تھی۔ آپ کے والدِ گرامی پیر غلام نبی عرف نبی چن عالمِ جذب و کیف میں سرمست و سرشار تھے اس لیے گھر کا معاشی نظام فاقہ کشی کی زد میں تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے اسی عالمِ بے سروسامانی میں سفرِ زیست آغاز کیا۔ انگہ کی مسجد میں قرآنِ حکیم کی ناظرہ تعلیم کے بعد سکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں چوتھی جماعت کے وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل رہے۔ والدِ گرامی کی وفات [۱۹۲۳ء] کے بعد اپنے چچا پیر حیدر شاہ کے زیرِ کفالت تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ کیمبل پور، شیخوپورہ اور بہاول پور کے مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول، شیخوپورہ سے میٹرک اور ۱۹۳۵ء میں جامعۂ پنجاب سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران میں سرپرست چچا کی وفات نے اُن کے تعلیمی سفر کو رُکنے پر مجبور کر دیا اور نان و نمک کی تلاش اُنھیں لاہور لے آئی جہاں وہ ریفارمز کمشنری میں محرر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد ازاں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں سب انسپکٹر بھرتی ہو کر ملتان چلے گئے۔ یہ ملازمت بھی اُن کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی۔ اس کے بعد صحافت اور ریڈیو کے شعبوں میں قسمت آزمائی کی اور یہیں سے اُنھیں وہ راستہ دکھائی دیا جو اُن کی منزل کی طرف جاتا تھا، سو اس راستے پر چل پڑے۔ ہفت روزہ “پھول”، “تہذیبِ نسواں”، “ادبِ لطیف”، “سویرا”، “نقوش”، “سحر”، روزنامہ “امروز”، “صحیفہ” اور “اقبال” کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بزمِ اقبال کے سیکرٹری اور پھر مجلسِ ترقیِ ادب کے ناظم مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ کئی اخبارات و رسائل میں کالم نگاری کی۔ ۱۹۶۳ء میں علمی و ادبی مجلّہ “فنون” کی داغ بیل ڈالی۔ یہ رسالہ صحیح معنوں میں اُن کی ہمہ رنگ شخصیت کا اظہاریہ ہے۔ ادب و فن کے فروغ اور کئی نسلوں کی تربیت میں اس رسالے نے ایسا فعال اور متحرک کردار ادا کیا جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ رسالہ فنون کے پلیٹ فارم سے کئی شاعر، افسانہ نویس، نقاد اور دانش ور ابھرے جنھوں نے علم و ادب کے

میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے علمی اُفق کو تاب دار کیا۔ اس ادبی فضا کی تعمیر وتشکیل اور اس علمی منظرنامے کی ترتیب وتہذیب میں احمد ندیم قاسمی کا غیر معمولی کردار ہمیشہ یادگار رہے گا۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنا ادبی سفر ایک شاعر کی حیثیت سے آغاز کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر ان کی تخلیق کردہ نظم کو بالعموم اُن کی پہلی شعری کاوش قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نظم ۱۹۳۱ء میں روزنامہ سیاست، لاہور کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی۔ علم وادب اور تخلیق کے ساتھ اُن کی غیر معمولی وابستگی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۱ء سے اپنی وفات [۲۰۰۶ء] تک وہ برابر پرورشِ لوح وقلم میں مصروف رہے۔ اُن کا یہ شاندار پچھتر سالہ علمی وادبی سفر علم وادب کی مختلف اصناف اور جہات کی ثروت ورفعت میں اضافے کا سبب ٹھہرا۔ شاعری میں غزل، نظم اور قطعہ میں انھوں نے اظہارِ خیال کیا اور ہر صنف کو نئے جمالیاتی رنگوں اور احساس وخیال کے نئے موسموں سے ہم کنار کیا۔ نعت کی تخلیق کے باعث وہ معاصر نعتیہ قافلے کے سالاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی نعت عشق وارادت کا مرقع اور جذب وشوق کا اظہاریہ ہے۔ جدید اُردو نعت کو انھوں نے نئے موضوعات اور نئے تکنیکی اوصاف سے مالا مال کر دیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری اپنے موضوعاتی، اسالیبی، فنی اور جمالیاتی رنگوں کے باعث بیسویں صدی کے شعری منظرنامے میں اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ قاسمی صاحب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا مگر عام ترقی پسند شعرا کے برعکس انھوں نے شاعری کو نعرہ نہیں بننے دیا۔ اُن کے احساسِ جمال نے شاعری کی حرمت کو مقصدیت کے بارِ گراں سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ موضوعات کے تنوع اور تکنیک کے معجزانہ استعمال میں کوئی بھی ترقی پسند شاعر اُن کا مثیل نہیں۔ افسانہ، قاسمی صاحب کی تخلیقی شخصیت کا دوسرا بڑا مظہر ہے۔ بعض ناقدینِ ادب نے اُن کی افسانہ نویسی کو اُن کی شاعری پر ترجیح دی ہے۔ انھوں نے افسانہ نویسی کو بھی نئی بشارتوں سے ہم کنار کیا۔ پنجاب کی تہذیب وثقافت کے رنگوں کو جس مشاقی اور ہنرمندی کے ساتھ انھوں نے اپنے افسانوں میں ڈھالا وہ اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اُن کے مضامین، دیباچے اور تبصرے اُن کی ناقدانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ انھوں نے پچھتر سالہ ادبی سفر میں چار نسلوں کی ادبی تربیت کا شاندار کارنامہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ چار درجن سے زائد کتب تصنیف وتالیف کیں جن سے بلاشبہ بیسویں صدی کا ادبی افق روشن ہوا۔ اُن کی چند اہم کتابوں میں دشتِ وفا، دوام، لوحِ خاک، محیط، بسیط، جمال، طلوع وغروب، چوپال، درودیوار، سناٹا، بازارِ حیات، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، نیلا پتھر، برگِ حنا، تہذیب وفن، معنی کی تلاش، پسِ الفاظ، میرے ہم سفر اور میرے ہم قدم شامل ہیں۔

(۲)

احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرا اولین تعارف اُن دنوں ہوا جب میں شعر و ادب کی دُنیا میں تازہ وارد تھا۔ اٹک کی ادبی محافل میں شرکت کے باعث میں احمد ندیم قاسمی اور ان کے ادبی رسالے ’’فنون‘‘ سے آشنا ہوا۔ آشنائی کے ابتدائی دور ہی میں مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ احمد ندیم قاسمی کا کچھ وقت کیمبل پور میں گزرا ہے؛ انھوں نے پانچویں سے نویں جماعت تک کی تعلیم یہاں کے نارمل اینڈ ماڈل سکول سے حاصل کی تھی؛ اُن کے چچا اُن دنوں یہاں محکمہ مال میں ملازم تھے۔ کیمبل پور کے ساتھ اُن کے اس تعلق نے مجھے اُن کے قریب ہونے کا موقع عطا کیا۔ بعد میں اُن کی شاعری اور افسانوں کا مطالعہ مجھے اُن کے اور قریب لے آیا اور میں نے اپنے خیال کے ادبی سنگھاسن پر اُن کو سب سے بلند مقام پر بٹھا دیا۔ ’’فنون‘‘ ہمارے شہر کے دو بک سٹالوں پر آتا تھا، خریدنے کی استطاعت نہ تھی، وہیں کھڑے کھڑے تین چار نشستوں میں شاعری بالخصوص غزلیں اور افسانے پڑھ لیتا، اس عمل میں بسا اوقات دکان داروں کی جلی کٹی بھی سننی پڑ جاتیں مگر ’’فنون‘‘ سے یہ تعلق کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا اور قاسمی صاحب کی شخصیت کا سحر مزید بڑھتا رہا۔ ’’فنون‘‘ میں اشاعت کے لیے غزلیں بھیجنے کا شوق سینے میں کروٹیں لیتا رہا مگر اُن کی بڑی ادبی شخصیت کا رعب اور رسالہ ’’فنون‘‘ کا جلال و شکوہ دیکھ کر حوصلہ سرد پڑ جاتا۔ ہر تازہ ’’فنون‘‘ دیکھ کر دل میں ہوک اٹھتی کہ کاش! اس میں میری بھی کوئی غزل شامل ہوتی۔ مگر کم دامانی راستے کی دیوار رہی اور میں نے شوقِ فراواں کے باوجود ’’فنون‘‘ کو غزلیں بھیجنے کی جرأت نہیں کی۔ ۱۹۹۰ء میں دوسرا شعری مجموعہ ترتیب دیا تو خیال آیا کہ اس پر قاسمی صاحب کی رائے ضرور حاصل کروں گا۔ اتفاقاً اُن دنوں لاہور جانے کا موقع ملا۔ عبدالعزیز ساحرؔ اُن دنوں گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی میں ایم اے فائنل کے طالب علم تھے اور نیو ہاسٹل میں قیام پذیر تھے؛ میں اُنھی کے پاس ٹھہرا۔ ہاسٹل میں گجرات کا ایک نوجوان انعام سعدی بھی مقیم تھا جو غالباً اس وقت بی اے کا طالب علم تھا۔ ساحرؔ صاحب نے مجھے اس سے یہ کہہ کر ملوایا کہ: ’’یہ تمھارا عاشق ہے؛ تمھارے کئی اشعار اس کو یاد ہیں؛ اس نے کچھ اشعار کو اپنے کمرے میں دیواروں پر مصور بھی کر رکھا ہے۔‘‘ انعام سعدی سے دو چار دنوں میں دوستی ہو گئی؛ ایک دن میں نے اسے بتایا کہ میں قاسمی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ انعام نے کہا کہ آج ہی چلتے ہیں۔ شام کو ہم دونوں قاسمی صاحب سے ملنے کے لیے لوئر مال پہنچ گئے۔ ’’فنون‘‘ کا دفتر اُن دنوں سیکریٹریٹ کے قریب لوئر مال پر واقع تھا۔ ہم پہنچے تو ’’فنون‘‘ کے دفتر میں آٹھ دس لوگ بیٹھے قاسمی صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی انتظار کرنے والوں میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد قاسمی صاحب منصورہ احمد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے؛ سب احترام میں کھڑے ہو گئے۔ قاسمی صاحب نے سب پر ایک نظر ڈالی، سلام کیا اور بڑی میز کے دوسری طرف

رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ منصورہ احمد بھی اُن کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ لطیف ساحل صاحب نے قاسمی صاحب کو اپنا تازہ شعری مجموعہ پیش کیا، غالباً بیک فلیپ پر قاسمی صاحب کی رائے موجود تھی۔ پھر کچھ دیر اعجاز رضوی صاحب کوئی مسئلہ بیان کرتے رہے۔ میں شعری مجموعے کا مسودہ دبائے خاموش بیٹھا رہا؛ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہوں گے تو میں عرضِ مدعا کروں گا، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ از خود بڑھ کر بات کرنا میں نے سوءِ ادب جانا اور خاموش بیٹھا رہا۔ قاسمی صاحب جتنی دیر دفتر میں رہے محوِ گفتگو رہے۔ اُن کی باتوں میں سحر تھا، جاذبیت تھی، دلچسپی سے سب سُن رہے تھے۔ دورانِ گفتگو منٹو کا ذکر آ گیا۔ منٹو کا ذکر بہت محبت سے کرتے رہے؛ اس کی یادیں تازہ کرتے ہوئے فرمانے لگے: ”مجھے ایک بار عبدالمجید بھٹی اصرار کر کے ایک ریستوران میں لے گئے کہ میں اُن کے تازہ ناول کا ایک باب سنوں۔ منٹو میری تلاش میں وہاں تک آ پہنچا؛ مجھ سے کچھ بات کی اور جانے کے لیے مڑا تو عبدالمجید بھٹی نے بڑی لجاجت سے کہا کہ منٹو صاحب! قاسمی صاحب میرے نئے ناول کا ایک باب سُن رہے ہیں، آپ بھی سُن لیں۔ منٹو نے کہا: میں قاسمی کی طرح چوتیا نہیں ہوں، اور تیز تیز قدم اٹھاتے نکل گیا۔“ قاسمی صاحب نے منٹو کے الفاظ دہرا کر مجھے اور زیادہ اپنا اسیر کر لیا۔ اس واقعے سے میں اُن کی شخصی عظمت کا مزید قائل ہو گیا۔ یہ مجلس دو اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔ میں نے قاسمی صاحب کی گل افشانیٔ گفتار کا منظر دیکھا۔ پھر یک لخت جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے پر سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملائے۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ سر میرا تعلق کیمبل پور سے ہے۔ کیمبل پور کا نام سُن کر اُن کی آنکھوں میں چمک اُبھری اور کہا کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ایک دو منٹ مجھ سے ہم کلام رہے اور پھر کہا کہ آپ پھر کبھی تشریف لائیں، باتیں ہوں گی، کیمبل پور سے میرا بھی تعلق ہے۔ اس کے بعد وہ رخصت ہو گئے اور میں مسودہ اسی طرح بغل میں دبائے انعام کے ساتھ واپس ہاسٹل آ گیا۔ میں دیہاتی نژاد کم گو سا طالب علم شہر والوں کے ادب آداب سے بے گانہ تھا۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں فلیپ کے لیے مجموعہ پیش کرنا مجھے اچھا نہ لگا۔

قاسمی صاحب سے ملاقات ہو جانے کے بعد بھی کئی سال میں ”فنون“ کو اپنا کلام بھیجنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ۱۹۹۳ء میں، بے روزگاری مجھے لاہور لے گئی۔ میں یہاں وہاں کوشش کرتا رہا، ہاتھ پاؤں مارتا رہا مگر ناکام رہا۔ اس عرصے میں مختلف تقریبات اور محافل میں قاسمی صاحب کو دیکھنے اور سُننے کا البتہ موقع ملتا رہا۔ قریب ہونے اور بات کرنے کا بھی ایک دو بار موقع ملا مگر کلام انھوں نے ہی کیا میری حیثیت بس سامع کی ہی رہی۔ ایک بار میں کیمرہ لے کر مجلسِ ترقیِ ادب کے دفتر میں جا پہنچا، خواہش تھی کہ قاسمی صاحب کے ساتھ تصویر بنواؤں گا۔ قاسمی صاحب دفتر میں تھے۔ ایک بزرگ اپنے کسی نوجوان لڑکے یا پوتے کے ساتھ ملاقات

کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اُن کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں، قاسمی صاحب کے چہرے پر بھی تکدر تھا مگر اس کا اظہار انھوں نے نہیں کیا۔ وہ جب اٹھے تو قاسمی صاحب اُن کو باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے، میں بھی ساتھ ہی اُٹھ آیا۔ کیمرہ جیسا لے کر گیا تھا، ویسا ہی واپس لے آیا۔ لاہور میں جب کوئی روزگار کی سبیل نہ نکلی تو واپس آ گیا؛ آتے ہی اپنی چار غزلیں “فنون” کے لیے روانہ کر دیں؛ یہ سوچ کر کہ اگر نہیں چھاپیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ کچھ دن بعد قاسمی صاحب کا خط ملا۔ اس میں ایک غزل کو شاملِ “فنون” کرنے کی خبر تھی اور باقی غزلوں کے متعلق یہ رائے کہ انھیں “فنون” کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ خط کچھ حوصلہ افزا تھا، کچھ حوصلہ شکن۔ مگر اس احساس نے کہ احمد ندیم قاسمی کے پرچے میں چھپنا مذاق تھوڑی ہے، یہ بہت بڑی عزت ہے کہ میری ایک غزل اُن کے معیار پر پوری اُتری ہے، نے دل کو قدرے اطمینان بخشا۔ انھی دنوں استادِ گرامی حضرت نذر صابری کا نعتیہ مجموعہ “واماندگیِ شوق” منظرِ عام پر آیا تو میں نے صابری صاحب کی کتاب کے دو نسخے قاسمی صاحب کو تبصرہ کے لیے ارسال کر دیے اور بہ اصرار صابری صاحب سے ایک خط بھی قاسمی صاحب کو لکھوایا۔ اس کے بعد “فنون” کا انتظار رہنے لگا، نہ غزل شائع ہوئی نہ صابری صاحب کی کتاب پر تبصرہ۔ اسی غصّے اور جھنجلاہٹ میں کئی سال بیت گئے۔ ۱۹۹۶ء کے کسی “فنون” پر میں نے ایک خط لکھا جس میں “فنون” میں شائع ہونے والی کئی تخلیقات کے تسامحات کا ذکر نمایاں تھا۔ اگلے پرچے میں میرا مراسلہ کچھ کتربیونت کے ساتھ “فنون” کے بہرۂ اختلافات میں شائع ہوا۔ میں نے غصّے میں انھیں ایک خط لکھا کہ آپ نے فلاں سال میری غزل شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا، جو ہنوز ایفا نہیں ہوا۔ میرے استاد حضرت نذر صابری کی کتاب پر ابھی تک آپ نے تبصرہ نہیں لکھا اور “فنون” میں میرا خط پورا شائع نہیں کیا۔ قاسمی صاحب نے جواب میں اپنے مسائل اور مصروفیت کا ذکر کیا اور لکھا کہ: “آپ ایک تکلیف کیجیے؛ وہی غزل جس کی اشاعت کا آپ سے وعدہ کیا تھا، ایک بار پھر بھجوا دیجیے۔ بڑا کرم ہوگا۔” ایک دور افتادہ طالب علم کو اپنے عہد کی سب سے اہم ادبی شخصیت کا اس طرح مخاطب کرنا خود اس شخصیت کے بڑا ہونے کی دلیل ہے۔ بعد میں “فنون” کے لیے میں غزلیں بھجواتا رہا؛ قاسمی صاحب سے بحث کرتا رہا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں غزل کے صرف پانچ شعر بھجواتا ہوں، انتخاب کرنے کا انھیں حق نہیں دیتا اور میرے بعض اشعار مبہم یا بے معنی ہو جاتے ہیں۔ منیر نیازی کے زیرِ اثر ایمائیت اور رمزیت، جو میرے کلام میں ابھر کر سامنے آنے لگی تھی، قاسمی صاحب اسے ابہام سے موسوم کرتے رہے۔ وہ غزل میں ابلاغ کے قائل تھے اور مجھے اس کا قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے فخر ہے کہ قاسمی صاحب نے میری غزلیں “فنون” میں شائع کیں اور میرے خطوں کا جواب دے کر مجھے عزت بخشی۔ آج اُن کے چند خط جو میرے پاس محفوظ ہیں، دیکھتا ہوں تو محجوب ہوتا ہوں کہ میں اپنے

وقت کے ایک عظیم انسان سے کس طرح بحث کرتا رہا۔ ایک دو خط اُن استفسارات کے جواب میں ہیں، جو قاسمی صاحب کی زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ خط میرا سرمایہ ہیں؛ یہ خط مجھے بے حد عزیز ہیں۔ ان کو دیکھ کر قاسمی صاحب کی ذات سے محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ ذیل میں اس متاعِ گراں بہا کو تاریخ وار پیش کیا جاتا ہے۔

(۳)

خط نمبر:۱

فنون
45/A مزنگ روڈ۔ لاہور

۱۵/دسمبر۱۹۹۳ء

مکرمی! سلام مسنون۔

آپ کا کلام ملا۔ ان میں سے ایک غزل (تیز آندھی میں گھر گیا ہوں میں) فنون کے لیے رکھ لی ہے۔ باقی غزلیں فنون میں استعمال نہیں کی جاسکیں گی۔ معذرت کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

خط نمبر:۲

THE FUNOON QUARTERLY
Editor:- Ahmad Nadeem Qasmi

۲/اپریل ۱۹۹۷ء

مکرم و محترمی!

شکایت نامہ ملا۔ آپ کی سب شکایات بجا۔ میری طرف سے معذرت کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔ دراصل ہر شمارے کی اشاعت کے بعد طے کرتا ہوں کہ رسالہ بند کر دوں۔ اس کا بوجھ مجھ سے نہیں سہارا جا سکتا۔ یوں ہر چیز سمیٹ لیتا ہوں۔ مگر جب ایک بار پھر رسالہ مرتب کرنے کی ہوک اٹھتی ہے تو اس اتھل پتھل میں کئی اہم چیزیں رہ جاتی ہیں اور احباب کو جائز شکایت پیدا ہوتی ہے۔ آپ ایک تکلیف کیجیے۔ وہی غزل جس کی اشاعت کا آپ سے وعدہ کیا تھا، ایک بار پھر بھجوا دیجیے۔ بڑا کرم ہوگا۔ نذر صابری صاحب کی کتاب پر تبصرہ کون لکھے؟ میں تو عدیم الفرصتی کے ہاتھوں سخت مجبور ہوں۔ رہے فنون کے بارے میں آپ کے تاثرات کی ’’مسنر شدہ‘‘ اشاعت تو ہر مراسلہ لفظ بلفظ درج نہیں ہو سکتا، بعض ترامیم لازمی ہوتی ہیں۔

مکرر معذرت کے ساتھ

احمد ندیم

خط نمبر: ۳

FUNOON A STANDARD MAGAZINE
DEVOTED TO LITERATE & ARTS

۲۰ / مارچ ۱۹۹۹ء

مکرمی و محترمی۔ سلامِ مسنون۔

آپ کا شکایت نامہ ملا۔ آپ کی شکایت بجا ہے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ میری مصروفیت اور علالت اور فنون کی معاشی بدحالی مجھے جم کے بیٹھنے اور سوچنے نہیں دیتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سہ ماہی فنون ایک طرح سے ''سالانہ فنون' ہو کر رہ گیا ہے۔ جب کوئی شمارہ مرتب کرنے بیٹھتا ہوں تو فائلوں میں تخلیقات کا انبار چھاننا مشکل ہو جاتا ہے چناں چہ کتنے ہی مہربانوں کی نگارشات رہ جاتی ہیں اور مجھے بعد میں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آپ کی غزل کے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی سانحہ پیش آیا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔

آپ عموماً غزل کے پانچ اشعار بھجواتے ہیں، یوں اشعار کا انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر آپ کے کلام میں ''چمک' 'اور ''چنگاری'' تو ہے مگر آپ خود محسوس کرتے ہوں گے کہ جو کچھ آپ کے دل و دماغ میں ہے اسے کما حقہٗ بیان کرنے میں آپ کو وقت پیش آتی ہے اور شعر تشنہ رہ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آپ میری یہ عرض داشت بھی محسوس کریں گے۔ مگر میں آپ کو گمراہ نہیں کروں گا۔ بہ ہر حال جو غزلیں آپ نے بھجوائی ہیں ان میں سے ''عرصۂ بہار ہمیں، اُتار ہمیں'' ____ اور ''ملاتے رہے، آزماتے رہے' 'میں نے فنون کے لیے رکھ لی ہیں۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ فنون میں آ جائیں۔ ایک بار پھر معذرت۔

مخلص

احمد ندیم

خط نمبر: ۴

THE FUNOON QUARTERLY
Editor:- Ahmad Nadeem Qasmi

۲۱ / ستمبر ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی۔

آپ کی نوازش سے مجھے اپنے ہی تین خط ملے۔ ممنون بھی ہوں اور نادم بھی۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ میں شدید بیماری میں سے گزرا ہوں۔ چند روز ہسپتال میں رہنے کی بھی نوبت آئی۔ اب معالجین کی ہدایت کے مطابق گھر میں پڑا رہتا ہوں اور کبھی کبھار کوئی خط یا ایک آدھ شعر لکھ لیتا ہوں۔

آپ سے میں نے اتنے بہت سے وعدے کیے اور کوئی بھی پورا نہ کر سکا۔ اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ آج دفتر جا کر آپ کی وہ غزلیں فائلوں کو کھنگال کر نکالوں گا جن کا میرے عریضوں میں ذکر موجود ہے۔ اگر خدانخواستہ دستیاب نہ ہوئیں تو آپ کو یہی غزلیں پھر سے بھجوانے کی تکلیف دوں گا، مگر فی الحال مجھے جستجو کرنے دیجیے۔

مخلص

احمد ندیم

خط نمبر:۵

احمد ندیم قاسمی
فنون۔ میاں چیمبرز۔ 3 ٹمپل روڈ لاہور

۲۰ رنومبر ۲۰۰۰ء

محترمی ارشد محمود صاحب! سلام مسنون۔

فائلوں کو کھنگالنا شروع کیا مگر ایک بار پھر علالت کی زد میں آ گیا۔ میں اپنی شکست مانے لیتا ہوں۔ آپ فوری طور پر، آج ہی مجھے اپنا کلام بھجوا دیجیے۔ میں مارے ندامت کے مرتب شدہ پرچہ، پریس بھیجنے کی بجائے، روکے بیٹھا ہوں کہ آپ سے اتنا پرانا وعدہ بھی پورا ہو اور اس غیر معمولی تاخیر کی تلافی بھی ہو جائے۔ شدت سے منتظر ہوں۔

مخلص

احمد ندیم

خط نمبر:۶

احمد ندیم قاسمی
فنون۔ میاں چیمبرز۔ 3 ٹمپل روڈ لاہور

۲۷ رنومبر ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی ارشد محمود صاحب۔ سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ غزلیں بھجوانے کا شکریہ۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اپنی غزل میں کہنا تو بہت کچھ چاہتے ہیں.... کوئی گہری، کوئی اونچی بات، مگر پوری طرح اظہار نہیں کر پاتے۔ کہیں کہیں آپ کا شعر جگمگا اٹھتا ہے مگر کہیں کہیں دُھند کا شکار ہو جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کے کلام کا انتخاب بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ آپ کی ہر غزل صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ فنون ۱۱۴ کے لیے میں نے آپ کی دو غزلیں منتخب کی ہیں۔

۱۔ نقش ونگار ہوئے ____ بیدار ہوئے

۲۔ عرصہ بہار ہمیں ____ اتار ہمیں

باقی غزلوں میں سے ''ذات میں گم، حالات میں گُم'' غزل کے تین اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح ''ملاتے رہے، آزماتے رہے'' ''تیز'' ''آفتاب دیکھتا ہوں، خواب دیکھتا ہوں'' میں بھی دو دو تین تین اشعار عمدہ ہیں مگر باقی اپنے معانی کی کماحقہٗ ترسیل نہیں کر پائے۔

خفا نہ ہو جیے گا۔ میرا ایک غلط یا صحیح معیار ہے جس کے مطابق فنون میں شاعری کا انتخاب کرتا ہوں۔ اور فن میں کسی کو غلط داد دینے کو گمراہی قرار دیتا ہوں۔ آپ کے اندر کا فن کو جوہر بے شک موجود ہے۔ مگر ذرا سی مزید ریاضت اور سلاست آپ کو نکھار سکتی ہے۔ جن تین غزلوں کا ذکر کیا ہے ان کے دو دو، تین تین اشعار ہی آئندہ شماروں میں درج کر دوں گا۔ سو یہ میرے پاس محفوظ ہیں اور اب ان شا اللہ انھیں گم نہیں ہونے دوں گا۔

دعا کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

خط نمبر: ۷

فنون سہ ماہی

۱۳ رجون ۲۰۰۲ء

عزیز مکرم! دعا۔

علیل رہنے لگا ہوں مگر آپ کے استفسارات کا جواب ضروری ہے سو عرض کرتا ہوں۔

۱۔ مجھے اپنے پر دادا مرحوم محمد قاسمؒ کے سالِ وصال کا علم نہیں۔ ان کا مزار انگہ کے قبرستان میں موجود ہے مگر اس پر کوئی کتبہ نہیں۔

۲۔ میں تصوف کے سلسلوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں مگر اندازاً عرض ہے کہ میرے خاندان کا سلسلۂ طریقت قادری ہے۔

۳۔ میرے دادا مرحوم کا اسمِ گرامی چراغ علی تھا مگر ان کے سالِ وفات کا علم نہیں۔

۴۔ میرے برادرِ اکبر پیرزادہ محمد بخش مرحوم کا سالِ وفات ۲۰۰۱ء ہے۔

۵۔ والدِ گرامی کے وصال کے بعد میرے گھرانے میں پیری مریدی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور میں تو پیری مریدی کے سلسلے کا سخت مخالف ہوں۔

۶۔ میری اولاد میں سے صرف ناہید قاسمی کا تعلق تخلیقِ ادب سے ہے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں اور نقاد بھی۔

اب وہ ماشااللہ ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) بھی حاصل کر چکی ہیں اور ان کا تھیسس انجمن ترقیِ اردو کراچی کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

۷۔ میرا بیٹا نعمان ندیم واپڈا سے منسلک ہے۔

۸۔ ''فنون'' کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ہوا اب تک اس کے ۱۱۷ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ تعطل کا حادثہ کبھی نہیں ہوا۔ خدیجہ مستور نمبر اور اختر حسین جعفری کے علاوہ ایک بار غالب نمبر اور ایک بار اقبال نمبر چھپا۔

۹۔ میں ۱۹۷۴ء سے مجلسِ ترقیِ ادب سے بحیثیت ڈائریکٹر وابستہ ہوں۔ اس ادارے کی داغ بیل ۴۸۔۱۹۴۹ء ہی میں پڑ گئی تھی مگر باقاعدہ آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ مجھ سے پہلے اس کے دو ڈائریکٹر تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم اور سید امتیاز علی تاج مرحوم۔

دعا کے ساتھ۔ مخلص

احمد ندیم

خط نمبر: ۸

THE FUNOON QUARTERLY
Editor:- Ahmad Nadeem Qasmi

۱۳؍ستمبر ۲۰۰۲

محترمی و مکرمی ناشاد صاحب! اسلام مسنون۔

آپ کی غزل فنون نمبر ۱۱۷ میں شامل ہے۔ پرچہ آج ہی چھپ کر آیا ہے۔

آپ کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ مجھ پر مادری زبان کے بے شمار حقوق ہیں مگر مشکل صرف یہ ہے کہ جب میں نے شعر کہنا شروع کیا تو فضا میں صرف اقبال اور جوش اور حفیظ اور ظفر علی خان اور اختر شیرانی کا غوغا تھا اور میری طرح سے پنجاب کے رہنے والے تمام نوجوان شعرا نے آغاز ہی ان سینئر حضرات کے تتبع میں اردو سے کیا۔ احمد راہی تک اردو میں شاعری کرتے تھے۔ میں نے پنجابی میں چند نظمیں یقیناً لکھ رکھی ہیں مگر ابھی ان کی تعداد معقولیت تک نہیں پہنچی۔ ایک سکھ ادیب نے تو میری بہت سی کہانیاں پنجابی میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں چھاپ دی ہیں مگر رسم الخط گورمکھی ہے۔ ویسے یہ ان کا کرم ہے کہ کتاب کی ایک کاپی مجھے بھجوا دی۔

اور عزیزم! اب تو پنجابی کی طرف پلٹنے کا وقت ہی باقی نہیں۔ اب تو ہم پابہ رکاب ہیں۔ دکھ یقیناً ہے کہ ہم اپنی ماں بولی کی خدمت نہ کر سکے۔

مخلص

ندیم

خط نمبر:۹

احمد ندیم قاسمی
مدیر فنون۔ میاں چیمبرز۔ 3 ٹمپل روڈ لاہور

یکم فروری ۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی! اسلام مسنون۔

آپ کی دو غزلیں ''فنون'' ۱۱۴ میں شامل ہو چکی ہیں۔ امید ہے آپ کی نظر سے یہ شمارہ گزرا ہوگا۔

آپ کا دو ماہ قبل کا مفصل خط میرے سامنے ہے۔ اس دوران طبیعت مضمحل سی رہی اس لیے جواب نہ لکھ سکا۔ یقیناً یہ ضروری نہیں کہ پوری کی پوری غزل مرصع ہو اور کوئی شعر بھی کم زور نہ ہو۔ میں نے کم زور اشعار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرا اشارہ ایسے اشعار کی طرف تھا جو بے معنی ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں یا اتنے خام ہوتے ہیں کہ غزل میں اجنبی سے لگتے ہیں۔ افسوس کہ آپ نے میری گزارش کا صحیح مقصد نہیں سمجھا۔ میں علیل رہنے لگا ہوں چناں چہ میرے پاس وقت نہیں کہ تفصیل میں جاسکوں۔ ویسے میں آپ کی ذہانت کی قدر کرتا ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے ہاں فن کا ''جوہر'' موجود ہے۔ دعا کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

☆☆☆☆

خالد مصطفیٰ

ایک پوری اور چند ادھوری ملاقاتیں

اسّی (۸۰) کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے، میں گورنمنٹ کالج اصغر مال روڈ راولپنڈی میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا اور معروف شاعر و نقاد پروفیسر یوسف حسن ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ چوں کہ پروفیسر یوسف حسن، احمد ندیم قاسمی کے بہت قریب رہے تھے اس لیے لیکچر کے دوران کہیں نہ کہیں احمد ندیم قاسمی کا ذکر ضرور آ جاتا۔ پروفیسر یوسف حسن سے قاسمی صاحب کا ذکر بار بار سننے سے میرے اندر قاسمی صاحب کے لیے انسیت پیدا ہو گئی۔ میرا شعر گوئی کا شوق بھی نیا نیا تھا اس لیے کالج لائبریری کا رُخ کیا اور قاسمی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ''رم جھم'' ایشو کرا لیا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا اس لیے قاسمی صاحب کی شاعری کی فکری جہت سے تو آشنا نہ ہو سکے مگر ان کی غزلیں پڑھ کر خوب حظ اُٹھایا۔ یہ میرا قاسمی صاحب سے پہلا تعارف تھا۔

دن گزرتے گئے اور قاسمی صاحب سے میری انسیت بڑھتی گئی۔ میں جب برسرِ روزگار ہوا تو قاسمی صاحب کا ادبی مجلّہ ''فنون'' خریدنا شروع کیا اور ساتھ ہی دل کے اندر ''فنون'' میں چھپنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ۲۰۰۲ء میں جب مَیں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تعینات تھا تو ہمدمِ دیرینہ شہاب صفدر نے مجھے احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''فنون'' کا خط و کتابت والا پتہ مہیا کیا اور ساتھ ہی مجھے میری تخلیقات ''فنون'' کو بھجوانے کا بھی مشورہ دیا۔ سہ ماہی ''فنون'' کے لیے تخلیقات بھجوانے کا مطلب یہ تھا کہ میں مدیر ''فنون'' احمد ندیم قاسمی صاحب کو خط لکھوں جو کہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ کہاں میں اور کہاں احمد ندیم قاسمی، لیکن میں نے ہمت دکھائی اور اپریل ۲۰۰۲ء میں قاسمی صاحب کو ایک مفصل خط لکھ ڈالا۔ یہ قاسمی صاحب سے میری پہلی آدھی یا ادھوری ملاقات تھی۔ میں نے اس خط میں اپنی نگارشات ''فنون'' میں شائع ہونے کے لیے بھجوائیں اور ساتھ ہی ''فنون'' کے لیے قاسمی صاحب کو بہت سے مشورے دے ڈالے مثلاً یہ کہ اس شمارے کی کوئی ویب سائٹ بنا دی جائے یا اس کو کسی دوسری ویب سائٹ پر ڈال دیا جائے تاکہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں اور رسالے کو محفوظ بنانے کے لیے اس کی پی ڈی ایف فائلز سی ڈیز پر منتقل کر دی جائیں۔ اگر قاسمی صاحب کی جگہ کوئی اور سینئر ہوتا تو میری اس ''جسارت'' پر ضرور وہ میری دھنائی کرتا کہ تم جیسا طفلِ مکتب اب

ہمیں مشورے دے گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس خط کا جواب قاسمی صاحب نے نہایت شفقت سے دیا۔ انھوں نے ۲۵ مئی ۲۰۰۲ء کو اس خط کا جواب لکھا جس میں پہلا جملہ یہ تھا ''عنایت نامے اور کلام کا شکریہ''۔ اور پھر اس کے بعد انھوں نے لکھا کہ سی ڈی اور ویب سائٹ کے متعلق تجاویز مدیر منتظم ''فنون'' منصورہ احمد کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ''فنون'' میں میری تخلیقات شائع کرنے کی یقین دہانی کرائی اور اگلے شمارے (شمارہ نمبر ۱۱۷، اگست ۲۰۰۲ء) میں میری دو نظمیں شائع بھی کر دیں۔

اس کے بعد قاسمی صاحب سے سعادت مندی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ میری نگارشات اور ''فنون'' کے پرچوں پر لکھے گئے میرے تاثرات تواتر سے ''فنون'' میں شائع ہونے لگے۔ مئی ۲۰۰۴ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''خواب لہلہانے لگے'' شائع ہوا تو شہاب صفدر نے اس پر تبصرہ لکھا جو ''فنون'' کے شمارہ نمبر ۱۲۴ میں شائع ہوا۔ قاسمی صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور کبھی کبھار فون پر بھی بات ہو جاتی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے میری پوسٹنگ حیدر آباد (سندھ) ہو گئی تو میں نے سوچا حیدر آباد جانے سے قبل قاسمی صاحب سے بالمشافہ ملاقات کے لیے لاہور جانا چاہیے۔ میں نے مدیر منتظم ''فنون'' اور قاسمی صاحب کی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد سے فون پر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے قاسمی صاحب سے ملاقات کا وقت لے لیا۔ میں جولائی ۲۰۰۳ء کے آخری ہفتے میں لاہور گیا اور منصورہ احمد کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ انھوں نے مجھے مجلس ترقی ادب کے دفتر میں آنے کو کہا جہاں ۱۹۷۴ء سے اپنی وفات تک قاسمی صاحب اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ میں فرطِ اشتیاق میں ڈوبا وہاں پہنچا تو منصورہ احمد مجھے بغیر کسی توقف اور تکلف کے قاسمی صاحب کے دفتر لے گئیں۔ چہرے پر وقار اور سنجیدگی سجائے اردو ادب کا دیوتا میرے سامنے موجود تھا۔ قاسمی صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی باہیں پھیلائیں اور میں ان سے بغل گیر ہو گیا۔ کئی ادھوری ملاقاتوں کے بعد آج ان سے پوری ملاقات کی میری دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

قاسمی صاحب کے ساتھ میں نے تقریباً پورا دن گزارا۔ وہ ساتھ ساتھ اپنا دفتری کام بھی کرتے رہے اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط کے جوابات لکھ کر منصورہ احمد کے حوالے کرتے رہے تاکہ وہ انھیں متعلقہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ ادب، سیاست اور معاشرت پر گفتگو بھی جاری رہی۔ منصورہ احمد بھی زیادہ وقت قاسمی صاحب کے دفتر میں موجود رہیں۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھا کھایا۔ کھانے کے بعد آم پیش کیے گئے تو قاسمی صاحب نے آم کھانے سے معذرت کی لیکن منصورہ احمد کے استفسار پر وہ آم کھانے پر آمادہ ہوئے۔ پھر میں

نے باپ اور بیٹی کا پیار دیکھا۔ منصورہ احمد نے آم کا گودا نکالا اور پلیٹ میں رکھ کر اس کو اچھی طرح Mash کیا اور اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے قاسمی صاحب کو کھلایا۔ میں نے جب قاسمی صاحب کو بتایا کی میرا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا ہے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ موسم کے حوالے سے حیدرآباد کی شامیں بہت خوشگوار ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات شام کو سمندری ہوائیں چلتی ہیں جن سے موسم بہت خوش گوار ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں چوں کہ جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہر طرف حبس کی حکمرانی ہوتی ہے اس لیے قاسمی صاحب کی اس بات سے مجھے بہت تسلی ہوئی کہ حیدرآباد میں کم از کم اس حبس زدہ موسم کا سامنا تو نہیں کرنا پڑے گا۔ قاسمی صاحب کا یہ مشاہدہ سو فیصد درست تھا کیوں کہ میں اگست ۲۰۰۳ء کے شروع میں جب حیدرآباد پہنچا تو سب سے پہلے ان تیز سمندری ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔

قاسمی صاحب سے ملاقات کے بعد جب واپس لوٹا تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا کیوں کہ میں ایک آدمی سے نہیں ایک عہد سے مل کر آ رہا تھا۔ ایک آدمی جو *۲۱ نومبر ۱۹۱۵ء کو احمد شاہ کے نام سے انگہ (سرگودھا) کی زمین پر اُتارا گیا تھا اب وہ احمد ندیم قاسمی بن کر ایک عہد میں ڈھل چکا تھا۔ موضع انگہ (سرگودھا) کا یہ موٹا سا، ٹھن متھنا، بچہ جسے مسجد مکتب کے مولوی نے اپنے ۶۰ سالہ تجربے کی بنا پر غبی (کند ذہن) ثابت ہونے کی نوید سنائی تھی، پانچ برس کی عمر میں پرائمری سکول میں داخل ہوا تو پہلی جماعت کے ادنیٰ و اعلیٰ درجوں سے میٹرک تک "مانیٹری" کرتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے گریجویشن کے بعد ۱۹۳۹ء میں محکمۂ آب کاری میں سب انسپکٹر کے عہدے پر تعینات ہو گیا۔ لیکن نوکری اسے کب راس آنے والی تھی، اس کی منزل تو بہت دور تھی اور راہ پُرخطر مگر اسے وہاں ضرور پہنچنا تھا۔ اس نے شعر کو اپنا عصا بنانا تھا اور افسانے کو زادِ راہ۔ اس نے تو ساتویں جماعت میں ہی اسّی (۸۰) صفحات کا ناول لکھ ڈالا تھا اور مولانا محمد علی جوہرؔ کی وفات پر ایک نظم بھی تخلیق کر ڈالی جو روزنامہ "سیاست" کے صفحۂ اوّل پر شائع بھی ہو گئی۔ پڑھائی اور نوکری سے اپنی جان چھڑا لینے کے بعد اس نے ایڈیٹری شروع کر دی۔ ایک عرصہ تک پھول، تہذیبِ نسواں، ادبِ لطیف، سویرا، نقوش اور فنون کی ایڈیٹری کی۔ ساتھ ساتھ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید نگاری بھی چلتی رہی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کے بعد دو مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں مگر پھر حکومت نے تمغۂ حسن کارکردگی (۱۹۶۸ء)، ستارۂ امتیاز (۱۹۸۰ء)، کمالِ فن ایوارڈ (۱۹۹۷ء)

---

* احمد ندیم قاسمی کی تاریخ پیدائش عموماً ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء معروف ہے تاہم خود قاسمی صاحب کی بعض تحریروں میں اُن کی یہی تاریخ پیدائش درج ہے مضمون نگار نے اگر اس کو درست مانا ہے تو یہ اُن کی اپنی صوابدید ہے۔ (مدیر)

اور نشانِ امتیاز (۱۹۹۹ء) جیسے اعزازات سے نوازا۔ ۱۰، جولائی ۲۰۰۶ء کو آسمان ادب کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ ادب کا ایک زرّیں باب ختم ہوا، احمد ندیم قاسمی کے جانے سے ایک عہد کا اختتام ہوا مگر میں اور مجھ جیسے ہزاروں لوگ زندگی بھر اس بات پر فخر کرتے رہیں گے کہ ہم عہدِ ندیم میں زندہ تھے۔ ہم نے ان ہاتھوں کو چھوا ہے جن ہاتھوں نے اردو ادب کے لیے لازوال افسانے رقم کیے۔ ہم اس بات پر اِترا تے رہیں گے کہ ہماری تخلیقات احمد ندیم قاسمی نے دیکھیں اور انھیں سہ ماہی ''فنون'' میں چھاپ کر اعتبار بخشا۔ میں نے قاسمی صاحب کی وفات کے بعد ایک غزل کہی تھی، جس کا ایک شعر کچھ یوں تھا:

سب رونقیں ادب کی گئیں قاسمی کے ساتھ
مدت ہوئی ''فنون'' کو نکلے ''مزنگ'' سے

☆☆☆☆

نعمان منظور

ندیم صاحب کی محبت

ندیم صاحب کے فن اور شخصیت پہ کچھ بھی لکھنا نہایت آسان ہے لیکن اس کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ لکھنے والے کو 'محبت' کے لفظ سے آشنائی ہو اور وہ خود بھی محبت کرنے اور محبت نبھانے کے فن سے آشنا ہو۔ کہنے کو 'محبت' ایک چار حرفی لفظ ہے اور اس لفظ کا آغاز 'م' سے ہوتا ہے جو محبوبِ خدا کے نام کا بھی پہلا لفظ ہے یعنی 'محمد ﷺ'، محبت میں دوسرا حرف 'ح' ہے جو اسمِ مونث، عربی کا چھٹا، فارسی کا آٹھواں اور اردو کا نواں حرف ہے۔ 'ح' سے لفظ 'حب' بنتا ہے جس کا مطلب بھی عربی میں محبت، الفت اور دوستی اور پیار ہے۔ 'محبت' میں تیسرا حرف 'ب' ہے جس سے لفظ 'باخبر' بھی بنتا ہے، یہ ایک صفت ہے اور اس کا مطلب 'عارفِ کامل اور 'مدبر' بھی ہوتا ہے۔ محبت میں آخری حرف 'ت' ہے جس سے 'تادیب' یعنی ادب سکھانا ہے'۔ اب اگر ذرا سا غور کیا جائے تو ندیم صاحب کی ساری عمر انہی چار حرفوں کے گرد گھومتی رہی ہے۔ ندیم صاحب نے نعت لکھی تو 'عشقِ محمدؐ' کی انتہا کر دی۔ جب 'حب' پہ آئے تو کیا اپنا اور کیا پرایا، سبھی پہ محبت نچھاور کی۔ 'باخبر' یعنی عارفِ کامل یا مدبر اتنے تھے کہ برسوں پاس بیٹھنے والوں کو بھی اپنی تکلیف کا علم نہیں ہونے دیا بل کہ کسی کو کانٹا بھی چبھ جاتا تو تکلیف محسوس کرتے اور احباب کی خوشی میں خوش رہتے۔ 'تادیب' یعنی ادب سکھانا، مجھ سمیت، آپ میں سے اکثر احباب نے ادب کرنا اور ادب انہی سے سیکھا۔

سو ندیم صاحب کے فن اور شخصیت کو سمجھنے اور اس پہ کچھ لکھنے سے پہلے 'محبت'، اور اس کے چار حرفوں 'محمدؐ'، 'حب'، 'باخبر اور 'تادیب' کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے کہ ندیم صاحب نے اپنی ساری عمر اسی چار حرفی لفظ کی حرمت میں گزاری۔ ہم بات ندیم صاحب کی شاعری سے شروع کریں یا ندیم صاحب کے افسانوں پہ بات کریں، موضوعِ گفتگو کچھ بھی ہو، بات ندیم صاحب کی محبت پہ ہی ختم ہوگی۔ ندیم صاحب کی شاعری پہ بات کرنا میرے بس میں نہیں کہ خالد احمد مجھے اکثر کہا کرتے تھے 'نعمان! اگر تم اپنی عقل استعمال کرو تو بہت اچھے شاعر بن سکتے ہو'، سو میں نے کبھی اپنی عقل استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ محبت کرنے اور محبت نبھانے کی ہر ممکن سعی کرتا رہتا ہوں۔

اندازہ لگایئے کہ میں ندیم صاحب سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۸ میں ملا تھا اور پھر ۱۹۸۰ سے باقاعدہ 'فنون' جانا شروع کیا تو دس برس تک متواتر حاضری دیتا رہا لیکن وہاں جا کے خاموشی سے ایک کرسی پہ بیٹھ جاتا اور باتیں سنتا رہتا، بس ندیم صاحب کے حال چال پوچھنے پہ بول پڑتا ورنہ خاموش رہتا۔ اُن دس برسوں میں، میں نے وہاں سے صرف ایک سبق لیا کہ 'محبت' کیسے کی جاتی ہے؟ اور اسے نبھانے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں؟۔ ندیم صاحب بہت بڑے شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار اور انسان تھے لیکن میرے نزدیک وہ صرف سراپا محبت تھے۔ محبت ان کی آنکھوں میں بولتی تھی۔ ندیم صاحب کی محبت صرف ہم تک محدود نہیں تھی ان کی محبت پاکستان سے، پاکستان کی مٹی سے جڑی ہوئی تھی۔ ان کی شاعری میں پاکستان اور پاکستانیوں کے مسائل اور مٹی کی محبت ہی تھی، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی رات پاکستان ریڈیو پشاور سے ندیم صاحب کا لکھا ہوا ملی نغمہ پیش کیا گیا جس کے بارے میں بہت کم احباب کو علم ہے لیکن ندیم صاحب نے اس بات کا کبھی بھی چرچا نہیں کیا کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان سے ان کی محبت غیر مشروط ہے۔

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ میں وجود میں آئی اور ادب میں نئے انداز کی تبدیلیاں بھی شروع ہوگئیں۔ پرانے اور نئے ادب میں ایک امتیاز سامنے آنا شروع ہوا۔ ترقی پسندوں نے ایک تحریک کے حوالے سے لکھنا شروع کیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ یہ تحریک ایک مخصوص قسم کی سیاست کے زیرِ اثر تھی۔ میرے نزدیک اس تحریک میں ادب کم اور سیاسی زور و شور زیادہ تھا۔ اس طرح ادب کی تحریک سیاسی تحریک کی آلہ کار بن گئی تھی۔ ندیم صاحب نے ترقی پسندی کی ابتدا اور انتہا دونوں کو دیکھا اور جائزہ لیا اور خاص طور پہ اپنے افسانوں اور کہانیوں میں پروپیگنڈے کی نفی کی اور جذباتیت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ ندیم صاحب کا یہ کارنامہ اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ افسانوی ادب میں ایک جاندار تبدیلی تھی۔ ندیم صاحب ایسے دانشور اور افسانہ نگار تھے جو کانٹوں میں بھی راستہ بنانا جانتے تھے۔ انھیں اپنے ماضی پہ ناز تھا۔ ان کا اندازِ فکر فعال تھا۔ وہ اخلاقی اقدار کو زندگی کا اثاثہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے افسانے کے مقاصد کو بلند اور ارفع کر کے اخلاقی اقدار کو اپنے فن کا محور بنا لیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ زندگی کو پرکھا جا سکتا ہے۔

ندیم صاحب کی شخصیت اور فن کا پس منظر دیہی ہے اور اخلاقیات کے حوالے سے انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں سوال بھی اٹھائے ہیں۔ ہمیں بار بار جھنجھوڑا ہے کہ افسانے صرف قصے اور کہانی نہیں ہوتے ان میں انسان کی اپنی بھی شخصیت ہوتی ہے۔ ندیم صاحب نے زندگی کے مسائل اور مصائب فلسفوں کی گہرائی میں

جا کے اخذ کیے ہیں۔ ان کو ایسا کرنا بھی چاہیے تھا کہ یہ علم و بصیرت کا بہترین استعمال ہوتا ہے۔ اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہماری تربیت بھی ہوتی ہے۔

ہم اگر ندیم صاحب کے افسانوں کی بات کریں تو اکثر یہ فقرہ سننے کو ملتا ہے کہ 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات اور دیہاتی زندگی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے'۔ میں مانتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک ہے لیکن میں نے کسی بھی نقاد سے آج تک یہ بات نہیں سنی کہ 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں محبت کا پہلو بھی صاف دکھائی دیتا ہے'۔ ہو سکتا ہے بلکہ یقیناً یہ میری کم علمی ہی ہوگی کہ میں نے آج تک ندیم صاحب کے افسانوں کے بارے میں کسی نقاد کو 'محبت' کے بارے میں گفتگو کرتے نہیں سنا۔ پھر بھی میں آپ کی خدمت میں ندیم صاحب کے تین افسانوں کے تین اقتباس پیش کرتا ہوں، ویسے تو ندیم صاحب کے بے شمار افسانے ہیں جو سارے ہی میرے پسندیدہ ہیں۔

بھری دنیا میں

اُن دنوں تم سچ مچ کنول کا پھول تھیں۔ تمہاری پتیوں پر اگر کوئی بوند گرتی تو صرف پھسل کر گر جانے کے لیے۔ تمہاری پنکھڑیوں کا ہلکا ہلکا گلابی رنگ، جو مرمریں سفیدی میں مبہم سی جھلکی مارتا تھا، بالکل شفق کے مشابہ تھا۔ تم ہنستی تھیں تو صرف اس لیے کہ تم ہنسنے پہ مجبور تھیں مگر تمہارا رونا بالکل تمہاری بے لوث ہنسی سے بھی زیادہ لذت انگیز تھا۔ تمہاری آنکھوں کی کٹوریاں چھلکنے کے لیے پلکوں کی ایک جھپک کی محتاج نظر آتیں۔

بھاڑا

ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی کالی، سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پہ ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔ اُن آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی تو سورج کو طلوع ہونے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی۔

نامرد

میں نے کنول کے پھولوں کو بھی چھوا ہے اور نرگس کے ڈنٹھلوں کو بھی، مگر اس کی ہتھیلی کنول سے زیادہ گداز اور اس کی انگلیاں نرگس کے ڈنٹھلوں سے زیادہ سبک تھیں۔ اُن میں آنچ بھی تھی اور خنکی بھی اور جیسے اس کے ہاتھ کی ساری رگیں لرز رہی تھیں۔ میں اُس لرزش کی آواز تک سن سکتا تھا، جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کا

طواف کرتے ہوئے سرسراتی اور جھنجھناتی ہیں۔ بہت دیر تک وہ ہاتھ میرے ہاتھ میں یا میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا۔

دیکھا، آپ نے کہ ندیم صاحب، جن پہ ان کی زندگی میں ہی یہ کلیہ لگ گیا تھا کہ 'اگر دیہاتی ماحول کو پڑھنا اور سمجھنا ہے تو احمد ندیم قاسمی کے افسانے پڑھ لیں'۔ ہم نے تو شہر میں آنکھ کھولی تھی لیکن ان کھلی آنکھوں سے دنیا کو ہم نے 'فنون' سے ہی دیکھنا شروع کیا تھا تو ہمیں 'دیہات' بھی نظر آیا اور جناب احمد ندیم قاسمی کی 'محبت' بھی۔ میں نے ابھی جو تین اقتباس پیش کیے ہیں، دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ محبت کے بارے میں، اگر کسی کے دل میں ذرا برابر بھی شبہ ہے تو ان تینوں اقتباسات کو دوبارہ پڑھ لے تو ساری کی ساری محبت سمجھ میں آ جاتی ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار

احمد ندیم قاسمی، تخلیقی جہتوں کے آسماں

تخلیقی فعالیت کے سامنے آ کر کائنات کی رفعتیں اور زندگی کی وسعتیں سمٹ کر ایک نقطۂ موہوم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ انسانی شعور جب ہستی کے تلاطم کے گرد ہالہ بننے لگتا ہے تو زندگی پر بازیچۂ اطفال کا گمان ہونے لگتا ہے۔ من کا ادراک جب پنکھ پھیلاتا ہے تو افلاک کی بلندیاں ان کی اڑان کی تمہید بن جایا کرتی ہیں۔ حوادثِ حیات جب تخلیقی جبلتوں سے متصادم ہونے لگتے ہیں تو نئی دنیا جنم لینے لگتی ہے اور عرفان کا تجربہ جب تجربوں کا عرفان عام کرتا ہے تو تخلیق کی سطح پر احمد ندیم قاسمی کا سراپا ابھرنے لگتا ہے۔ ایسا سراپا جس کا ہر زاویہ اور ہر جہت زندگی کے انکشافات کا مصدر و منبع محسوس ہوتا ہے۔ ایسا سراپا جس کی گہرائیاں اپنے انعکاس میں ترفع کے آسماں لیے پھرتی ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں بل کہ گزشتہ صدی کی ادبی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے بل کہ سچ تو یہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی بجائے خود بیسویں صدی کے اردو ادب کے صنفی تنوعات کی غیر منقطع تاریخ اور مسلسل ارتقا ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ انھوں نے تو فقط اپنی سانسوں کی گنتی پوری کی ہے۔ گویا قاسمی صاحب کو عالمِ طبعی کے اس روایتی تلخ حادثے نے مارا نہیں زندہ کیا ہے بل کہ وہ اپنے ساتھ پوری ایک صدی کی ادبی تہذیب، سماجی اقدار، ثقافتی رنگا رنگی، ہنری روایات، سیاسی بصیرت اور ادبی نظریات کو بھی جاوداں بنا گئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی شاعرانہ ارتفاع کی وہ کہانی ہیں جو اپنی روانی محبت کے جمودی لمحات کو بھی تحریکِ نو سے سرشار کر دیا کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی زندگی کی شکستہ ساعتوں کا ایسا آفاقی افسانہ ہیں جو اپنے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے انکشافات کا ساتواں در ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صحافتی بوالعجبیوں کی ایسی داستان ہیں جس کی طوالت کا ہر پہلو اور جس کے ضمنی واقعات کی ہر جہت معاشرے کی بھٹکتی سوچ کو انکشاف اور اعتراف کی بے ریا دہلیز پر لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کے قلم کی نوک پر آ کر جب مہکتے الفاظ ارتعاش کی منزل کو چھونے لگتے ہیں تو اذہان میں آگہی کے دریچے وا ہونے لگتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے ہنر اور ادراک کا کوئی بھی مرحلہ اپنی تکمیل کا دائرہ ادھورا اور نامکمل نہیں چھوڑتا۔ وہ

جب افسانہ لکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں اسی کام کے لیے بنایا ہوگا۔ سادہ کہانی، کب، کہاں اور کیوں کر افسانے کا روپ دھار لیا کرتی ہے۔ یہ راز موصوف کے افسانوں کے تیکنیک اور ٹریٹمنٹ (Treatment) کو دیکھ کر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ سہیل احمد کہانی اور افسانے کے تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”دراصل کہانی اور افسانہ میں اشتراکی عنصار ہونے کے باوجود ایک فاصلہ ہے۔ ہر افسانہ میں کہانی ہوتی ہے مگر ہر کہانی افسانہ نہیں بن سکتی۔ کہانی اور افسانہ کے درمیانی فاصلہ کو بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کا تعلق الفاظ سے زیادہ محسوسات سے ہے۔۔۔۔ مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ کہانی افسانہ کب بنتی ہے اور کس طرح بنتی ہے، میرے لیے اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔“

احمد ندیم قاسمی کی کوئی بھی کہانی افسانہ بننے کی منزل سے پیچھے نہیں رہتی، بھرپور افسانویت ان کی کہانیوں پر حاوی رہتی ہے۔ افسانے اور کہانی کا درمیانی فاصلہ ان کے یہاں محسوس ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ الفاظ کے بیرائے میں جذباب اور احساسات کا اظہار یقینی بناتے ہیں۔ شہری متمدن زندگی کے تلازمے ہوں یا گاؤں کی پسماندہ زندگی کے مسائل، قاسمی کا افسانہ نگار قلم بلاتفریق دونوں کا احاطہ اس طرح کرتا ہے کہ پھر وہ سب کچھ حافظے سے چپک کر رہ جاتا ہے۔ جتنی کثیر الجہات افسانوی تصویریں احمد ندیم قاسمی کے یہاں نظر آتی ہیں، پورے اردو ادب میں ان کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ چوپال، بگولے، طلوع وغروب، در و دیوار، کپاس کا پھول، اور نیلا پتھر وغیرہ ان کے وہ افسانے اور نمائندہ افسانوی مجموعے ہیں جو اردو افسانے میں فکری کم مائیگی کے احساس اور ہنری خلا کو پر کرتے نظر آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی جب انتقادِ ادبیات کے مراحل میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں کے بے لاگ تجزیے اور بلا تعصب محاکے تخلیق کاروں کی کاوشوں کو نہ صرف آلائشوں اور کثافتوں سے منزا کرنے کی راہ دکھاتے ہیں بل کہ اس طرح تخلیق کے امکانات کی گرہ کشائی بھی ہو جاتی ہے۔ ان کے نقد کا اسلوب دوٹوک، قطعی، عملی اور ادبی جاذبیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں یہ نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

> ”رضا کی شخصیت تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس کی نگارشات اردو، پشتو ادب کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔۔۔۔ اس کی غزل عصر حاضر کے تقاضوں کا کماحقہٗ

> لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی شعری روایت کا وقار بھی برقرار رکھتی ہے۔ یوں
> ایسی غزل وجود میں آتی ہے جو گزری ہوئی صدیوں کے لیے بھی اجنبی نہیں اور آنے
> والی صدیوں کے امکانات کی امین بھی ہے۔''

یہ انتقادی رائے ایک جانب رضا ہمدانی کی تخلیقی بصیرت سے پردہ اٹھاتی ہے تو دوسری جانب احمد ندیم قاسمی کے انتقادی نظریات کی وسعتوں کا تعین بھی کرتی ہے۔ اس طرح اس رائے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کی بات کے پیچھے صدیوں کا ادبی شعور متحرک ہے۔ بلاشبہ ان کی تنقید اپنے تمام ادوار کے حوالے سے زندگی اور ادب میں خیر کی قدروں کو عام کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ڈاکٹر شہادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''ادب اس وقت تک صحیح معنوں میں ادب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں خیر کی قدروں
> کو فروغ دینے کا احساس اور شعور پوری قدرت کے ساتھ موجود نہ ہو۔ یہ احساس و شعور
> ہر زمانے کے ادب میں ہوتا ہے۔ اور اس کی بلندی و برتری کو اسی پیمانے سے ناپا
> جاتا ہے۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی وابستگی بالعموم ادب کی بیشتر اصناف سے اور بالخصوص نقد و انتقاد سے ان کا رشتہ شر کی شکست اور خیر کی فتح اور ترویج کی بنیاد پر استوار رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اردو شاعری کو ارتقا کے اگلے مراحل کی جو کہکشائیں عطا کی ہیں ان کی بدولت اردو شعر و سخن کی بزم کی رونق میں اضافے اور وقار میں فراوانی کے باب کھلتے نظر آتے ہیں۔ اردو نظم کو انھوں نے جذباتی تعمق تخیلاتی اپج اور فکری وسعتوں کی جن سرشاریوں میں ابھارا ہے وہ جداگانہ انفرادیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے طویل پابند نظموں میں جذبہ حب الوطنی جن ہنروارانہ اسالیب اور جن تفکراتی زاویوں میں اجاگر کیا ہے، وہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک تسلسل میں لا کر اکائی کی صورت میں ڈھالتے رہے ہیں۔ اس طرح ان کی غزل نہ فقط قدیم و جدید کا سنگم بنتی ہے بل کہ نہایت اگلے پڑاؤ پر اردو غزل کو بے پناہ نئے رجحانات کا راستہ بھی دکھاتی ہے۔ یوں اردو شاعری کی تاریخ میں ان کی غزل ایک جدید تہذیب کی بنیاد اور ایک بے چہرہ عہد کی شناخت کا آئینہ بن کر ابھرتی ہے۔ انھوں نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر حوالے سے اپنی وقعت اور انفرادیت ثابت کی ہے۔ یقیناً اس عمل کے پس منظر میں ان کے یہ احساسات کارفرما رہے ہوں گے۔ فرماتے ہیں:

> ”آزادی کی تحریک کو میں انسانی آزادی کا عنوان قرار دیتا ہوں۔ مگر آج کا مروجہ قانون ایسا ذکی الحس ہے کہ شعر کہنے بیٹھوں تو خیال کو لبادے پہنانے پڑتے ہیں۔ میں الفاظ کو فرغلوں میں لپیٹنے کا عادی نہیں ہوں، اس لیے ایک ایک شعر پر سو سو بار محسوس کرتا ہوں کہ میری روح قبض ہو رہی ہے۔“

رم جھم، جلال و جمال، شعلۂ گل، دشت وفا، محیط اور دوام ان کے مجموعہ ہائے کلام ہیں جن میں ان کی تخلیقی انا اور شاعرانہ بصیرت ارتقاء کے کئی اہم سنگ میل عبور کرتی رہی ہے۔ امجد اسلام امجد نے کہا تھا:

> ”آواز، لفظ، زبان اور اسلوب، شعری اظہار کے بنیادی عناصر ہیں لیکن کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ان چاروں عناصر ترکیبی سے ماورا، ان سے مختلف کوئی بالکل الگ سی چیز ہے۔ میں اسے محسوس تو کرسکتا ہوں لیکن لفظوں میں وہ لفظ، رنگوں میں وہ رنگ، لمسوں میں وہ لمس اور خوشبوؤں میں وہ خوشبو شاید میری پہنچ سے باہر ہے، شاید وہ ہے ہی نہیں، مر چکی ہے یا شاید ابھی پیدا نہیں ہوئی۔“

گویا بعض تخلیق کاروں کو تخلیقی انہماک، تجربات کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے اور انکشاف کی بجائے یہ سلسلہ بے نام جہات اور نامعلوم سمتوں میں بھٹک کر بکھر جاتا ہے تاہم احمد ندیم قاسمی کا تخلیقی ایقان، ہنروارانہ عرفان اور شفاف ادراک راستے دریافت کرتا ہے۔ منزلیں اس سے ہم آہنگ ہو جایا کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقی فراست کے لیے ماورا ہونے کے معانی ہی بدل جایا کرتے ہیں۔ ان کا تخلیقی صرف کسی تردد کا شکار نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انھیں لفظوں میں مطلوب لفظ مل جایا کرتا ہے۔ رنگوں میں مقصود رنگ ان سے حجاب کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے اور وہ مخصوص خوشبو خود ان کے قلم کا تعاقب کرتی ہے جس پر کسی تخلیق کے ارتقاء اور ارتفاع کا انحصار ہوتا ہے اس لیے تو کمال ایقان کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

روز اول سے ہے فطرت کا نقیب آدم زاد
دھوپ نکلی تو مرے جسم سے سایہ نکلا

فتح محمد ملک اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ”آس پاس کی دنیا ہو یا ماورا کا جہاں، ندیم کا دل بیدار اور ندیم کی چشم بینا ہر آن، افق حسن کی جانب نگراں رہتی ہے۔ افسانہ ہو یا شاعری آپ ندیم کو اپنی تہذیبی و فکری

> روایت کے پس منظر میں حسن کو ذکاوت احساس کے ساتھ سمجھنے اور عفت قلب ونظر کے ساتھ پیش کرنے میں منہمک پائیں گے۔ ندیم کے نزدیک حسن فرد کے جذباتی وروحانی زخموں کے لیے مرہم اندمال ہے تو معاشرتی اور تہذیبی روگوں کے لیے زبردست قوت شفا“

احمد ندیم قاسمی کی شاعری عہد بہ عہد ایک تحاریک برپا کرتی رہی ہے۔ کئی ایک تحاریک کی ترجمان رہی ہے لیکن من حیث المجموع کسی تحریک میں گم ہوئی ہے اور نہ ہی کسی ادبی یا سیاسی تحریک کے نقائص اور مصائب اس کی رگ وپے میں سرایت کرتے نظر آئے ہیں۔ شاید اسی بھروسے پر فتح محمد ملک کو کہنا پڑا۔

> ”ندیم عصرِ رواں کی فنی اور فکری تحریکوں کے منفی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر ان سے اکتساب فیض کر پائے اور مشق سخن کے دور سے ہی ان کا فنی افق اس قدر وسیع، لہجہ اس قدر توانا، دل اس قدر گداز اور اندازِ نظر اس قدر مابعد الطبیعاتی رہا ہے کہ عہد حاضر کا سوز وساز اور درد وکرب ان کی شاعری میں سمٹ آیا ہے۔“

احمد ندیم قاسمی کا تخلیقی ذہن افق در افق کہکشاں اور جہت در جہت آسماں بنتا رہا ہے۔ ان کی نوکِ قلم سے نکلی ہوئی کوئی تحریر بھی متفرق صنفی اختصاصات کے باوصف ضمنی یا ثانوی نوعیت کی نہیں۔ وہ جس صنفِ ادب میں بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اسے اس کے جملہ فنی تقاضوں اور فکری مقتضیات کی رعایت سے زندہ کر دیتے یا اس کے احیاء کے لیے امیدوں کے آفتاب و ماہتاب طلوع کرتے۔ یقیناً ان کی تحاریر پر ان کے بعض بشری تقاضے بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں تاہم ان کی تحاریر میں شعوری لغزشوں کی ایک موہوم جھلک بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ وہ ہشت پہلو ادبی حیثیات کے حامل رہے ہیں لیکن ان کے قلم کی توانائیاں کسی خاص صنف یا شعبہ ہائے ادب سے منسلک رہ کر زوال یا ضعف سے ہم کنار نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے جب وہ صحافت سے اپنی قلمی وابستگی اختیار کر لیتے ہیں تو پھر وہ ہر پہلو سے ایک منجھے ہوئے صحافی نظر آتے ہیں۔ ان کے کالم روزمرہ کے مسائل کا اس طرح احاطہ کرتے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ گویا یہ مسائل اپنے آپ ان کے کالموں میں زندہ رکھنے کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کالم نگار قلم کی نوک سے مترشح مسائل فقط خارجی سطح پر اظہار نہیں پاتے بل کہ اپنی داخلیت کے سات دروازے قاری کے لیے کھول دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی صحافیانہ تحریریں عوامی سطح کا لحاظ رکھنے کے باوصف بلند معیاری اور مخصوص ادبی فضا کی نفی نہیں کرتیں۔ ہفت روزہ

پھول، لاہور۔ ہفت روزہ تہذیب نسواں، لاہور۔ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور۔ ماہنامہ سویرا، لاہور۔ ماہنامہ نقوش، لاہور۔ ماہنامہ سحر، لاہور۔ روزنامہ آج، پشاور۔ روزنامہ امروز، لاہور اور فنون، لاہور وغیرہ ان کی صحافتی زندگی کے شب و روز کو معتبر ہونے کی سند فراہم کرتے ہیں۔ ان کی صحافتی حیات سے مجنونانہ وابستگی کی ایک جھلک سنگِ میل پشاور کے مدیر فارغ بخاری کے نام لکھے گئے ان کے اس مراسلے میں ملاحظہ کیجیے:

> ''میرے لیے یہ بے حد مسرت کا مقام ہے کہ سنگِ میل کا احیاء ہو رہا ہے۔۔۔۔ میں جانتا ہوں اور آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ ہم قلمی محنت کش، رسالے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے مگر اس جنون کا کیا علاج جو مجھے ''فنون'' جاری رکھنے اور آپ کو ''سنگ میل'' کے دوبارہ احیاء پر مجبور کر دیتا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی کا صحافیانہ قلم چاہے سنجیدہ مراحل عبور کر رہا ہو چاہے ہلکے پھلکے نیم مزاحیہ یا طنزیہ راستوں پر گامزن رہے۔ انسانی وقار اور انا پر وار نہیں کرتا۔ کسی کی عزت نفس کو مجروح کرنے سے دامن بچاتا ہے۔ یہ تسلیم کہ اپنے خاص انداز میں وہ بعض طبقوں کے نامناسب رویوں کی مذمت کرتا اور کچوکے لگاتا ہے۔ البتہ ان کا قلم انسان کی دل آزاری کی لغزشوں سے بے قابو نہیں ہوتا۔ گویا بڑی حکمت سے اپنے فرائض نبھاتا ہے لیکن یہ حکمت غاصب کے خلاف للکار اور جابر کے سامنے احتجاج بننے سے کہیں بھی باز نہیں آتی۔ ان کی صحافیانہ حیات اک جانب ان کی ڈرامہ نگاری کی یاد تازہ کرتی ہے، کہیں ان کے انشائیہ نگارانہ حربوں کا پتہ دیتی ہے تو کہیں تہذیب نسواں لاہور کے حوالے سے ان کی بے بدل ترجمہ نگاری کا اعتبار بھی قائم کرتی ہے۔

ادب کی دنیا میں احمد ندیم قاسمی بلا مبالغہ ہر فن مولا رہے ہیں۔ انھوں نے جس منثور یا منظوم صنفِ سخن کو چھوا ہے، اسے ارتقا کی لذتوں سے مالا مال کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ اشعار ان کی ہمہ جہت تخلیقی فراست پر ہو بہو صادق نظر آتے ہیں۔

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستان بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
ہم سفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اسی لیے راقم الحروف نے انھیں تخلیقی جہتوں کا آسمان کہاں ہے۔ یہ آسمان اپنی رفعتوں میں جلال و جمال

کے بے تحاشا مناظر کو جگہ دیتا ہے۔ وہاں روز و شب، طلوع و غروب کا سماں رہتا ہے جو زندگی کی متحیر المزاجی کا پول کھولتا ہے۔ آسماں کی یہ بلندیاں زمین کی وسعتوں کو تسخیر کر کے لحہ بہ لحہ اس کی گہرائیوں سے محوِ کلام ہونے کی رعایت نکالتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ادبی افق پر کئی اہل قلم نے صنفی تنوعات کے پھول کھلانے کی کوشش کی ہے لیکن انھیں اس سلسلے میں جزوی اور وقتی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ شاید احمد ندیم قاسمی ادبی دنیا کے واحد فعال کردار ہیں جنھوں نے علم و ادب سے وابستہ ہر شعبہ میں نہ فقط اپنی عظمتوں کو منوایا بل کہ جس جس صنف سے وہ منسلک رہے، اسے شناخت کے نئے حوالے بھی بخشتے رہے۔ اس بات کا انھیں خود بھی شدید احساس تھا۔ اس لیے ان کے لاشعور کی یہ بازگشت جگہ جگہ سنائی دیتی رہی۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

یقیناً یہاں ’بجھ تو جاؤں گا‘ کے الفاظ نہایت ظاہری معنوں میں مستعمل نہیں ہیں بل کہ بجھنے کا عمل از سرنو روشن ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ یہاں بجھ جانا ختم یا فنا ہونا نہیں ہے بل کہ تنویر کا عالم گیر اہتمام کر کے اس کی ابدیت اور دوام کا گرہ کشا بنا ہوا ہے۔

گویا احمد ندیم قاسمی نے عالمی تہذیبوں کے ہاتھ میں زندگی کے مجاہدوں کا جو نصاب تھمایا ہے۔ اس کا حرف حرف اتنا روشن، تابندہ اور درخشاں ہے کہ حالات کی تاریکیاں نہ صرف اس کے سامنے آتے ہی سایہ سایہ لرزنے لگتی ہیں بل کہ تحلیل ہو کر سفیدیٔ سحر میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اسی سبب سے وہ تخلیقی جہتوں کے آسماں ٹھہرتے ہیں۔

☆☆☆☆

محسن شکیل

تم نے ہمیں قابلِ فخر بنایا

سانحہ بہت بڑا تھا، گونج یک دم پھیل گئی۔ میں نے بھی سنا تو سکتے میں آ گیا لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ پے در پے سانحات ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا پر تفریحی پروگراموں کے دوران اسکرین کی باریک پٹی پر دوڑتی مظالم کی خبروں نے رستے لہو کو دیکھنے اور اس کی شدت کو نرم کرنے میں اس خوبی سے اپنا منفی کردار ادا کیا کہ بڑے سے بڑا حادثہ بھی لمحہ بھر کے تاثر کے بعد اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ لگتا ہے میڈیا ہماری آنکھوں میں ویژن ولز کی بار بار Repetition سے آنسو نکلوانے کی سوچی سمجھی سکیم پر عمل پیرا تو ہے لیکن میرے غم میں شریک نہیں۔ میرا دکھ جو ذرا مختلف انداز کا ہے، اسے پیش نہیں کیا جا رہا۔ سب کچھ انجینئرڈ ہے۔

قاسمی صاحب کی شدید علالت کی خبر میں ان کی کالم نگاری کا اعلان وضاحت سے کیا گیا۔ مجھے لگا اب ادیب مر رہا ہے، شاعر آخری سانس لے رہا ہے، دانش جاں بلب ہے جبکہ کالم نگار زندگی پا رہا ہے۔ تخیل گم کیا جا رہا ہے، مثالیہ کھو رہا ہے۔ دوسرے دن ان کے انتقال کی خبر آ گئی خبر کو بھی خون خون گلیمرائز کیا گیا۔ قاسمی صاحب نے لکھا تھا کہ:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

لیکن مجھے ادیب کی یہ خوش فہمی بھی ہوا ہوتی نظر آئی۔ روزمرہ کے تذکروں میں پی آئی اے کی ہلاک ہونے والی ایئر ہوسٹس تک کا ذکر آتا رہا لیکن قاسمی صاحب نہ ہونے کے برابر۔ ادیب اس انجینئرڈ میڈیا کی ترجیح نہیں۔ چلو اچھا ہی ہے۔

تمام سچ لکھنے والوں کی طرح احمد ندیم قاسمی صاحب نے سماج میں تخلیقیت ابھارنے کے لیے ہر تازہ کار لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمارے آج کے ادب کے بہت قد آور ناموں کی پرورش اور تربیت میں انھوں نے بہت کردار ادا کیا۔ فنون جیسے اعلیٰ معیار کے ادبی رسالے کے ذریعے فکر و فن کے تازہ اور قدیم زاویوں، امکانات اور موضوعات پر تسلسل سے عمیق مباحثے اور تجزیے ہم ایسے ادب کے طالب علموں اور قارئین کی تربیت کرتے رہے۔ ہم سب کے اجتماعی خوابوں کی تربیت میں وہ اپنی آخری سانس تک موجود رہے۔ جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہ ہونے کے باوجود اردو ادب کی تاریخ میں ان کے تخلیقی کاموں کی سانسیں تا دیر محسوس

ہوتی رہیں گی کہ ادیب اپنے عہد کی صورت گری کے ساتھ ساتھ مستقبل کا خاکہ بھی متعین کرتا ہے۔

قاسمی صاحب پرورشِ لوح وقلم میں مگن کسی استعارے کی طرح تھے۔ اس ملک کے لاتعداد مسائل کو کبھی افسانے، کبھی کہانی، کبھی نظم ونثر تو کبھی کالم نگاری سے واضح کیا۔ اس سماج میں مختلف رویوں کی تشکیل کے ذمہ داران نے یہاں کے لکھنے والوں سے جو سلوک روا رکھا ہے، اس کی گواہی میں ہم سب کے پاس کوئی نہ کوئی شہادت موجود ہے لیکن لکھنے والے اپنے تجربے اور وارداتِ قلبی کو بیان کرنے میں مگن ہیں کہ شاید سماجی انصاف تک کی کوئی راہ دکھانے میں اتنا تفویض کردہ کردار ادا کر سکیں۔

فرانس کے صدر شیراک کا فٹ بالر زیڈان کے لیے بیان رپورٹ ہوا کہ پوری فرانسیسی قوم ان سے محبت کرتی ہے، وہ دلوں پر راج کرتا ہے، فرانس اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے فرانس کو قابلِ فخر بنایا کاش اس طرح کے معنوں میں ڈوبا ہوا بیان قاسمی صاحب کے لیے بھی ہمیں پڑھنے اور سوچنے کو ملتا کہ قاسمی صاحب جیسے ادیبوں نے بلاشک وشبہ بین الاقوامی طور پر اس ملک کی پہچان کروائی۔ ''رِم جھم''، ''جلال وجمال''، ''سناٹا''، ''دشتِ وفا'' اور ''دوام'' جیسی کتابیں اس معاشرے کو دیں۔ ''پرمیشر سنگھ''، ''الحمد اللہ''، ''ست بھرائی'' اور لارنس آف تھلیبیا'' جیسے افسانے تخلیق کیے جن میں انسان کا کرب ایک دکھ کی سطح چھوتا نظر آتا ہے۔ دراصل قاسمی صاحب نے انسانوں سے محبت کی۔ اس لیے عاشق کا جنازہ دھوم سے نہ نکلا ورنہ اگر وہ قوم قوم کا ورد کرتے تو سوگ میں کئی اداروں میں چھٹی ہونے کا امکان رہتا لیکن انھوں نے اس سرزمین اور یہاں بسنے والوں کے بارے میں لکھا اور سچ لکھا کہ:

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات بوجھ نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

اگر چہ اب کچھ بھی نہیں ہونے کا لیکن میری سماعت نجانے کیوں یہ سننے کو بیتاب ہے کہ ''احمد ندیم قاسمی نے ہمیں قابلِ فخر بنایا۔''

☆☆☆☆

امرت مراد

ندیم: ایک نقاش، اک مصور

کائنات کی وسعت کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ عالمی سطح پر اندازہ تو درکنار اسے لفظوں میں بیان کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ محدود وسعتوں میں گم اس کائنات میں رہنے والی دوسری مخلوق کے ساتھ ساتھ اشرف المخلوقات یعنی بنی نوع انسان کا وجود بھی کائنات میں رنگ بھرنے میں مصروف کار ہے۔

انسان اور اس سے وابستہ دنیا اور زندگی کے بے شمار رنگ جس میں غم، خوشی، حیرت، سوچ، خیال، تخیل احساس، رشتے، ایجادات، تخلیقات وغیرہ شامل ہیں۔ جنھیں ہم ثقافت کہتے ہیں۔ ثقافت ہمہ گیر معنوں میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ جس میں رہن سہن سے لیکر بودوباش، رسم ورواج، سوچ وبچار، مزاج، احساس، نفسیاتی پہلو، تہوار، میلے ٹھیلے، لباس، خوراک، انداز، عادات حتیٰ کہ اجتماعی اور انفرادی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔

انسان جس جگہ رہتا ہے وہاں کے اثرات اس کے مزاج یا روح کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے بیان میں لفظوں میں اظہار میں، خیال اور تخیل میں وہ رنگ کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ہمہ جہت پہلو لیے ہوئے ہے۔ اور ان کا مطالعے کے ساتھ ساتھ گہرا مشاہدہ ان کی تخلیقات میں نکھار کا سبب بنا ہے۔

اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جس میڈیم کو ندیم نے چنا وہ شاعری اور افسانہ نگاری بڑے میڈیم ہیں۔ ندیم اپنی تخلیقی صلاحیت اور اک وسیع وژن کے ساتھ تخلیق کو دوام بخشتے رہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح اور روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ نئے تصورات اور افکار نو کی صورت میں بے شمار ذخیرہ ذہن میں رکھتے تھے۔ کبھی ان کے اسلوب میں نت نئے تخیل کے اظہار مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں۔

ندیم کے موضوعات کا بطور اک طالبہ مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں دیہات کی زندگی کو نمایاں رکھا ہے۔ دیہات اور وہاں کی طرز زندگی، رسم ورواج، اخلاق و عادات، ماحول کو جس طرح ندیم نے اپنے الفاظ سے تصویری کی صورت زندہ کیا ہے۔ وہ بھی اک اعلیٰ پائے کا ہنر

اور نمونہ ہے۔ پنجاب کی دیہی زندگی اور اس کے رومان پرور فضا، کھیت، کسان، دہقانی زندگی کے مسائل اور برطانوی راج اور ان کے قائم کردہ جاگیردارانہ نظام کو ندیم نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو احمد ندیم قاسمی نے وہ المیہ اپنے الفاظ کی صورت بطور نقاش یوں دائمی طور پر ثبت کیا ہے جو ایسے کسان اور اس کی دہقانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بیان میں وہ تاثر او راثر رہا کہ جب ان کے افسانے پڑھے جائیں تو اک ماحول اپنی پوری شدت کے ساتھ واضح تصویر بن کر سامنے آ جاتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ احمد ندیم قاسمی دیہی زندگی کو ہی Paint کرتے رہے ان کے افسانے کے مجموعے کم و بیش 18 ہیں اور ہر افسانہ موضوع کے تناسب سے اپنی الگ پہچان بیان کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا نام ایسے ادیبوں شاعروں میں ہے جنھوں نے بیسویں صدی میں ایک عظیم نام، عظیم کام کے طور پر اپنا لوہا منوایا ہے۔

ندیم ترقی پسند تحریک کے سرخیل تھے اور انھوں نے اپنے معاشرے کے حقیقی رنگ، زندگی اور حقیقی تلخ مسائل کو موضوع بنا کر افسانوں میں بطور نقاش رنگ بھرے ہیں۔ زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کو ضبط قلم کرنا بھی ایک بڑا فن ہے۔ یہ کام ہی وہی کر سکتا ہے جسے زندگی کے مسائل کا ادراک ہو۔

معاشرہ افراد کے گروہ سے تشکیل پاتا ہے اور افرادی اجتماعی اور انفرادی خصوصیات کی بنا پر الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش کے حوالے سے دیکھا جائے تو طبقاتی جنگ نے جہاں احساس محرومی کو مزید سے مزید تر بڑھاوا دیا وہیں بالادتی کے حوالے سے احساس برتری کو بھی بڑھایا ہے۔ اور انسان انسان کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوتا ہے تو غریب انسان کی مظلومی اس کی واضح مثال ہے۔ معاشرتی تضاد بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ ندیم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جہاں ان معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا وہیں انھوں نے دیہاتی معاشرے کے رسم و رواج سے لیکر لباس، تقریبات، بول چال مزاج کو اس خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ کردار زندہ ہو کر ہمارے سامنے خاص دیہاتی لباس زیب تن کیے کبھی کرخت، کبھی نرم لہجے میں گفتگو کرتا چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے تحت ندیم نے حقیقت نگاری کو اپنا منشور بنا کر افسانے کے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اس سے قبل داستانی انداز اور محض تخیل کی بنیاد پر ہی جو کچھ بیان کیا جاتا رہا وہ اپنی جگہ داستان ہی کہلاتا ہے۔ ندیم اور ان کے ہم عصروں اور ان سے قبل کے ادیبوں شاعروں کے ہاں حقیقت پسندی نے داستان کا

رخ افسانے کے دل کی جانب موڑ کر وہ موضوعات چنے جو معاشرے کے عکس دکھاتے جس میں وہ خود جیتے اور مرتے ہے۔

ندیم کے افسانوں میں ”بڑی سرکار کے نام“ اور ”رئیس خانہ“ ” ماتا“ ”آتش گل“ ”کنجری“ ”الحمد اللہ“ ”گنڈا سا“ ”چور“ ”سناٹا“ جیسے افسانوں میں دیہات اور دیہاتی زندگی کی تلخیاں، خوشیاں اور حالات کو شامل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیہات کو اپنے لفظوں سے زندہ کر دیا ہے۔ اس لیے برملا یہ کہتی ہوں کہ پنجاب کے دیہات کے بہت بڑے نقاش احمد ندیم قاسمی ہیں۔ کیوں کہ دیہات ان کے لفظوں کے انبوہ سے شناخت سامنے لاتا ہے جو بظاہر تو سامنے تھی مگر اپنی پوری رعنائیوں اور دیہات کی سماجی زندگی کے حوالے سے نظر انداز کی گئی تھی۔ ندیم محض تلخیوں، رعنائیوں، رسم و رواج اور عادات واطوار کو بیان نہیں کرتے وہ اپنے افسانوں میں دیہات کی فطری زندگی اور فطرت کے عکاس بنتے ہیں۔

لفظوں سے ایسی مصوری کرتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے افسانہ سنا جائے تو گرتے ہوئے چشمے، پہاڑ، ریگستانی علاقوں کی تپش، گرمی سردی کا احساس جانوروں کی زبان، پرندوں کی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ تک سنائی دے جاتی ہے تو وہیں اناج چھاننے کی آواز، بیل کے گلے میں پڑی گھنٹی کے ٹن ٹن کے ساتھ ریوڑ کے پیروں سے اٹھتی دھول ناک میں محسوس ہوتی ہے۔ کھلیان ہری بھری فصلوں کے لہلہانے سے جو ہوا چہرے پر محسوس ہوئی وہیں فصل کی خوشبو، گیلے چارے کی باس بھی محسوس ہوتی ہے۔

ندیم کے قلم میں زندگی کے سب رنگوں کی روشنائی ہے۔ وہ چاہے لاہور کے گھر میں کسی پر آسائش کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے ندیم دیہات اور دیہاتی زندگی سے نکل نہیں پاتے۔ جب ان کا قلم چلنے لگتا ہے تو وہ دیہات کی زندگی کا سارا روپ سامنے لانے میں ذرا بھر تو توقف نہیں کرتے۔ دیہاتی زندگی اور وہاں کی پگڈنڈی پر کوئی سواری بے شک سست چلتی ہو مگر احمد ندیم قاسمی کا قلم زور و شور سے رواں دواں رہتا ہے۔

اس پر طرہ یہ ہے کہ سوچ اور صلاحیت کی فنی پختگی نے فطرت کے نقوش میں رنگ بھرنے میں ان کا بہت ساتھ دیا ہے۔ اک کامیاب ادیب کی طرح ندیم بہت کامیاب رہے کہ اپنے افسانوں کو جہاں کلاسیکی ادبی روایت سے جوڑا وہیں اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی تقاضوں کو یوں ہم آہنگ کیا کہ ان کا تخلیقی فن اپنے جمالیاتی تقاضوں اور اسلوب کے ذریعے قاری کے لیے سماجی شعور کی پیداوار میں معاون ثابت ہوا۔ زندگی اپنی سفاک حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے لیکن ندیم کا معجزہ فن یہ ہے کہ وسیع النظری کے باعث وہ حقیقت کو حقیقی

رنگ میں یوں پیش کرتے کہ قاری کو سب حقیقت اور اس کا کرب محسوس ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''لارنس آف تھیلیسیما'' میں جہاں جاگیردارانہ سماج کی سفاکی نظر آتی ہے وہیں عورت کی نفسیات کا عکس بھی نمایاں ہے۔

یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانے ہمہ جہت زاویے کے ساتھ زندہ اور پائندہ ہوگئے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے عہد کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اور فنی باریکیوں سے زندگی کے سماجی، معاشی، تاریخی، تہذیبی اور نفسیاتی معاشرت کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں اتنی وسعت ہے اور گہرائی ہے کہ اسالیب میں ندرت جابجا نظر آتی ہے

☆☆☆☆

ارشد نذیر ساحل

الوداع

شعر شعور کا اظہار ہوتا ہے ۔ بلند شعری سرمایہ بلند شعور کا اظہار ہوتا ہے ۔ جب کوئی شعر کہنے والا اس جہانِ رنگ و بو کو چھوڑتا ہے تو شعور کا دروازہ بند ہوتا ہے اور یہ کہتے ہوئے غالب کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہے تھے کہ الفاظ اپنے معانی کے ساتھ اس کرۂ ارض پر بولے برتے اور لکھے پڑھے جاتے ہیں مگر یہ شاعرانہ شعور کی حسن کاری ہے کہ ان مستعمل الفاظ کو ایک نئے ڈھب سے اظہار شعور کو شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں ۔

گوئٹے نے کسی شاعر کے مرنے پر کہا تھا کہ شاعر کا مرنا آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے کا مرنا ہے جس سے لوگ سمت نمائی اور روشنی حاصل کرتے ہیں ۔ احمد ندیم قاسمی چپکے سے یہ جہاں چھوڑ گئے، ہمارے عہد کا درخشندہ ستارہ ٹوٹ گرا۔ ان کا شاعرانہ وژن بہت بلند اور پختہ تھا۔ انھوں نے برصغیر کی تقسیم کا عہد دیکھا تھا۔ ایک حساس فنکار ہونے کے ناطے وہ دوبار کسی ایسے خون آشام تجربے سے گزرنے کے امکانات ختم کرنا چاہتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسان دوستی کے لطیف جذبوں کے ساتھ وطن دوستی کے جذبات کو شامل کیا اور ایسی شاعری صفحۂ شہود پر آئی جس میں پیار ہی پیار تھا۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم کا ذہنی پس منظر دیہات کی سادہ اور فطری زندگی سے وابستہ تھا۔ ہر چند کہ وہ ایک کوہ قیامت تخلیق کار تھے مگر ان کی ذات میں درویشی اور استغنا بدرجہ، اتم موجود رہا۔ انھوں نے ایک شجرِ سایہ دار کی طرح تخلیق کاروں کا گلستان آراستہ کرتے ہوئے، اسے اپنے فکر و نظر کی دولت سے نوازا۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم اس حوالے سے خوش قسمت تھے یا یوں کہیے قسمت ان پر خوش تھی کہ وہ نوجوان نسل کے مرکزِ نگاہ رہے ۔ انھوں نے اپنی شفقت اور علمی سخاوت سے نسلِ نو کو نہال کر دیا۔ اس بے ریا خدمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعری میں قاسمی صاحب کی پیری مریدی چل پڑی جسے حاسدین نے کسی دوسرے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔

احمد ندیم قاسمی کا شاعرانہ شعور سماجی او تاریخی رفتار سے بہت آگے تھا۔ وہ انسانی اقدار کے سچے ترجمان بن کر اپنے فکر و نظر کو گروہی اور کتابی دھڑے بندیوں سے بہت بلند رکھتے ہوئے سرگرم عمل رہے ۔ ان کی مخالفت بھی ہوئی ۔ ایک برطانوی دانشور نے کہا ہے ”مخالفت“ حسد اور رقابت کسی آدمی کی شہرت کا ٹیکس ہوتے ہیں، چناں چہ انھیں ہنسی خوشی جھیلنا چاہیے ۔“ احمد ندیم قاسمی کی اعلیٰ ظرفی کو داد دیجیے وہ تا عمر ”ٹیکس“ ادا کرتے رہے اور فارسی شاعر عرفی کی طرح ہر مخالفانہ آواز پر مسکراتے رہے ۔

☆☆☆☆

پروفیسر فتح محمد ملک

اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام

احمد ندیم قاسمی کو قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ تخلیقی وفور کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اردو شاعری اور اردو نثر کی بیشتر اصناف ان کے فنی اور فکری کمالات کی احسان مند ہیں۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے ان کے ہاں موضوعات کی وسعت اور گہرائی اور اسالیب کی ندرت اور تنوع حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اپنے فنی سفر کا آغاز وہاں سے کیا تھا جہاں پریم چند کے فنی سفر کا اختتام ہوتا ہے اور بالآخر رفتہ رفتہ وہاں آ پہنچے جہاں مستقبل کا فنکار ان کے فنی اعجاز کو اپنا تخلیقی مسلک بنانے کو پر تول رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے رومانی حقیقت نگاری اور ترقی پسند حقیقت نگاری کے اسالیب میں یادگار کہانیاں لکھنے کے بعد اس اسلوب خاص میں کمال حاصل کیا جسے خود انھوں نے صداقت پسندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کا اسلوب صدافت پسندی کیا ہے؟ یہ خود انہی کی زبان میں پڑھیے:

> ”اگر ہم حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کے فرق کو اپنے ذہنوں میں واضح کر لیں تو ادب و فن میں حقیقت کے اظہار سے متعلق ہماری تمام الجھنیں دور ہو سکتی ہیں اور یہ وہ نکتہ ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کی ابتداء میں ایک حد تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ادیب بھی جو منفرد اور مجرد حقیقت کی تصویر کشی کر کے بزعم خود حقیقت نگاری کا منصب ادا کر لیتے تھے ترقی پسند کہے جانے لگے ان ادیبوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حقیقت کوئی جامد چیز نہیں۔ ہر خارجی حقیقت کے اندر متعدد لہریں رواں ہیں ایک تو خود اس کی حقیقت کی انفرادی حرکت ہے۔ دوسرا اس کا ماضی کی تاریخی حقیقتوں سے رشتہ ہے اور تیسرا مستقبل کے ساتھ اس حقیقت کی وابستگی ہے۔ اگر خارجی حقیقت کو ان میں منتقل کرنے والا اس بات سے ہی بے خبر رہے کہ حقیقت کو موجودہ صورت اختیار کرنے میں کتنی صدیاں صرف ہوئی ہیں تو وہ حقیقت کا فنکارانہ یا دوسرے لفظوں میں صداقت پسندانہ اظہار نہیں کر سکتا ...... صداقت پسندی فن کار کو خواب دیکھنے سے نہیں

> روکتی ...... اور اس تضاد کو ختم کر دیتی ہے جو حقیقت پسندی اور رومانیت کے درمیان حائل رہا ہے۔ گویا حقیقت پسندی اور رومانیت کے اسالیب کے زندہ عناصر کو اپنی انقلابی آرزومندی کی آنچ میں باہم دگر آمیز کر کے یہ اسلوب ایجاد کیا گیا ہے۔''

یوں تو ندیم کا فن ایک مسلسل ارتقاء ہے۔ سید وقار عظیم سے لے کر مظفر علی سید تک کتنے ہی نامور نقادوں نے اسے رومانیت اور واقعیت نگاری سے لے کر علامت، تجرید اور تمثیل نگاری تک کا مسلسل ارتقائی سفر قرار دیا ہے مگر ندیم نے اپنے ہر ارتقائی دور میں ایسے شاہکار افسانے بھی لکھے ہیں جو اگلے ارتقائی مرحلے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً رومانیت پسندی کے دور میں جب انھوں نے ''طلوع و غروب'' کا سراسر رومانی طویل مختصر افسانہ تخلیق کیا تھا عین اسی وقت ''خربوزے'' میں ایک سفاک حقیقت کو سائنسی حقیقت نگاری کے اسلوب میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک اور حیران کن حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ایک نقاد نے ان کی کسی ایک تخلیق کو بغائت پسند قرار دیا تو کسی دوسرے نقاد نے اسی تخلیق کو بغائت بلند ٹھہرایا۔ اس کی مثال میں افسانہ ''وحشی' 'پیش کیا جا سکتا ہے۔ سید وقار عظیم نے اپنے مضمون 'ندیم کے افسانے سنانا کے بعد'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ندیم یہ کہانی نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ اسکے برعکس مظفر علی سید نے اسی افسانے کو ندیم کے شاہکار افسانوں میں شامل کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''افسانہ ''وحشی'' کی بڑھیا ندیم کے بہت سے ابتدائی کرداروں کی طرح غیرت نفس کی حامل ہے، مگر یہاں ایک تمثیلی انداز میں پیش ہوئی ہے۔ اسے اپنی زمین کا استعارہ سمجھیے اور اس اکنی کی خیرات جس پر اسے غصہ آیا ہے، غیر ملکی امداد۔ یہ معنی خود کہانی سے نکلتے ہیں جو اپنی جگہ ایک سادہ مختصر کہانی بھی ہے اور ایک تمثیل بھی دونوں سطحوں پر اس کی اپیل موجود ہے مگر اس بڑھیا کی خودی کے بارے میں سوچیے تو غیر ملکی امداد کے معنے دور کی بات نہیں رہتے۔''

اپنے اپنے پسندیدہ اسالیب کی محبت میں اسیر نقادوں کی داد اور بے داد سے بے نیاز احمد ندیم قاسمی صداقت پسندی کے فنی مسلک پر قائم ہیں۔ گزشتہ پچاس برس کے دوران پاکستان کا دیہی اور شہری معاشرہ جس سماجی اور تہذیبی انتشار سے دوچار ہے اور اس انتشار کے باعث ہمارے جذباتی اور رومانی رشتوں میں شکست وریخت کا جو بھیانک عمل جاری ہے اس کی ترجمانی اور تنقید کا فریضہ احمد ندیم قاسمی نے اس انداز میں کیا ہے کہ

جہاں زمانۂ حال کا اقتصادی اور سیاسی استحصال بے نقاب ہوگیا ہے، وہاں ماضی کی زندہ روایات کے سہارے تعمیر نو کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔ خیر، ان موضوعات پر تو ان کے نامور معاصرین نے بھی ان جیسے، ان سے اچھے یا ان سے کم اچھے افسانے تخلیق کیے ہیں۔ مجھے اس تحریر میں احمد ندیم قاسمی کے فنی کمال کے متذکرہ بالا رخ سے بہت کم سروکار ہے۔ میں یہاں ان کی فنی انفرادیت کے ان رخوں کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں جن میں سے بعض اس عہد کے لکھنے والوں میں نایاب ہیں اور بعض بے حد کم یاب۔

احمد ندیم قاسمی اس باب میں اپنی مثال نہیں رکھتے کہ انھوں نے تصور پاکستان اور تحریک پاکستان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا وہ عوامی جمہوری جدوجہد جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا تھا اس کی کوئی ایک جھلک بھی کسی اور افسانے نگار کے ہاں نظر نہیں آتی مگر ندیم کے ہاں اپنے تمام تر جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

پاکستان: تصور اور تحریک

تحریک آزادی کے زمانے میں مسلمان ادیب اور مسلمان قوم کی روز بروز بڑھتی ہوئی بیگانگی کا خیال افروز تجزیہ کرتے وقت محمد حسن عسکری نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ "خلافت جیسی تحریک کو اردو افسانے میں نمائندگی نہیں ملی۔" احمد ندیم قاسمی اس عمومی صداقت سے استثنٰی کی ایک مثال ہیں۔ انھوں نے "سرخ ٹوپی" اور "ارتقاء" کے نام سے تحریک خلافت پر دو یادگار افسانے لکھے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے اور صرف پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے تحریک خلافت کے مقبول ترین رہنما محمد علی جوہر کا مرثیہ لکھا۔ گویا تحریک خلافت کی ہنگامہ خیزیاں اُن کے لڑکپن کی ناقابلِ فراموش یادوں کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اس کو یاد کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ:

> "قومی جدوجہد میں ماہیا اور ڈھولا نے دیہاتی قومی کارکنوں کو بہت سہارا دیا۔ فرنگی کی مخالفت۔ پاکستان کی حمایت اور عوام کی روحوں کی پکار کو ان کے اندر جذب کر لیا گیا ..... تحریکِ خلافت کے دنوں میں علی برادران کے پیروؤں نے ٹپے سے پروپیگنڈہ کا کام نہایت دور اندیشی اور مہارت سے لیا ایک ٹپے کا ابتدائی بند ہے"

انور موڑ مہار وے سانوں تیریاں لوڑاں
تیرے ہوندیاں یاروے سانوں لٹ لیا چوراں" [۲۲]

ہر چند تحریک خلافت ندیم کے شعورمند ہونے سے پہلے ہی سیاسی ناکامی سے دوچار ہو کر تنظیمی اعتبار سے

منتشر ہو چکی تھی مگر آزادی و مساوات اور بغاوت و انقلاب کے ساز پر چھیڑے گئے نغمات اور حریت کی لے پر گائے جانے والے عوامی گیت برصغیر کے گوشے گوشے میں زبان زد عام تھے۔ سامراج دشمنی اور انقلاب دوستی کے یہ ترانے ندیم کے شخصی مزاج اور فنی مسلک ہر دو کی تشکیل و تعبیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجابی لوک گیت کا درج بالا ٹکڑا جو ندیم کے کانوں میں ابھی تک گونج رہا ہے اس زمانے کی یادگار معلوم ہوتا ہے جب ترک مجاہد انور پاشا دنیا بھر کے محکوم و مظلوم مسلمانوں کے لیے شجاعت و مردانگی اور آزادی و خودمختاری کی آتشیں علامت بن چکا تھا۔ اتحادِ اسلامی کا یہ سر بکف علمبردار اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کو روسی استعمار سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہا اور بالآخر بخارا میں سوویت روس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوا۔ ''انور موڑ مہاروے'' میں انور پاشا کو فرنگی استبداد کے خلاف ہندی مسلمانوں کی تحریکِ مزاحمت کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مصطفیٰ کمال اتاترک کی بجائے انور پاشا ہندی مسلمانوں کی اجتماعی آرزوؤں کی بھرپور علامت بنے ہوئے تھے کیوں کہ ہندی مسلمان بھی انور پاشا کی مانند اپنے اجتماعی مقدر کو پوری دنیائے اسلام کے مقدر سے وابستہ سمجھتے تھے اور وسیع تر اسلامی برادری کو مصائب سے نجات دلانے کی جدوجہد میں اپنے قومی مصائب کو فراموش کر چکے تھے۔

اتحادِ اسلامی کی اس تحریک کو سامراج نے ایسے کچل کر رکھ دیا تھا کہ بقول اقبال:

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سرخ ٹوپی'' اسی کلاہِ لالہ رنگ کی رسوائی کے احوال و مقامات کا تذکرہ ہے۔ ''پنجاب کے ایک دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں کی کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکتی رہتی تھی جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند تارے کا نشان بھی تھا۔ ایک روز مہری نے گاموں سے پوچھ ہی لیا کہ ٹوپی کس کی ہے؟ کون پہنتا ہے؟ یہاں کیوں لٹک رہی ہے؟'' اور گاموں نے جواب دیا ''یہ ایک بہت اچھے زمانے کی یاد دلاتی ہے مجھے کچھ سال گزرے ہمارے ملک پر ایک بہت اچھا زمانہ آیا تھا۔ میں ان دنوں بچہ ہی تھا لیکن ابا مجھے بتایا کرتے تھے کہ اس زمانے کو خلافت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ابا قصبے سے گتا خرید کر لائے اور اس پر سرخ کھدر چڑھا کر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند تارا ٹانک کر یہ ٹوپی بنائی اور میرے سر پر رکھ دی۔ بزرگ لمبے لمبے جھنڈے کاندھوں پر رکھے گلیوں کے چکر کاٹتے اور ہاتھ ہاتھوں میں ڈال کر ہم بچے ان

کے پیچھے پیچھے چلتے اور گایا کرتے:

أنت الهادی انت الحق　　لیس الهادی الا هو ......"

پھر یہ ہوا کہ

> "ابا کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور چھ مہینے وہ جیل میں چکی پیتے رہے۔ واپس آئے تو بیمار تھے۔ چارپائی سے لگ گئے۔ آخر چل بسے۔ نمبردار جی کی دشمنی نہ ہوتی تو انھیں کون قید کرتا وہ تو بس انت الہادی انت الحق، زور زور سے گایا کرتے تھے۔ سرکار کی خلافت کو تو انھوں نے کبھی کچھ کہا نہیں۔ یہ سُرخ ٹوپی ان دنوں کی نشانی ہے۔ پڑی رہے کبھی کام آئے گی"۔

انگریز استعمار نے کُلاہِ لالہ رنگ کو پورے زمانے میں رسوا کر دیا مگر گاموں نے اِسی سرخ ٹوپی کو ایک سہانے زمانے کی یاد جان کر سنبھال رکھا ہے۔ یہ یاد اُس کا سامراج دشمن ماضی ہے جسے وہ اپنے بچے کا مستقبل بنانے کا آرزومند ہے۔ المیہ یہ ہے کہ گاؤں میں سامراج کا عیار کارندہ ...... نمبردار گاموں کے اس عزم سے واقف ہے۔ چناں چہ:

> "وہ بولا، میں پکا ہونے والا تھا۔ اس لیے میرے افسروں نے چال وچلن کے بارے میں نمبردار سے پوچھ بھیجا تو اس نے کہہ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کا والد "انت الہادی انت الحق" پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر میں ابھی تک سُرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے جس پر چاند تارے کا نشان ہے...... افسروں نے مجھے برخاست کر دیا ہے۔"

تحریک خلافت ندیم کے ہاں اُس مقدس آگ کی صورت میں جلوہ گر ہے جو کبھی بجھائی نہ جا سکی۔ انگریز کے سیاسی و معاشی استبداد نے جب گلی بزار اور کھیت کھلیان میں اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا تو یہ جانبازوں کے دلوں میں دہکنے لگی۔ افسانہ "ارتقاء" میں یہ آگ نسل در نسل منتقل ہوتی نظر آتی ہے اور اس کے زیرِ اثر تحریکِ خلافت تحریک پاکستان بنتی دکھائی دیتی ہے:

> "تحریکِ خلافت کے دنوں میں اچانک بوڑھے کے دل میں اپنے بیٹوں کی یاد ایک عجیب زہریلی صورت اختیار کر گئی۔ گاؤں بھر میں بلندترین جھنڈا اس کا تھا، بلندترین نعرہ اس کا تھا، بلندترین دعویٰ اس کا تھا۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود اُس نے بڑے

> بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور دہقانوں کا محبوب ترین نمائندہ بن گیا۔ ایک مرتبہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ تم آنسوؤں کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب دل کا غبار نکالنے کے لیے تمہارے سامنے تمہاری اجازت کے بغیر یہ آنکھیں شرارے خس و خاشاک پر گریں گے اور تمہارے خس و خاشاک پر گرتے ہوئے ان شراروں کو ہماری آہیں ہوا دیں گی اور جب شعلے بھڑکیں گے تو ہم اُگلیں گی اور یہ شرارے تمہارے ان شعلوں کے گرد ناچیں گے...... اُس روز پولیس بوڑھے کو گرفتار کر کے لے گئی، بڑھیا نے جب یہ خبر سنی تو درد آمیز مسرت سے چیخ کر بولی۔ ''اب میری باری ہے، میرا خدا مجھے بُلا رہا ہے، میرا رسولؐ مجھے بُلا رہا ہے، میرا دستگیر مجھے بُلا رہا ہے، میرا علی مجھے بُلا رہا ہے۔''

قید و بند اور ہندوستانی سیاست کی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی جذباتی الجھنوں کے باوجود:

> ''یہ شعلہ بوڑھے کے دل میں برسوں بھڑکتا رہا۔ جب اس نے سنا کہ محمد علی پردیس میں چل بسے تو اس بھوبھل پر ایک بگولا جھپٹا، چنگاریوں کا ایک مینار بلند ہوا۔ یہ مینار اس کے ذہن کی وسعتوں میں رقصاں و جولاں رہا۔ اس روز اُسے کسی پہلو قرار نہیں ملتا تھا، چاند کو دیکھ کر کہتا تھا۔ ''میرے بچے، تیرا سپہ سالار مر گیا۔'' اپنے اداس خلافتی ساتھیوں کو دیکھ کر کہتا تھا۔ میرے رفیقو، تمہارا سرپرست چل بسا۔ مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے کہا۔ ''میاں جی ہماری ملت کا سہاگ لٹ گیا۔''

قیادت کے فقدان کے باعث بوڑھے کو زندگی میں تحریک بار آور ہوتی نظر آئی تو وہ جنونِ عشق کے ساتھ جذبۂ آزادی کے شعلوں کی آنچ میں اپنے بیٹے کو کندن بنانے میں ہمہ تن منہمک ہو گیا:

> ''سرما کی طویل راتوں میں جب کڑوے تیل کے دیے کی لو دھوئیں کی مٹمٹی لہریں چھوڑتی اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی چنگیروں اور چھاجوں کے پیچھے ٹڈیاں سنگیت سجا جماتیں، تو وہ چاند کو اپنے پاس بٹھا لیتا، اسے خلافت کے زمانے کے قصے سناتا، اس سے وعدہ لیتا کہ جب ایک مرتبہ پھر یہ شعلہ بھڑکے گا تو وہ اس میں بے خوف کود جائے گا اور یہ نہیں سوچے گا کہ ابھی اُس کی عمر چھوٹی ہے یا اُس کے ماں باپ بوڑھے ہیں۔''

بوڑھے کے ذہن میں ایک ہی خیال جاگزیں تھا اور:

> ”اس کے دل میں صرف ایک لگن تھی ...... کاش وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے خواب کی تعبیر دیکھ لے اور جیتے جی ایک مرتبہ پھر محسوس کر سکے کہ ابھی غلاموں کے ذہنوں سے آزادی کا تصور محو نہیں ہوا۔ اس راکھ میں ابھی کئی سخت جان چنگاریاں چمچا رہی ہیں جن کو ہوا دینے کے لیے ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے اور وہ محمد علی ثانی اُس کے ذہن کے اُفق پر طلوع ہو چکا۔“

یوں محمد علی جوہر کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا بالآخر محمد علی جناح نے پورا کر دکھایا اور تحریک خلافت ایک مرتبہ پھر زندہ ہو کر تحریک پاکستان میں سرگرم ہو گئی۔ چناں چہ بوڑھے کا بیٹا چاند اسلام اور آزادی کے لیے اور اپنے محمد علی کی اجازت سے فاشزم کے خلاف جنگ کے محاذ پر دادِ شجاعت دینے لگا۔ اس روز بوڑھے کی تمام تر تمناؤں کی گویا تکمیل ہو گئی جس روز بغداد سے چاند کا خط آیا:

> ”میں نے حضرت پیر دستگیر سبحانی کے روضہ مبارک کی زیارت کی ...... وہاں میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ مجھے اپنے رسول پاک ﷺ اور اپنے نیک بندے کی برکت سے اس راہ پر قربان ہو جانے کی توفیق عطا فرما جو مجھے میرے ابا بچپن سے دکھاتے چلے آئے اور ابا جان، جب میں یہ دعا مانگ چکا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم محمد علی تشریف لے آئے ہیں اور میری دعا میں شامل ہو گئے ہیں۔“

> ”خط پڑھتے پڑھتے بوڑھے کی آواز بھر آ گئی ...... بوڑھا اُٹھ بیٹھا اور بڑھیا کے شکوک دُور کرنے کے لیے ایک لمحہ میں فقرہ مکمل کر کے کئی طریقے سوچ لیے اور بالآخر بولا۔ ”جب وہ پورا چاند بن جائے گا تو اپنے آپ کو سورج کے حوالے کر دے گا۔“
>
> ”سورج؟“ بڑھیا چونک پڑی۔
>
> ”ہاں ہاں، ہمارا نیا محمد علی ہماری دنیا کا سورج ہی تو ہے۔“ بوڑھا کامیاب ہو گیا تھا اور بڑھیا چونکے ہوئے اعصاب کے تناؤ کو مسکراہٹوں کی پھوار سے نرم کرنے لگی تھی۔“

یہ اپنی قوم کی اجتماعی تمناؤں سے ندیم کی جبلی وابستگی کا کرشمہ ہے کہ افسانے کے تینوں کردار بوڑھا، بڑھیا اور تحریک آزادی کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں نئے محمد علی (قائداعظم) کے جانفروش پرستار اور تحریک پاکستان کے بے لوث سپاہی بن جاتے ہیں:

> ''لاہور میں ہمارے محمد علی نے ایک بڑا جلسہ کیا ہے۔ ایک روز بوڑھے نے کہا اور انگریز کو بتایا ہے کہ ہندو مسلمان کبھی اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ اُن کا مذہب، چال ڈھال، رہن سہن، لباس خوراک سب کچھ الگ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور جہاں جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو، اس طرح ہندوستان میں رہنے والے دو بھائی جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں الگ الگ ہو کر چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ معقول بات ہے، بڑھیا نے کہا کہ اس کی مسکراہٹ کا محیط وسیع ہو گیا۔ جیتا رہے ہمارا محمد علی۔''
>
> جیتے رہیں وہ سب لوگ جو آزادی کے عاشق ہیں، بوڑھا بولا:
>
> اور جیتا رہے میرا چاند جسے سمندر پار بھی اپنا چاند تارا نہیں بھولا۔ بڑھیا نے غرور سے کہا۔''[۴]

احمد ندیم قاسمی کے یہ دو افسانے افسانوی ادب میں ہندی مسلمانوں کے جداگانہ قومی طرزِ احساس کے بہترین ترجمان ہیں۔ ''سرخ ٹوپی'' اگر تحریکِ خلافت کے سامراج دشمن رُخ کی معنی خیز علامت ہے تو ''ارتقاء'' کی پوری فضا میں ہندی مسلمانوں کا جداگانہ تہذیبی وجود سانس لے رہا ہے اور چاند تارے کی علامت نے تحریکِ خلافت کو تحریکِ پاکستان سے آملایا ہے۔

''ارتقاء'' کی تخلیق کا زمانہ ندیم کے ہاں عملی سیاست میں شدید ترین انہماک کا زمانہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بلند کیے ندیم جس علاقہ میں سرگرمِ عمل تھے وہ نہ صرف انگریز کے خوشامدی سفاک ترین جاگیرداروں کا گڑھ تھا بلکہ پنجاب کے متکبر حکمران خضر حیات ٹوانہ کا حلقۂ انتخاب بھی تھا۔ نتیجہ یہ کہ یہاں تحریک کے کارکنوں پر جبر و تشدد دو چند تھا۔ قائداعظم اور پاکستان کے حق میں نعرہ لگانے والوں کا حوالات میں بند کر دیا جانا اور مسلم لیگ کا جھنڈا اکھاڑ دینے والوں کا انعام و اکرام سے فیضیاب ہونا معمول کی بات تھی۔ استبداد کی روز افزوں بلند ہوتی لہر کے باوجود ندیم کو انگریز سامراج کی پسپائی اور جاگیرداری استحصال کی موت ناگزیر معلوم دیتی تھی۔ ہر طرح کے استحصال سے پاک معاشرے کی تلاش میں انسان کے مسلسل اور غیر مختتم ارتقاء کے باب میں فکر و تخیل کی یہی نقش گری ہمیں اس دور کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''آس پاس'' کے چند منفرد افسانوی میں کہانی اور پلاٹ، فکر و تخیل اور جذبہ و احساس کی چُھوٹ کی ایک

مثال ملاحظہ ہو:

> ’’ چلتے رہو میرے تھکے ماندے ساتھیو، تمہیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے، اندھیرے کی شکایت نہ کرو، راتیں اکثر اندھیری ہوتی ہیں …… مجھ سے کوئی بات کرو ہمدمو، دیکھو ، الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے اور ستارے ڈوبے جا رہے ہیں، رات کا نظام زوال پذیر ہے ، اب اس تخریب کے ایک نئے اور روشن نظام کی تعمیر ہو گی، اسی تعمیر میں ہم اپنا خون کھپاتے جا رہے ہیں، ہم ایسے دنوں سے تھک چکے ہیں جو صرف بلندیوں کی مستعار شعاوں سے روشن رہ سکتے ہیں ۔ ہمیں ایک ادبی دن چاہیے جس کی روشنی ہمہ گیر اور جس کی وسعت کائنات پیما ہو ۔‘‘

اس افسانے میں ظلمات سے نُور کی جانب کٹھن اور صبر آزما سفر ایک موسیقار، ایک فلسفی، ایک مصور اور ایک شاعر ایک ساتھ طے کر رہے ہیں ۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب کردار افسانے کے واحد متکلم کی اپنی تخلیقی شخصیت کے مختلف پہلو ہوں ۔ ندیم اس دور میں اپنے دل و دماغ کی ساری توانائیوں کے ساتھ اسلامیانِ ہند کے اجتماعی خواب کی صورت گری میں محو تھے ۔

فسادات کے موضوع پر وجود میں آنے والی عہد آفریں کہانی ’’پرمیشر سنگھ‘‘ کا مرکزی کردار اختر ایک جیتا جاگتا، کردار بھی ہے اور ہندی مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی شناخت کا معنی خیز استعارہ بھی ۔ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کے دوران ’’اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے ۔‘‘ ننھا اختر ایک نیک دل اور انسان دوست شخص پرمیشر سنگھ کے ہاتھ لگا جس نے اُسے گمشدہ بیٹا کرتا ر سنگھ بنا کر پروان چڑھانا چاہا مگر پرمیشر سنگھ کے لاڈ پیار کے باوجود اختر اپنی ماں اور اس کی سکھائی ہوئی تہذیبی روایات فراموش کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا:

> ’’پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔ یہ بھی تمہاری ماں ہے بیٹے ۔ نہیں اختر بڑے غصے سے بولا ۔ یہ تو سکھ ہے ۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے ۔‘‘

رات کے اندھیرے کمرے میں کسی چیز کو قرآن پڑھتے سُن کر جب گھر کے سب افراد چیختے ہوئے جاگ اٹھے تو اختر نے بڑے فخر سے اعتراف کیا کہ میں پڑھ رہا تھا:

> ’کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟ پرمیشر سنگھ نے پوچھا
>
> ’’پڑھوں؟‘ ‘اختر نے پوچھا
>
> ’’ہاں ہاں۔‘ ‘پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔
>
> اور اختر قُل ھُو اللہ اُحد پڑھنے لگا۔ کُفُوا اَحَد پر پہنچ کر اُس نے اپنے گریبان میں چھوکی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔
>
> ’’تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔‘ ‘
>
> ’’ہاں ہاں‘ ‘پرمیشر سنگھ نے گریبان سے بٹن کھول دیا اور اختر نے چُھو کر دی۔
>
> اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔
>
> پرمیشر سنگھ بولا۔ کیا نیند نہیں آتی تھی؟‘ ‘
>
> ’’ہاں! اختر‘ ‘اختر بولا۔ اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قُل ھُو اللہ پڑھو نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔ پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ’’روز پڑھا کرو، او نچے پڑھا کرو، اسے بھولا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی، لو اب سو جاؤ۔‘ ‘

’’پرمیشر سنگھ‘ ‘اختر کو اختر کے بجائے کرتا رسنگھ کے روپ میں دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ وہ سارے چاؤ چونچلے کرتا ہے جو وہ اپنے بیٹے کرتا رسنگھ سے نہیں کر سکا مگر پرمیشر سنگھ کی بیوی، اسی کی بیٹی، گرنتھی جی اور پورا گاؤں اختر کو کرتا رسنگھ کے روپ میں دیکھتے ہوئے بھی اس نفرت کا نشانہ بناتا ہے جو سکھوں کی بستی میں آباد مُسلے کا صدیوں سے مقدر رہی ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیٹی امر کور، جو بیمار اختر کے حلق میں پانی کی ایک بوند ٹپکانا گناہ سمجھتی ہے اور ہر آن اختر کی بوٹی بوٹی‘ کر ڈالنے کے سنہری موقع کی تلاش میں سرگرداں ہے اس بھرپور نفرت کی علامت ہے۔ اسی نفرت سے تنگ آ کر اختر نئے وطن کی راہ لیتا ہے اور پاکستان سے بلند ہوتی ہوئی آذان کی آواز سُن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

قیامِ پاکستان کی بشارت ندیم کے لیے ایک ایسے جہانِ نو کی تخلیق سے عبارت تھی جہاں انسان کی اَن مٹ قوتِ تخلیق اور لامحدود قوتِ تسخیر کے اپنی آخری حدوں تک بڑھنے پھیلنے کے امکانات کا در وا ہوگا۔ چناں چہ وہ ایک نئی دنیا اور اس میں بسنے کے لیے ایک نئے آدم کے تصور میں خیال و خواب کی نقش گری میں منہمک رہے۔

ہر چند فسادات کی وحشت و بربریت نے صبحِ آزادی کو دُھواں دھواں کر دیا تھا مگر اس عالم میں بھی ندیم کی رجائیت کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ انھوں نے فسادات کی تمام تر ذمہ داری پسپا ہوتے ہوئے برطانوی سامراج پر ڈال دی۔

ترقی پسندوں کے لیے پارٹی لائن یہ تھی کہ پاکستان کا قیام نفرت کے منفی جذبہ کا رہینِ منت ہے۔ اس کا ثبوت فسادات ہیں سو پاکستان کے قیام کو بٹوارے کے منحوس نام سے یاد کیا جائے۔ احمد ندیم قاسمی نے فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے کبھی ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے نہیں دکھایا بلکہ اسے آزادی سے تعبیر کیا۔ افسانہ ''نیا فرہاد'' کا ہیرو جعفر لوٹ مار اور قتل و غارت کے جنون میں مبتلا ہجوم سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> ''میرے بھائیو، مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ وہ مسافر، اصل میں انگریز نے بھیجا تھا۔ اس کا پیشہ یہی ہے کہ وہ گاؤں گاؤں جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں زہر بھر دیتا ہے۔ یہ انگریز کی چال ہے اور اب ہم اُس کی چال میں نہیں آئیں گے۔ اگر یہ اس کی چال نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ذیلدار، نمبردار اور کرسی نشین اور سفید پوش سب کے سب اپنے چوپایوں پر حقے گڑگڑا رہے ہیں اور پنڈلیاں دبوا رہے ہیں اور ہم غریب سکھوں اور کمزور ہندوؤں کے سینوں میں چُھرے گھونپ گھونپ کر اسلام کا نام اونچا کر رہے ہیں۔ کیا اسلام نے ہمیں یہی سکھایا ہے؟''

نیا ملک، پرانا معاشرہ

اسلام کے نام پر اسلامی تعلیمات سے رُوگردانی کی سازش کو ندیم برطانوی سامراج کے مقامی کارندوں کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ فسادات اور ہجرت سے پیدا ہونے والے روح فرسا مصائب کے گرد بنی ہوئی کہانیوں میں جاگیردار، ذیلدار، نمبردار کرسی نشین اور نام نہاد معززینِ شہر کی شیطنت کو بڑے جذباتی انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ افسانہ ''تسکین'' کے راؤ صاحب سامراجی ذہنیت کی حامل افسر شاہی کے نمائندہ ہیں جو نئے نویلے پاکستان کے ایک مہاجر کیمپ میں دلدوز انسانی مصائب سے لاتعلق اور مطمئن بیٹھے سگار پی رہے ہیں اور رنائی کے رنگوں اور کالر کے ڈیزائن سے لے کر علم الکلام اور حیات بعد الممات تک بہت سے غیر متعلق مسائل پر گفتگو فرما رہے ہیں۔ جبکہ عام پاکستانی ایک عجیب جذبہ یگانگت کے ساتھ رضاکارانہ طور پر مہاجرین کی فوری ضروریات کی فہرستیں بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جب ایک رضاکار، جس کا دل غم

میں ڈوب رہا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں، عملی کارروائی کا مطالبہ کرتا ہے تو افسرِ اعلیٰ فرماتے ہیں:

> ''یہ سب کچھ بیچاروں کی تسلی ہی کے لیے ہو رہا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں ان حالات میں ...... خیر اب آپ بقیہ لوگوں کے عزیزوں کے بارے میں پوچھئے گا۔ تسلی ہوتی رہے گی بے چاروں کی۔''

اس زمانے کا ایک اور افسانہ ''جب بادل اُمڈے'' ایک مہاجر دہقان کی بحالی اور آباد کاری کی سرگزشت ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچنے والا یہ دہقان جب متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کا حکم لے کر گاؤں پہنچتا ہے تو ایک غریب کسان شیرا، انصار مدینہ کے سے جذبہ محبت و رفاقت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے مگر گاؤں کا جاگیردار اس خیال سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے کہ جب یہ مہاجر تنگ آ کر بھاگ کھڑا ہو گا تو وہ اس کی متروکہ زمین پر خود قبضہ کرے گا۔ جاگیردار کی یہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ مہاجر دہقان ثابت قدمی کے ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ گاؤں کے مزارعین اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور یوں یہ افسانہ حق و باطل کے درمیان تصادم پر ختم ہو جاتا ہے۔

خیر و شر کے درمیان اس کشمکش میں ندیم خیر کی قوتوں کا دم بھرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت تحریک پاکستان سے اُن کی عملی وابستگی اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتی۔ اس زمانے کے چند افسانوں سے اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ۱۔ ''اور جب جاگیردار تھوک نگلنے کے بعد رکا تو وہ بولا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکستان بھی اپنے اندر آپ ایسے پھوڑے چھپائے بیٹھا ہے اور جاگیردار جی اگر پاکستان کو زندہ رہنا ہے تو اسے یہ پھوڑے کاٹ کر پھینکنا پڑیں گے۔''
>
> ۲۔ ''ہم نے لہو کے سیلاب میں کشتیاں چلائی ہیں بھئی ہم اس جاگیردار کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے اور اب سب جاگیریں ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں۔''
>
> ۳۔ ''خضر حیات کے زمانے میں ہم نے لیگیوں کے بیسیوں جھنڈے پھاڑے تو سرکار نے ہمیں ایک مربع زمین دے دی۔ اب لیگ کا راج ہے تو مربع اُسی طرح ہمارے پاس رہا اور لیگی اپنے گھروں پر پرانے جھنڈوں پر سے گرد جھاڑ کر رہ گئے اور کھانڈ کا

> ڈپو بھی ہمیں مل گیا۔ سرکار جب بھی ہماری تھی اب بھی ہماری ہے۔ اٹھائے پھرتا ہے سرکار کو، جاؤ نہیں ملے گی اور یہ زمین!'' (جب بادل اٹھے)
>
> ۴۔ ''چند کسانوں نے جناح صاحب کا نام لیا تو ملک صاحب نے انھیں چوپال کے ستونوں سے باندھ کر کالے خانیوں کو بلوایا، انھوں نے مرچوں کا دھواں دیا تو لیگ کے سارے نشے ہرن ہو گئے اور آج ملک صاحب پاکستان کے بہت بڑے خیر خواہوں میں گنے جاتے ہیں۔''......(ووٹ)

تحریک پاکستان کے اصولوں سے اس کھلے انحراف کا ردعمل ندیم کے ہاں تحریک پاکستان کے آئیڈیلز کو عملی زندگی کے قالب میں جلوہ گر دیکھنے کی آتشیں تمنا کی صورت میں نمودار ہوا۔ قائداعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی مسلم لیگ کی جاگیردار قیادت نے تحریک پاکستان کے دوران کیے گئے معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے وعدوں سے روگردانی کر کے زمینداری اور جاگیرداری کو نئے تحفظات دینے کی روش اپنالی۔ اس صورت حال نے کسانوں اور مزارعین میں بے چینی کی ایک زبردست لہر دوڑا دی۔ چوں کہ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں میں سلطانی جمہور کے خواب سجا کر قیام پاکستان کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی تھی۔ اس لیے پنجاب کسان سبھا ہاری کمیٹی اور سرحد کسان جرگہ نے زخمی جبر و استبداد کے سے ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ جاگیردار قیادت نے اس بے چینی کو دبانے کی خاطر وہی پرانا سامراجی سکہ رائج کر دیا۔ سن اڑتالیس سے پچاس تک مزارعین کو جبری طور پر بے دخل کر کے جاگیردار اپنی جاگیروں میں توسیع کرنے میں مصروف رہا۔

ندیم کے ایک دوست اور پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل چوہدری اقبال چیمہ نے اعتراف کر رکھا ہے کہ اس عرصہ میں جبری بیدخلی کے باعث ہزاروں کسان خاندان فاقہ کشی اور موت کی دہلیز پر جا پہنچے۔ اس ظلم و ستم کے خلاف کسان تحریک نے احتجاج شروع کر دیا۔ سب سے پہلے صوبہ سرحد میں کسان جرگہ نے ۱۹۴۸ء میں جاگیرداری کے خلاف عوامی مہم شروع کر دی جس میں سرخ پوشوں اور مسلم لیگ کے غریب کارکنوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نتیجہ یہ کہ کسان جرگہ کو خلاف قانون قرار دے کر ہزاروں کسانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد سندھ ہاری کمیٹی نے دادو میں زمین کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح پنجاب میں سارے مغربی پاکستان کے کسانوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا جس میں جاگیرداری کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا اور پابندی سے ہر ضلع کی سطح پر کسان کانفرنسوں کے انعقاد کا باقاعدہ پروگرام بنایا گیا۔ ان تمام کسان اجتماعات

میں مظلوم ومحروم مزارعین کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے نمائندے بھی شریک ہوتے رہے۔ اس تاریخی پسِ منظر میں ’’درودیوار‘‘ کے افسانوں اور ’’شعلۂ گل‘‘ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی حقیقی معنویت اُجاگر ہوتی ہے:

> ۱۔ ’’اب یہی کسان ہیں کہ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں، اِدھر ایک ہاتھ اٹھاؤ تو اُدھر پچاس درانتیاں ابھرتی ہیں اور مجھے ان گنواروں کے پاس ووٹ لینے کے لیے بھیجا جا رہا ہے...... میں نے تو سنا ہے بزرگوں سے کہ فصل میں ڈوبی ہوئی درانتی جب کسان کے کندے سے اوپر اٹھ کر تُل جائے گی اور تُلی ہی رہے گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرتِ اسرافیل اپنے صور کو پھونکنے والے ہیں۔‘‘
>
> ۲۔ ’’وہ بھی کیا کسان عورتیں تھیں بے چاریاں، بالکل بھیڑیں، سیدھی سادی، ڈری ڈری بات بات پہ جی جی کی رٹ اور یہ نئی کسان لڑکی دیکھو۔ ایسی دلیر اور بہادر شہزادیاں ضروری گزری ہوں گی مگر کسان ماؤں نے ایسی بیٹیاں کہاں جنی تھیں۔‘‘

افسانہ ’’کہانی لکھی جا رہی ہے کا ایک کردار بیدخل شدہ مزارعین کے ایک باغی ہجوم کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے۔‘‘

’’یہ کون ہیں؟‘‘ اُس نے پوچھا

’’جانے کون ہیں؟‘‘ میں نے جواب دیا

’’مزارے ہیں اور کون ہیں! فاطمہ مشین کی طرح بولی۔‘‘

پھر اچانک وہ اس شدت سے چلائی کہ میں نے آج تک اس کی اتنی تیز وتند آواز نہیں سنی تھی۔ ’’ہماری ہے‘‘ وہ چلائی۔ ایک لمحے کے بعد وہ پھر گرجی۔ ’’اور میں اس پاگل پن کی وجہ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ پھر گرجی۔‘‘

’’ہماری ہے۔ گرد وغبار میں سے بلند ہوتا ہوا شعور بالکل واضح ہو گیا۔ ایک اور آواز آئی۔ زمین کس کی ہے؟‘‘

اور میں فاطمہ سے مل کر چلایا۔ ’’ہماری ہے۔‘‘

اور فاطمہ گٹھڑی کو میری طرف پھینک کر پگڈنڈی پر دیوانوں کی طرح بھاگنے لگی اور میں گٹھڑی کو مسافر کے پاس رکھ کر فاطمہ کے پیچھے بھاگنے لگا اور چراغ مچل کر مسافر کے کندھے پر اترا اور میرے پیچھے بھاگنے لگا۔

’’ہماری ہے‘‘ وہ بھی چلایا۔

تحریک پاکستان زیر اثر کسانوں کی بیداری اور پھر قیام پاکستان کے ساتھ ہی جاگیردار مزارع کشمکش کے دور میں نمودار ہونے والی نئی کسان عورت اپنے شوہر کو جاگیردار کے جور وستم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے چلے جانے کی عادت ترک کر کے بغاوت کی راہ پر ڈالنے میں کوشاں ہے۔ نتیجہ یہ کہ درانتی کے تیز دانوں کی چمک اب فقط سنہری فصل تک ہی محدود نہ رہی بلکہ جاگیرداری کا فرسودہ نظام بھی اس کی زد میں نظر آنے لگا اور نیا پاکستان ضمیر جہاں میں ایسا انقلاب بونے میں سرگرم عمل ہو گیا جس کی فصل پروان چڑھے گی تو روئے زمین پر خلد بریں کا جواب کاٹا جا سکے۔ مگر فیض احمد فیض کے لفظوں میں:

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

یہاں زندگی کے ٹھوس حقائق افسانہ نگاری کی انقلابی آرزومندی کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے۔ خواب وخیال کی نقش گری بڑی حد تک زمینی حقائق کا پردہ بن کر رہ گئی ہے۔ ندیم کی فنی زندگی کے اس نئے موڑ پر جاگیرداری نظام کے ہواخواہوں کا آتش زیرپا ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ اس نظام میں خدا کی شان میں گستاخی سے تو درگزر ممکن ہے مگر دیہہ خدا کی شان میں گستاخی ایک ناقابل معافی جرم قرار پاتا چلا آرہا ہے۔ اس گناہ کبیر کے مرتکب پر پہلے کفر کی تہمت تراشی جاتی ہے اور پھر پاکستان دشمن کا الزام دھرا جاتا ہے۔ چناں چہ ان ہی الزامات کی آڑ میں ندیم کی سربراہی میں سرگرم عمل انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک سیاسی پارٹی قرار دے ڈالا گیا۔ ان کی واردات میں ترقی پسند اور روشن خیال ادبی ذوق کی تربیت میں مصروف ادبی جرائد ''نقوش'' اور ''سویرا'' کی اشاعت جبراً روک دی گئی۔ ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رُو سے کسی بھی جلسہ عام میں مسلم لیگ کا ۱۹۴۴ء کا منشور پڑھ کر سنانا قابل تعزیر جرم قرار پایا اور بالآخر ۹ مئی ۱۹۵۱ء کو احمد ندیم قاسمی متعدد نامور ترقی پسند ادیبوں سمیت گرفتار کر لیے گئے۔

وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت کی سازش میں کامیابی کے بعد برطانوی ہند کی تربیت یافتہ سویلین اور فوجی بیوروکریسی نے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھال لی جس نے اپنی اندرون ملک ریشہ دوانیوں اور بیرون ملک کارستانیوں کے باعث پہلے عام انتخابات کے انعقاد کو ممکن بنا دیا۔ اقبال کا یہ ترانہ کہ:

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

ایک قصہ پارینہ بن کر رہ گیا۔

معصومیت اور معصیت

یوں تو اپنے افسانوں کے پہلے مجموعہ ''چوپال'' کے افسانہ ''ننھا مانجھی'' سے لے کر تازہ ترین کہانی ''کوہ پیما'' تک ندیم کے فن پاروں میں جتنے بھی بچے اور جتنی بھی مائیں ستم ہائے روزگار سے پنجہ آزما ہیں، ان سب کے کردار پر ندیم کے اپنے بچپن کی معصومیت اور حیرت اور اُن کی اپنی ماں کی خلوص و محبت اور عفت و تقدس میں رچی ہوئی شخصیت کا عکس نمایاں ہے مگر ''ننھے نے سیٹ خریدی''، ''خربوزے'' اور ''چوز'' کے سے افسانوں میں سوانحی رنگ بہت گہرا ہے۔ افسانہ ''نیلا پتھر'' کا آغاز تو اُس زمانے کی حقیقی زندگی کی جھلک معلوم ہوتا ہے۔ جب ندیم کیمبل پور میں زیر تعلیم تھے۔ اطہر کے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے بعد کیمبل پور روانگی کا سماں دیکھیے:

> ''اماں نے ہمیں آدھی رات کو ہی جگا دیا، اُٹھو بیٹو، منہ ہاتھ دھولو، کپڑے بدل لو، شیرو میراثی اور نورا ساربان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''
>
> بھائی جان نے پوچھا۔ اور اماں۔ ہمارے چلے جانے کے بعد آپ روئیں گی تو نہیں نا؟
>
> ''نہیں تو''...... اماں بولیں اور پھر رونے لگیں۔
>
> ہم چارپائیوں پر سے کود کر اماں سے لپٹ گئے اور اماں دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روتی رہیں اور کہتی رہیں، میں کیوں روؤں؟ میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی روؤں۔ جب میرے بچے میرا سہارا بننے والے ہیں پھر جب تم دونوں نوکر ہو جاؤ گے نا تو میں اپنی گزری ہوئی زندگی سے جی بھر کر بدلے لوں گی۔ میں نواڑ کے پلنگ پر سوؤں گی۔ میں ریشم کی چادر اوڑھوں گی۔ میں طلہ گچ جوتے پہنوں گی اور تمہاری بیویوں سے اپنے پاؤں دباؤوں گی......''

ایثار و محبت کا یہ سخت کوش پیکر جس حوصلہ مندی اور روحانی استقامت کے ساتھ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنی ذاتی زندگی کے ستم کو کرم بناتا ہے اُس کی یاد ندیم کے دل میں ہمیشہ تازہ رہی۔ شخصی کردار ہی نہیں فنی مسلک کی تشکیل میں بھی اپنی ماں کی شخصیت ندیم کے لیے مینارہ نور ثابت ہوئی۔

فقر و فاقہ میں مبتلا ماؤں اور ناداری و محرومی کے کچوکے سہتے ہوئے بچوں کے مصائب کو ندیم نے بڑی دردمندی کے ساتھ سمجھا اور انقلابی انداز نظر کے ساتھ پیش نظر کیا ہے۔ افسانہ ''ننھے نے سیٹ خریدی'' کا

مرکزی کردار عزیز اپنے ننھے منے ذہن اور اپنے حیران و معصوم دل کے ساتھ معاشی عدم مساوات پر سوچتا ہوا بچہ ہے۔ سکول جاتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو وہ خود بھی اور اس کا غریب باپ بھی زخمی پاؤں کی فکر بھول کر سلیٹ کے ٹوٹ جانے کے غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ باپ تو خبر یہ خبر سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے:

> چُپ کرتا ہے یا لگاؤں ایک اور؟''......اور اُس کی آواز ایک دم رک گئی۔
>
> سلیٹ بھی توڑ آیا ہے اور ریں ریں بھی کیے جاتا ہے......اندھا......اندھے تو سامنے دیکھ کر کیوں نہیں چلتا؟......ہیں؟......یہ ہمیشہ تیری نظر آسمانوں پر کیوں رہتی ہے؟......جیسے اللہ میاں سے باتیں ہو رہی ہیں! اندھا......تو تو مجذوب ہے۔''
>
> اور جب اُس کا باپ اُٹھ کر چوپال چلا گیا تو اس نے ماں سے نہایت رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ''ماں مجذوب کسے کہتے ہیں؟''
>
> ''جسے خدا کے علاوہ کسی کا خیال نہ ہو......یعنی اللہ میاں کا دوست!'' ماں نے بتایا۔
>
> اور عزیز سوچنے لگا کہ اللہ میاں کا دوست ہونا بہت بُری بات ہے؟......''

عزیز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ مجذوب کا سا مقدس لفظ گالی کیوں بن گیا؟......معاشی استبداد کی لپیٹ میں آئے ہوئے معاشرے میں خوب بتدریج ناخوب ہو جاتا ہے......؟ یہ راز سمجھنے کو ایک عمر پڑی ہے۔ ابھی تو ذہن اس گتھی کو سلجھانے کی فکر میں ہے کہ اگر ننگے پاؤں ٹھوکریں کھانا ہی مقدر تھا تو پھر اللہ میاں نے انسان کے پاؤں بھی بیل کے سُموں کی طرح ہڈی سے کیوں نہ بنائے؟ ننھے عزیز کی سب سے بڑی حسرت اگر لوہے کی سلیٹ ہے تو افسانہ ''خربوزے'' کے مرکزی کردار کا سب سے بڑا خواب خربوزہ ہے۔

کہانی خربوزے کے کرداروں کا المیہ یہ ہے کہ انھیں خربوں کے موسم میں خربوزہ خریدنے کی استطاعت نہیں۔ بچہ سوتے جاگتے خربوزے کے خواب دیکھتا ہے وہ خربوزے کے ذائقے ہی نہیں خوشبو کو بھی کچھ یوں ترس رہا ہے کہ آسمان کے ستارے بھی خربوزے معلوم ہوتے ہیں مگر بیوہ اور مفلس ماں جس کے پاس اچار تک خریدنے کی سکت نہیں خربوزہ کہاں سے لائے؟ بچے کو ذیلدار کا بھوسہ لتاڑنے کی مزدوری میں دو پیسے ملتے ہیں تو وہ خوشی خوشی خربوزہ خرید کر ماں کے پاس یوں آتا ہے جیسے آسمان سے ستارے توڑ لایا، مگر وہ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو جاتی ہے:

> ''پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا۔ مگر خیر، تجھے شوق تھا، شکر ہے

> تیرے من کی آگ ٹھنڈی ہوئی لے ذرا چھری اٹھا لا۔ چولھے کے پاس پڑی ہوگی۔"
>
> مگر ماں نے تین بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر خربوزے پر چھری چلائی تو:
>
> "دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ندی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔"

خربوزے سے محرومی افسانہ "چور" کے رحمان کی زندگی کا بھی بہت بڑا المیہ ہے۔ جب وہ راجہ اللہ داد کے گھر کے کوڑے کو گھوڑے پر پھینکتا تو خربوزے کے چھلکوں کو دیکھ کر اس کے دانتوں میں چُل سی ہونے لگتی ہے۔ اُس کے منہ میں اُس زمانے میں کھائے ہوئے خربوزوں کا ذائقہ پانی بن کر امڈ آتا جب اُس کے ماں باپ زندہ تھے۔ رحمان کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا اور ماں گاؤں اور ہسپتال کے درمیان چلتے چلتے دم توڑ بیٹھی تھی۔ ایک دو برس تک یوں ہی روتے رہنے کے بعد وہ پھوپھی کے گھر اٹھ آیا جہاں اس کے امیر مگر خسیس پھوپھا نے اُس کی زندگی اجیرن کر دی۔ وہ کچھ ایسا سنگدل شخص تھا کہ:

> "جب بیوی نے اُسے بتایا کہ رحمان دن بھر بھوسے کی کوٹھڑی میں ماں کی یاد میں روتا رہا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا' ساٹھ ستر روپے کے بھوسے کا ناس مار دیا ہوگا لونڈے نے۔ میں حیران ہوں یہ تم شیشے کے گھر میں بندر کیوں پال رہی ہو؟"
>
> پھر وہ دن آنے میں دیر نہ لگی جب پھوپھا نے رحمان پر چوری کا الزام جڑ دیا اور:
>
> "رحمان بگولے میں پھنسا ہوا کاغذ کا پرزہ ہو رہا تھا۔ پلکیں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں میں مٹی گھس گئی ہے۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ میلے میلے گلابی رنگ میں سے گلاب غائب ہو گیا تھا۔ صرف میل باقی رہ گیا تھا۔ بس اتنا کہہ سکا کون سی واسکٹ؟ اور پھر ایک دم اُس کی اُجڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو پھیل گئے۔ اس کا نیچے والا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا، ٹھوڑی میں چند شکنیں پیدا ہوئیں، نتھنے پھڑ کنے لگے اور وہ زار و زار رونے لگا۔"

ہر چند یہ بات دو تین منٹ میں کھل گئی کہ پیسے رحمان نے چوری نہیں کیے تھے بلکہ خود پھوپھا نے بھولے سے دوسری جیب میں رکھ دیے تھے مگر رحمان اس گھر کو خیرباد کہہ کر زار زار روتا ہوا اپنے گاؤں چلا آیا جہاں راجہ اللہ نواز نے اُسے اپنے گھر میں پناہ دینے کی بشارت سُنائی۔

> ”میں سارے گاؤں کی طرف سے تمہارے آنسو پونچھنے کو تیار ہوں۔ یوں کرو کہ یہاں میرے اصطبل میں رہو، تمہاری نوکری کے بدلے ہر روز شام کا کھانا تم میرے گھر سے کھانا، سمجھے؟ ......اوپر سے سال میں ایک دو مرتبہ تمہیں میرے بچوں کی اُترن بھی ملتی رہے گی۔ سو میں تمہیں انشاءاللہ ننگا بھی نہیں رہنے دوں گا۔ باقی رہا صبح کا کھانا تو اُس کا انتظام یوں ہو جائے گا کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں ان کے ہاں کا کوڑا اٹھا کر باہر گھورے پر پھینک آیا کرو اور بس۔ سب پردہ نشین بیبیاں ہیں۔ نائن، میراثن آئے تو کوڑا اُٹھے۔ تمہاری وجہ سے یہ فائدہ ہوگا کہ گھر صاف رہیں گے بس اتنا سا کام ہے۔ تم اس گاؤں کے بیٹے ہو اور تمہارے سر پر ہاتھ رکھنا میرا فرض ہے۔“

یوں سارے گاؤں میں راجہ اللہ نواز کی فیاضی اور خدا ترسی کی دھوم مچ گئی اور رحمان کو اس مشقت کے بدلے سر چھپانے کو ایک اصطبل میسر آ گیا۔ راجہ اللہ نواز کے خاندان میں رزق کی فراوانی اور آس پاس کے گھروں میں بنیادی انسانی ضروریات زندگی کی شدید قلت یا نایابی کے مشاہدات رفتہ رفتہ رحمان کے فرشتوں جیسے معصوم دل و دماغ میں غربت اور نیکی، اخلاقی اقدار اور مادی احتیاج کے درمیان شدید کشمکش برپا کر دیتے ہیں۔ اب کبھی اسے راجہ صاحب پر بھی غصہ آنے لگتا ہے۔

> ”نوکری لگتی ہے تو تنخواہیں ملتی ہیں۔ یہ بھی کیا کہ دن بھر اصطبل صاف کرو سیروں کوڑے کے ٹوکرے اٹھاؤ اور بدلے میں دو روٹیاں اور پیاز کی دو گانٹھیں لے کر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کنجوس، مکھی چوس، مہینے میں ایک آنہ ہی دے دیتا تو ہم یہ جاتی بہار کا پھل تو ذرا سا چکھ لیتے۔“

اس عالم میں چوری کا خربوزہ کھانے کا تصور کرتے ہی رحمان کو:

> ”کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے کوٹھے کے غار میں سے اُس کی ماں پیٹ کے درد سے کراہتی اور روتی ہوئی نکلی ہے اور اُس نے رحمان کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مار دیا ہے۔ یکا یک وہ پوری شدت سے واپس بھاگا۔ اسے کچھ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اس کے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ گلیوں میں اڑا جا رہا تھا......“

ایک رحمان پہ ہی کیا موقوف ندیم کے کتنے ہی ننھے کرداروں کو ماں کی یاد اخلاق اور شرافت اور نیکی اور

پاکیزگی کی ایک خاص سطح سے نیچے گرنے نہیں دیتی۔ شدید ترین مادی مصائب میں گھرے ہوئے ان کرداروں کی شخصیتیں ماں کے دودھ کے ساتھ رگ و پے میں رچی ہوئی دینی و روحانی اقدار کی بدولت شکست و ریخت سے محفوظ رہتی ہیں اور وہ صبر آزما مشکلات کا مقابلہ اعلیٰ انسانی اقدار پر ثابت قدمی سے کرتے ہیں ۔ اسی طرح دکھ کے سناٹے میں ماں کی یاد ہی ان کا سب سے بڑا نفسیاتی سہارا بن جاتی ہے۔ افسانہ ”پاؤں کا کانٹا“ کا ننھا کریم سوتیلی ماں کے ظلم اور باپ کی بے رُخی کے زخموں کو اپنی حقیقی ماں کی محبت بھری یادوں ہی سے مندمل کر پاتا ہے:

> ”کریم اندر جا کر سُوئی لے آیا۔ دِیئے کی مدھم روشنی میں بیٹھ کر ایڑی لگائی اور سوئی سے کانٹے کے اردگرد کا گوشت کریدنے لگا۔ رہ رہ کر اُسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جو اُسے ہاتھوں پر اٹھائے رکھتی تھی جو اُس کے لیے قسم قسم کی چیزیں خرید لاتی تھی جس نے اپنی پڑوسن کو جو ایک دن کریم کے پاؤں سے کانٹا نکال رہی تھی کہا تھا۔ اری ذرا دھیرے دھیرے سوئی پھیر۔ بس یہ سمجھ تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے!“۔

ہمارے ہاں کے سرداری اور جاگیرداری نظام جہاں بچپن کی فرشتوں کی سی معصومیت کے قتل پر ذرا نہیں شرماتے وہاں عنفوانِ شباب کے سادہ و معصوم نسوانی حسن کو تاراج کرنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہاں میں اس موضوع پر ندیم کے متعدد افسانوں میں سے صرف دو کی جانب اشارہ کروں گا۔ افسانہ ”بین“ میں حُسنِ قدس اگر ایک پیرزادے کی شیطنت کا شکار بنتا ہے تو افسانہ ’لارنس آف تھیلیا‘ میں ایک جاگیرزادے کی زندگی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ہر دو کہانیوں کے انجام پر ذہن آسیب کی سی فضا کے حامل افسانوں ”گڑیا“ اور ”ماسی گُل بانو“ کے بدنصیب کرداروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ”گڑیا“ کی بانو اور مہراں ...... ہو یا ماسی ”گل بانو“ اور تاجو میراثن ہو۔ یہ وہ کردار ہیں جو ایک انتہائی پسماندہ اور بے حد ضعیف الاعتقاد معاشرے کی رسمیات کے شدید دباؤ میں آ کر معمول کی انسانی زندگی سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ قافلہ حیات سے بچھڑے ہوئے یہ بھٹکے راہی جن ہو جاتے ہیں یا پریاں قرار پاتے ہیں۔ فطری زندگی کے نشاط و الم سے محروم ہو کر رہ جانے والے یہ لوگ ہوں یا ندیم کے افسانوں میں بار بار ابھرنے والی دیوانی عورتیں یا چڑیلیں ہوں۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس یہ ندیم کی وہ مخلوق ہیں جن کی روح اتھاہ دُکھوں محرومیوں اور جانکاہ صدموں سے نڈھال اور زخموں سے چور ہے ۔ جو گرد و پیش پھیلی ہوئی بہیمیت، شیطنت، درندگی اور سفاکی کی تاب نہ لا کر اپنے ہوش و حواس کا حصہ گنوا بیٹھی

ہے لیکن اس کے باوصف ان کی روح میں محبت، انسانیت اور غیرت وحمیت کی شمع ٹمٹما رہی ہے۔ ''لارنس آف تھیلیا'' کی رنگی اور 'بین' کی رانوائن کرداروں کی نمائندگی کرتی ہیں جو دیوانگی کی بجائے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے شکاری پر پوری طاقت کے ساتھ جھپٹ پڑتی ہے۔ پنجاب کے ایک علاقہ تھل کے جاگیر دار کے نوجوان بیٹھے خُدا بخش نے لارنس آف عریبیا کی طرز پر اپنے محبوب باز کا نام 'لارنس آف تھیلیا' رکھ چھوڑا ہے۔ اُس نے اس باز کی دیکھ بھال اور خاطر مدارت کے لیے باقاعدہ ایک اردلی بھی مقرر کر رکھا ہے۔ نام تو اس اردلی کا بھی خدا بخش ہے مگر غریب مزارع ہونے کے سبب اسے بشکو کہتے ہیں۔ خدا بخش، بشکو اور افسانہ کا واحد متکلم پرندوں کے شکار پر نکلتے ہیں۔ خدا بخش ایک درخت پر بیٹھی ہوئی لالی کو دیکھ کر اپنے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اُتارتا ہے اور پھر:

> ''ایک دم جیسے باز پر وحشت تاری ہوگئی۔ موت کی تلوار ہوا کو کاٹتی چلی گئی اور لالی اڑ گئی مگر باز نے آن کی آن میں اُس کو جالیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا۔ تب اُس نے لالی کی چیڑ پھاڑ شروع کر دی۔ اُس کی مڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی۔ ہڈی پر سے گوشت اتارتا ہے۔ انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ کچا گوشت ہے تازہ اور وٹامن سے بھرپور!
>
> 'لعنت' میں نے کہا۔ 'تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے'......''

واپسی پر خدا بخش کی بہن کی سہیلی رنگی سامنے آ گئی۔ غریب مزارع کی اس بیٹی کا:

> ''اصل نام نہ جانے کیا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے......سات رنگوں میں سے کوئی رنگ بھی ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اُس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اُس کے تہ بند، کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے......اگر ایک بے رنگ چپلی سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لیے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خُدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس

انتہا کا حُسن کار ہے ۔“

خدا بخش یہ فریب دے کر رنگی کو واپس اپنے گھر لے آیا کہ اس کے والد نے اُسے پیغام بھیجا ہے کہ شام کے وقت اکیلے واپس آنے کی بجائے رات کو خدا بخش کی بہن کے ساتھ ہی قیام کر لے ۔ صبح بشکو نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں اطلاع دی:

> “کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے ۔ لارنس مرا پڑا ہے ۔” خدا بخش کو جیسے سکتا ہو گیا ۔ ایک خاص طویل وقفے کے بعد وہ بولا ۔“
>
> “رنگی کو یہاں لے آؤ ۔“
>
> فوراً بشکو آیا ۔ رنگی تو منہ اندھیرے سے چلی گئی چھوٹے مالک ۔‘ اور خدا بخش اپنی لہو لہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا ۔ ”دیکھا میں نہ کہا تھا؟ میرے باز کو اسی کمینی نے مارا ہے ۔ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی ۔ میں نے کہا...... لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان ۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو میں جانتا ہوں ۔ یہ قتل اُسی بدذات کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے ۔“
>
> میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا ۔ میں اس کی ......“

اِس اختتامی پیراگراف میں ”لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان !“ کا جملہ شکار کے منظر میں باز کے لالی پر جھپٹنے، لالی کی بوٹیاں نوچنے اور اس کی ہڈی پر سے کچا تازہ اور وٹامن سے بھرپور گوشت اُتارنے کی سی جزئیات کو نئی اور تلخ تر علامتی معنویت سے لبریز کر دیتا ہے ۔ پھر شکار کا جو منظر خدا بخش کے لیے لذت سے بھرپور تماشا ہے وہی منظر واحد متکلم میں کراہت کا ردِعمل پیدا کرتا ہے:

> “لعنت تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے ۔“

گویا یہ پورے جاگیرداری نظام کی درندگی پر ایک بلیغ تبصرہ ہے ۔ رنگی کا لارنس کو گردن مروڑ کر پھینک دینا اس درندگی کے خلاف کھلی بغاوت ہے ۔ نظام خانقاہی کے خلاف ایسی ہی بغاوت افسانہ ”بین“ کی رانو نے کی ہے ۔ نورانی صورت کی سولہ سترہ برس کی اس فرشتہ سیرت لڑکی کی آواز میں سائیں حضرت شاہ جی نے ”فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی تو اس کے ضعیف الاعتقاد والدین کو فریب دے کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ۔ خوف و وحشت بھرے اس تجربے کے ردِعمل میں رانو نے:

> ”مزار شریف پر گول گول پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لیے اور چیخ چیخ کر کہا کہ سائیں! مزار شریف سے دستِ مبارک تو جب نکلے گا، اگر ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولھے شاہ جی کے دیے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی۔ خادم رانو کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھا تو سائیں جی نے انھیں روک کر کہا کہ نادانو! یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے؟“

جہاں درویشی بھی عیاری ہو، سلطانی بھی عیاری، وہاں خلقِ خُدا کو ظلم کی گرفت سے کیونکر نجات دلائی جائے؟ ......سوال رہ رہ کر ندیم کے دل و دماغ میں سر اٹھاتا ہے اور وہ اس کے گرد کہانیوں پر کہانیاں بُنتے اور نظموں پر نظمیں تخلیق کرتے چلے آتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ندیم کے ہاں بربادیِ اطفال اور مظلومیِ نسواں بجائے خود کوئی الگ موضوع نہیں بلکہ ہمہ گیر انسانی صورت حال ہی کا حصہ ہے۔ یہ صورت حال جبر و استبداد کے مروجہ نظام نے پیدا کر رکھی ہے۔ جب تک یہ نظام باقی ہے خدا بخش اور سائیں جی رنگی اور رانو کی سی فاختاؤں پر عقاب بن کر جھپٹتے رہیں گے۔ حُسن تاراج ہوتا رہے گا اور آدمیت کی تذلیل ہوتی رہے گی۔

جنگ اور امن

احمد ندیم قاسمی نے یوں تو متعدد افسانوں میں اور اپنی ذہنی نشو و نما کے اہم موڑ پر جنگ کی ماہیت اور اثرات پر غور و فکر کیا ہے مگر طویل مختصر افسانہ ”ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد“ میں انھوں نے اپنے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو جس ہمہ گیر انداز میں اور جس فنکارانہ صناعی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ندیم کے ہاں ہی نہیں بلکہ اُردو افسانے میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ممتاز شیریں نے اگر اس افسانے کو ایک شخص کی بجائے ایک گاؤں کی، ایک دور کی اور ساری انسانیت کی کہانی قرار دیا ہے[۴] تو ڈاکٹر محمد حسن فاروقی نے اسے اُردو ادب کا سب سے زیادہ معنی خیز افسانہ بتایا ہے[۵]۔ اس افسانے میں جنگ و امن کے موضوع پر اُس سے پہلے لکھے گئے ندیم کے افسانوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور اس موضوع پر بعد میں تخلیق ہونے والے افسانوں کی آہٹ بھی۔ کہانی شمشیر خان کے اقتصادی بحران اور جذباتی و نفسیاتی طوفان کے گرد گھومتی ہے۔

شمشیر خان اقتصادی مصائب سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو محاذِ جنگ پر بھیجتا ہے اور پھر آئے دن جنگ میں جوانوں کے کٹ مرنے پر قیدی ہو جانے کی خبروں سے جذباتی انتشار اور نفسیاتی آشوب کا شکار ہونے لگتا ہے۔ بہو کا طرزِ عمل اس انتشار و آشوب کو مزید خوفناک بنا دیتا ہے اُس کی بہو کہ وفا کی پُتلی تھی۔ آہستہ آہستہ یوں بدلنے لگتی ہے جیسے بہار خزاں میں بدلتی ہے اور بالآخر دھوبی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس طرح امن و سکون اور تقدیس و وفا کی جو دنیا جنگ سے پہلے آباد تھی، جنگ کے باعث برباد ہو جاتی ہے۔ ممتاز شیریں نے درست کہا ہے کہ یہ افسانہ ''صرف شمشیر خان ہی کی داستان نہیں بلکہ اُس کے پورے گاؤں کی بھی داستان ہے اور اس کا اجتماعی پسِ منظر کرداروں سے زیادہ اہم اور معنی خیز ہے۔''۲

ہر چند ندیم نے اپنے اس افسانے میں جنگ کا وسیع تر اور عمیق تر اثرات کا احاطہ کرنے کے لیے جنگ کے تجربے کو سپاہی کی زبانی بیان کرنے کی بجائے شمشیر، شہباز، شداں، پٹواری، مہاجن اور ذیلدار کے سے ناقابلِ فراموش کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے مگر اس کہانی کا مرکزی کردار پورا گاؤں ہے۔ بلاشبہ ندیم کو ماحول اور فضا کی تعمیر کا حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے اور یہاں انھوں نے خارجی ماحول اور نفسیاتی فضا کی مصوری اس عمدگی کے ساتھ کی ہے اور حقیقی اور خیالی سرحدوں کو یوں ٹوٹتا اور باہم دگر آمیز ہوتا دکھایا ہے کہ کوہستان نمک کا یہ چھوٹا سا گاؤں سات سمندر پار برپا جنگ کا ایک محاذ بن گیا ہے:

> ۱۔ بچہ رونے لگا۔ شاداں بھاگی آئی، وہ رو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خُون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خُون تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں۔ لاشیں پہیوں تک چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑ رہی ہیں۔ کسی آہنی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جس میں زیادہ خون کی بو ہے۔ جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے۔ 'دیا جلاؤ' وہ پکارا۔
>
> ۲۔ ''جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اِدھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے جیسے جنگ کے ساتھ ان کی ساری دلچسپی اور وابستگی ان کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی اور وہ جب کٹ مرے یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی۔ باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے

> تو ان کے پیچھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں، چوپالوں پر الاؤ کے گرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ گلیوں میں خاک اڑتی۔“

> ۴۔ ”آہستہ آہستہ گاؤں میں سکون چھاتا گیا مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ، ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا۔ مویشی تک اداس نظر آتے تھے۔ ہر ماں، ہر بیوی، اور ہر بہن ہر جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، ان کے سرہانے دیے رکھ کر دعائیں مانگتی ...... میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے۔“

گاؤں کا چوپال اور گاؤں کا مدرسہ گویا جنگ کے اعصابی مرکز تھے۔ ہر رات چوپال پر کرۂ ارض کے طول و عرض بکھرے ہوئے جنگی محاذوں کے تذکرے اور تبصرے ہوتے۔ نت نئی خبریں آتیں، ان پر حاشیہ آرائیاں ہوتیں اور یادِ ماضی سے نڈھال بڑوں، بوڑھوں کے ذہن اُن اجنبی سرزمینوں میں بھٹکنے لگے جہاں اُن کے بیٹے، پوتے کرائے کے سپاہیوں کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف تھے اور:

> ”ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا، سب اپنے اپنے بیٹوں بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے اور دکھوں کی گٹھڑیاں اٹھائے واپس جاتے اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر برآمد ہوا۔ ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے ...... خط کھلتے جاتے تھے اور آنکھیں بھیگی جاتی تھیں۔ اچانک ایک طرف بوڑھے نے پٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا ”میں اجڑ گیا۔“ اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون ...... ڈاکخانہ ماتم کدہ بن گیا ...... آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا۔ جنگ ہر جگہ ہے۔ ”شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونجنے لگے۔“

احمد ندیم قاسمی نے اس افسانے میں اقتصادی زوال سے لے کر اخلاقی بربادی تک ایک گاؤں کی پوری جذباتی اور نفسیاتی سرگزشت کچھ ایسی ذکاوتِ احساس کے ساتھ بیان کی ہے کہ جنگ کا خاتمہ جنگ سے پہلے کی

زندگی کا خاتمہ بن جاتا ہے۔ گاؤں نوجوانوں سے خالی ہو جاتا ہے اور اپنے فلسفی پٹواری سے محروم ہو جاتا ہے۔ پٹواری کی روشن خیال فلسفہ طرازی کا ارتقائی روپ ہمیں بعد کی ایک انوکھی تخلیق ''راجے مہاراجے'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

پٹواری کا استعمار دشمن رویہ، امن و انسانیت کے تصورات غیر متزلزل ایمان اور ترقی پسند سیاسی شعور پنجاب کی اُس فضا کا حقیقت پسندانہ ترجمان ہے جس میں تحریکِ خلافت مقبول ہوئی اور ''مجلس احرار'' پروان چڑھی تھی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ تحریکِ خلافت کے رہنماؤں نے جہاں ہندوستانیوں سے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی پرزور اور موثر اپیلیں کی تھیں۔ وہاں جمعیت العلمائے ہند نے مسلمانوں پر فوج کی ملازمت حرام ہونے کا فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔ علی برادران اور ان کے ساتھیوں پر ۱۹۲۱ء میں کراچی کا مشہور مقدمہ بغاوت فوجی بھرتی کی مخالفت اور فوج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں چلایا گیا تھا۔

اِدھر برطانوی فوج اور پنجابی عوام کے درمیان یہ لڑائی جاری تھی اور اُدھر ضلع شاہپور ہی کے گاؤں میں احمد ندیم قاسمی گھٹنوں چلنا سیکھ رہے تھے۔ جب احمد ندیم قاسمی پیدا ہوئے تو پہلی عالمگیر جنگ کی عمر ۲ سال کو پہنچ چکی تھی۔ قدرتی طور پر ندیم نے مقامی غریب و غیور کسانوں اور بیرونی جابر اور مستبد حکمرانوں کے درمیان تصادم کی کہانیوں کے طلسم اور اُن لوک گیتوں کی گونج میں ہوش سنبھالا جن میں ''لام'' ایک باقاعدہ دیو مالائی کردار کا مقام پا چکی تھی:

> جنگ ختم ہوگی تب پتہ چلے گا کہ بیوہ کون ہے اور سہاگن کون؟(۷) اور جب انھوں نے ادب کے میدان میں قدم رکھا تو پہلی عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی مگر جنگ کے قصے گھر گھر جاری تھے اور ساتھ ہی دوسری عالمی جنگ کی تیاری میں بھرتی زوروں پر تھی۔ اب فوجی بھرتی کے لیے جبر کی ضرورت نہ تھی۔ نوجوان رضاکارانہ طور پر بھرتی ہو رہے تھے:
>
> ''بھرتی میں اس قدر شدت کی کشش تھی کہ وہ نوجوان جو اپنے کھیتوں کے تیار کھوالے تھے۔ نلائی کے بہانے گھروں سے نکلے اور ہلوں اور بیلوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہفتوں کے بعد سکندر آباد یا لکھنؤ سے ان کی چٹھیاں آتیں کہ وہ ماں باپ اور بھائی بہن کو فاقوں سے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے فوج میں بھرتی ہو گئے۔''

برطانوی استعمار نے رضاکارانہ بھرتی کی فضا پیدا کرنے کی خاطر اگر ایک طرف حفیظ جالندھری کے

سے مغنیوں کے جنگی ترانوں سے کام لیا تو دوسری طرف افلاس کے جہنم کو دہکانے کا اہتمام بھی کیا۔ پنجاب کے کوہستان نمک میں فوجی بھرتی کی فصل کو سدا بہار رکھنے کے لیے لوگوں کو مفلس بنانے اور پسماندہ رکھنے کے لیے خصوصی منصوبہ بندی کی۔ (۸)

ندیم کے یہاں جنگ کے باعث انسانی زندگی کی مادی روحانی بربادی کا موضوع فقط زمانہ جنگ تک محدود نہیں ہے بل کہ عالمگیر جنگوں کا تجربہ ندیم کے دل و دماغ پر اب تک منڈلا رہا ہے اور وہ اسے نت نئے زاویوں سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے اور متنوع رنگوں میں پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ ندیم کا اپنا علاقہ فوجی بھرتی کا اہم ترین مرکز تھا۔ اس اعتبار سے "سپاہی بیٹا" کا آغاز قابلِ غور ہے۔

> "یہ علاقہ فوجی بھرتی کی سدا بہار فصل تھا۔ ان گنت گھروں میں مانگیں بگاڑی اور
> چوڑیاں توڑی جا چکی تھیں۔ بچوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں یتیمی کی ریت گھس گئی تھی
> اور اچھے خاصے سیدھے سیدھے چلنے والے بزرگوں کی کمریں جھک گئی تھیں۔ لیکن
> بھرتی بدستور زوروں پر تھی ..... بھرتی کی ہر کھیپ کے ساتھ ذیلدار کے گھروں میں
> سندوں کا ایک انبار جمع ہوتا گیا اور انگریزی ٹوپ والے صاحبوں کی تعداد بڑھتی گئی۔"

پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیانی وقفہ زماں میں پنجاب کے "مارشل ایریا" میں فاقوں کی فصل کو اس زور شور سے پروان چڑھایا گیا اور مہاجن کے پنجہ استبداد کو اس اہتمام کے ساتھ مضبوط اور موثر بنایا گیا کہ دوسری عالمگیر جنگ کا اعلان ہوتے ہی کوہستان نمک کے آس پاس کے گاؤں کے گاؤں نوجوانوں سے خالی ہو گئے۔ ایسے ایسے والدین بھی جن کے تین میں سے دو بیٹے پہلی جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اپنے تیسرے اکلوتے بیٹے کو بھی جنگ کے الاؤ میں جھونکنے پر مجبور ہو گئے۔ اقتصادی بحران نے فوجی بھرتی کو پرکشش بنایا، سپاہیوں کی تنخواہ اور پنشن سے پیدا ہونے والی مصنوعی خوشحالی، نوجوانوں سے خالی دیہات میں اخلاقی ابتری کی اس فضا میں بوڑھوں کی مجروح دیوانگی کی سرحد پر آ پہنچی۔ اقتصادی، اخلاقی اور نفسیاتی بحرانوں میں گھرے ہوئے پنجاب کی یہ بپتا احمد ندیم قاسمی نے ایک عجیب طلسماتی حقیقت نگاری کے اسلوب میں نکتہ بہ نکتہ ہو بہو بیان کی ہے۔ اپنے معاشرے پر جنگ کے بھیانک اثرات کو انھوں نے روحانی و جذباتی سے لے کر فکری اور نظریاتی زاویوں تک دیکھا اور متنوع اسالیب میں پیش کیا ہے۔

جنگی خدمات کے عوض پنشن پانے والوں کی خدمات کو یہ احساس تلخ تر بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی اقدار

کے تحفظ کی خاطر نہیں بل کہ فقط چند ٹکوں کے لالچ میں موت اور تخریب کے سفاک ڈرامے کا ایک بے بس کردار تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے پسِ منظر میں لکھے گئے افسانہ ”بوڑھا سپاہی“ کا مرکزی کردار اپنی تلخ ترین یادیں یوں بیان کرتا ہے:

> ”ایک دفعہ میں نے ایک سپاہی (جرمن) کے دل میں سنگین گھونپ دی۔ وہ بے تاب ہو کر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب سے بھرے بھرے گالوں اور سنہرے گھنگھریالے بالوں والی ایک خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کی تصویر نکال کر اُسے چوما ہچکی لی اور مر گیا۔ ملک جی! میں نے اُس سپاہی کو اپنے ہاتھوں دفن کیا اور دفن کرتے ہوئے تصویر اس کے زخمی دل پر رکھ دی۔ کسی کو جان سے مار دینا ان دنوں ہمارا روز کا معمول تھا۔ میں نے ان گنہگار ہاتھوں سے کئی سو آدمی جان سے مارے ہیں۔ ملک جی! لیکن اس سپاہی کا قتل کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرے زخم چھل گئے ہیں۔ میں دُنیا کا سب سے گنہگار ہوں۔“

یہ سپاہی جب واپس اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو خود اُس کا قریہ محبت تاراج ہو چکا ہوتا ہے سو وہ اپنی محبوبہ کے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی خاطر اپنی زندگی تج کر اس احساسِ گناہ سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لوگ جن پر فرار کا یہ دروازہ کھلتا با لآخر پاگل پن کے جنگلوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔ ایسے کرداروں کے گرد بنی ہوئی کہانیاں اردو افسانے میں طنز کے استعمال کی نادر و نایاب مثال ہیں۔ ”سپاہی بیٹا“، ”بابا نورا“، ”ہیرا“ میں طنز لفظوں اور جملوں سے نہیں پھوٹتی، صورتِ واقعہ میں بھی طنز کا شائبہ یا تو معدوم ہے اور یا پھر کم کم ہے۔ اس کے برعکس یہاں طنزیہ کاٹ افسانہ نگار کے اندازِ نظر کا کرشمہ ہے۔ اُن افسانوں میں طنز اس فکری زاویے سے جنم لیتی ہے جس سے افسانہ نگار انسانی المیہ کو دیکھتا اور پیش کرتا ہے افسانے کے اختتام تک آتے آتے پاگل کردار ہوشمند نظر آنے لگتا ہے اور ہوشمند لوگ دیوانے معلوم دیتے ہیں۔ سپاہی بیٹے کی ماں، بابا نورا اور وریام عجب با شعور دیوانے ہیں۔ آیئے ان سے ایک ایک کر کے ملیں۔

”سپاہی بیٹا“ کی ماں جسے افسانہ نگار نے کوئی نام نہیں دیا اور جو جنگ میں ہلاک ہونے والے ہر سپاہی کی ماں معلوم ہوتی ہے۔ فوجی بھرتی کی ٹیم کو اپنے گھر لاتی ہے مگر اس کے گھر پہنچ کر انھیں پتہ چلتا ہے کہ وہ جس خوبصورت اور بہادر نوجوان کو بھرتی کرنے آئے ہیں وہ تو ایک مہینہ پہلے رنگون میں جنگ کا ایندھن بن چکا

ہے۔ آخری سطروں تک پہنچ کر ماں کی ساری گفتگو جس پر افسانے کے بہاؤ کے دوران کسی کو بھی پاگل پن کا شائبہ نظر نہ آیا۔ مرحوم بیٹے کا مؤثر اور دلگداز نوحہ بن جاتی ہے۔ یہ حقیقت المیہ کی شدت کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے کہ افلاس کے جس خونی پنجہ سے نجات کی تمنا میں ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو محاذ جنگ پر بھیجا تھا۔ اس کی گرفت تو جوں کی توں قائم ہے:

> ''اتنی غریب ہوں صاحب کہ آج مجھے گھن لگے چنے کھانے پڑے۔ جب سے جیسے پیٹ میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ گھن لگے چنوں میں چنا تو ہوتا ہی نہیں۔ صرف چھلکا ہوتا ہے اور چھلکا بھی ایسا کڑوا جیسے کریلا۔''

ماں کے یہ فقرے بڑے بلیغ انداز میں بڑے صاحب کے اس وعدے کا کھوکھلا پن بے نقاب کرتے ہیں جس کی رو سے فتحیاب ہو کر گاؤں واپس آنے والے فوجی تمغے اور سندیں حاصل کریں گے اور ''اپنے بادشاہ سلامت کی آن پر قربان'' ہونے والے پنشن پائیں گے۔ افسانہ ''بابا نورا'' کو ڈاکٹر قمر رئیس نے غیر فانی تخلیق قرار دیا ہے اور بابا نورا کی دیوانگی سے پیدا ہونے والی رقت اور نشریت میں میر کی شاعری سے مماثلت دیکھی ہے۔ (۹) واقعتاً ندیم نے بابا نورا کی کردار نگاری میں میر کی سادہ پرکاری سے کام لیا ہے۔ بستی والوں کے پاس بابا نورا کے پاگل پن کا صرف یہی ایک ثبوت ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے برما میں مارے جانے کی اطلاع پانے کے باوجود گزشتہ دس برس سے روزانہ، بلاناغہ بیٹے کے خط کے انتظار میں ڈاک خانے جاتا ہے اور جب چپ چاپ نامراد واپس آجاتا ہے۔ اس ایک عادت سے قطع نظر کر لیں تو بابا نورا جیسا ہوشمند ڈھونڈے سے بھی خال خال ہی ملے گا۔ لباس کی تراش خراش ہو یا چال ڈھال کا بانکپن ہو۔ عبارت، اشارت اور ادا کی شائستگی ہو یا کردار کی باوقار پاکیزگی ہو بابا نورا حُسنِ انسانی کے تمام جوہروں سے مالا مال ہے۔ اس پر مستزاد دہقانی احساسِ محبت:

> '' پگڈنڈی مینڈ مینڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی تو بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آجاتی تھی۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں، ہاتھ اور چولے کے دامن بچاتا ہوا چلتا۔ اگر کسی مسافر کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آر پار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نورا اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا اور جس جگہ سے پودے نے زخم کھایا تھا اُسے یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہو۔ پھر وہ کھیت

> کی منڈیر پر پہنچ کر تیز تیز چلنے لگتا۔ ''اُدھر بابا نُو را ڈاکخانہ کی طرف رواں دواں ہے اور اُدھر ڈاک خانے میں جنگ کی حمایت میں عقل کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں:
>
> ایک سیٹھ کہہ رہا تھا کہ بس ایک اور بڑی لام لگ جائے تو کراچی ولائت بن جائے گا کہتے ہیں کتنی بار لام لگنے لگی پر لگتے لگتے رہ گئی، کوئی نہ کوئی بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ کہتے ہیں لام میں لوگ مریں گے۔ کوئی پوچھے لام نہ لگی تو جب بھی لوگ مریں گے، ۔ٹھیک ہے نا؟''
>
> اتنے میں بابا نورا نمودار ہوتا ہے اور محض اپنی پاگل موجودگی سے ان کے دلائل کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتا ہے:
>
> ''سفید برق بابا نورا سید ھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آ رہا تھا اور لوگ جیسے سہمے جا رہے تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''ڈاک آ گئی منشی جی؟''
>
> ''آ گئی یار۔'' منشی نے جواب دیا۔
>
> ''میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی'' بابا نے پوچھا
>
> ''نہیں بابا'' ۔منشی بولا
>
> بابا نورا چپ چاپ واپس چلا گیا۔ دُور تک پگڈنڈی پر ایک سفید دھبا رینگتا ہوا نظر آتا رہا اور لوگ دم بخود بیٹھا سے دیکھتے رہے۔

''ہیرا'' کا ہیرو وریام ایک ایسا کردار ہے جسے محاذ جنگ پر تشدد اور بربریت کا مشاہدہ انتشار ذات میں مبتلا کر دیتا ہے تباہی و تخریب اور خوف و دہشت کا اس پر اتنا شدید ردعمل ہوتا ہے کہ وہ بیٹھے بٹھائے بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں گولیاں سنسنانے لگتی ہیں۔ اس کے گھر میں میدان جنگ کا نقشہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے اس جہنم سے صرف تشدد کے ذریعے ہی نجات پاتا ہے۔

برطانوی سرکار اس قابل علاج ذہنی مرض کا علاج کرانے کی بجائے اس معذور سپاہی کو واپس اس کے گاؤں پھینک گئی اور سال بھر تک اس کی پنشن کا بھی فیصلہ نہ ہوا۔ اس دوران زینو ......اس کی بیوی گھر کا سامان بیچ کر اور امیروں کے گھروں میں محنت مشقت کر کے گھر کا انتظام چلاتی رہی اور آخر ایک روز جب اس دیوانی کو یہ احساس ہوا کہ لوگ غریب جان کر اس کی مدد کرنے لگے ہیں تو مارے غیرت کے اُس نے خودکشی کر لی۔

جنگ اور جنگ زرگری سے پیدا ہونے والے نفسیاتی بحران کی مصوری کے ساتھ ندیم نے اخلاقی بحران کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔ "السلام علیکم" کا امیر خان کہ فرانس کے ایک گاؤں میں نازک اندام لیوی کا بستر گرم کرتا رہا تھا۔ جب تین سال کے بعد محاذ جنگ سے واپس اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو نور کے تڑکے میں اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ مصروف اختلاط پاتا ہے کہ اُس کی بیوی کے اپنے آشنا کے ساتھ کہے گئے یہ الفاظ:

"جاؤ دن چڑھ آیا ہے، مرغ کب کے بانگیں دے چکے، جاؤ"

اُسے لیوی کے الوداعی کلمات کچھ یوں یاد دلاتے ہیں کہ فرانس اور پنجاب ایک ہو جاتے ہیں اور پورا افسانہ ایک اخلاقی رمز بن جاتا ہے:

"جاؤ دن چڑھ آیا ہے، بگل کب کا بج چکا ہے، جاؤ"

زمانہ جنگ میں اور خصوصاً مفتوحہ و مقبوضہ بستیوں میں ماں کی مقدس اور لازوال محبت کی پامالی کے دلدوز مناظر افسانہ "مامتا" میں بڑی نفسیاتی گہرائی اور کمال فنی ہنر مندی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ یہ افسانہ مامتا کے جذبے کو آفاقی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ جنگ کے ماحول میں انسان وحشت و بربریت اور سفاکی و درندگی کی کن ہولناک پستیوں میں گر جاتا ہے اور غالب قوت کے لیے تباہی اور موت کیونکر لطیفہ بن کر رہ جاتی ہے؟ ......اس موضوع کو ندیم نے پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں ......"کپاس کا پھول" اور "اندمال" سمیت نت نئے انداز سے اپنی کہانیوں میں کھنگالا ہے۔ مگر "مامتا" کا فنی حسن اور فکری نکھار عجب تکمیلی شان رکھتا ہے۔ پنجاب اور چین کے حسنِ فطرت پر پنجابیوں اور چینیوں کی غلامی اور ذلت کے گھناؤنے داغ ہوں یا مفتوح انگریز غارت گروں پر فاتح جاپانیوں کی غارت گری کے عبرت ناک مناظر ہوں، انسانی جذبات کا طلسم ہوشربا ہو یا درندوں تک کو شرما دینے والی انسانی سفاکی اور سنگدلی کے مناظر ہوں، قاری ہر ہر قدم اور ہر ہر مقام پر افسانہ نگار کی تیز بین نگاہوں کی روشنی اور دردمند دل کی حرارت محسوس کرتا ہے مگر اس شاہکار افسانے کی سب سے زیادہ نادر و نایاب متاع مائیں ہیں۔ پنجابی ماں، انگریز ماں، چینی ماں، یہ گویا مامتا کے آفاقی جذبے کے تین مقامی روپ ہیں۔ پنجابی ماں بطور کردار افسانے میں کہیں متعارف نہیں کرائی گئی مگر ہر جگہ موجود ہے۔ انگریز ماں:

> "پناہ گاہ کے دروازے کے پاس ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکی ہوئی جھلی کو

> مسلے جا رہی تھی اور جب وہ آخری چہرے تک پہنچی تو "میرا بیٹا" کہا اور دھم سے نیچے گر پڑی اور ہم سب کے منہ لٹک کر رہ گئے۔"

چینی ماں ایک اجنبی نوجوان کو سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر کچھ یوں بے چین ہو جاتی ہے کہ وہ جاپانیوں کے عتاب اور آس پاس منڈلاتی ہوئی موت سے بے نیاز ہو:

> "آگے بڑھ کر میری قمیض میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں سے مسکرائی، جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا اور میری قمیض سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی اور میں نے ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں اُبھر کر اُلٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گر پڑتا ہوں۔"

یہ وہ مقام نظر ہے جہاں مقامیت اور آفاقیت کچھ یوں شیر و شکر ہو جاتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کے مصداق ٹھہرتا ہے۔ دین و وطن، قوم و ملت، رنگ و نسل اور مشرق و مغرب کی سرحدوں سے ماورا محبت فاتح عالم اپنا جادو جگانے لگتی ہے، حسن و خیر کی دائمی انسانی اقدار پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی فنی اور جمالیاتی جد وجہد کا جلی عنوان قرار پاتی ہے۔

حسن و محبت

وہ آس پاس کی دنیا ہو یا ماورا کا جہاں ندیم کا دل بیدار اور ندیم کی چشمِ بینا ہر آن افق حسن کی جانب نگران رہتی ہے۔ افسانہ ہو یا شاعری آپ ندیم کو اپنی تہذیب و فکری روایت کے پس منظر میں حسن کو ذکاوت احساس کے ساتھ سمجھنے اور عفتِ قلب و نظر کے ساتھ پیش کرنے میں منہمک پائیں گے۔ ندیم کے نزدیک حُسن فرد کے جذباتی اور روحانی زخموں کے لیے مرہم اندمال ہے تو معاشرتی اور تہذیبی روگوں کے لیے زبردست قوت شفا ہے۔ ندیم گرد و پیش کی دنیا میں حسن کو ناقدری اور پامالی سے بچانے کی جد وجہد کو بھی حسن کاری کا ایک ناگزیر تقاضا مانتے ہیں اور یوں حسن اور حسن عمل، خواب اور حقیقت کا یہ سنگم ندیم کے فکر و فن کی پہچان بن جاتا ہے۔

حُسن اور افلاس، جمال اور استحصال کی کشمکش کے باعث ہمارا تمدن اور ہماری تہذیب جس جمالیاتی بحران میں مبتلا ہے اس کی جڑیں دورِ حاضر کے مادی ہمہ اُوست میں پوشیدہ ہیں۔ ندیم اس معاشی استبداد کی بیخ کنی کو بھی حسن کاری کا ایک ناگزیر تقاضا مانتے ہیں جس نے حسن کو سرِ راہ بھکاری بنا کر بٹھا رکھا ہے۔ منظوم کہانی

"یہاں سے وہاں تک" فن اور حُسن اور حسنِ عمل کے بیچ در بیچ مگر صداقت آفرین رشتوں کی آئینہ دار ہے۔

یہ منظوم کہانی کائنات میں حُسنِ اضداد کی جلوہ گری اور فن میں عصریت اور ابدیت کے ربط باہم پر تخلیق غور و فکر سے شروع ہوتی ہے۔ شاعر حُسن کی تلاش و جستجو میں دامنِ کوہ میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ندی میں آنکلتا ہے۔ جس میں چند حسینائیں پنڈلیاں کھول کر اتری ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا حُسن ایک جداگانہ عالم ہے۔ کسی کی آنکھوں میں نئی صبح کا شرمیلا پن ہے تو کسی کے ہونٹوں پر جیسے کلی چٹکنے کا منظر مسکرا رہا ہے، کسی کی ٹھوڑی میں سحر کا تارا ضیا بار ہے تو کسی کے عارض میں شفق پھول رہی ہے، کسی کے ابرو غالب کی غزل کا مطلع ہیں تو کسی کا ملبوس تاج محل کی جالی کی مانند ہے۔ شاعر حسینہ ہائے خیال کے اس جھرمٹ میں گھرا سوچ رہا ہے۔

کس کو اپناؤں تو کس کو نظر انداز کروں
ایک صف میں نظر آتی ہیں ، تمنائیں چند
ان کو دیکھوں تو قیامت، جو نہ دیکھوں تو مجھے
وسعتِ دہر نظر آتی ہے خالی خالی

تمناؤں کا یہ جمگھٹ شاعر کو خواب و خیال کے طلسمات سے نکال کر حقیقت کے کارزار تک لے آتا ہے۔ یہاں ایک ایسی حسینہ چکی پیسنے میں مصروف ہے جس کا بدن اس کے پھٹے پرانے لباس میں سے شفق بن کر جھلک رہا ہے چکی کی مشقت اور پیرہن چاک چاک جن تلخ حقائق حیات کا استعارہ ہے اُن کے سیاق و سباق میں حسن بدن کی ماہیت کو سمجھنے اور فنی گرفت میں لانے کی تمنا انقلابی جد و جہد کو بھی جمال پرستی ہی کا ایک فطرتی تقاضا بنا دیتی ہے۔ مژدۂ عشرتِ جمہور اور وعدۂ وصل ایک ہی احساس کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ کہانی حسن کی ماہیت پر فکری خیال آرائی سے شروع ہو کر خوابناک حکایات بنتے بنتے اور سوچتی ہوئی حسین تصویریں دکھاتے بالآخر ایک حکیمانہ رنگ میں حُسن اور حُسن کاری (فن) کا مفہوم متعین کرتی ہوئی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ندیم نے یہاں فن کے مقصد اور فن کار کے مقصود کی وضاحت کرتے وقت بہ یک نگاہ زندگی کے جمالیاتی اور سیاسی رُخوں سے اعتنا کیا ہے مزید یہ کہ انھوں نے زندگی کے مادی مطالبات اور روحانی تقاضوں کو بھی بہ یک وقت پیشِ نظر رکھا ہے۔ چناں چہ وہ اجتماعی زندگی میں معاشی عدل اور معاشرتی مساوات کے قیام کی لگن کو شاعری کا حُسن اور حسن کا عرفان قرار دیتے ہیں۔

افسانہ "گنڈاسا" کا مرکزی کردار مولا اپنے باپ کے قتل کا بدلہ چکانے کے بعد گُلے کے پورے

خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کے جس قبائلی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اسے گُلے کی منگیتر راجو کے معصوم اور بے پرواہ حُسن کے مشاہدے نے گلستان بنا دیا اور وہ اپنا خونی گنڈاسا بھول کر حُسن کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا۔ پھر جب اس کا خاندانی دشمن مگر اس کی راجؔو کا خوبصورت منگیتر گُلا اس کے چنگل میں صید زبوں ہو کر خوف میں کانپ رہا تھا مولاؔ کچھ سوچ کر:

> ”سکتے میں آ گیا۔ ایک قدم آگے بڑھا۔ لٹھ دُور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دی اور گُلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔
>
> چودھری کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے۔ رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔“
>
> اس نے ہولے سے گُلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا۔
>
> ”رسید تو تم ہی کو دے دیتا پر تمھیں تو دولہا بننا ہے ابھی اس لیے جاؤ، اپنا کام کرو۔ گُلا سر جھکائے ہوئے چلتا گلی میں مڑ گیا۔“

یہ ہے حُسن کا اعجاز کہ ایک قاتل کی آنکھوں میں اُترا ہوا خون آنسوؤں کے سیلاب میں ڈھل کر غائب ہو گیا۔ وحشی آنکھوں میں محبت کی چمک جاگ اٹھی اور آدمی دور وحشت و بربریت کی تاریکی سے نکل کر امن و انسانیت کی روشنی میں سانس لینے لگا۔

ندیمؔ کے خیال میں محبت انسان کا سب سے بڑا حُسن اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ انداز نظر ندیم کی عشقیہ شاعری میں وہ ندرت نکھار اور توانا نزاکت پیدا کرتا ہے جو جدید اردو شاعری میں کم یاب ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صحیح معنوں میں ندیمؔ کی عشقیہ شاعری کا آغاز شخصی اور فنی پختگی کے زمانے کا واقعہ ہے۔ انھوں نے فکری اور مقصدی شاعری سے فنی سفر کی ابتداء کی ہے اور اگر ”جلال و جمال“ اور ”رم جھم“ میں عشقیہ شاعری کے چند نہایت حسین نمونے ملتے ہیں تو وہ محض تہذیب رسم عاشقی کی ذیل میں آتے ہیں۔ بجا کہ ”جلال و جمال“ میں رومانی اور افلاطونی عشق سے لے کر خالص کتابی عشق تک کیفیات مل جاتی ہیں مگر ”جلال و جمال“ اور ”رم جھم“ کا حسین ترین حصہ وہ ہے جہاں آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں اگر ایک طرف فضا اور کرداروں کے ذریعے انسان کے بنیادی اور آفاقی جذبات کی پیش کش کا حق ادا کیا گیا ہے تو دوسری جانب جذبۂ عشق کو سماجی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش بھی ملتی ہے مثلاً ”رم جھم“ کے بے شمار قطعات کے علاوہ ”آخری سجدہ“، ”سہاگن“، ”سپاہی مورچے میں“، ”پرواز جنوں“ کی سی نظموں اور ”گونج“، ”جوانی

کا جنازہ''، ''من کی ڈالی''، ''ادھورا گیت'' اور ''طلوع وغروب'' کے سے افسانوں میں جذبۂ عشق کی مصوری سے ندیم نے علاقائیت کو آفاقیت بنا دیا ہے لیکن میں اردو کی شاعری میں جس نئی پہنائی کا ذکر کر رہا ہوں اسے سمجھنے کے لیے اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک مختصر نظم ملاحظہ ہو:

غنچۂ دل جو کھلا بھی تو سرِ شام کھلا
کون ظلمت میں نکلتا پئے نظارۂ گل
تو کہاں تھا کہ ترے دامن رنگیں کے لیے
ہاتھ پھیلائے رہی نکہتِ آوارۂ گل

اس زمانے کے متعدد افسانے بھی جذبۂ عشق کی ماہیت پر تخلیقِ غور وفکر سے عبارت ہیں۔ مثلاً ''موجِ خون''، ''بے نام چہرے''، ''ایک احمقانہ محبت کی کہانی''، ''جن وانس'' اور ''پہاڑوں کی برف'' میں ندیم اسرارِ محبت کی کھوج میں سرگرداں ہیں۔ یوں تو ان تمام کہانیوں کے کردار عشق بلاخیز کی گرفت میں پڑے تڑپتے ہیں مگر جن وانس میں تحیرِ عشق کی عجب طلسماتی فضا ملتی ہے۔ اللہ یآر، بآنو کی محبت کا دم بھرتا ہے تو بآنو، یونؔس کے عشق میں مبتلا ہے۔ جبکہ یونؔس بیگمآن کے آگ کی طرح بھڑکتے ہوئے حسن کا پروانہ ہے تو بیگمآن راجہ کے عشق میں بے چین رہتی ہے۔ کبھی جذبۂ عشق کی کسی نہ کسی معجزہ نمائی کی علامت ہیں۔ کبھی محرومی کی آگ میں سلگ رہے ہیں اور کبھی معاشرتی احتساب کی زد میں ہیں۔ احتساب کی اندھی قوت معصوم جذبات کے بیساختہ اظہار کی راہیں مسدود کر دیتی ہے تو انسانوں کے دل ودماغ میں جن گھر کر لیتے ''ایک احمقانہ محبت کی کہانی'' کا واحد متکلم اپنی واردات محبت کا یوں انکشاف کرتا ہے:

> ''تم کہتی ہوگی صدیق انکل کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم کبھی نہیں سوچو گی کہ تم نے صدیق انکل کا کیا کر دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو کیس بائیس برس کے فاصلے پر پاتی ہو اور میں تمھیں نبض کی ایک دھمک کے فاصلے پر دیکھتا ہوں۔ قُرب کا یہ تصور ان لوگوں کے لیے بے معنی ہو سکتا ہے جنھوں نے کبھی محبت نہ کی ہو...... حیران نہ ہو عالیہ''! محبت صرف انتقام لینا ہی تو نہیں سکھاتی۔ محبت نبھانے میں مدد دے رہا ہوں تو دراصل تم سے محبت کر رہا ہوں...... کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ تم میری ہوتیں۔ میں ایسا سوچتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ میں تم سے محبت نہیں کر رہا ہوں، دشمنی

کر رہا ہوں، سو فضل کے ساتھ تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے محرومی کا احساس ہرگز
نہیں ستائے گا۔ جب میں تمہارے ساتھ محبت کیے جاؤں گا تو محرومی کیسی ۔۔۔؟

دل کی یہ تہذیب اور تمنا کی یہ شائستگی عشق کو تہمت نہیں بننے دیتی عبادت بنا دیتی ہے۔ چادرِ افلاس میں لپٹا ہوا معصوم حسن ندیمؔ کے افقِ فن پر بار بار طلوع ہوتا ہے ایک بھکارن کے چہرے کی ایک رُخی جھلک سے ”پہاڑوں کی برف“ کے واحد متکلم کی کشتِ خیال میں یونانی دیومالا کے حسین چہروں کی ندیاں اُمڈ آتی ہیں اور وہ اساطیری حسیناؤں سے لے کر غالبؔ کے اصنامِ خیالی تک کتنی ہی صورتوں اور عشق کی کتنی ہی سیرتوں کے جلو میں نیرنگِ تمنا کا تماشا کرنے لگتا ہے:

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں
یہ راز مجھ پہ کھلا اس کی حسن کاری سے
کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتو

تخلیقِ مسلسل میں مصروف خالقِ اکبر نے انسان کو اپنے عکس پر پیدا کر کے فخرِ کونین کا مقام اسی لیے تو عطا کیا ہے کہ وہ حسن کی مدح اور عشق کے چلن سے حسنِ عمل کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے رفاقت کا حق ادا کر سکے۔ حسن پرست اور حسن کار احمد ندیمؔ قاسمی عمر بھر یہ حق بڑی شانِ دلربائی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

حواشی

۱۔ حقیقت اور فنی حقیقت، مطبوعہ نقوش لاہور، ۶۲ء
۲۔ انسان اور آدمی، لاہور ۵۹ء
۳۔ آس پاس ۔ صفحات ۳۱ تا ۱۵۲۔ مکتبہ فسانہ خواں لاہور، ۱۹۴۷ء
۴۔ معیار تکنیک کا تنوع، ص ۵۳
۵۔ ندیم نامہ، ص ۱۹۱
۶۔ معیار تکنیک کا تنوع، صفحہ ۵۳
۷۔ افکار، کراچی، ندیم نمبر ۸۷ء
۸۔ پنجابی لوک گیت: لام ٹُھسی تان رنڈی سہاگن سئی تھسی ۔
۹۔ افکار، ندیم نمبر، ص ۳۷۲

منشا یاد

احمد ندیم قاسمی کے افسانے

جناب احمد ندیم قاسمی موجودہ دور میں دنیائے ادب کی ممتاز ترین شخصیت اور ادب برائے زندگی کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ فیض صاحب کے بعد وہ فکری او رنظریاتی حوالے سے اہل قلم کے لیے ایک مینارہ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس قدر زرخیز دماغ اور تخلیقی توانائی عطا کی تھی کہ ان کے خیالات و افکار کا دریا کسی ایک صنف ادب میں سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ ادب کی مختلف اصناف میں اپنے فن اور افکار کا اظہار کرتے رہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں خواہ شاعری ہو، افسانہ نگاری ہو، مکالمہ نویسی ہو یا کالم نگاری اپنی الگ اور منفرد پہچان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی عظمت، محبت اور رواداری کی اقدار کو فروغ دیا اور تمام تر ترقی پسندی اور مقصدیت کے باوجود شاعری کو شعری اور جمالیاتی اوصاف سے کبھی محروم نہ ہونے دیا۔ اور بے شک وہ خود بھی افسانہ نگار کی بجائے ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے کو ترجیح دیتے تھے (میں نے ان سے خود بھی ایک بار یہ سوال کیا تھا) مگر وہ افسانے کے اس دور کے جسے 'سنہری دور' کہا جاتا ہے آخری اور اہم ترین افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کی رحلت اور تعصبات کی دھند چھٹنے کے بعد جب ان کے افسانوں کا بے لاگ تجزیہ ہوگا تو میرا اندازہ ہے کہ وہ اردو افسانے میں اس سے بھی بڑا مقام حاصل کریں گے جو انھیں اب تک حاصل رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعادت منٹو بہت بڑے افسانہ نگار تھے اور ان جیسی شہرت اور مقبولیت کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی اور بے شک انتظار حسین میرے پسندیدہ اور ایک بڑے افسانہ نگار ہیں مگر ان سب کے افسانوں کے ذائقے مختلف ہیں۔

اردو افسانے کی دنیا میں رئیس خانہ، گنڈاسا، لارنس آف تھیلیبیا، ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد، کنجری، سناٹا، گھر سے گھر تک، بھرم، وحشی، جوتا، نیلا پتھر، بین اور الحمد اللہ جیسے ناقابل فراموش افسانے انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انھوں نے افسانے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں لکھے بل کہ انھیں اپنے فکر و فلسفہ کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اردو افسانے میں انھوں نے پندرہ مجموعوں کا گراں قدر اضافہ کیا جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ چوپال، ۲۔ بگولے، ۳۔ طلوع و غروب، ۴۔ سیلاب و گرداب، ۵۔ آنچل، ۶۔ آبلے، ۷۔ آس پاس،

۸۔ در و دیوار، ۹۔ سناٹا، ۱۰۔ بازارِ حیات، ۱۱۔ برگِ حنا ۱۲۔ گھر سے گھر تک، ۱۳۔ کپاس کا پھول، ۱۴۔ نیلا پتھر، ۱۵۔ کوہ پیما۔

آخری مجموعے کے بعد بھی انھوں نے بہت سے افسانے لکھے اور اب ایک طویل، اہم اور سلسلہ وار افسانہ (یا ناولٹ) ''ایک ریوڑ ایک انبوہ'' لکھ رہے تھے جس کی چوتھی قسط فنون کے گزشتہ شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے خود منتخب کردہ چالیس افسانوں کا ایک انتخاب ''افسانے'' کے نام سے شروع ہوا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان چالیس افسانوں میں کوئی ایک بھی کمزور افسانہ شامل ہو۔ اس طرح میرے خیال میں ان کے ہاں اچھے افسانوں کی تعداد اپنے دور کے دیگر اہم افسانہ نگاروں سے کم نہیں ہے۔ ''افسانے'' کو ان کا نمائندہ انتخاب سمجھنا چاہیے۔ اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''تخلیق کار کو اپنی تخلیق کسی نہ کسی پہلو سے عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے خود اس کے لیے ان تخلیقات کا انتخاب کرنا خاصا دشوار کام ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے طبیعت پر جبر کر کے اپنے افسانوں کے سبھی مجموعوں میں سے چند ایسے افسانے منتخب کیے ہیں جنھیں میرے نمائندہ افسانے قرار دیا جا سکتا ہے۔ چوپال سے لے کر نیلا پتھر تک کے افسانوں کے انتخاب کے بعد میں نے بعد کے افسانوں میں سے بھی ایک افسانہ منتخب کر دیا ہے اور یوں میری 'حیات افسانہ نگار' کی۔ ایک لحاظ سے پوری نمائندگی ہو گئی ہے۔ قارئین میں سے اگر کسی کا پسندیدہ افسانہ اس مجموعے میں شامل نہ ہو۔ یا کسی قاری کا کوئی ناپسندیدہ افسانہ ہو گیا ہو تو میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

(ندیم۔ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۱ء)

بہ حیثیت افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی پریم چند کی روایت کے افسانہ نگار ہیں اور ان کے زیادہ تر موضوعات اور کردار ہماری دیہی زندگی اور معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر ان کو پوری طرح سمجھنے اور Appriciate کرنے کے لیے بعض اوقات دیہات اور خاص طور پر پنجاب کی دیہی معاشرت اور رسم و رواج سے آگاہی ضروری ہے۔ مثلاً ہمارے دیہات میں کسی کارندے یا کامی (جسے کمی کمین کہا جاتا ہے) کا معاشی، سماجی یا علمی اعتبار سے ترقی کر جانا یا زمیندار اور اس کی آل اولاد سے آگے بڑھ جانا ایک ناقابل معافی جرم بن جاتا ہے۔ وہ کسی طرح گوارہ نہیں کرتا کہ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا کوئی ادنیٰ درجے کا انسان اس پر فوقیت و اہمیت حاصل کر

جائے۔ اس مرکزی خیال کو انھوں نے اپنے افسانہ ''جوتا'' میں بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ کرموں گاؤں کا ایک معمولی آدمی اور پیشے کے اعتبار سے میراثی تھا۔ وہ برسوں ایک قوال پارٹی میں تالی بجا بجا کر تال دیتا رہا مگر بڑے قوال کو جب احساس ہوا کہ وہ اس کے گھٹنے سے گھٹنے ملا کر بیٹھنے لگا ہے تو اس ڈر سے کہ کہیں وہ اس سے آگے نہ نکل جائے اس نے اسے چلتا کیا۔ جس کے بعد کرموں نے اپنی قوالی پارٹی بنالی اور میلوں ٹھیلوں میں گاتا اور اپنے تینوں بیٹوں کو سکول اور کالج کی تعلیم دلاتا رہا۔ اس پر ایک چودھری نے اسے دارے پر بلایا اور ڈانٹا:

''شرم کرو کرموں۔ میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں ان سے لوگ ڈھول شہنائی کی بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انھیں؟ کیوں نام مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟''

مگر کرموں باز نہ آیا اور اس کے بیٹے پڑھ لکھ کر شہر میں ملازمتیں کرنے اور بہت سا روپیہ بھیجنے لگے۔ کرموں نے قوال پارٹی توڑ دی اور گھر میں رہنے، صاف ستھرے کپڑے پہننے اور خیرات دینے لگا۔ اور پھر ایک سال اس نے زکوٰۃ نکالی۔ چوہدری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ قرب قیامت کی نشانی تھی مل کہ سورج سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ پھر جب کرمو نے گھر میں پختہ بیٹھک بنانے کا اعلان کیا تو چوہدری سے نہ رہا گیا اور اس نے اسے دارے میں بلوا کر خوب جوتے لگوائے۔ گالیاں دیتا اور کہتا رہا:

''بیٹھک بنوائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح؟ چار پیسے کیا آ گئے اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔ لگاؤ اور لگاؤ''

لیکن جواب میں کرموں جوتے گنتا اور کہتا رہا کہ وہ اس لیے گن رہا ہے کہ قیامت کے روز ایک کے بدلے ستر کا حساب چکانے میں اس سے غلطی نہ ہو جائے۔ اسے پورے باسٹھ جوتے لگے مگر اس کے بعد بھی چوہدری کو جوتے لگانے کا کوئی نہ کوئی موقع مل جاتا اور کرمو اسی طرح گنتا رہتا۔ دوسری بار باسٹھ جوتے کھا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

''چودھری زیادہ مارو گے تو قیامت کے روز تمھیں زیادہ تکلیف ہوگی۔ پچھلے باسٹھ ملا کر کل ایک سو چوبیس ہو گئے۔ اب ایک کے ستر کے حساب سے خود ہی گن لو تا کہ تمھیں اور جوتے لگانے والے فرشتے کو کتنی تکلیف ہوگی''

یہاں پہنچ کر کہانی ایک اڑان بھرتی ہے اور افسانہ نگار اپنے قاری کو ایک تشبیہ کے ذریعے گاؤں کے دارے سے اٹھا کر تھوڑی دیر کے لیے ایک بڑا منظر دکھاتا ہے:

''اس کے بعد چودھری اس سے سنبھل کر بات کرنے لگا کرموں میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ جیسے امریکہ روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔''

کرموں اب چودھری کو چڑانے، ستانے اور مذاق کرنے میں اور دلیر ہو گیا تھا۔ ایک بار فیصل آباد جانے لگا تو بولا:

''چودھری کوئی چیز چاہیے تو لیتا آؤں کوئی چھڑی وڑی کوئی جوتا ووتا؟''

ایک بار کہنے لگا ''سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوے ہی کی نسل میں سے ہے صرف رنگ دار پر نکال لیے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا ہے۔''

چودھری اور کرموں کی یہ دلچسپ نوک جھونک سارے افسانے میں چلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک بار کرموں کو اس کے بیٹے نے ایک خوبصورت، قیمتی اور امپورٹڈ کمبل بھجوا دیا۔ چودھری سے اور کچھ تو ہو نہ سکا اس نے کرموں سے پوری قیمت پر کمبل خرید لینا چاہا۔ اور منشی سے کہا کہ اسے منہ مانگی قیمت تین سو چوبیس روپے دے دو۔ اس پر کرموں بولا:

''روپے ہی منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے''

''روپے نہیں تو کیا پیسے؟'' منشی نے نوٹوں کا گھٹا نکالتے ہوئے کہا:

''میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کی بجائے تین سو چوبیس جوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں'' کرموں بولا

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کی یک چادر ہے جس پر کنکروں سے چاند ماری ہو رہی ہے۔ کرموں نے روپے لیے اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اسے خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل کا میراثی پنا نکال رہا ہے۔ اسے تہہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔

''کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی بھٹی میں پھینک دیں''

پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔

''درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کمبل۔ گھر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہیے'' (جوتا/۱۹۷۹)

کرموں کی طرح کا ایک انوکھا کردار ''وحشی'' افسانہ کی بوڑھی کسان عورت ہے۔ میں نے پورے اردو اور پنجابی ادب میں ایسا دلچسپ، خوددار اور یونیک کردار اور کسی کے ہاں نہیں دیکھا۔ وہ میو ہسپتال سے والٹن جانے والی بس میں سوار ہوتی ہے اور کنڈکٹر کی اس بات پر کہ ''پہلے عورتیں'' بہت خوش ہوتی اور اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں اس کی تحسین کرتی ہے:

''تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے۔ راستے تو میں ویسے بھی بنا لیتی مل کر آدھا تو بنا بھی لیا تھا مگر تو نے جو بات کہی وہ ہزار روپے کی ہے۔''

مگر وہ اس وقت پریشان ہو جاتی ہے جب وہ اس سے ساڑھے پانچ آنے کرایہ مانگتا ہے کیوں کہ اس کے پاس صرف ایک چونی ہے۔

''ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے ساڑھے پانچ آنے کیوں لگنے ہیں؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں۔ میرا بوجھ ہی کتنا ہے۔ لے یہ چار آنے''

یہ جھگڑا اور کشمکش جاری رہتی ہے یہاں تک کہ مسافروں میں سے کوئی سفید پوش بزرگ اس کا کرایہ پورا کر دیتا ہے۔ اور جب اس کے استفسار پر کنڈکٹر بتاتا ہے کہ فلاں مسافر نے اس کے چھ پیسے دے دیے ہیں تو وہ بھڑک اٹھتی ہے اور سفید پوش کو مخاطب کر کے کہتی ہے:

''یہ چھ پیسے کیا تیری جیب میں بہت کود رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے''

''لیجیے یہ ہے بھلائی کا زمانہ'' کوئی اور بولا۔ سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی چلی گئی:

''ارے سخی داتا کہیں کے، تو مجھ پر ترس کھاتا ہے جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اگنے اور خوشیوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیے ہیں۔ تو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے جنھوں نے

اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیرے گھر میں تیری کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کے لیے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں۔ شرم نہیں آئی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے''

پھر وہ کنڈیکٹر کی طرف پلٹی۔ ''یہ چھ پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں۔ اسے واپس دے دے اور مجھے یہیں اتار دے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

بڑھیا خاموش ہوگئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پرواہ کیے بغیر دروازے میں سے نکلی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہوگئی۔ پھر وہ اٹھی کپڑے جھاڑے اور نا قابل یقین تیزی سے والٹن کی طرف چل پڑی۔ بس میں سے کسی کی آواز آئی۔

''عجیب وحشی عورت ہے!'' (وحشی)

پنجاب کے دیہی کلچر کو اپنے افسانوں میں زیادہ اہمیت دینے کے باوجود احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ماحول، کردار نگاری اور موضوعات کے حوالے سے بے حد تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک طرف اگر وحشی عورت کی طرح کا خودداری اور انا کا مجسمہ کردار ہے تو دوسری طرف رئیس خانہ کے چوکیدار فضلو جیسا مفلس، لالچی اور بے غیرت شخص ہے۔ یہ افسانہ بجا طور پر اردو کے اہم اور مقبول ترین افسانوں میں شامل ہوتا ہے۔ اس افسانے کے کئی ایک رخ، پرتیں اور شیڈز ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کا موضوع ہے جو احمد ندیم قاسمی کی بجائے سعادت حسن منٹو کا موضوع معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس افسانے کو جب بھی پڑھا مجھے برابر یہ خیال آتا رہا کہ اگر اسے منٹو لکھتے تو کیسے لکھتے؟ میرا خیال ہے وہ یقیناً اختصار سے کام لیتے۔ لیکن معلوم نہیں وہ اس کے چھیالیس صفحات میں سے کتنے صفحات کم کر سکتے۔ ایک تہائی یا شاید نصف! میرا خیال ہے وہ ماحول کی تصویر کشی، معاشرت کی عکاسی اور جزیات تو یقیناً چھوڑ دیتے جس سے وہ فنی طور پر زیادہ چست ہو جاتا۔ منٹو نسبتاً زیادہ سرعت سے اپنے ٹارگٹ کی طرف لپکتے اور اپنی زیادہ توجہ ڈرامائی سچوایشن پر مرکوز رکھتے اور اس بات کی بالکل پرواہ نہ کرتے کہ یہ قاری کے لیے افسانے کے واقعات قابل قبول یا قابل یقین (Believeable) بنے ہیں یا نہیں؟ بل کہ وہ قاری کو موذیل اور کھول دو کی طرح اس قدر رو ہلا کر رکھ دیتے کہ اسے اس پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ وہ اس کے آخری دو ایک صفحات بھی نہ لکھتے اور افسانہ وہیں ختم کر دیتے جہاں اگلی صبح کو فضلو

رئیس خانہ پہنچاتے اور دیکھتا ہے کہ دور موڑ کاٹتی ہوئی ایک موٹر غائب ہو رہی ہے اور مریاں دروازہ کھول کر کہتی ہے: ”تم شرط ہار گئے ہو حرام زادے“

اور پھر اس کی آواز بھرا جاتی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی محض ایک کہانی نہیں سنانا چاہتے تھے۔ وہ محض چونکایا قاری کو دہلانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کے ذریعے اور بھی بہت کچھ کہنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مفلسی اور سادہ لوحی کے ساتھ کمینگی اور لالچ بھی شامل ہو جائے تو معاملات کیسی خوفناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آدمی بنیادی طور پر معصوم ہوتا ہے مگر حالات اور مجبوریاں اسے کیسے تبدیل کر دیتی اور گناہ اور ذلت کی پستی میں دھکیل دیتی ہیں۔ ایک نارمل شخص کی آہستہ آہستہ کیسے قلب ماہیت ہوتی ہے۔ رئیس خانہ کا چوکیدار فضلو غریب ضرور تھا مگر بے غیرت نہیں تھا۔ (گر چہ اس کے بیج اس میں موجود تھے)۔ وہ بتدریج بے غیرتی پر آمادہ ہوتا ہے۔ پہلے اس نے دلالی قبول کی پھر آہستہ آہستہ اس ذلت کی طرف بڑھا جو اس کا مقدر بنی۔ اس کے ساتھ ہی افسانہ نگار یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ دولت کیا کیا کھیل دکھاتی ہے۔ اور رئیس زادے عیاری، مکاری اور استحصال کے کیسے کیسے ہم رنگ زمین جال بچھاتے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سکیسر کا ماحول اور معاشرت بھی دکھانا چاہتے تھے جس کو انھوں نے جزئیات کے ساتھ نہایت خوب صورتی سے بیان کیا۔ چوں کہ یہ علاقہ افسانہ نگار کا دیکھا بھالا تھا اس لیے اس کی بہت سچی، دلآویز اور محاکاتی عکس بندی کرنے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ افسانہ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ہم اسے جزئیات سمیت پردہ سکرین پر دیکھ بھی رہے ہوں:

”یہ رئیس خانہ کوہستان کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھند میں لپٹا پڑا رہتا اور دور سے یوں نظر آتا جیسے کوئی بڈھا مہینوں سے نہیں نہایا۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے جنگلوں کی چمنیوں پر الو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔ بنگلوں کی پہلو کی کوٹھریوں میں چوکیدار اور ان کے بیوی بچے دوپہر تک کھاٹوں کھٹولوں پر پڑے سکڑا کرتے اور پھر دھوپ کی ڈھنڈیا پڑی رہتی لیکن جوں ہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی، جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لپٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو

بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔ چوکیداروں کی بیویاں اور بچے جالے اتارتے اور شیشے دھوتے، مالی باغیچوں میں سے خزاں کا ملبہ اٹھاتے اور قسم قسم کی پنیری لگاتے۔ دکاندار میدانوں کو چھوڑ کر خچروں پر دکانوں کا سامان لادے اوپر آ جاتے۔ شام ہوتے ہی بنگلوں کے پہلو میں دبکی ہوئی کوٹھریوں کی کھڑکیاں جاگ اٹھتیں اور ہر طرف عیدرات کی سی ہما ہمی طاری ہو جاتی'' (رئیس خانہ)

یقیناً منٹو اس افسانے کی ضخامت کم کر دیتے لیکن اس افسانے میں جو تہذیبی رچاؤ اور فکری گہرائی ہے وہ ماند پڑ جاتی اور چٹکلا پن جو پہلے سے موجود ہے، حاوی ہو جاتا۔ مگر چوں کہ افسانہ نگار کو معلوم تھا کہ اس میں ایک چونکا دینے والی ڈرامائی سچوایشن موجود ہے اس لیے انھیں اپنے ٹارگٹ پر پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی اور وہ اسے ہر طرح سے قابلِ یقین بنانے کی کامیاب کوشش کرتے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ ماحول کی عکاسی، جزیات اور تفصیل نگاری کے باوجود افسانہ قاری کی مبہوت کر دیتا ہے۔

موضوعات کے تنوع کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کے اکثر افسانوں میں بے حد گہرائی، سچائی اور تاثیر ہے۔ کبھی کبھی مجھے ان کے سارے افسانوں کو ذہن میں لاتے ہوئے خیال آتا ہے کہ ان میں پھیلی ٹکڑے ٹکڑے زندگی کو اگر ایک خاص ترتیب اور تسلسل کے ساتھ جوڑا جائے تو کسی طویل ناول کی طرح پورے عہد کی سماجی تاریخ بن جائے۔ ایسی تاریخ جس میں ہمارے دیہات اور شہروں کی ثقافت، تہذیب اور زندگی کی سچی اور حقیقی تصویریں دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے افسانے اگر ایک طرف دیہی معاشرت اور عوام سے جڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف انسانی اقدار اور عالمی معاملات اور موضوعات کو چھوتے ہیں جیسے پرمیشر سنگھ اور ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد وغیرہ۔

تقسیم کے موضوع پر ہر افسانہ نگار نے کچھ نہ کچھ لکھا مگر میرے خیال میں منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، بیدی کا لاجونتی، قدرت اللہ شہاب کا یا خدا اور احمد ندیم قاسمی کا پرمیشر سنگھ اس موضوع پر لکھے جانے والے بہترین اور مقبول ترین افسانے ہیں۔ بل کہ پرمیشر سنگھ کے ذریعے عظمتِ آدم، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کے جذبوں کو جو ان کی شاعری میں بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں، ابھارا گیا ہے۔ یہ بات اس افسانے کو سب سے الگ ذائقہ عطا کرتی ہے:

''لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔

بہر حال وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا۔

"میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا"

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا: ہنسو نہیں یارو:

پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی

"اسے مارو نہیں۔ اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔

"بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے"

اختر بولا: اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا"

سب سکھ ہنسنے لگے تو پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ روتی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔

"سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا "لے پرمیشرے سنبھال اسے، کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ" (پرمیشر سنگھ)

پرمیشر سنگھ نہ صرف فنی، فکری اور تاثر کے حوالے سے ایک کامیاب ترین فن پارہ ہے بلکہ اس میں عام قاری کے لیے بھی بہت اپیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ افسانہ ڈرامے کی صورت میں ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا تو بے حد مقبول ہوا مگر اس سے پہلے یہ "کرتار سنگھ" کے نام سے فلم کی صورت میں پیش کیا جا چکا تھا اور اسے بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میرے خیال میں یہ ہر لحاظ سے پاکستان کی سب سے اچھی، کامیاب اور مقبول پنجابی فلم تھی جسے مشرقی پنجاب (بھارت) میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے نغمات "اے مردِ مجاہد جاگ ذرا، اب وقت شہادت ہے آیا" ہمارے فوجی اور قومی بینڈ کا پسندیدہ نغمہ ہے اور اس کا

گیت ”نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا“ پاکستان میں سب سے زیادہ بجایا جانے والا اور عوام کا پسندیدہ ترین گیت ہے جو ہر شادی پر کسی نہ کسی فارم میں ضرور بجایا جاتا ہے۔ اس میں ماما جی (ظریف مرحوم) کی چلتی پھرتی مشہور کچہری ہمارے عدالتی نظام پر کامیاب ترین طنز ہے۔ پتہ نہیں ہماری زوال پذیر فلم انڈسٹری کو اس فلم کو نئی کاسٹ ٹیکنالوجی اور رنگوں کے ساتھ دوبارہ بنانے کا خیال کیوں نہیں آتا۔ حالاں کہ یہ فلم اس کو زوال سے باہر نکالنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

ہمارے زیادہ تر ادیبوں کی طرح احمد ندیم قاسمی صرف خواص کے ادیب ہی نہیں تھے انھوں نے عام لوگوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر بھی بہت کچھ لکھا یہاں تک کہ بچوں کے لیے بھی۔ اسی طرح قاسمی کہانی کے عنوان سے ٹی وی کی ایک سیریز عوام و خواص میں بہت مقبول ہوئی۔ انھوں نے بعض کامیاب فلموں کے مکالمے لکھے اور کرتار سنگھ کے علاوہ ان کے ایک افسانے گنڈاسا پر بھی مولا جٹ (مل کہ جٹ سیریز کی بہت سی) کامیاب اور مقبول پنجابی فلمیں بنیں۔ بطور افسانہ بھی گنڈاسا ایک بہت اثر انگیز افسانہ ہے۔ جس میں محبت کے جذبے کو ایک کردار کی قلب ماہیت کرتے دکھایا مل کہ محسوس کرایا گیا ہے۔ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کی یہ ایک بہت خوبصورت مثال ہے۔ مگر پہلے کبڈی کے میدان کی فضا ملاحظہ کیجیے:

”اکھاڑہ جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی ’چوکیاں‘ چن لی تھی ’پڑ کوڈی‘ کے کھلاڑی بدن پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ انھوں نے رنگین لنگوٹیں باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سفید پھینٹے ان کے چڑے ہوئے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے۔ وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی بھی میدان میں نہیں اتری تھیں۔ یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدت سے تیل چپڑ وا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا۔ پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں اترے۔ انھوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے گرد ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی ’مولا کہاں ہے؟‘“

اس تمہید کے بعد دھماکہ سا ہوتا ہے اور دور دور سے مولا کا کھیل دیکھنے کو آئے ہوئے لوگ نعرہ مارتے ہیں اور مولا میدان میں آجاتا ہے۔ اب افسانے کی اٹھان اور واقعات کا ڈرامائی موڑ دیکھیے: ”مولا اپنے جوڑی

وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر "یا علی" کا نعرہ لگا کے ہاتھ ہوا میں بلند کیا تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈا سا بن کر پڑی۔ "مولے اے مولے! تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے۔ "رنگے نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی سینے سے لگائے بھاگا آ رہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوفزدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا، وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑیوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا۔ اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے۔

"رک جا مولے!"

مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایکدم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے گئے اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے۔

"تو آگے نہیں جائے گا مولے!"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا پھر بولا

"آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"   (گنڈاسا)

لیکن اس افسانے کا ایک خوبصورت موڑ وہ ہے جہاں راجو کا حسن مولے میں احساس و جمال پیدا کرتا اور موڑے گنڈاسے والے کو ایک بدمعاش سے عاشق بنا دیتا ہے۔ جیسے ہیر کے روپ نے بے فکرے اور بھابیوں، مسجد کے ملا اور لڈن ملاح سے لڑ جھگڑا کر آنے والے جاٹ نوجوان دھید و کو رانجھا اور جوگی میں تبدیل کر دیا تھا۔ راجو کی سراپا نگاری اور حسن و جمال کا بیان جس خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے وہ کوئی احمد ندیم قاسمی جیسا شاعر ہی کر سکتا تھا۔

''راجہ نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تا کہ بڑھیا گھی سونگھ لے مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے۔ اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کر لیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کا پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں۔ اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے یا اسے اس ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے“

اس افسانے میں بھی رئیس خانہ کے فضلو کی طرح آہستہ آہستہ کردار کی قلب ماہیت ہوتی ہے اور وہ ایک پہلوان اور لٹھ باز بد معاش سے ایک عاشق، صلح جو اور معاف کر دینے والے کردار میں ڈھل جاتا ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتے مولے کے اندر اس تبدیلی کا آغاز بھی راجو ہی کی بدولت ہوا۔ جب وہ اسے پہلی بار دکھائی دی تھی تو وہ گلی کو لٹھ سے روک کر بیٹھا ہوا تھا اور گزرنے والے راستہ بدل کر گزرتے تھے لوگ کہتے تھے کہ جہاں مولا بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے راجو کو اپنے حسن و جمال کا پورا علم اور احساس تھا اور اس کی طاقت پر اعتماد تھا۔ اس نے گلی میں یہاں سے وہاں تک پھیلی اس کی لٹھ کو ایک تنکے کی طرح اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اپنی بکھری ہوئی مرچیں چننے لگی جو جھکتے ہوئے اس کی گٹھڑی سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آ گیا۔ کڑک کر بولا۔

''جانتی ہو تو نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟''

راجو نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے اطمینان سے جواب دیا ''کوئی سڑک لگتے ہو''

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی ''اسی لیے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تم پر ترس آ گیا تھا“

ایسے لگتا ہے راجو کا یہی جملہ مولے کے اندر اتر گیا۔ اس پر حسن کا جادو چلا گیا۔ مگر ابھی اس میں کچھ زہر باقی تھا وہ دھاڑا اور اسے بتایا کہ وہ مولا گنڈاسے والا ہے۔ جس پر وہ تھوڑا چونکی مگر مسکرا کر گلی میں جانے لگی۔ مگر اب مولے میں فوری طور پر ایک تبدیلی آ چکی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اس کی لاٹھی کو گلی میں پھینکے دیکھ کر رک گئی تو وہ بولا:

"آ جاؤ ماسی آ جاؤ میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا"

اس جملے کی مخاطب ماسی سے زیادہ راجو تھی مگر وہ لمبی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد تبدیلی کا اگلا مرحلہ بھی جلد ہی آ گیا۔ مولا راجو کے پیچھے بھاگا۔ آنگنوں میں بیٹھی عورتیں دروازوں تک آ گئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے کا پیش خیمہ سمجھا گیا۔ اور حادثہ تو ہوا مگر خود مولے کے ساتھ اس کے قدموں کی چاپ سن کر لڑکی جم کر کھڑی ہوئی: "میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا"

مولا بولا

لڑکی نے وضاحت کی "میں ڈر کر نہیں رکی، ڈریں میرے دشمن"

"بس اتنا بتا دو تم ہو کون؟"

لڑکی ذرا مسکرائی۔ اور یہ جان کر کہ وہ اس کے باپ کے قاتل اور دشمن رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر ہے اس کا ہاتھ ٹیبک تک بھی گیا مگر پھر رسے کی طرح لٹک گیا اور وہ اس کی گر جانے والی مرچیں چننے اور انھیں اس کی گٹھری میں ٹھونسنے لگا۔ اب مولا گنڈاسے والا مولا بخش کی جون میں واپس آ چکا تھا۔ سانپ کیچوے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی وہ لٹھ کو کیا کرتا۔ راجو چلی گئی تو مولا بھی واپس ہو لیا تو بڑھیا نے اسے پکارا: "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رہ گئی مولا بخش"

کہتے ہیں محبت سے بڑا جادو آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ یہ دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ جنگ و جدل اور خون خرابے کو روک لیتی ہے۔ آدمی میں پہاڑ کاٹنے اور کچے گھڑے پر دریا عبور کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ بگڑے ہوئے اور لاڈلے کسان کو چاک (ملازم) اور شہزادے کو مہینوال بنا دیتی ہے۔ افسانے کے خوبصورت اختتام نے اس کے تاثر کو دوبالا کر دیا ہے۔ جب راجو کا منگیتر گلا اس کے منہ پر تھپڑ مار دیتا ہے اور اس کے ساتھی مولے کا لٹھ دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں مگر گلا خود گھبراہٹ میں گر جاتا ہے تو سکتے میں آیا ہوا مولا لٹھ ایک طرف پھینک کر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتا اور بڑی نرمی سے کہتا ہے "رسید تم کو ہی دے دیتا پر تمہیں تو دولہا بننا ہے

ابھی ۔۔۔۔۔ اس لیے جاؤ اپنا کام کرو"

گلا سر جھکائے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا مگر افسانے کو بھی ابھی ایک اور موڑ مڑنا تھا۔ مولا کھاٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور خوفزدہ پیچھے ہٹ رہے تھے کہ اس کی ماں چیختی چلاتی اور بھاگی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آ کر نہایت وحشت سے بولنے لگی۔

"تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے۔ ارے تو تو میرا حلالی بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا" وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی "تو تو رو رہا ہے مولے؟"

اب مولا ماں کو کیا بتاتا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ وہ گلے پر وار کیوں نہیں کر سکتا اور وہ اتنا بے بس کیوں ہے؟

"مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا

"تو کیا اب روؤں بھی نہیں"

احمد ندیم قاسمی کی شگفتہ کلامی، لطیفہ گوئی اور محفل آرائی مشہور ہے۔ وہ ایک زندہ دل اور ہر دم ہشاش بشاش رہنے والے شخص تھے۔ وہ قنوطیت، تنہائی پسندی اور خود پسندی جیسی خرابیوں سے مبرا تھے۔ چوں کہ دوسروں سے بہت محبت اور خلوص روا رکھتے تھے اس لیے بہت حساس بھی تھے اور احباب کی چھوٹی سے غلطی یا سرد مہری کو بھی محسوس کرتے تھے۔ مگر چھپاتے نہیں تھے اس کا اظہار کر دیتے تھے اور بال کی کھال نہیں نکالتے تھے۔ معذرت یا وضاحت کر دینے سے مطمئن بھی ہو جاتے تھے۔ ان کی شگفتہ بیانی ان کے افسانوں میں ایک زیریں لہر کی طرح جاری رہتی ہے۔ وہ کرداروں کے مضحک پہلوؤں کے ذکر اور شوخیوں سے لبریز نوک جھونک اور مکالموں سے اپنے افسانوں میں شوخی اور شگفتگی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے افسانوں کی ریڈابلٹی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر ان کی طبیعت کی یہ شوخی اور ظرافت ان کے کالموں میں ذرا زیادہ اجاگر ہوتی تھی۔ اب تو خیر کچھ عرصہ سے وہ زیادہ تر قومی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدہ کالم لکھتے تھے مگر امروز کے حرف و حکایت کے زمانے میں ان کے کالم بہت شگفتہ، ظریفانہ شوخیوں اور چھیڑ چھاڑ سے لبریز ہوتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب ایک محبت کرنے والے، نیک دل اور شریف انسان تھے۔ جس ماحول اور معاشرے میں ہمارے بعض بے درو سینئر ادیب اور شاعر خط اور کتاب کی رسید تک بھجوانے کے روادار نہ ہوں۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو مشہور اور نامور بھی ہوں اور دوستوں اور عزیزوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور

غموں میں شرکت کریں یا خط لکھ کر احوال پرسی کریں۔ اپنی نشست سے اٹھ کے تخلیقات وصول کریں اور گلے لگا کر ملیں مگر قاسمی صاحب ایسا کرتے تھے۔

جناب احمد ندیم قاسمی نے بھرپور ادبی زندگی گزاری اور اپنے پیچھے محبتوں کا جو سرمایہ چھوڑ گئے وہ کبھی دلوں سے محو نہ ہوگا۔ فنون کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے کئی نئی نسلوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ بظاہر ہم سے بچھڑ گئے ہیں مگر اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شعر و ادب کا ایک عظیم دریا تھے جو ان گنت اشجار کو سینچ کر اور بہت سے کھیتوں کھلیانوں اور صحراؤں کو سیراب کرنے کے بعد ابدیت کے سمندر میں اتر گیا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ناہید قاسمی

احمد ندیم قاسمی: بطور افسانہ نگار

قدرت کی طرف سے احمد ندیم قاسمی کو بھرپور تخلیقی وفور سے نوازا گیا تھا۔ شاعری کے ساتھ اُن کے فنِ افسانہ نگاری نے کئی مدارج طے کیے۔ بالآخر اہلِ ذوق اور صاحب الرائے ناقدین نے اُن کی فنی عظمت کو تسلیم اور اُن کے منفرد اندازِ بیان کی تابندگی اور تازگی کا اعتراف کرلیا اور کہا کہ "موضوعات کے تنوع کے علاوہ ان کے اکثر افسانوں میں بے حد گہرائی، سچائی، وقار اور تاثیر ہے اور جراُتِ اظہار کا وصف نمایاں ہے۔" احمد ندیم قاسمی نے اردو افسانے کو کئی شاہکار و یادگار افسانے دیے۔ ان افسانوں کے کردار و واقعات قارئین کی یادوں میں ان مٹ مہک بن کر زندہ رہتے ہیں۔ اپنے فن پاروں کے ذریعے ندیم نے ثابت کیا کہ انھیں افسانہ نویسی کی خاص صلاحیت، میعار اور ہنر حاصل تھا۔ انھوں نے متنوع موضوعات کو اپنایا۔ افسانے کی تکنیک میں خوبصورت تجربے بھی کیے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے پلاٹ منظم اور گُتھے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی جھول نہیں۔ افسانہ طویل ہو یا مختصر وہ کسی طرح کے رخنے نہیں رہنے دیتے۔ روزمرہ زندگی سے لیے چھوٹے چھوٹے واقعات اور عام کرداروں کو اس خاص قرینے سے ترتیب دیتے ہیں کہ وہ ان کے ذریعے اپنے مضبوط اور وسیع النظریات خیالات و نظریات، بلند افکار اور پہلو دار تصورات کو نمایاں کر لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ سب اس خوبی سے کیا کہ قاری کا تجسس اور دلچسپی کہانی کے آغاز سے اُس کے عروج اور کلائمکس اور پھر اُس کے اختتام تک برقرار رہتے ہیں۔ یہ ندیم کے فنی خلوص کا کمال ہے کہ قاری افسانوں کو شروع کرتے ہی ان کی گرفت میں آجاتا ہے اور پھر مکمل افسانے پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ افسانوں کے اختتام اُسے حیران کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ انوکھی کیفیتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ایسی کائنات میں داخل ہوجاتا ہے جہاں خوبصورت دنیائیں اپنے سبھی رنگوں کے ساتھ اپنے قاری کے لیے نئے نئے در وا کر دیتی ہیں۔ جہاں دُکھ بھی ہیں اور سُکھ بھی۔ جہاں کسک بھی ہے اور مُسکان بھی۔ ندیم کو اپنے منفرد اسلوب بیان پر قابلِ رشک مہارت حاصل ہے۔ ان کی خداداد خوبی تحریر کا حسن متاثر کن ہے جس کی حیرت انگیز سادگی و پُرکاری، بے تکلفی و روانی اور الفاظ کا درست انتخاب اُنھیں پُرکشش و پُروقار انشا پرداز کہلائے جانے کا استحقاق دیتے ہیں۔ یہ

رواں، سادہ نکھرا ہوا، تازگی اور دلچسپی سے بھرپور اسلوب جہاں بہت ذہین ہے وہیں بے حد پُرتاثیر بھی ہے۔ اس کی معتدل تہہ داری، ایمائیت اور تمثالیت کے باوجود قاری کسی ابہام یا اُلجھاؤ میں نہیں پڑتا۔ وہ موضوع اور اسلوب کی کشش کے دائرے میں رہتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا شاعر ہونا بھی انھیں اس تخلیقی نثر میں فائدہ دے گیا کہ اس نے انھیں حسنِ بیان کی شگفتہ اور شائستہ انفرادیت دی جب کہ شاعرانہ اظہار کے حُسن نے کہیں بھی ان کی نثر کا توازن کھونے نہیں دیا بل کہ اس کی اپنی سرحدیں واضح طور پر الگ برقرار رہتی ہیں۔ دراصل مختلف تخلیقی جہات اور انقلابی آرزومندی نے وسیع کینوس اور گہرے عمیق وژن کے ملاپ نے ندیم کے اسلوبِ نثر کو بھی منفرد حیثیت دے دی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ”احمد ندیم قاسمی نے تخلیقی اظہار کے دو بڑے میڈیم یعنی شاعری اور افسانے کا انتخاب کیا۔ یہ دونوں میڈیم ایک دوسرے کے برعکس سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں سے وابستہ ہیئت اور اسلوب کے تقاضے بھی جداگانہ ہیں مگر قاسمی صاحب نے اپنی تخلیقی توانائی سے ہر دو کا حق ادا کر دیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔“(۱)

جب کہ اطہر رضوی کا کہنا ہے کہ:

> ”اردو ادب میں کسی بڑے شاعر نے بڑی کہانیاں نہیں لکھیں اور کوئی قصہ نویس بڑا شاعر نہیں بن سکا۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی تاریخ کی اولین شخصیت ہیں جنھوں نے ہر دو اصناف میں یکساں قدرت اور یکساں شہرت حاصل کی۔ یہ بذاتِ خود ایک ایسا مرتبہ، ایک ایسی توقیر ہے جس سے صرف قاسمی صاحب کو نوازا گیا۔“(۲)

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ماضی کی روایات اور عہدِ نو کی جدتوں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں زیادہ تر مختصر کہانیاں لکھیں۔ بعد میں طویل تر افسانے بھی لکھے اور مختصر تر بھی۔ آغاز رومان و حقیقت سے کی بعد میں کھری اور جرأت آموز صداقت نگاری اپنائی۔ ندیم کے افسانوں کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) پہلا دور: پہلا افسانوی مجموعہ ”چوپال“ (۱۹۳۹ء)، ”بگولے“ (۱۹۴۱ء) ”طلوع و غروب“ (۱۹۴۲ء) میں شدتِ جذبات و احساسات ہے۔ سُلگتے خارج کا گہرا مشاہدہ ہے۔ جلدی سے بہت کچھ کہہ ڈالنے کا رویہ ہے۔ اضطراب، بے چینی اور افکار و خیالات کے مد و جزر صاف محسوس ہوتے ہیں۔ بے بسی اور غصے کی جھلکیاں ہیں۔ کہانی کہنا بخوبی آتا ہے۔ زیادہ تر رومانوی حقیقت نگاری سے بھرپور مختصر، خوبصورت اور پُراثر کہانیاں ہیں۔ (۲) دوسرا

دور: ”سیلاب“، ”گرداب“ (۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء)، ”آنچل“ (۱۹۴۵ء)۔ توازن و اعتدال کا دور ہے۔ فن پر گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ کہانی کی پیش کش نکھر رہی ہے۔ نمایاں بات یہ ہے کہ جرأت آموز، تیکھا اور واضح انداز ہے۔ (۳) تیسرا دور: ”آبلے“ (۱۹۴۶ء)، ”آس پاس“ (۱۹۴۸ء)، ”درودیوار“ (۱۹۴۹ء)، ”سناٹا“ (۱۹۵۲ء) میں فنِ افسانہ نگاری میں مختلف تجربات کیے۔ افسانوں کے لفظ لفظ اور جملے جملے میں ہر واقعے، ہر مکالمے میں پوری فنی توجہ جھلکتی ہے۔ طویل تر افسانے بھی ہیں اور مختصر بھی۔ بیانیہ بھی ہیں اور تاثراتی بھی۔ جنگِ عظیم اور تحریکِ خلافت کا ذکر بھی ہے۔ اور امن، تحریکِ آزادی، ترقی پسند تحریک، تقسیم، فسادات اور ہجرت کا بھی بلیغ ایمائی انداز میں ذکر ہے۔ پُراسراریت بھی ہے، کھلی حقیقت بھی۔ یہ افسانے حساس بھی ہیں اور پُردانش و فکر انگیز بھی۔ دُکھ بھی دیتے ہیں اور تسکین بھی پہنچاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس دور میں کئی شاہکار افسانے لکھے۔ (۴) چوتھا دور: ”بازارِ حیات“ (۱۰۵۵ء)، ”برگِ حنا“ (۱۹۵۹ء)، ”گھر سے گھر تک“ (۱۹۶۳ء)، ”کپاس کا پھول“ (۱۹۷۳ء)، ”نیلا پتھر“ (۱۹۸۰ء) میں کچھ بھی غیر ضروری یا زائد نہیں۔ اب ایک جملے میں بہت کچھ کہہ ڈالتے ہیں اور تھوڑے میں بہت کچھ سمیٹ لینے کا رجحان ہے۔ سادگی تُرش کر مزید نکھر گئی ہے۔ نئے اور مختلف موضوعات ہیں۔ جدید علامتی رنگ ہیں اور دلچسپی اور تازگی کی فضا کی مہک بڑھ گئی ہے۔ اب پُرسکون فنی بہاؤ ہے، روانی ہے۔ اردگرد کے حالات پورے بدلے نہیں۔ اب تک توہمات بھی ہیں اور جہالت بھی ہے۔ ہر طرح کا استحصال بھی جاری ہے۔ دُکھ اور مُفلسی میں کمی نہیں آئی لیکن اب کرداروں پر بے بسی غالب نہیں مثلاً 'جوتا' میں کھل کر اظہارِ محبت کیا اور اپنا حق مانگا۔ اس دور میں پاک بھارت جنگوں سے بھی حوصلے پست نہیں ہوئے۔ (۵) پانچواں دور: ”کوہ پیما“ (۱۹۹۵ء)، ”پت جھڑ“ (۲۰۰۷ء) میں جیسا جاتا ہوا سورج اپنی کرن کرن سمیٹتا ہے۔ اس طرح اب اپنے مقصد، اپنے کام مکمل کر لینے کا انداز ہے۔ یادداشتوں کو اکٹھا کر لینے کا رویہ ہے۔ افسانے کے انداز میں خاکے بھی لکھے اور افسانے بھی لکھتے رہے۔ اسی دور میں پہلے کی لکھی غیر شائع شدہ تحریروں کو مکمل یا پھر نامکمل صورت میں شائع کروا دیا۔ مثلاً نامکمل ناول 'پت جھڑ' کے دو خوبصورت باب اور بہت پہلے لکھا معنی خیز ناولٹ ”اُس رستے پر“ (یعنی: 'ایک ریوڑ ایک انبوہ“)۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے ہر مجموعے میں بہت اچھے افسانے شامل ہیں جب کہ میرے نزدیک جن مجموعوں میں بہترین اور زندہ جاوید افسانے زیادہ تعداد میں ہیں اُن میں ”درودیوار“، ”سناٹا“، ”برگِ حنا“، ”بازارِ حیات“، ”گھر سے گھر تک“، ”کپاس کا پھول“ اور ”کوہ پیما“ شامل ہیں جب کہ 'آبلے' میں تین طویل ترین ناولٹ

نما افسانے ہیں جن میں بہت مشہور، پُر معنی اور دل کش افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' بھی شامل ہے۔

ادب بجا طور پر زندگی کا عکاس بھی ہے اور مفسر بھی۔ ادب کی وسیع بستی میں زندگی کے تمام راستے پہنچ کر آباد ہو جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے ادب نے بھی زندگی اور سماج پر مختلف حیثیتوں سے امتیازی انداز میں سنجیدہ فکری و فنی تنقید کی اور مختلف جہتوں سے عکاسی بھی کی۔ صد شکر کہ قدرت نے انھیں بہت حساس دل، بے حد زرخیز دماغ اور بھرپور فنی و تخلیقی توانائیاں ودیعت کی تھیں جن سے انھوں نے سبھی اصنافِ ادب میں خوب کام لیا اور اپنے عہد کی ممتاز ترین ادبی شخصیت رہے۔ اُن کے اثرات اُن کی پوری صدی پر نمایاں رہے۔ ان کی مقبولیت اس لیے بھی دوچند ہوئی کہ انھوں نے بڑی نفاست اور مہارت سے انسانی رویوں اور مقامی رنگوں کو آفاقیت کا رنگ دیا۔ وہ شروع سے آخر تک انسان دوست فن کار رہے۔ اُن کے فن پاروں نے مینارۂ نور کی حیثیت حاصل کر لی جو نسل در نسل روشنی دیتے رہیں گے اور اس سمت آنے والے نئے ادیبوں کو روشن رہنمائی ملتی رہے گی۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، تازگی بھی ہے اور وقار بھی۔ ان کے افسانے فنی و فکری لحاظ سے سربلند ہیں۔ بقول اسلوب احمد انصاری ''احمد ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دل سوزی، متانت، میانہ روی اور ہمدردی، رفاقت کا جذبہ ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بلا کم و کاست جھلک اُٹھیں اور ایک معیار بھی جہاں تک انھیں پہنچنا ہے۔''(۴)

جب کہ اعلیٰ ظرف رکھنے والے ندیم کا کہنا ہے کہ:

''میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں، میں داڑھی مونچھیں مُنڈوا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں سمجھتا لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف بر سرِ بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔''

ندیم کے افسانوں میں موضوعات کی رنگا رنگی، وسعت اور تنوع قابلِ قدر ہے جب کہ اسلوب بیان کی

ندرت، شگفتگی اور تازگی پُرتاثیر ہے۔ اس دور میں ہمارے بیشتر تخلیق کار محدود موضوعات چُن کر اُن میں ہی کمال کو پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں محمد حمید شاہد کی رائے میں: ”قاسمی نے یہ کیا کہ ان حدوں کو توڑا ہے لہٰذا تخلیق بھی آخری عمر تک اُس پر مہربان رہی۔ میں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اس خالص طرزِ عمل کی وجہ سے اس کے ہاں ایسے افسانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے جن میں کسی خاص نقطۂ نظر کی تشریح کرنے کی بجائے کہانی کے اپنے وجود پر اکتفا اور اعتماد کرنے کا چلن اپنایا گیا ہے۔ اس سے قاسمی کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی کا سماں بندھ گیا ہے۔ کہیں رشتے محترم ہو گئے ہیں تو کہیں خود انسانی وجود، کہیں ظالم اس کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے تو کہیں وہ رویے جو جہالت کے مظاہر ہو گئے ہیں، انھیں رد کیا گیا ہے۔ عورت کو بھی قاسمی نے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔۔۔۔ ایک سے زیادہ تخلیقی جہات رکھنا میری نظر میں ایک غیر معمولی عطا ہے اور قاسمی غیر معمولی تخلیق کار ہے۔“(۴)

ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار کا کہنا ہے کہ: ”جتنی کثیر الجہات افسانوی تصویریں احمد ندیم قاسمی کے یہاں نظر آتی ہیں۔ پورے اردو ادب میں اُن کی مثال ملنا مشکل ہے۔“(۵)

ندیم نے جو اندازِ بیان اپنایا اسے صداقت پسندی کا نام دیا۔ اُن کے نزدیک حقیقت پسندی اور صداقت پسندی میں فرق ہے۔ حقیقت یک رخی ہوتی ہے جب کہ صداقت میں کئی جہتوں اور کئی پہلوؤں سے سچائیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بقول ندیم: ”اگر ہم حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کے فرق کو اپنے ذہنوں میں واضح کر لیں تو ادب و فن میں حقیقت کے اظہار سے متعلق ہماری تمام الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔۔۔۔ (دراصل) حقیقت کوئی جامد چیز نہیں۔ خارجی حقیقت کے اندر متعدد لہریں رواں ہیں۔ ایک تو خود اس حقیقت کی انفرادی حرکت ہے۔ دوسرے اس کا ماضی کی تاریخی حقیقتوں سے رشتہ ہے اور تیسرے مستقبل کے ساتھ اس حقیقت کی وابستگی ہے۔ اگر خارجی حقیقت کو فن میں منتقل کرنے والا اس بات سے ہی بے خبر رہے کہ حقیقت کو موجودہ صورت اختیار کرنے میں کتنی صدیاں صرف ہوئی ہیں تو وہ حقیقت کا فنکارانہ یا دوسرے لفظوں میں صداقت پسندانہ اظہار نہیں کر سکتا۔۔۔۔ صداقت پسندی فن کار کو خواب دیکھنے سے نہیں روکتی۔۔۔۔ گویا حقیقت پسندی اور رومانویت کے اسالیب کے زندہ عناصر کو اپنی انقلابی آرزومندی کی آنچ میں باہم دگر آمیز کر کے یہ اسلوب ایجاد کیا گیا ہے۔“(۶)

ندیم کے فنِ افسانہ نگاری میں بھی صداقت پسندی سب سے اہم ہے۔ ان کا پُرسلیقہ طرزِ تحریر سادہ،

رواں، پُرکشش اور پُرتاثیر ہے۔ وہ اپنے گہرے عمیق اور ہمہ جہت مشاہدے سے مدد لیتے ہیں۔ فن پر اُن کی گرفت مضبوط رہتی ہے۔ تہہ داری، اشاریت، ایمائیت اور علامت نگاری کو ایک خاص توازن سے اپناتے ہیں۔ ان کے فن پارے امن وخیر، حسن وخوبی اور عدل ونیکی کی حمایت بھی کرتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے مدد بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ہاں انسان دوستی انسان عاشقی میں بدل گئی ہے۔ ہر سچا فن کار بنیادی طور پر انسان دوست ہوتا ہے لیکن ندیم تو انسان اور اس کی انسانیت کے سچے عاشق ہیں۔ وہ انسان کے وسیلے سے زندگی، زمین اور وطن کے مسائل پر غور کرتے ہیں اور حل سوچتے ہیں اور انسان ہی کی خاطر آفاق بھر اور کائنات بھر تک اپنے فن کا دائرہ پھیلا دیتے ہیں۔ انھیں انسان کی غیرت مندی، احساسِ عزتِ نفس اور باسلیقہ جرأتِ اظہار میں بے حد حسن محسوس ہوتا ہے۔ ندیم اپنے نظریات، اپنے مقصد اور نصب العین کی بہت فن کارانہ عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں اور اسے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ قاری کے جذبات وافکار متحرک ہو جاتے ہیں اور اُس کے دل میں بھی ارادہ وعمل کا استحکام جاگ جاتا ہے۔ اس طرح ندیم سوچنے اور غور کرنے پر بھی قائل اور مائل کر لیتے ہیں۔ دراصل ان کے فن پارے بیک وقت دل اور دماغ کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ندیم کی ادبی تخلیقات بے سمت نہیں۔ ان کی ایک سوچ ہے۔ ایک نظریہ ہے۔ وہ انسان کی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور غور وفکر سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ جرأتِ اظہار اُن کا نمایاں ترین وصف ہے اور یہ سب کچھ فنی تقاضوں کے اندر رہ کر سامنے لاتے ہیں۔ وہ اپنے بے حد خوبصورت فن پاروں کا سرمایہ اردو ادب کو دے کر اُسے ثروت مند کر دیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے دیہاتی اور شہری دونوں طرزِ زندگیوں کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ ندیم کے آبا واجداد عرب سے تھے۔ وہ افغانستان، ایران، ملتان سے ہوتے ہوئے تبلیغِ دین کے لیے وادیِ سون سکیسر پہنچے اور پہاڑی گاؤں انگہ بسایا۔ خاندان کے بزرگوں نے لوگوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دینا جاری رکھا جب کہ آبائی پیشہ کاشت کاری رہا۔ ندیم بھی اُن کسانوں میں سے ایک ہیں اور کسانوں کی خوب ترجمانی کرتے ہیں۔ چوں کہ وہ سچے فن کار ہیں اس لیے شاہکار اور زندہ جاوید افسانے بھی تخلیق کرتے ہیں۔ ندیم نے بعد میں شہروں میں بھی زندگی گزاری۔ دیہاتی موضوعات پر اگر ایک سو پچاس (۱۵۰) کے قریب افسانے لکھے تو شہری حیات پر پچاس (۵۰) خوبصورت اور زندہ رہنے والے افسانے تحریر کیے۔ کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں ندیم کے دوسرے افسانوی مجموعے ''بگولے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''اردو زبان میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے

متعلق صحیح اور جامع مرقعے سب سے پہلے منشی پریم چند آنجہانی نے ترتیب دیے اور موجودہ دور میں جن ادیبوں نے دیہات کے موضوع کو نہایت کامیابی سے اپنایا ہے اور اس پر اپنے ذاتی تجربے، صحیح ادراک اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام پیش پیش ہے۔ (وہ ایک کسان ہے۔ اسے کسانوں کی زندگی سے کماحقہٗ واقفیت ہے) قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کا مقامی رنگ ہے اور وہ بھی کوہستانِ نمک کے دیہاتوں کا مقامی رنگ ۔۔۔۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اپنے دامن میں پتلی پتلی ندیاں اور سرسبز چراہ گاہوں کو لیے خوبصورت گاؤں، سرخ سپید مٹی سے لپے ہوئے گھروندے، درخت، پھول اور جھاڑیاں، نیم، ببول، بیری، پکائن، شیشم، لمبی سبز گھاس اور بیکیڑ کی جھاڑیاں بہ افراط پائی جاتی ہیں۔ شیریں زبان پوٹھوہاری پنجابی سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں کے لوگ خوبصورت بھی ہیں اور غیور بھی ۔۔۔ اسی سطح مرتفع کی ننھی منھی وادیوں میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے رنگین اور دل آویز افسانے سجائے ہیں ۔۔۔ ندیم خالی خولی فوٹوگرافی سے کام نہیں لیتے بل کہ ایک چابک دست فن کار کی طرح اس مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر اس کے تانے بانے پر دیہاتی زندگی کے جان دار مرقعے تیار کرتے ہیں ۔۔۔ کہ زندگی اپنی تمام تر صعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔ ان میں کہیں بھی ندیم زندگی سے گریز کرتا نظر نہیں آتا بل کہ اُسے چھو لینے کے لیے بے قرار دکھائی دیتا ہے ۔۔۔ جہاں تک فنی صداقت اور شدتِ تاثر کا تعلق ہے، ندیم کا درجہ بہت بلند ہے اور اس کے ادبی تجربے ہمارے لیے وقعت رکھتے ہیں۔“ (۷)

نوعمری اور نوجوانی میں ندیم کو افسانہ نگاری سے مطالعے کی حد تک دل چسپی تھی۔ اپنے سرپرست چچا (کہ والد تو ندیم کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے) کی لائبریری (کیمبل پور) میں رکھے رسالوں سے اور گاؤں انگہ کی چھوٹی سی سکول لائبریری کی کتابوں سے افسانے پڑھے۔ وہیں انھیں پریم چند کے افسانوی مجموعوں تک رسائی بھی ہوئی۔ اس سے پہلے وہ تخلیقِ فن کر تو رہے تھے اور کم سنی سے ہی اپنی مقامی بولی میں شعر (خصوصاً بولیاں، ٹپے اور ماہیے کی کلیاں وغیرہ) کہہ رہے تھے۔ اس لیے ان کا بنیادی اور زیادہ رجحان شاعری کی طرف رہا۔ ان کی ادبی اشاعت کا آغاز بھی نوعمری یعنی ۱۴ برس کی عمر میں جنوری ۱۹۳۱ء سے شاعری کے ذریعے ہی ہوا جب کہ حصولِ تعلیم کے دوران بہاول پور کے کالج میں اپنے ایک مطالعے کے شوقین کالج فیلو دوست محمد خالد اختر (جو بعد میں مشہور نثر نگار ہوئے) کے کہنے پر انیس بیس برس کی عمر سے افسانے لکھنا اور شائع کروانا شروع کیے۔ آغاز میں دیہاتی زندگی کی عکاسی کی۔ اس کی وجہ اور وضاحت ہمارے اس کسان فن

کاراحمد ندیم قاسمی نے یوں کی کہ ”ابھی (۱۹۴۲ء) تک شمالی مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے اور کسی حصے کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں نے دیہی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا۔ گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس میں رہنے بسنے والے انسان میرے افسانوں کے کردار ہیں۔ انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے۔ دُکھ سُکھ بھی ایک سے ہیں۔۔۔۔ دراصل انسانوں کی انسانیت سے متعلق فن اپنے اندر کائناتی جاذبیت رکھتا ہے۔۔۔۔ میں نے اپنے غیور، غریب اور محنتی بھائیوں کے احساسات و جذبات کو کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ میں نے اُن بے زبانوں کی نمائندگی کی ہے جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مُہر لگا رکھی ہے۔۔۔۔ یقین مانیے کہ اسی سرزمین میں ایک ایسی جماعت بھی آباد ہے جو باسی روٹی اور پیاز سے پیٹ بھر کر بھی طاقت ور رہ سکتی ہے۔“ (۸)

ندیم نے دیہات اور دیہاتیوں کو خود دیکھ رکھا تھا۔ اُن کے درمیان اپنی زندگی کا اہم اور پُرجوش حصہ گزارا تھا۔ تحریکِ آزادی میں حصہ بھی اپنے گاؤں اپنی وادی میں رہ کر لیا تھا۔ حصولِ تعلیم کے بعد ذریعہ معاش کے لیے شہروں میں جا بسنے تک دیہات میں رہے اور وہاں کا مشاہدہ کیا۔ اسی لیے دیہی زندگی کی نہایت فطری، مکمل اور حسین عکاسی کی ہے۔ انھوں نے گاؤں کی فضاؤں اور گاؤں والوں کی معصومیت، سادگی، صاف دلی اور خوب صورتی بھی بیان کی۔ چوں کہ وہ ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے سچے فن کار ہیں اس لیے شہروں میں بسرام کے باوجود بھی دیہاتیوں اور وہاں کے خوددار مفلسوں کے دُکھ، بے چارگی، مجبوری اور بے بسی کو اور اُن کے سُکھ اور مسکراہٹوں کو نہیں بھلایا۔ اس کا احساس کیا بھی اور کروایا بھی۔ دیہی زندگی کے روشن، حسین بھی اور تاریک، بدصورت بھی دونوں طرح کے پہلو دکھائے۔ یہ بھی سمجھایا کہ محنت کرنے والوں کو حق اور صلہ نہیں ملا۔ جب کہ جاگیردار، زمین دار، سرمایہ دار اور اہلِ اقتدار ظلم و جبر کی انتہا کیے رکھتے ہیں۔ چوں کہ ندیم کو انسانوں کی انسانیت سے ہمیشہ دل چسپی اور لگاؤ رہا اور وہ امید و جستجو کے سدابہار پرستار رہے۔ اس لیے اس ذریعے سے بھی اُن کے افسانے گاؤں سے شہروں تک اور مقامیت سے آفاقیت تک محیط ہیں اور ہر پل ہر مقام پر درِ امکان وا رکھتے ہیں۔

یہاں پہلے ندیم کے دیہی افسانوں، خاص طور پر دیہی افسانوں کے موضوعات اور کرداروں پر ایک

نظر ڈالتے ہیں کہ ندیم نے ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال کی رائے میں ”احمد ندیم قاسمی کا دیہات فطرت کے مثبت و منفی پہلوؤں کی آماجگاہ ہے۔ راست اقدار، بے لوث جذبے، اکہرے اور سادہ افعال و اعمال، پیچیدہ فطرت کے سادہ سادہ اظہاریے، یہاں دیہات کی پہلی اکائی یہی سادگی کا اثبات دکھائی دیتا ہے، جس میں منفیت کا نمک بھی زیادہ نمکین نہیں ہے۔ یہ وہ کھرا اور بنیادی جذبوں کا حامل دیہات ہے، جس تک ابھی جدید دنیا کی آلائشیں نہیں پہنچی ہیں۔ یوں یہ افسانے نیچرل انسان اور ازلی فطرتوں کے براہ راست مطالعے بن جاتے ہیں، جس میں تمام تر دیہی خوشبوؤں کا ذائقہ اور ان ذائقوں کی کھٹاس مٹھاس گھلی ہے۔ یہاں کسان بھی رہ رہا ہے اور زمین دار بھی موجود ہے۔“(۹)

مُّو بھائی نے ایک کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ ”وادیِ سون سکیسر، پانی سے باہر آنے والی دنیا کی پہلی خشکی ہے۔ یعنی دنیا کی قدیم ترین وادی ہے۔ روئے زمین پر پھیلے سمندر کے اس پہلے اور واحد کنارے کا ثبوت ”کوہستانِ نمک“ ہے ---- یہاں کی چٹانیں اپنی عمر کم از کم پچپن کروڑ سال بتاتی ہیں اور ان پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ ماہرینِ ارضیات نے اس وادی کو ارضی علوم کا عجائب گھر قرار دیا ہے۔“(۱۰)

اسی انوکھی اور دل کش وادی میں بسے ایک چھوٹے سے خوب صورت گاؤں ”انگہ“ میں ۱۹۱۶ء کے ماہ نومبر میں ایک بچے احمد شاہ نامی نے پہلی بار اپنی آنکھیں کھولیں اور صاف ستھری فضاؤں کو دیکھا۔ مختلف حالات کے اتار چڑھاؤ کا سامنا کرتا ہوا، پتھریلی راہوں پر چلتا اور بل کھاتی پگ ڈنڈیوں سے گزرتا ہوا آخر کار علم و دانش، تخلیقِ فن اور پُرکشش انسانیت کا اعلیٰ نمائندہ ”احمد ندیم قاسمی“ بن گیا۔ مختلف زبانوں میں تراجم کے ذریعے اس کے فن پاروں کی مہک دنیا بھر میں پھیل گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان فن پاروں کا مرکزی موضوع انسان اور اس کی انسانیت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ ندیم کے سبھی افسانوں کو پرکھیں لیکن اس کے لیے تو ایک پوری کتاب لکھنا ہوگی۔ اس ایک مضمون میں یہ تفصیل کہاں سما پائے گی اس لیے چیدہ چیدہ افسانوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یوں تو حسن و خیر، انسانیت اور محبت ندیم کے بیشتر افسانوں میں نمایاں ہے لیکن خاص محبت کے موضوع پر تقریباً ۳۵ افسانے ہیں جن میں محبت کا ہر رنگ سما گیا ہے۔ ندیم کے پہلے افسانوی مجموعے ”چوپال“ میں بہت سے افسانے رومانویت کی فضا لیے ہوئے ہیں۔ ان میں ”بے گناہ“ کے رحمان اور جواہر، ”مسافر“ کا نوجوان جسے منزل نہ مل سکی ”حق بجانب“ کی خوب صورت اجنبی دہقانی عورت کا اپنی محبت کا ناقدری کا بدلہ یا پھر ”انتقام“ کا نوجوان

جس نے محبت کی خاطر اپنے انتقام ہی کی قربانی دے دی۔ ”بوڑھا سپاہی“ میں رومانویت اور حقیقت کے امتزاج سے محبت کا انوکھا رنگ دکھایا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے میدانوں کا جنگ جو سپاہی محبت کے زم احساس سے تہی نہ تھا۔ اپنی فوت ہو جانے والی محبوبہ کے بچوں کی دیکھ بھال میں ہی عمر گزار دی۔ دوسرا مجموعہ ”بگولے“ تھا جس کا خوب صورت افسانہ ”طلائی مہر“ ہے فیض وار سوئی ظالم تھانے دار سے اپنی غربت میں لٹی محبت بچا لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ”طلوع وغروب“ طویل افسانہ ہے جو خوبصورت ریگستانی دیہی پس منظر میں سجا ہے۔ شہری غضنفر بڑی مکاری سے اپنے صاف دل ریگستانی، دوست سنبل کی معصوم محبت نرگس کو بھی چھین لیتا ہے اور آخر اُسے بھی دھوکا دے جاتا ہے ”گونج“ بے حد خوب صورت افسانہ ہے۔ سبز پہاڑ کی چوٹی کے ٹھنڈے میٹھے چشمے کے پاس بنے چھوٹے سے گھروندے میں رہنے والی عمراں بڑے بڑے حسین خواب دیکھ بیٹھتی ہے لیکن خوابوں نے تو ٹوٹنا ہی تھا اور حقیقت بے حد تلخ تھی۔ ”سیلاب و گرداب“ میں شامل افسانے ”اُلجھن“ میں نوبیاہتا کا اضطراب کہ جانے دولہا کیسا ہوگا لیکن وہ تو بہت اچھا نکل آیا۔ ایک لڑکی کی بے چینی کو گہری نظر کے ساتھ دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے جب کہ افسانہ ”غریب کا تحفہ“ کی غریب خانی امیر افسر سے محبت کر بیٹھی جب کہ وہ وعدہ خلافی کر کے خود کسی اور سے بیاہ کرنے چل دیا۔ خانی نے اپنی جمع کی گئی دولت یعنی سارے خشک اُپلے افسر کی دعوت ولیمہ کی تیاری کے لیے تحفے میں دے دیے۔ اب ذکر کرتے ہیں ”سناٹا“ کے شان دار افسانے ”گنڈا سا“ کا۔ جہاں اس میں غیور قومی اور جری نوجوان کی ضد کی سختی کو دکھایا ہے تو وہیں حسن ومحبت کی نفاست اور لطافت کو بھی نمایاں تر رکھا ہے۔ اس بے حد نفیس افسانے پر بہت ظلم ہوا۔ کراچی ٹی وی سے جب یہ افسانہ ڈرامے کی صورت میں سلیقے سے پیش کیا گیا تو اسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ نئے ابھرتے نوجوان اداکار منور سعید نے مولے کا اور ایک نئی خوش شکل اداکارہ نے راجو کا کردار نبھایا۔ مشہور اداکار محمد علی نے ندیم صاحب سے اس افسانے پر اردو فلم بنانے کی اجازت لے لی جس میں مولے کا کردار محمد علی نے خود ادا کرنا تھا لیکن اُس سے پہلے ہی ایک اور فلم ساز نے ندیم سے پوچھے بغیر اور کوئی مشورہ کیے بغیر ہی اوپر تلے دو بہت چلنے والی پنجابی فلمیں ”وحشی جٹ اور مولا جٹ“ کے نام سے بنا ڈالیں۔ جن میں ندیم کے تخلیق کیے کردار کی خوب صورتی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا۔ مولے کو صرف ایک ظالم وحشی گنڈا سا بردار قاتل کے طور پر پیش کیا گیا اور اُس کی انسانیت، اُس کی حسِ جمال اُس کے احساسِ محبت کی نفاست، اس کے دل کے سوز و گداز کو نظر انداز کر دیا۔ بالکل اسی طرح کا ظلم ندیم کے ایک اور بے حد مقبول افسانے ”پرمیشر سنگھ“ کے ساتھ بھی ہوا

اوراب کے یہ ظلم ایک شاعرفلم ساز نے کیا۔ اس افسانے پر ''کرتا رسنگھ'' کے نام سے فلم بنائی اور کرتار کو صرف ایک ظالم، اکھڑ، بدتمیز اور بدمزاج ڈاکو کے طور پر پیش کر دیا۔ جب کہ ''ستویا رو!'' کہنے کے عادی پریشر سنگھ کے کردار کی نفیس انسانیت، ننھے بچے سے اُس کی معصوم محبت، مذہبی رواداری کی اُس کی اعلیٰ سوچ، اُس کے تتلیاں پکڑنے اور اُس کے گیت گانے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ بہر حال یہ دونوں افسانے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور قلب ونظر کی گہرائیوں کے لیے باعثِ تسکین ہوں گے کیوں کہ یہ دونوں ہی لازوال شاہکار افسانے ہیں۔ ''سناٹا'' کا ایک افسانہ ''آتشِ گُل'' بھی ایک عمدہ فن پارہ ہے۔

ہم محبت کے موضوع کے گرد گھومتے ندیم کے افسانوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ ''برگِ حنا'' کا افسانہ ''ماتم'' ایک ادھیڑ عمر جوڑے کی پُرخلوص محبت کا انوکھا رس لیے ہوئے ہے۔ جب کہ ''جن والس'' بھی انوکھا افسانہ ہے۔ پُراسرار فضا اور ماحول میں چار کرداروں کے درمیان مثلث محبت کی اس عجب اور غضب کہانی میں محبت کا فلسفہ واضح ہوتا ہے۔ صورتِ حال نرالی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف، دوسرا تیسرے کی طرف اور تیسرا چوتھے کی طرف مائل ہے۔ بانو یونس سے، یونس بیگماں سے اور بیگماں راجے سے متاثر ہے۔ اسی گھمن گھیری میں محبت کے لیے قربانیاں دیکھتی کہانی انوکھے انجام تک پہنچتی ہے۔ مجموعے ''گھر سے گھر تک'' کے افسانے ''بھرم'' میں شہری اُمرا کے ایک گروہ کی شراب نوشی اور خرمستی کے درمیان عطیہ بڑے کھلے انداز میں اپنے ہی بہنوئی خالد سے محبت کا اعتراف کر لیتی ہے جب کہ افسانہ ''بھاڑا'' میں مُلکھاں کی پُرکشش آنکھوں کے حسین شعلے کا دیدار اتنا گہرائی سے کیا گیا کہ وہ بُجھ کر رہ گئیں۔ یہ دونوں افسانے ایمائی اور علامتی انداز لیے ہوئے ہیں۔ ایک اور خوب صورت افسانوی مجموعے ''کپاس کا پھول'' کے انوکھے افسانے ''تمر'' میں چھوٹے قد کا شہباز بڑی بڑی مونچھیں اور بڑے بڑے ارادے رکھتا ہے۔ اُس کی محبت کا رنگ ظالمانہ ہے جب کہ ''بے نام چہرے'' میں عام سی محبت کی، لیکن مختلف سے خاص انداز میں کہی، دلچسپ کہانی ہے۔ مجموعے ''نیلا پتھر'' کے مقبول افسانے ''عالاں'' میں اس امر کا اظہار ہے کہ امیر اور اونچے گھرانے والے غریب اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کو محبت کرتے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عالاں بہادر ہے۔ مجبوری اور بے بسی کا جرأت سے اور غریبی و مفلسی کا اَن تھک محنت سے مقابلہ کر رہی ہے۔ بہت خوددار اور مضبوط لڑکی ہے اور اتنا حوصلہ بھی رکھتی ہے کہ اظہارِ محبت بھی کر دے۔ ''کوہ پیما'' کا بے حد متاثر کن خوب صورت افسانہ ''چرواہا'' بتاتا ہے کہ محبت قربانی مانگتی ہے اور محبت قربانی دے بھی سکتی ہے۔

محبت پر اس تیرتی ہوئی نظر کے بعد ندیم کے افسانوں میں سماجی، معاشی، سیاسی مسائل کے سلسلے میں غربت، جہالت، عدم مساوات، بے انصافی، ظلم اور ہر طرح کے استحصال کے موضوعات کو جانچتے ہیں۔ فنی پہلوؤں پر مضمون کے آخر میں بات کریں گے۔ ''چوری'' کا منگو چور تو نہیں ہے مگر غریب ضرور ہے اس لیے اُس پر جھوٹا الزام لگا دیا گیا۔ بے گناہی ثابت ہو جانے کے باوجود اُس سے چھینا ہوا مزدوری کا سکہ تک تھانے دار نے واپس نہیں کیا۔ ''سونے کا ہار'' میں غریب باپ نے اپنی پیاری بیٹی کو جہیز میں سونے کا ہار دینے کے لیے سخت مزدوری کی لیکن عین بارات کے سامنے ظالم ذیلدار نے اُس خالص سونے کے ہار کو نقلی قرار دے دیا۔ یہ ایک معصوم سا افسانہ ہے۔ ''شعلہ نیم خوردہ'' میں ایک گاؤں کا سادہ دل غریب نوجوان اور دوسرے گاؤں کی سادہ دل غریب لڑکی اتفاقیہ راہ میں ملے۔ دونوں اپنے گھر والوں کی بڑی مشکل سے حاصل کی گئی چیزیں دور دیہاتوں میں مقیم اپنی اپنی نانیوں کو پہنچانے نکلے تھے لیکن دونوں کو راستے ہی میں ظالم افسروں نے لُوٹ لیا اور وہ خالی ہاتھ رہ گئے۔ حسین میٹھے منظر میں کڑواہٹ گھُل گئی۔ ''رئیس خانہ'' ندیم کے شان دار شاہکار افسانوں میں سے ایک ہے۔ وادی کے خوب صورت مناظر میں فضلو، مریاں اور اُن کے بچے پر مشتمل چھوٹی سی غریب مگر خوش باش فیملی کا ایک خودغرض امیر شہری نے بڑی مکاری سے استحصال کیا اور وہ خواہشوں کی معصومیت بھی لُٹا بیٹھے۔ ایک اور شاہکار افسانہ ''الحمد اللہ'' ہے۔ گاؤں کے نوجوان، حسین اور پروقار مولوی نے گرہستی تو آباد کر لی۔ شرافت سے زندگی گزارنے لگے لیکن اوپر تلے کئی بچوں کی پیدائش اور بدلتے زمانے میں لوگوں کی قدیم روایات سے عدم دل چسپی نے اُن کی معاشی حالت دگرگوں کر دی۔ آخر میں نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اپنے محسن چوہدری فتح داد کے انتقال کی خبر کو خوش خبری جانا کہ اب شاید اُنھیں رواج کے مطابق کچھ رقم مل جائے۔ قاری حیران تو رہ جاتا ہے لیکن مولوی ابوالبرکات کے آنسو اُس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اور حالات کی سنگینی کا احساس اُبھار دیتے ہیں۔ ندیم کی انقلابی آرزومندی کا مقصد بھی یہی تھا کہ احساس ہوگا تو سوچا جائے گا اور سوچ سے مسائل حل ہوں گے۔ اور یوں ظلم و ناانصافی کے بجائے انصاف ہوگا، سُکھ ہوں گے۔ ندیم کے نزدیک سُکھوں پر ہر انسان کا حق ہے اور یہ بھی کہ سُکھ سب میں برابر تقسیم ہونا چاہئیں۔ ''کنجری'' افسانے کی غریب، بن ماں کی بچی کمالاں اچھی تربیت تو حاصل کر لیتی ہے لیکن نوعمری میں اپنے خودغرض قریبی عزیزوں کے حوالے کر دی جاتی ہے جو اُسے اپنے مذموم ارادوں کے جال میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی معصومیت اور نیک نیتی کی وجہ سے بچتی تو چلی جاتی ہے لیکن آخر دادی اور والد کی بیماری اُسے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اختتام ایسا

ہے کہ قاری کا جی چاہتا ہے کہ اس لڑکی کو کہیں پناہ مل جاتی۔ طویل اور خوب صورت افسانہ ''بیٹے بیٹیاں'' بہت معنی خیز اور گہرا افسانہ ہے۔ گاؤں میں رائج رواج کے ہاتھوں اپنے بچوں کے رشتے طے کرنے کے لیے پریشان ہادی کمہار کو اپنی محبوب بیوی شرفی کی قربانی دینا پڑ جاتی ہے۔ دو عمدہ افسانوں ''جوتا'' اور ''بین'' کے مرکزی کردار ظلم و استحصال کا شکار ہونے پر خاموش رہنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں شدید مزاحمت کرتے ہیں۔ کرموں کو تو سلیقے سے بدلہ لینے کا موقع مل جاتا ہے لیکن خوب صورت اور معصوم رانو اپنے والدین اور گاؤں والوں کی توہم پرستی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پاتی۔ ماں بین کرتی رہ جاتی ہے ''چھین'' اور ''عاجز بندہ'' کے شمشاد علی اور میاں حنیف دیہی اخلاقیات کی رسمیت اور دیہی کم علم معاشرت کی دھند میں بھی حسن و خیر، نیکی، اچھائی اور امید کی روشنی ہیں۔ دونوں کو رحمان، رحیم خالق پر بہت بھروسہ ہے۔ ان خوب صورت پر اثر افسانوں میں بلیغ ایمائیت ہے۔

ان افسانوں میں ندیم کی انفرادیت اعلیٰ فن کارانہ جرأت، صداقت نگاری، حقیقت شناسی، سادہ، شائستہ اندازِ بیان اور فنِ افسانہ نگاری کی بہترین مہارت کے ذریعے نمایاں ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر طاہرہ اقبال ''تمام سماجی حقیقت نگاری اور فلسفۂ حیات اک نظامِ جمال میں ڈھلتا چلا جاتا ہے جو قاری کو جمالیاتی انبساط دیتا ہے۔ اور ''ندیم کے منفرد تجربات اپنی مٹی، تہذیب، روایت، تجربے اور جڑوں سے جُڑے ہوئے ہیں۔ ماضی کی روایت، حال کے تقاضوں اور مستقبل کے امکانات سے مزین ہیں۔''(۱۱)

جب کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے میں:

> ''احمد ندیم قاسمی اپنے افسانوں میں آدرش یا مقصد کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں لیکن ایسی حسن کاری کے ساتھ کہ آدرش، اُن کے فن کو مجروح کرنے کے بجائے زیادہ جاندار بنا دیتا ہے۔ ان کا ذہن اور قلم پوری طرح مشرقی تہذیب کا تربیت یافتہ ہے۔۔۔۔ موضوعات کی رنگا رنگی بھی ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے اور کائنات کی بوقلمونی کو ذات کے حوالے سے دیکھنے اور دکھانے پر بھی انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔''(۱۲)

ندیم کے افسانوں کا ایک اہم موضوع جنگ اور امن بھی ہے۔ وہ اہم تحریکوں کو بھی فن کارانہ انداز میں جاندار نمائندگی دیتے ہیں۔ جنگِ عظیم کے اثرات کے موضوع پر لکھے گئے ندیم کے بہترین افسانے اور ان کے کردار مقبول ہیں۔ مثلاً ''ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد'' کے شہباز، شمشیر، دلیر اور شاداں، ''السلام علیکم''

کے امیر خان اور اس کی بیوی، ”سپاہی بیٹا“ کی غم زدہ نیم دیوانی ماں، ”مامتا“ کا پنجاب کا قیدی جوان اور چین کی ایک بزرگ ماں کی مامتا“، ”بابا نور“ کا پروقار بزرگ جو بیٹے کے فوت ہو جانے کی خبر کے بعد بھی اس کی چھٹی کا برسوں سے انتظار کر رہا ہے۔ ”ہیرا“ کا وریام جنگی دہشت کی وجہ سے نفسیاتی مسائل میں گھر گیا، بیوی بچے کا پیار اور ہمدردی بھی اُس کے کام نہیں آئے۔ ”بھری دنیا میں“ بھی جنگی حوالے سے علامتی افسانہ ہے۔ تحریکِ خلافت پر ”سرخ ٹوپی“ تحریکِ آزادی پر ”ارتقاء“ کے بوڑھے بڑھیا اور بیٹا چاند میاں اور ”اس رستے پر“ کے باہمت نوجوانوں کا گروہ اور فسادات کے اثرات پر ”نیا فرہاد“، ”میں انسان ہوں“ اور ”کفن دفن“۔ ہجرت کے اثرات پر چونکا دینے والا افسانہ ”تسکین“ اور ”پرکشش افسانہ“ جب بادل اُمڈے ”تقسیم کے موضوع پر بے حد مقبول یادگار اور نفیس افسانہ ”پرمیشر سنگھ“۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ پر ”کپاس کا پھول“ اور ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں دوسری ہجرت پر ”اندمال“۔ ان افسانوں میں انسانیت اور وطنیت کے پہلو عالم گیریت اور آفاقیت لیے ہوئے ہیں۔ یہاں ذکر ہو جائے ایک اور بہت خوب صورت افسانے ”کہانی لکھی جا رہی ہے“ کا۔ یہ کسان تحریک اور ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ندیم صدی سے پہلے اردو ادب، تحریک علی گڑھ کی عقلیت پسندی، سرسید احمد خان اور رفقاء کی اصلاحی تحریک، اقبال کی روح و وجدان کے تعاون سے عمل کی ترجیح و تلقین، رومانویت پسندوں کی پھیلائی رنگین دُھند اور پھر انقلابیوں کی گھن گرج سے بھرپور رہا۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحثوں نے ماحول گرما دیا۔ ندیم نے دورانِ ادبی تربیت ان سب کے اثرات بھی لیے اور پھر اپنی سوچ اپنے احساس اور اپنے تجزیے تخمینے سے کام لے کر کلاسیکیت، رومانویت اور حقیقت پسندی کی اصلیت کے امتزاج سے روشن خیالی کا جرأت آموز صداقت پسندی کا اپنا رنگِ خاص تشکیل دے دیا۔ وہ اپنے اسی رجحان اور اپنے دین کی تعلیمات سے اُنس اور اپنے مطالعے مشاہدے کی بنا پر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو گئے اس تحریک کے اردو ادب پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اقبال اور پریم چند کے آخری دور کے فن پاروں نے بھی اس تحریک کے لیے زمین ہموار کر دی۔ ۱۹۳۶ء سے اس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ادیب و شاعر و فن کار اور دانش ور خاصی بڑی تعداد میں اس سے متاثر ہوئے۔ ان لوگوں نے معاشی و معاشرتی، مذہبی و سیاسی استحصال، عدم مساوات، ناانصافی اور سماجی اوہام پرستی سے بغاوت کی۔ اس سے وابستہ حقیقی ادیبوں نے اردو ادب کو زندگی سے بھرپور بہت سی اچھی اور یادگار تخلیقات کا سرمایہ دیا۔ ایسے ہی ادیبوں نے ادب کو پراپیگنڈے

اور اشتہار بنا لینے سے اجتناب برتا اور فن کو فن ہی رہنے دیا۔ ندیم بھی ان سمجھ دار، نیک نیت اور اچھے فن کاروں میں شامل ہیں جنھوں نے اس تحریک کے نظریات کو غور وخوض کے بعد ہی دل سے اپنایا اور اپنے عزم وعمل سے اتنے زیادہ مخلص تھے کہ مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے اعلیٰ فن پاروں (شعروافسانہ) کے ذریعے مدوجزرِ سیاست کو بھی افسانوی انداز میں پیش کیا مثلاً ''ووٹ'' اور ''جلسہ'' نامی افسانوں میں۔ اس مضمون کے لیے ندیم کے افسانوں کا نئے سرے سے مطالعہ، تجزیہ اور انتخاب کرتے ہوئے مجھے بیشتر فن پاروں میں اُن کے فنی وفکری نظریات کا اور اُن کے انسان اور انسانیت سے عشق کا خوب صورت عکس نظر تو آیا لیکن یہ ندیم کے فنی کمال اور ان کی افسانہ نگاری کی مہارت میں اتنا گھلے ملے تھے کہ الگ سے نکل آنے کے بجائے شبنم کے قطروں کی طرح اور سورج کی کرنوں کی طرح شعور واحساس میں نفوذ کرتے گئے۔ بس تحریکِ آزادی کا واضح نمائندہ افسانہ ''ارتقاء'' اور دوسرا یہ افسانہ ''کہانی لکھی جارہی ہے'' ایسے چُن پائی، جن کی نشان دہی میں واضح طور پر اس طرح کر سکی کہ یہ ندیم کے آدرش اور خوابوں کے نمائندہ ہیں جب کہ یہ آخرالذکر کہانی کسان تحریک اور ترقی پسند تحریک کے منشوروں سے متاثر ہے لیکن یقین مانیے کہ یہ حیران کن حد تک خوب صورت اور مکمل افسانہ ہے۔ یہ سبھی فنی تقاضے بخوبی پورے کر رہا ہے۔ ''کہانی لکھی جارہی ہے'' میں دلچسپی اور تجسس کسی لمحے کم نہیں ہوتے۔ اس کے چاروں مرکزی کردار، مفلس مزارع میاں بیوی ان کا ننھا بیٹا چراغ اور ایک کہانی کار روشن خیال مسافر، زندگی سے بھرپور کردار ہیں۔ اس لیے اچھے دنوں کی امید سے جُڑے ہیں۔ کاشت کار اور اس کی بیوی فاطمہ بہت بہادر اور غیرت مند ہیں اور نیکی اور خیر کی علامت اچھے انسان ہیں جب کہ کہانی کار مسافر پوری فن کارانہ برادری کی نمائندگی کر رہا ہے۔ فاطمہ عورت ہو کر بھی کھرا سچ بول تو دیتی ہے لیکن وہ خوش مزاج بھی بہت ہے۔ جلدی صورتِ حال کو سمجھ بھی لیتی ہے اور سنبھال بھی دیتی ہے۔

اسی سے مجھے یاد آیا کہ غیرت مندی، خودداری اور عزتِ نفس ندیم کا خاص موضوع ہے۔ اندھیرے میں کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی کردار کا روشن ستارا جھلملانے لگتا ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال افسانہ ''وحشی'' ہے۔ اس کی اَن پڑھ بوڑھی کھیت مزدور کسان عورت کی خودداری اور عزتِ نفس لاجواب اور مثالی ہے۔ کہانی کی ٹریٹمنٹ اور افسانے کی پیش کش بہت عمدہ اور متاثر کن ہے۔ جب کہ ''لارنس آف تھلیبیا'' کی رنگی بھی ہمت اور موقع بھر اپنی بے عزتی کا بدلہ مغرور چھوٹے چوہدری سے لے کر رہتی ہے۔ غیرت مندی صرف دیہات تک محدود نہیں شہروں میں بھی جہاں سیٹھ، راؤ شکور خان اور راجہ عرفان اللہ کی مکاری اور ہوشیاری کے

درمیان ’’اخبار نویس‘‘ کے عباس، ’’سیکرٹری‘‘ کے ابراہیم اور ’’مشورہ‘‘ کے ندیم جیسے ایمان دار غیور اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں۔ ندیم نے جہاں حسن و عشق کا موضوع بڑی نفاست سے نبھایا وہیں جنس کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیا۔ البتہ سلیقہ یہاں بھی ہے۔ اسی طرح شہروں میں بگڑتے نظام، سسٹم کی خرابیوں، ٹوٹتی اقدار، مٹتی تہذیب اور بدلتے رویوں کے سلگتے موضوع بھی ہیں۔ البتہ اچھائی اور بہتری کی اُمید ہر جگہ باقی ہے۔ مابعد جدیدیت سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ندیم کے ایسے افسانے قابلِ غور ہیں۔

شہری زندگی اور میٹروپولیٹن کلچر کی نمائندگی کرتے افسانوں میں ’’استعفا‘‘ کی غیر شادی شدہ استانی کی نفسیات کو مختلف زاویے سے لکھا گیا ہے۔ ندیم نے دیہی ماحول کی معصومیت، سادگی اور خلوص کے ساتھ ساتھ شہری فضاؤں کی ذہانت، مکاری اور خود غرضی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ جس سے دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یہی فرق ’’ایک رات چوپال پر‘‘ میں بہت دل چسپ انداز میں بیان ہوا ہے۔ ’’مہنگائی الاؤنس‘‘ انوکھا افسانہ ہے۔ ایک ہندو فیملی کا ذکر ہے۔ کاروبار ہی کاروبار چھایا ہے۔ اخلاقیات و تعلقات میں بھی لین دین اور کاروباری سوچ داخل ہو گئی ہے۔ ’’نمونہ‘‘ میں نچلے طبقے کی ایک اینگلو انڈین کرسچین فیملی کی آرزوئیں اور نچلے طبقے والوں کی سی ہیں تو کیا ہرج ہے؟ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ ’’سناٹا‘‘ ایک طویل اور متاثر کن افسانہ ہے۔ اس میں تو جیسے پورا شہر آباد ہے۔ جب کہ ’’مخبر‘‘ بتا رہا ہے کہ شہروں میں بھی غربت اپنا زہر پھیلانے سے باز نہیں آتی۔ چرسی خادو غربت اور ناکامی کے ہاتھوں جتنا بھی مجبور ہو جائے اس کی انسانیت نہیں مرتی۔ یہ افسانہ فنی پختگی کا بھی کامیاب نمائندہ ہے۔ ’’دارورسن‘‘ کے نتھو کو نہ چاہتے ہوئے بھی جلاد بننا پڑا۔ پر وہ ہر پھانسی پانے والے کے پاس گلاب کا پھول رکھ کر معافی مانگتا رہا لیکن بیٹے کی لاش کے پاس پھول نہ رکھ سکا۔ ’’کفن دفن‘‘ بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ میاں سیف الحق اپنے بے گور و کفن بیٹے کی موت کی یاد میں غفورے کی بیوی کلی کو جو بچے کو جنم دے کر مر گئی تھی کفن دیتے وارشان دار جنازہ نکالتے ہیں لیکن غفورے کی غیرت اور محبت تڑپتی رہ جاتی ہے اور وہ ایک دن قرض اتارنے آ جاتا ہے۔ ’’گھر سے گھر تک‘‘ ایک مقبول افسانہ ہے۔ شہر کے دو نچلے متوسط طبقے اونچائی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بالآخر ایک دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں۔ ’’سفارش‘‘ اور ’’پہاڑوں کی برف‘‘ بھی شہری سماج کے نمائندہ بہت عمدہ افسانے ہیں۔ اسی طرح ’’کھمبا‘‘ میں، سکوت و صدا اور ’’احسان‘‘ شہری نفسیات کے کئی سلگتے پہلو دکھا رہے ہیں۔

اسی طرح شہری سماج، بدلتی تہذیب اور امرا و اہلِ اقتدار کے مصنوعی طرزِ زندگی کو اور منافقت میں مبتلا

اپنے ہی میں مست شہریوں کو بھی ندیم نے کئی متاثر کن افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ مثلاً ‘‘ہذا من فضلِ ربی’’، ‘‘بھرم’’، ‘‘بندگی بے چارگی’’، ‘‘فیشن’’، ‘‘پاگل’’، ‘‘سفید گھوڑا’’، ‘‘عورت صاحب’’، ‘‘بارڑ’’ اور ‘‘مجبور’’ وغیرہ زندہ رہنے والے افسانے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ندیم چوپال اور ڈرائنگ روم کا فرق بہت اچھی طرح دکھاتے ہیں۔ ان افسانوں میں شہری طرز حیات کی خامیاں اور کمیاں فن کارانہ انداز میں سلیقے سے نمایاں کر کے افسانہ نگار ہمارے دلوں میں ہُوک جگا دیتا ہے۔ ہم یہ سوچنے اور غور کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں کہ انسانیت کہیں کھو ہی نہ جائے۔

آج دیہات ہوں یا شہر دونوں جنریشن گیپ کی دہائی دے رہے ہیں۔ یہ فاصلہ چاہے، دیہی زندگی کی نفسیات کے نمائندہ افسانے ‘‘فالتو’’ کے ساس سسر اور تنک چڑھی نخریلی بہو خاتون کے درمیان ہو، یا ‘‘ست بھرائی’’ کے انتہائی لاڈ پیار سے بیٹی کو پالنے والے عبداللہ اور نیکاں اور ان کی بیٹی ست بھرائی کے درمیان ہو کہ اُس کی ہر بات کو ہمیشہ مان لینے والے والدین اس کی زندگی کے نہایت اہم موڑ پر اس کے جیون ساتھی کا فیصلہ اُس کو بتائے بغیر اور اس سے مشورہ کیے بغیر خود ہی کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ اُن کے لیے بہت تکلیف دہ نکلتا ہے۔ ‘‘کپاس کا پھول’’ کا ایک بہت نفیس اور بہت کچھ سمجھاتا، بہت سے سوال جگاتا، ان کے جواب دیتا افسانہ ہے، ‘‘آسیب’’۔ جس میں سید امجد حسین کا پسندیدہ برگد کا درخت اُن کے بیٹے سقراط اور بہو نگینہ کی نفرت کی وجہ سے باپ بیٹے میں دوریوں کا باعث بن گیا۔ ندیم نے اسی طرح شہری نفسیات کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں کہ شہروں میں آتی تیز رفتار تبدیلی زمانے کے بدلنے کی خبر دے رہی ہے۔ ‘‘ہم سفر’’ اور ‘‘بہزاد آرٹ گیلری میں’’ بھی کچھ ایسا ہی زمانہ دکھایا گیا ہے۔

ندیم کے افسانوں کا ایک اور بہت ہی خوب صورت، نفیس اور پُر کشش پہلو ہے۔ بچوں کی معصومیت، ان کی نفسیات اور ان کی خوشیاں اور غم۔ مستقبل کو سنورا دیکھنے کے خواہش مند ندیم نے افسانوں میں اعلیٰ معیار کی پُر تاثیر اطفال کردار نگاری کی ہے۔ یہ ننھے کردار ہر انسان کا دل موہ لیتے ہیں۔ وہ ‘‘ننھا مانجھی’’ کا ملاح بچہ ہو یا ‘‘مسافر’’ کا معصوم چرواہا ہو۔ ایک اور بہادر چرواہا ‘‘کوہ پیما’’ کا نور الٰہی بھی ہے۔ ‘‘بڈھا’’ کی ننھی ولیتو ‘‘ننھے نے سلیٹ خریدی’’ کا ننھا عزیز، ‘‘پاؤں کا کانٹا’’ کا سوتیلی ماں کے ہتھے چڑھے ننھا کریم، ‘‘گونج’’ میں عُمران کا سکول نہ جانے کا تمنائی چھوٹا بھائی شاہو، ‘‘کہانی لکھی جا رہی ہے’’ کا تتلیوں کا شوقین چھوٹا بچہ چراغ ‘‘خربوزے’’ کا یتیم ننھا، ‘‘ارتقاء’’ کا چاند میاں، ‘‘اکیلی’’ میں خانی کا منا سا بھائی جمو، ‘‘سلطان’’ کا بے حد

غریب بھکاری بچہ سلطان ''چور'' کا بے گناہ شریف النفس اور اچھے دل والا رحمان، ''نیلا پتھر'' کے بھائی اکبر اور اطہر، ''چاچا چوکھا رام'' کے بھائی امجد اور نواز اور لاسٹ بٹ ناٹ لیسٹ ''پرمیشر سنگھ'' کا اپنی مسلمان ماں کا متلاشی پانچ سالہ ذہین اختر۔ کیا آپ انھیں بھلا سکتے ہیں؟ یہ وہ ہیں جو آپ کے اندر بسے بچے کے دوست بن جاتے ہیں۔ جو آپ کو اداس بھی کر دیتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں اور دلوں میں آنسوؤں کے جھلمل موتی بھی بھر دیتے ہیں۔ انسانی رشتے ناتے ندیم کے نزدیک بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ماں کی مامتا کے لاجواب اور اَن مول جذبات کے عکاس تین شان دار افسانے دیکھیے ''ماں'' میں ماں گلابو اپنے بیمار بچے کی محبت میں اپنے محبوب بیمار شوہر ولی محمد کو ہی بھول گئی۔ ''مامتا'' کی بزرگ چینی عورت ایک غیر، اجنبی، مجبور، جنگی قیدی نوجوان کی قمیص کا ٹوٹا ہوا بٹن ٹانکنے آ گئی اور ظالم حملہ آوروں سے بھی نہیں ڈری۔ دراصل اُسے اس نوجوان کی بُری حالت کی وجہ سے اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا۔ ''افسانہ ''مائیں'' کی بیگم رابعہ اور بیگم خواجہ لڑاکا عورتیں ہیں۔ پورا محلّہ اُن کی لڑائی اور نوک جھونک کا تماش بین رہتا ہے لیکن یہی مائیں ایک دوسرے کے بچوں کے لیے ابھرتے مامتا کے جذبات کی وجہ سے آخر لڑائی جھگڑے کی قربانی دے دیتی ہیں۔ اسی مامتا کے موضوع پر ایک انوکھے افسانے ''امانت'' میں ایک کامی ماں گامی تمام عمر اپنے بیٹے سے اپنا صندوق چھپاتی پھرتی ہے لیکن آخر میں معزز خاتون بی بی گل سے کہتی ہے کہ یہ صندوق تو میں اپنے بیٹے کو جا کر دوں گی۔

جہاں تک افسانہ نگاری میں احمد ندیم قاسمی کی اعلیٰ معیاری مہارت کی بات ہے تو یہ تفصیل کی متقاضی ہے لیکن یہاں مختصراً ذکر ہو جائے۔ ندیم کے افسانوں کے پلاٹ گُتھے ہوئے اور مضبوط ہیں۔ پیش کش کے انداز میں تجربات بھی کیے ہیں۔ طرزِ تحریر سادہ رواں ہے جو حقیقی انداز کو ترجیح دیتی ہے لیکن خوبصورتی، کشش، دلچسپی اور تازگی کو ہمیشہ ساتھ لیے رہتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہوں یا معنی خیز گفتگو کے سلسلے، ندیم اپنا فلسفہ، اپنا جذبہ، اپنی سوچ اور اپنا مقصد متاثر کن ایمائی انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ کردار نگاری میں اپنے عمیق مشاہدے، عمدہ قیافہ شناسی اور باشعور صداقت پسندی کی وجہ سے کمال کر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں یہی کہہ دینا کافی ہے کہ ندیم نے اردو افسانے کو کئی ناقابلِ فراموش کردار دیے ہیں۔ نوجوان گھبرو اور دوشیزائیں ہوں یا بوڑھے اور بزرگ، مرد ہوں یا خواتین اور چاہے وہ کم سن بچے بچیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ کردار نگاری کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مقصدیت کے حامی ہونے کے باوجود وہ مثالی کرداروں کے بجائے حقیقی انسانی کرداروں کو منتخب کرتے ہیں۔ مکالمے ہوں یا بحث مباحثہ، کرداروں کی شخصیت، ان کے جذبات و احساسات،

ان کی سوچیں ہوں یا اُن کی حرکات وسکنات ہوں، ندیم کا گہرا مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اور زرخیز تخیل ان کا خوب ساتھ دیتے ہیں۔ آپ اُن کرداروں کو اپنے آس پاس چلتا پھرتا، بولتا سوچتا محسوس کرتے ہیں۔ ان سب کے پیچھے ندیم کا تراشا ہوا پس منظر بھی پُر معنی ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر فتح محمد ملک: ''بلاشبہ ندیم کو ماحول اور فضا کی تعمیر کا حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے۔'' (۱۴) وہ زمان ومکان کا بھی بہت سمجھداری اور بیداریِ ذہن کے ساتھ خیال رکھتے ہیں۔ انسانی رویوں اور نفسیات کی سچائیوں اور گہرائیوں سے آگاہ ہیں اس لیے یہ پُر معنی، پُر کشش اور مکمل مرقعے بن جاتے ہیں جو قاری کی یادوں میں بس جاتے ہیں جب کہ پُراسرار فضا کے حامل افسانے ''گڑیا''، ''ماسی گُل بانو'' اور ''چڑیل'' بھی نہایت انوکھے اور حیرت انگیز افسانے ہیں۔

منظر نگاری کا حسن ہو یا اس منظر میں موجود مرد و زن کا جمال، ندیم کی باثروت حسِ جمالیات اپنے خوب رنگ جماتی ہے۔ وہ دیہی کوہستانی، میدانی، ریگستانی، صحرائی، ساحلی اور شہری پس منظر کو خوبصورتی سے تخلیق بھی کرتے ہیں اور مصور بھی کر لیتے ہیں۔ اُن میں رہتے بستے اَن پڑھ یا پڑھے لکھے غریب، متوسط، امیر اور بااختیار، ان چاروں طبقوں کو صداقت پسندی کے تحت بھرپور نمائندگی دیتے ہیں۔ پہلے منظر نگاری کے حُسن کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ کیجیے:

''جب رات کا اندھیرا اپنے پوربی آنچل کو پَو کے چشمے میں بھگو لیتا ہے اور کائنات کی نیندوں میں انگڑائیاں کنمنانے لگتیں تو بابا عمرو آنکھیں کھولتا اور دیمک خوردہ دروازے کے رخنوں میں دھندلے اُجالوں کو مسکراتا دیکھتا تو آدھے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کے کلمہ پڑھتا۔'' (''بڈھا۔ سیلاب وگرداب'')

''منہ اندھیرے اُس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اُترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اُس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں کبھی نہیں دیکھی تھی ---- چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے کو رینگ رہے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہوئی۔ اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آئی ہوئی ان گنت پگ ڈنڈیاں اُن کے قریب آ کر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑیوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ اُن کے گرد درختوں کا ایک دائرہ

تھا۔‘‘(’’مامتا‘‘۔’’سناٹا‘‘)

’’۔۔۔۔بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی، نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندیوں کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اُتر آتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی، اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اُٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔‘‘(’’رئیس خانہ‘‘)

ان مناظر میں خودرو پھولوں کے رنگ بھی ہیں اور پرندوں کی چہکاریں بھی شامل ہیں۔ جمالِ انسان کے بیان میں قدرت کے اُس حسین شاہکار جس کی وجہ سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہیں، کی کئی افسانوں میں حسین عکاسی بھی متاثر کن ہے۔ مثلاً افسانہ ’’گنڈاسا‘‘ کے مولا بخش عرف مولے نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی لڑکی:

’’راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مُڑی ہوئی ہیں جیسے اُٹھیں گی تو بھنوؤں کو مَس کر لیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سُوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اُس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں اُچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اُڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لَس لَس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور اُن بُندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح اُلجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی رہنے دے یا اُسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے۔‘‘

یہ تو ایک دوشیزہ کے حسن کا ذکر تھا جب کہ ایک گبھرو اور ایک مرد بھی صحت و طاقت کے جمال کے ساتھ ساتھ حسین پیکر اور پُر کشش وجود کا مالک ہو سکتا ہے۔

’’تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوب صورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوب صورت ہے پر اب اس کی خوب صورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اَٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیروں، بادامی آنکھیں ہیں اور

اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے۔ پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا، تو وہ بالکل مُور تھا۔ تمھارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے۔ اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھنچے رہے جیسے کُھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ (’’بین‘‘۔ ’’کوہ پیما‘‘)

’’پُجھن‘‘ کے شمشاد علی سے یوں متعارف کرواتے ہیں:

’’وہ مبالغے کی حد تک وجیہہ نوجوان تھا۔ جدھر سے گزرتا تھا اُسے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ نئی نئی داڑھی مونچھوں کے بالوں میں کہیں کہیں سنہرے بال کوندے کی طرح لپک لپک جاتے تھے۔ آنکھوں کی پُتلیوں کا رنگ گہرا بادامی تھا مگر کبھی کبھی وہ نیلی نیلی سی لگتی تھیں۔‘‘

جب کہ کردار اور شخصیت کا حسن بھی ندیم کو بہت عزیز ہے۔ اب حسین مکالمہ نگاری کی ذیل میں کچھ مکالمے۔ ’’مسافر‘‘ کا کم سن چرواہا دینوا اپنا تعارف بچپن کی معصومیت کے ساتھ یوں کرواتا ہے:

’’اس پہاڑی سے پرے میرا گاؤں ہے۔ صاف ستھرے تالاب ہیں۔ تین دکانیں ہیں۔ نمبردار کے پاس کالے کالے توؤں والا باجا ہے۔ نورآباد کا نام تم نے کبھی نہیں سنا؟ اتنا مشہور ہے اور تم نہیں جانتے؟ ---- نیم کے درخت والا گھر نمبردار کا ہے! ---- اور آج اس کی لڑکی کی شادی ہوگی۔ خوب رونق ہوگی وہاں۔ میں تو اماں سے کہہ آیا تھا حلوہ خود ہی نہ اُڑا جانا، میرا حصہ رکھ چھوڑنا۔‘‘

’’سفارش‘‘ کے ایک غریب اَن پڑھ مگر محنتی فیکا کی باتیں اُس وقت جب اُس کا احساس پُرآزمائش حالت میں گھر جائے مفکرانہ فلسفیانہ رنگ میں ڈھلنے لگتی ہیں۔

’’بابو جی، کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولہا بُجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتہ کوئی چنگاری سُلگ رہی ہو۔‘‘

’’ڈاکٹر جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ۔ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔‘‘

’’جب بادل اُمڈے‘‘ کا لالچی خود غرض جاگیردار ہجرت کر کے آنے والے کسان کو حکومت کی طرف سے دی جانے والی زمین کا حکم رد کر کے کہتا ہے: ’’اپنی سرکار اُٹھائے پھرتا ہے۔ سرکار تمھاری تو ہماری بھی ہے اور پھر سرکار کا کیا، خضر حیات کے زمانے میں ہم نے لیگیوں کے بیسیوں جھنڈے پھاڑے تو سرکار نے ہمیں ایک مربع زمین دے دی۔ اب لیگ کا راج ہے تو مربع اسی طرح ہمارے پاس رہا اور لیگی اپنے گھروں میں

پرانے جھنڈوں پر سے گرد جھاڑتے رہ گئے اور کھانڈ کا ڈپو بھی ہمیں مل گیا۔ سرکار جب بھی ہماری تھی اب بھی ہماری ہے۔ اٹھائے پھرتا ہے سرکار کو۔ جاؤ نہیں ملے گی یہ زمین۔''

''کہانی لکھی جارہی ہے'' کا ننھا چراغ تتلی نہ پکڑ سکنے پر رو دیا۔ غصے میں کہنے لگا:

''ایسی اچھی تتلی تھی، ایسے پیارے پیارے رنگ تھے۔ سؤر کی بچی ایسی تیز اُڑتی تھی۔ حرام زادی۔''

رحیم و کریم خالق و مالک جمال کا ذکر جمیل بھی مختلف انداز میں ہوا ہے مثلاً افسانہ ''بڈھا'' کے بابا عمرو کے بقول:

''صبح کی نماز پڑھ لو تو سمجھو اللہ کی نگری میں داخل ہو گئے۔ دوسری نمازوں کی توفیق ہو تو پڑھو۔ پر ہمیں تو اللہ کی نگری کا ایک کونہ چاہیے۔ جیسے یہاں رہے ویسے وہاں بھی کہیں سمٹے پڑے رہیں گے۔ بس صبح کی نماز قضا نہ ہو۔''

یا ''عاجز بندہ'' کا میاں حنیف خفا ہو کر اپنے رب سے شکوہ بھی کرتا ہے لیکن اُس کی نعمتوں پر نہایت عاجزی اور پیار سے شکر بھی ادا کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا گہرا عمیق مشاہدہ اور مضبوط بنیادوں پر اٹھتے افکار ہر جگہ ہر موقع پر اُن کے ساتھ ہیں اور اُن کے فن کو انوکھا منفرد نکھار دیتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ سوچ بھی حسین رنگ سجاتی ہے۔ مثلاً ''جب بادل اُمڈے'' کا مہاجر سوچتا ہے کہ:

''اگر حکومت اُسے ہرنام سنگھ کے کھیتوں کے بجائے صرف دہقان شیرے کی محبت اور شفقت اور رفاقت دے دیتی جب بھی وہ اس کا ممنون ہوتا۔ یہ سونے کی طرح چمکیلی اور مکھن کی طرح نرم دوستی، جس کا خمیر بہاروں اور ستاروں کے رنگ و نور کا مرکب ہے۔ رہتک سے لے کر واہگہ تک کی تمام بربادیاں، بے آبروئیاں اور بے دست و پائیاں جو اُس کے دماغ میں گہری خراشوں کی طرح ایک ابدی کسک کے ساتھ نمایاں تھیں، مٹنے لگیں۔''

''کونج'' کی حسین اونچے پربت پر رہنے والی عمراں بھی خواب بنتی ہے وہ چاہتی ہے کہ نیچے اندھیری گپھاؤں اور دور دُھند میں ڈوبے ہوئے پربتوں پر تھرکتی اور گاتی پھرے لیکن وہ تنہا نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ کوئی باتیں کرنے والا بھی ہو۔'' آخر وہ دیکھتی ہے کہ:

''بیگ عمراں کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور ڈھوک پر سے کسی ان دیکھی ان جانی پگ ڈنڈی پر چلنے لگتا ہے۔

اچانک پگ ڈنڈی پر نرم نرم سبزہ بچھ جاتا ہے۔ آس پاس عجیب عجیب جھاڑیوں میں عجیب عجیب پھول کھِل اُٹھتے ہیں۔ پھلاہیوں اور صنوبروں کی ٹہنیاں پتوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ پرندے چہچہاتے اور پھریریاں لیتے فضاؤں میں گیندوں کی طرح لڑھکنے لگتے ہیں۔ پگ ڈنڈی اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ بیگ کی انگلیاں تپ جاتی ہیں۔ عمراں کی انگلیاں بھینچ جاتی ہیں۔ دونوں مسکرا رہے ہیں۔ بیگ کے بال اس کے کانوں پر اُڑ رہے ہیں۔ عمراں کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر مخملی پگ ڈنڈی پر گھسٹتا آتا ہے اور بادلوں کی آڑ سے نکلتی ہوئی پیلی کرنوں میں اس کے بال سونے کے مہین تاروں کی طرح چمک اُٹھتے ہیں اور جب یہ بادل لہراتے ہیں تو یہ کرنیں ان پر قوس قزح سی چھڑک دیتی ہیں۔“

تخلیقی ادب میں صنفِ سخن کی صنعتیں خوب صورتی میں اضافے کا کام کرتی آئی ہیں۔ صنعتِ تضاد ہو یا استعارہ، وصف کا ذکر ہو یا تشبیہ سے کام لیا ہو یا پھر اشاریت، تہہ داری اور بلیغ ایمائیت، ندیم انھیں اچھے انداز میں اپناتے ہیں۔ ”کہانی لکھی جا رہی ہے“ کے معنی خیز استعارے ہوں، علامتیں ہوں یا ”پرمیشر سنگھ“ کا آغاز:

”اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کی جھاگ کی طرح اُٹھا اور بیٹھ گیا۔“

”وہ کچھ ایسا مُسلا اور نچڑا ہوا لگ رہا تھا جیسے رس نکالنے والے شکنجے میں سے کچلا ہوا گنا لٹک رہا ہو۔“ (”کفن دفن“)

جبکہ ندیم جہاں ضروری ہو وہاں تو مفصل لکھتے ہیں جب کہ زیادہ تر وہ تفصیل بتانے کے بجائے مختصر سے مکالمے یا منظر کے تھوڑے سے Glimps کے ذریعے پوری بات سمجھا دیتے ہیں۔ مثلاً ”السلام علیکم“ میں امیر خان اپنی بیوی کے ریشمی باریک دوپٹے کے پلو کی گرہ میں بندھے سکوں کی چھنن سے سب کچھ سمجھ جاتا ہے۔ ایسے علامتی افسانوں میں ”بھری دنیا میں“، ”افق“، ”راجے مہاراجے“، ”بہزاد“۔ ”آرٹ گیلری میں“ اور اس سلسلے کا نہایت اہم اور خوب صورت نمائندہ افسانہ ”ایک گیگ لباس آدمی“ بھی شامل ہے۔

اس مضمون کے آخر میں ڈاکٹر طاہرہ اقبال کے ان تاثرات سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ:

”احمد ندیم قاسمی نے عمر بھر میں جو کچھ لکھا اس سے کہیں بڑھ کر وقت، ریاضت، ادراک، ذہنی و ادبی اُفق کی کشادگی، اُن کے لکھے پر لکھنے کے لیے درکار ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے فن پر کچھ کہنا بھی اک عمر کی ریاضت

مانگتا ہے۔ ان کا ہر جملہ، ہر سطر ایک مضمون کی گنجائش چاہتا ہے۔ اُن کی لکھی ہر کہانی میں ایک اَن لکھی کتاب موجود ہے اور ہر کتاب کے اندر وہ جہانِ فن، جس کی سیاحی کے لیے نقدِ عمر کم پڑتی دکھائی دیتی ہے۔۔۔۔ قاسمی صاحب، اعتبار تھے نئے لکھنے والوں کا، انسانیت کا، ادب کا، فن کا۔ جویائے علم و فن اس شیش محل میں صدیوں محوِ سفر رہیں گے تو کہیں اس کے روزن وا کر پائیں گے۔''(۱۴)

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ ''احمد ندیم قاسمی، تخلیقی شخصیت'' ۔ نذرِ ندیم۔ سہ ماہی ''مونتاج'' لاہور: ۲۰۰۷ء ص: ۷۳، ۷۷

۲۔ اطہر رضوی۔ ''دریا سمندر سے جاملا'' نذرِ ندیم ''مونتاج'' لاہور: ۲۰۰۷ء، ص: ۲۴۹

۳۔ اسلوب احمد انصاری۔ ''احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ'' ۔ ''ندیم نامہ'' ۔ ملتان: ۱۹۷۶ء۔ ص ۲۱۷

۴۔ محمد حمید شاہد۔ ''احمد ندیم قاسمی کا افسانہ۔ تخلیقی بنیادیں'' ۔ خصوصی شمارہ ''ادبیات''، اسلام آباد۔ ۲۰۰۶ء۔ ص: ۱۹۲۔۱۹۳

۵۔ ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار۔ احمد ندیم قاسمی، تخلیقی جہتوں کے آسماں۔ خصوصی شمارہ ''ادبیات'' اسلام آباد۔ ۲۰۰۶ء۔ ص: ۲۰۰

۶۔ احمد ندیم قاسمی۔ ''حقیقت اور فنی حقیقت'' ۔ رسالہ ''نقوش'' لاہور۔ جون ۱۹۵۷ء

۷۔ کرشن چندر: دیباچہ۔ ندیم کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بگولے'' مکتبہ اردو، لاہور: ۱۹۴۱ء، ص: ۷

۸۔ احمد ندیم قاسمی: دیباچہ ''طلوع و غروب'' (تیسرا افسانوی مجموعہ) ۔ ''نیا ادارہ'' ۔ لاہور ۱۹۴۲ء، ص: ۷

۹۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال: ''احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات نگاری'' سہ ماہی ''معاصر'' لاہور۔ مارچ ۲۰۰۸ء، ص: ۲۴۷

۱۰۔ مُنّو بھائی: دیباچہ ''وادیٔ سُون سکیسر'' ۔ احمد غزالی۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۹۳ء۔ ص: ۲۰

۱۱۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال: ''لفظوں کا کوزہ گر'' ۔ نذرِ ندیم ''مونتاج'' لاہور ص ۲۸۲

۱۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' ۔ الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۰ء

۱۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ''اردو افسانہ اور افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام'' خصوصی شمارہ ''ادبیات'' اسلام آباد۔ دسمبر ۲۰۰۶ء۔ ص: ۵۲

۱۴۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال۔ ''تاثرات'' ۔ خصوصی شمارہ ''ادبیات'' اسلام آباد۔ دسمبر ۲۰۰۶ء۔ ص: ۱۷۸، ۱۸۰

☆☆☆☆

ڈاکٹر شاہین مفتی

نشانِ راہ

افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی کہانی اس کی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ فکشن کی تحریری تفاصیل شاعری کے رمز و ایما سے قطع نظر اپنے تحریر کنندہ کے خیالات سے ایک حقیقت پسندانہ آگاہی کی سزاوار ہوتی ہے، ندیم کا پہلا افسانہ ’بدنصیب بت تراش‘ ۱۹۳۲ء کے رسالہ ’’رومان‘‘ لاہور میں شائع ہوا اور اگر میں غلطی پر نہیں تو اس کے عہد کے شاعر رومان اختر شیرانی اور ان کے ہم پیالہ اس رسالے کی آبیاری کر رہے تھے۔ ہمارے ممدوح نے ۱۹۳۵ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی اے پاس کیا۔ اور وہ تازہ تازہ اپنی محبت کی واردات سے نبرد آزما تھا ’’دیہاتی لڑکی خوبصورت تھی، یتیم تھی اور غریب تھی۔ احمد شاہ پیر غلام نبی عرف نبی چن کا صاحبزادہ صاحبِ شرف تھا اور بے روزگار تھا چناں چہ ماں نے وقتی مصیبت اور جھگڑے کے خاتمے کے لیے منیر شامی کے سات سوال ہاتھ میں تھمائے کہ روزگار حاصل کرنے کی شرط بیٹے پر عائد کر دی۔ بیٹا اَنگہ کی پہاڑیوں سے اترا اور میدانوں میں گلِ آرزو تلاش کرنے لگا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب احمد شاہ بی اے نے ۳۷ـ۱۹۳۶ء تک ریفارمز افسانوں کے تراجم سے معاوضہ جمع کیا۔ اسی دوران اکاوڑہ میں ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر بھی کچھ دن کام کیا، تین سو روپے جمع ہو چکے تھے لیکن جب ہمارا افسانہ نگار گاؤں پہنچا لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ محبت کے چاند کو گہن لگ چکا تھا۔ واقعہ اس قدر شدید تھا کہ اضطراب کچھ عرصے کے لیے غیر محسوس دیوانگی میں تبدیل ہو گیا لڑکی بھی محبت میں یکتا تھی، شادی کے فوراً بعد بیمار ہوئی اور آخری سانس لینے سے پہلے ایک نظر اپنے چاہنے والے کو دیکھا اور ابدی نیند سو گئی۔

(صاحب از محمد طفیل، ص۷۲ـ۷۳)

بے معنویت زندگی اور وقت کی بے رحمی کے احساس کے ساتھ ساتھ ہمارا افسانہ نگار موت کی موجودگی سے بھی آگاہ ہو چکا تھا اس کے دامن میں محبت اور وعدے کی سچائی بھی تھی اور معیشت کے ظالمانہ جبر کا تجربہ بھی، یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے ابتداء میں ہی اسے ترقی پسند تحریک سے منضبط کرنے میں گہرا کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک وہ ایکسائز سب انسپکٹر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اور اپنے چچا سرپرست پیر حیدر شاہ

مرحوم کے احکامات کی تعمیل میں مشغول رہا اور وہ جو فیض نے کہا تھا ''عشق کے گہرے معاملات کی بدولت عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی، یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے، زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا، سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے۔ ندیم کے افسانوں کی مجموعی فضا پسماندہ علاقوں کے دبے ہوئے لوگ اور تشدد کرنے والوں کے ہی گرد گھومتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی طرح یہاں عقلی دانائی کو شعوری سطح پر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بل کہ کرداری مقابلہ بہت سی سطحوں پر افسانے میں ڈرامے کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ تھل خوشاب، کیمبل پور، بہاولپور، سرگودھا کے مرکزی راستوں سے کٹے ہوئے علاقوں میں زندگی کس طرح رینگ رینگ کر چلتی ہے، کھارے پانیوں کی سر زمینوں پر برسنے والی بارش کیا کرامت رکھتی ہے۔ اور ننگی، بے چہرہ، بے آب وگیارہ پہاڑیوں کے لوگ کس طرح اناج کے دانوں کو ترستے ہیں۔ ان کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے ان علاقوں کی بے رحم زندگی اور ظالمانہ روایات کا کشٹ کاٹا ہو، ندیم کا پہلا افسانوی مجموعہ چوپال ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس وقت ہمارے ممدوح کی عمر چوبیس برس تھی۔ وہ جمالیاتی انبساط، جمالیاتی المیے اور جمالیاتی استحصال کے کئی تماشے دیکھ چکا تھا۔ تحریک خلافت سے قرار داد پاکستان تک ہندوستان کے ایک مرکزی نگر کٹے ہوئے شہر لاہور میں انسان دوستی کی تلاش کرتا احمد ندیم قاسمی آنے والے طویل دنوں میں کبھی مایوسی کا شکار نہیں اور یہی اس کے فنی سفر کی استقامت کی بنیاد ہے اس نے لکھا:

غبارِ راہ سہی ہم نشانِ راہ بھی ہیں
جہاں گزیدہ بھی ہیں اور جہاں پناہ بھی ہیں
عوام دوست ہیں یعنی گنا گار ہیں ہم
مورخوں سے مگراس کے دادخواہ بھی ہیں
لبوں پہ گیت تو ہاتھوں میں ہے عنانِ حیات
کہ ہم تمدن و تہذیب کی سپاہ بھی ہیں
یہ انقلاب کی ہے اولیں جھلک کہ ندیم
ہماری کھوج میں شاہان کج کلاہ بھی ہیں

(ترقی پسند مصنفین)

۱۹۴۱ء میں اس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ بگولے شائع ہوا اور پھر جیسے کہانی کی لپک نے اس کا دامن

پکڑ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں طلوع و غروب، ۱۹۴۳ء میں گرداب، اسی برس سیلاب، ۱۹۴۴ء میں آنچل، ۱۹۴۶ء میں آبلے، ۱۹۴۸ء میں آس پاس، ۱۹۴۹ء میں در و دیوار، ۱۹۵۴ء میں سناٹا، ۱۹۵۵ء میں بازارِ حیات، ۱۹۵۹ء میں برگِ حنا، ۱۹۶۳ء میں گھر سے گھر تک، ۱۹۷۳ء میں کپاس کا پھول، ۱۹۸۰ء میں نیلا پتھر اور پھر رسالہ فنون میں شائع ہونے والے بعد کے افسانے، اس نے ٹھیک ہی لکھا تھا۔

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستہ غم ہو جاتے

اس طرح وحشی، چوپال، کوہ پیا، خربوزے، پرمیشر سنگھ، پاؤں کا کانٹا، زمین ہماری ہے، گنڈاسا، بے نام چہرے، پہاڑوں کی برف، لارنس آف تھیلیبیا، سفارش، گھر سے گھر تک، بارڈر سسٹم، نیا فرہاد، جب بادل امڈے، سرخ ٹوپی، ارتقاء، افق، کنگلے، چبھن، پیپل والا تالاب، ماسی گل بانو، کفارہ، غریب کا تحفہ، ادھورا گیت، شہرِ غبار، ہرجائی، رئیس خانہ، احسان، حق بجانب، چھاگل الغرض افسانوں کی ایک لمبی فہرست جو عصری، سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تناظر میں مصنف کا نقطۂ نظر ظاہر کرتی ہے۔

ندیم کی زندگی میں ادبی ارتقاء کا ایک دروازہ اس وقت کھلتا ہے۔ جب ادبی رسائل کی ادارت کے مواقع اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء ادبِ لطیف، ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء ماہانہ سویرا، ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۹ء روزنامہ امروز اور پھر ۱۹۶۳ء تا دمِ مرگ فنون۔

میرے باطن میں کوئی قافلہ ہے محوِ سفر
سانس لیتا ہوں تو آوازِ درا آتی ہے

ظہیر کاشمیری نے ایک جگہ لکھا تھا ”ندیم اور فیض اپنے اعلیٰ ادبی تجربوں اور دلکش ہیتوں کے باوجود درمیانہ طبقہ کے نیوراسس کا شکار ہیں۔“ فیض کی حد تک تو شاید اس معاملے میں ۵۰ فیصد سچائی موجود ہو لیکن ندیم کی زندگی کے اس شاعرانہ اور افسانوی موضوعات بہت حد تک نچلے مل کر بہت نچلے طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں مبالغہ آمیز رومانویت جنم لیتی، یہ اتنی سیدھی اور یک رخے پلاٹ کی کہانیاں ہیں کہ ابہام و تشویش کا گزر نہیں۔ اس کے کردار اتنے سچے اور عام لوگ ہیں کہ انھیں اپنی ظاہری حالت چھپانے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ ان افسانوں کی فضا اور کلام کسی غیر مرئی ماحول کے غماز نہیں اور گفتگو کرنے والے کردار لسانی چرب زبانی سے عاری ہیں۔

اس نے لکھا ہے ”دراصل آج میرا جو بھی نظریہ ہے وہ ایک دم میرے ذہن میں نہیں پھوٹ پڑا بل کہ میں نے اسے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں جدلیاتی انداز سے قبول کیا ہے۔“

انسان عظیم ہے خدایا“ کی نعرہ زنی میں پیرزادہ احمد شاہ کا یہی جدلیاتی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ وہ فکشن میں ٹالسٹائی سے متاثر ہوا اور فلسفے میں برٹرینڈ رسل سے کہ اس کے زمانہ طالب علمی میں اب برائے زندگی کے مباحث غیر منقسم ہندوستان میں اپنی جڑ پکڑ چکے تھے۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ اردو افسانہ نگاروں کی تین زندہ نسلوں کے ساتھ رہا، جن میں اپنے وقت اور اپنے نظریے کے بڑے نام بھی شامل تھے۔ ندیم ،فرائڈ ،لینن مارکس کے دونوں نظریاتی دھاروں کے بین بین چلا، اس کی بڑی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ نفسیاتی سطح پر اپنی ذات میں کوئی الجھا ہوا اور مشکل آدمی نہیں تھا۔ اس کی اخلاقی حدیں خاندانی شعوریت نے پہلے ہی مقرر کر دی تھیں اور اپنے شملے کی وضع داری کی حفاظت کے سوا اس کی انا پرست طبیعت کو کوئی دوسرا راستہ پسند نہیں تھا۔ اسے زندگی سے کسی شاہانہ جاہ و جلال اور تصور پرستانہ زندگی کی توقع بھی نہیں تھی۔ چناں چہ عملی اور تحریری طور پر اس کی ذہنی زندگی عام آدمی کے طرز حیات سے الگ نہ رہ سکی۔ افسانے کی دنیا میں ایک طرف نیاز فتح پوری کی عشق آسا افسانہ طرازی تھی تو دوسری جانب غلام عباس، حسن عسکری اور اسی قبیل کے دوسرے افسانہ نگار۔ کچھ اگلے برسوں میں اسی بساط پر انتظار حسین کا علامتی افسانہ اپنی تمثیلیت کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو کے معاشرتی اور تکنیکی افسانوں کی موجودگی میں بھی اس نے اپنی کہانی کی سادگی اور آسان مکالمہ نویسی سے ہاتھ کھینچنا پسند نہیں کیا بل کہ اس کے کردار خون کی ہولی کھیلتے موسموں میں بھی جی داری اور انسان دوستی کا سبق دینے کی کوشش کرتے رہے۔

> ”چلتے رہو“ میرے تھکے ماندے ساتھیو، تمھیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے، اندھیرے کی
> شکایت مت کرو............ راتیں اکثر اندھیری ہوتی ہیں“

اس کا خیال تھا ”شرفِ انسانی کا مذاق اڑانے کے لیے پوری دنیا میں خود انسانوں نے نسلی اور خاندانی امتیازات کھڑے کر رکھے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر تحریکیں چلتی ہیں تو اس نوعیت کی دیکھیے فلاں لوگ کسانوں کو اکسا کر اور مزدوروں کو بھڑکا کر اس مخلوق خدا سے ان کے حقوق چھین لینے کے مذموم ارادے رکھتے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے دولت اور آسودگی سے نواز رکھا ہے۔ نجانے ایسی تحریکیں کیوں نہیں چلتیں کہ سب انسان اشرف ہیں، سب انسانی نسل میں سے ہیں، اس لیے سب اصلی انسان ہیں محض نسلی نہیں۔“

(فنون، اپریل ۲۰۰۴ء، ۱۳۔۱۴)

شرفِ انسانی کے اسی تماشے سے وہ ہمیشہ افسردہ خاطر رہا۔ پاکستان میں پنپنے والی ترقی پسندی، صنعتی کلچر اور دیہاڑی دار فیکٹری مزدور کی موجودگی سے عاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ "سرخ سویرے کا" خواب بہت دیر تک آنکھوں میں بند ہی رہا، پاکستان کے شہروں میں بسنے والے ترقی پسند کافی کے پیالے میں طوفان اٹھانے کے خواہش مند اور مجاز کی طرح نشے کی سرمستی میں سڑکوں پر آوارہ گھومنے کے آرزومند تھے۔ سوسائٹی کی ایلیٹ کلاس مارکس کے نظریہ معیشت زیادہ رشتوں کی آزادی کے معاملات میں سرگرم عمل تھی۔ پھر ہندوستان کے قدیم مذاہب اور اسلامی عقائد کی جکڑبندیاں لاشعوری طور پر ہمارے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو کوئی ایک مگر مستقل فیصلہ کرنے پر راغب نہ کرسکیں، یہی وہ مقام تھا جہاں ترقی پسند تحریک نظریاتی، سماجی اور ذہنی سطح پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقسیم ہوئی۔ فیض کے حصے میں فوج کا ایک وفادار گروہ آیا چناں چہ فیض کو ترقی پسندوں کی اس ایلیٹ کلاس نے پسند کیا جسے سبز گوشوں پر نیلگوں سائے" میسر تھے۔ لیکن ندیم نے فیض کی نظمِ انتساب کے ساتھ ایک حقیقی زندگی بسر کی۔ وہ اس ناپاک خاشاک اور کٹڑیوں۔ مکانوں سے گزرا جہاں چاند وضو کرتے ٹھٹھک جاتا ہے۔ اسی لیے ندیم کے شاگرد پیشہ میں زیادہ تر وہی لوگ چنیدہ ہیں جو سیلف میڈ ہیں اور جن پر زندگی آہستہ آہستہ مہربان ہوئی ہے۔

> "میں ندیم صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے چالیس برسوں پر محیط لمحات پر نظر دوڑاتا ہوں تو میرے تخیل میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ ابھرتا ہے۔ میں نے انھیں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تو دیکھا لیکن اپنی کسی پریشانی کو اپنے احباب کو منتقل کرتے ہوئے کبھی نہیں پایا۔ وہ ہم نوجوانوں کے ساتھ جوان بن جاتے تھے اور ہمارے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ برصغیر کا اتنا بڑا افسانہ نگار اتنا بڑا شاعر اور اتنا بڑا کالم نگار ہمارے ساتھ بیٹھا ہے۔"

(سورج ڈوب گیا از عطاالحق قاسمی، جنگ ۱۴ جولائی ۲۰۰۶ء)

ندیم کی روح میں بچپنے کی محبت، معاشی استحصال اور نوجوانی کے جذباتی ٹکراؤ نے اپنے لیے معاشرتی تصادمات کا راستہ چنا تھا، ایک دین دار گھرانے کا ترقی پسند نوجوان جس نے سماجی نظام بدلنے کی سازش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کسی فیشن ایبل مظلومیت اور مقہوریت کا نمائندہ نہیں تھا اس کے افسانوں کے کردار حکیم جی، اللہ یار رہٹلہ، پیر جی، شیرا، عالاں، بانو، سائیں کمالے شاہ، شمشاد علی، رانو، میاں حنیف، فضلو، مریاں، بابا نورا اور بہت سے دوسرے اپنا تعارف آپ ہیں۔

پاکستان نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام کے بعد امروز سے استعفیٰ اور پھر صدائے احتجاج پر گرفتاری ندیم

کے مزاج کی استقامت کا ایک اور ثبوت ہے۔ ندیم نے لکھا کہ فن ایک معاشرتی فعل ہے۔ میں انسان اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ میرے نزدیک غم کے باوجود زندگی کا اثبات ممکن ہے۔

(معنی کی تلاش، ص ۱۳۳)

> ''زمین ہماری ہے'' کا چراغ ندیم کے اس قافلے کا رہنما ہے جو رات کے آخری سرے پر نئی صبح کی چاندی اور نئے سورج کا متلاشی ہے۔''

آدمی اور انسان، آزادی اور جمہوریت، عوامیت اور انقلاب، انکشاف وعقائد، اشتراکیت ومقامیت، ندیم کا افسانہ انہی معاملات کی سیدھی سادھی تصویر ہے۔ جس ترقی پسند تحریک کے مصنفین اسے مغرب کے استحصال سے چھٹکارے کا علمبردار سمجھتے ہیں، بتدریج غربت اور غلامی کے طوق سے آزاد ہوئے اور دونوں ممالک میں ایک اچھی مل کر شاندار زندگی تک رسائی حاصل کی لیکن ندیم کے معاملات بہت حد تک مختلف رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسٹیبلشمنٹ اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہوئے بظاہر اس پر مہربان ہی رہی لیکن یہ مہربانی القاب واعزازات اور معمولی سی یافت سے بڑھ کر کبھی مستقل خوشحالی کی پیامبر نہ بن سکی۔

قاسمی صاحب ہر طور سے یعنی ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ اب بھی روایات کے مطابق تو وہ خاندانی طور پر بھی ایک اہم شخصیت کہے جا سکتے ہیں اور پچاس برس پہلے وہ کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ ''پیرزادہ'' کا لقب بھی شامل کر لیتے تھے۔ انھوں نے خصوصاً اپنی محنت تخلیقی اثاثوں اور عملی خوش مزاجی سے لے کر ایک بڑی سماجی حیثیت بنائی تھی۔ اس سماجی حیثیت میں کوئی اقتصادی پہلو مضمر نہیں ہے .... بیس پچیس برس پہلے گلڈ نے لاہور میں بہت سے ادیبوں کو حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب کے ہاتھوں سستے داموں زمین الاٹ کرائی تھی تو کچھ رقبہ قاسمی صاحب کو بھی ملا۔ انھیں اس وقت بھی ''فنون'' سے کوئی معقول آمدنی نہیں تھی۔ شاید کچھ اپنی زرعی زمینوں سے مل جاتا تھا۔ میری معرفت پر میر خلیل الرحمٰن مدیر جنگ سے اٹھارہ ہزار روپے قرض لیے (مجھ سے چھ ہزار) (آخری آدمی از جمیل الدین عالی) گھر بنانے کی یہ مشقت ندیم کے مزاج کا حصہ نہیں تھی لیکن مشقتی زندگی کی یہ داستان اس کے مزاج کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ دیتی ہے جس کے اشارے اس کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ اپنے بچپن کی یادیں قلم بند کرتے ہوئے اس نے لکھا:

> ''گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز یا سرخ مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت

> زندگی سفاک بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی۔ ماں مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کی بجائے میرے آنسو پوچھ دینا زیادہ آسان سمجھتی۔"

(چند یادیں، مطبوعہ افکار، ندیم نمبر، ص: ۸۹۔۹۰)

اس اقتصادی زوال سے گزرتا ہوا نوے برس کا بوڑھا ندیم زندگی کی آخری سانس تک چکی کی مشقت سے آزاد نہیں ہو سکا۔ امن و انسانیت کے غیر متزلزل ایمان نے اسے حالات سے ایک عجیب قسم کی شمشیر زنی سکھائی تھی اور اس کا معمولی سا، "ہیروشیما" سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ندیم اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ "اعتدال اور احتیاط جبھی ہوئی منظم زندگی کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ حقیقت میں اعتدال اور احتیاط کی پکار معاشرت اور اقتصادی پوری تاریخ لیے ہوئے ہے۔" (معنی کی تلاش ص: ۷۹۔۸۳)

دوسری عالمی جنگ، ۱۹۶۵ء کی جنگ، کشمیر کے معاملات پر بار بار جھڑپیں، ۱۹۷۱ء کا سیاسی المیہ، بار بار کی مارشل لائی حکومتیں، جمہوریت کی پیش دستیاں، مجاہدین اور دہشت گردی، گلوبل ویلج والا امریکہ، انگریزی ابلاغ کی یلغار، ندیم کی دنیا کئی طرز کے اخلاقی بحرانوں سے بوجھل ہے۔

پاکستانی افسانے کے موجود ہراول دستے میں جہاں اسد محمد خان، منشا یاد، مظہر الاسلام، مسعود مفتی، علی تنہا، احمد جاوید، انور سجاد اور ندیم کی سماجیات کو آگے بڑھانے والے بہت سے افراد کھڑے ہیں۔ یقیناً افسانے کا مستقبل روشن ہے۔ یہاں ان افسانہ نگاروں کا ذکر مناسب نہیں جو اپنی ڈگر کے مسافر ہیں اور اپنی طرز کے اسلوب اور کہانیوں کے ہمراہ موجود ہیں کہ گزشتہ تینتالیس سالوں میں ندیم کے "فنون" نے اپنی طرز فکر اور اس کی شائستگی کے لیے اپنی وضع کے ایک نظام شمسی کو ترتیب دیا ہے۔"

لاہور سمن آباد، غالب کالونی کے ایک معدوم ہوتے ہوئے رنگ و روغن والے مکان سے ایک عام آدمی کی طرح رخصت ہوتا ہوا ندیم اپنی ہی سطح کے انسانوں سے ایک مستقل استواری کی علامت ہے۔ اس کے ارتقائی اور اجتہادی سفر میں کوئی مقام حیرت نہیں۔ اسے کبھی یہ خوش فہمی بھی نہیں کہ وہ کسی شہنشاہیت کا سزاوار تھا۔ اس کی معتدل جمع بندی، پر استدلال نقطہ نظر اور تہی دامنی کے اقداری فیصلے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خاص آدمی ہونے کے باوجود عام آدمی کی طرح زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرتی تبدیلی کے لیے سائنسی اعداد و شمار کی ضرورت نہیں البتہ افسانہ نگار ندیم کی اثباتیت، انسان دوستی اور یقین ذات کی مثلیت اس کے شاعرانہ سفر میں علیحدہ مباحث کی متقاضی ہے۔

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ: تخلیقی بنیادیں

کوئی دس گیارہ برس اُدھر کی بات ہے احمد ندیم قاسمی سے نیلوفر اقبال کے ہاں ایک طویل مکالمہ ہوا تھا۔ تب اور باتوں کے علاوہ اس کی سماجی حقیقت نگاری کی حقیقت بھی جاننا چاہی تھی کہ یار لوگ جب جب اس کے افسانے کی بات کرتے ہیں ساتھ ہی ترقی پسندوں کے اس رویے کا ذکر ہونے لگتا ہے جس میں ایک مخصوص زاویے سے سماج کو دیکھنا ہی حقیقت ٹھہرتا تھا۔ یوں گمان گزرنے لگتا ہے کہ جیسے ایک فارمولا قاسمی کے ہاتھ آگیا ہوگا بس اسی کے عین مطابق آنکھوں دیکھی کہانی افسانہ بن جاتی ہوگی۔ اس ملاقات میں ہی میں جان گیا تھا کہ جس طرح قاسمی کی ترقی پسندی ایک منزل پر جا کر اپنے ترقی پسند دوستوں سے مختلف ہو جاتی تھی اسی طرح حقیقت کا تصور بھی مختلف ہو گیا تھا اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ قاسمی کا فرد اور سماج سے رشتہ بالائی سطح پر نہیں بنتا تھا وہ تو کہیں گہرائی میں جا کر بنتا تھا، مضبوطی کے ساتھ اور اس میں روحانی سطح پر بھید بھنور اپنا کام دکھاتے رہتے تھے۔

خیر! ایک ملاقات کا ذکر ہو رہا تھا اور اگر میں بھول نہیں رہا تو اس باب میں قاسمی کا نقطۂ نظر جو بنا اس کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ اس کے ہاں مجرد واقعہ نگاری اور مشاہدے کے وسیلے سے محض تصویر کشی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی اور یہ بھی جو کہ ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں فی الاصل حقیقت وہی نہیں ہوتی کہ وہ تو حقیقت کا ایک رخ سے اظہار ہو سکتا، وہ رخ جو ہمارے مشاہدے میں آیا یا آ سکتا تھا مگر ایک تخلیق کار کو لکھتے ہوئے خارجی حقیقت کے پیچھے کام کرنے والے تاریخی عمل کے ساتھ احساس کی سطح پر جڑنا ہوتا ہے۔ لگ بھگ یہ وہی بات تھی جو قاسمی نے اپنے ایک مضمون ''حقیقت اور فنی حقیقت'' میں کہی تھی جو بہت پہلے یعنی جون انیس سو ستاون کے نقوش میں چھپا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ قاسمی عین آغاز ہی میں اپنے دوستوں سے اس باب میں مختلف ہو گیا تھا۔ اس الگ طرز احساس کا خود قاسمی کو بھی ادراک تھا تبھی تو اس نے کہا تھا:

> ''اگر ہم حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کے فرق کو اپنے ذہنوں میں واضح کر لیں تو ادب و فن میں حقیقت کے اظہار سے متعلق ہماری تمام الجھنیں دور ہو سکتی ہیں اور یہی وہ نقطہ ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کی ابتداء میں ایک حد تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔''

''حقیقت اور فنی حقیقت''/احمد ندیم قاسمی

یہ جو اوپر کی سطروں میں قاسمی کو اپنے ترقی پسند دوستوں کی ناقص حقیقت پسندی کا پول کھولتے ہوئے حجاب سا آ گیا اور اسے ''ابتداء میں ایک حد تک'' کے اضافی الفاظ لکھنے پڑے تو اس کی تلافی اس کے قلم کی روانی نے یوں کر دی کہ اگلے ہی جملے میں ''ایک حد تک' ہونے والی غلطی ترقی پسندوں کے ہاں چلن بنتی دکھائی دیتی ہے۔ قاسمی نے حقیقت کے اس ناقص تصور کو کھلے لفظوں میں مسترد کر دیا تھا۔

قاسمی کی اسی تحریر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کے ہاں حقیقت کی کئی سطحیں تھیں۔ خود اسی کے الفاظ میں:

۱۔ حقیقت جامد چیز نہیں ہوتی۔
۲۔ ہر خارجی حقیقت کے اندر متعدد لہریں رواں ہوتی ہیں۔
۳۔ اس کی ایک انفرادی حرکت ہوتی ہے۔
۴۔ اس کا ماضی کی تاریخی حقیقتوں سے رشتہ ہوتا ہے۔
۵۔ اور یہ مستقبل کے ساتھ بھی ایک رشتہ بناتی ہے۔

قاسمی نے حقیقت نگاری کو اس صداقت پسندی سے جوڑا جس میں حقیقت اور رومانیت کے درمیان موجود تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ یوں قاسمی نے ایک تخلیق کار کو اپنے بنیادی وظیفے سے جڑنے کا قرینہ بتا دیا ہے۔ لگ بھگ یہ وہی نقطہ نظر بنتا ہے جس کے زیر اثر فیض نے منشی پریم چند کی حقیقت نگاری مسترد کیا تھا اور یہی وہ تخلیقی طرز عمل ہے جس میں ترقی پسندوں کی لہر میں رومانیت کی لہر آمیز ہو کر اس کے ہاں اپنا جادو جگانے لگی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ طرز احساس حقیقت کے باب میں اتنا راست اور جامع ہے کہ جس میں انسانی فہم تخلیقی عمل کے دوران اس بھید بھرے علاقے میں پہنچ جاتی ہے جہاں حقیقت مادے تک محدود رہتی ہے نہ مادی حقیقتوں کی نفی ہوتی ہے مگر فن پارے میں تیسری جہت کی گنجائش بھی نکل آیا کرتی ہے تاہم اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اس طرز احساس نے قاسمی کے ہاں حقیقت اور رومان کو بہم کر کے جملے کی ساخت کو ٹھوس حقیقت نگاروں سے بہت مختلف بنا دیا تھا۔

صاحب، یہ جو قاسمی کے افسانوں پر بات کرنے کا ارادہ باندھ کر اس کی حقیقت نگاری کے تصور کو گرفت میں لینے کے جتن کرنے لگا ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ میری نظر میں اس کے افسانے کا مزاج اس کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ قاسمی کے ہاں غالب رجحان رومانیت پسندی کا رہا ہے تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ کہانی لکھتے ہوئے کبھی کبھی وہ شعوری طور پر اس کے زیر اثر رہا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ کہانیاں بھی جوں جوں آگے بڑھتی گئیں سماجی حقیقت نگاری کی لپک اپنا اثر گہرا کرتی گئی۔ ممکن ہے میری یہ بات آپ فوری طور پر ہضم نہ کر پائیں اسی لیے میں آپ کی توجہ قاسمی صاحب کے چند افسانوں کے جملوں کی ساخت کی طرف چاہوں گا:

> ''ڈوبتا ہوا سورج ایک بدلی سے چھو گیا تو شام کو آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
> شفق میں سما نہیں سکی اس لیے جھلک پڑی ہے''

(افسانہ ''بھرم'' / احمد ندیم قاسمی)

> ''درختوں کی شاخیں رات کی خنکی میں ٹھٹھر کر رہ گئی ہیں۔ ہوا چلتی تو شاید ان کی رگوں میں اترتی ہوئی برف جھڑ جاتی مگر ہوا بھی جیسے درختوں کے اس جھنڈ میں کہیں ٹھٹھری پڑی ہے۔ چاندنی میں کفن کی سی سفیدی ہے۔ فراغ اور ہموار لان پر ایک بلی دبے پاؤں بھاگی جا رہی ہے۔ وہ لان کے قوسی حاشیے پر اگے ہوئے پھولوں پر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے اور اپنا ایک اگلا پنجہ اٹھا کر دم کو یوں حرکت دیتی ہے جیسے جادر کر رہی ہو۔''

(افسانہ ''زلیخا'' / احمد ندیم قاسمی)

> ''آسمان پر کفن سا سفید بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی سی بو بسی ہوئی تھی۔''

(افسانہ ''ماتم'' / احمد ندیم قاسمی)

> ''انگڑائی کا تناؤ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ انگڑائی ٹوٹ گئی۔ بانہیں ادھ کٹی شاخوں کی طرح لٹک گئیں اور گالوں کی شفق زردی میں بدل گئی۔''

(افسانہ ''اکیلی'' / احمد ندیم قاسمی)

> ''ان دنوں تم سچ مچ کنول کا پھول تھیں۔ تمہاری پتیوں پر اگر کوئی بوند گرتی تو صرف پھسل کر گر جانے کے لیے۔ تمہاری پنکھڑیوں کا ہلکا ہلکا گلابی رنگ جو مرمریں سفیدی میں مبہم سی جھلکی مارتا تھا بالکل شفق کے مشابہ تھا۔ تم ہنستی تھیں تو صرف اس لیے کہ تم ہنسنے پر مجبور تھیں، مگر تمہارا رونا تمہاری بے لوث ہنسی سے بھی زیادہ لذت آمیز تھا۔''

(افسانہ ''بھری دنیا میں'' / احمد ندیم قاسمی)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس ترقی پسند حقیقت نگار نے ڈوبتے ہوئے سورج کے بدلی سے چھیڑ چھاڑ کے معاملے سے کوئی انقلابی معنی نہیں نکالے۔ درختوں کی شاخیں رات کی خنکی میں ٹھٹھرتی رہیں تو اس کے کوئی نظریاتی معنی نہیں ہیں۔ آسمان پر کفن سا سفید بادل چھا رہا ہے تو اس میں بھی بالادست طبقے کی قہاری کی طرف اشارہ خطا ہو گیا ہے۔ انگڑائی کا تناؤ ٹوٹتا ہے اور گالیوں کی زردی شفق میں بدل جاتی ہے مگر یہ نعرے کی سرخی نہیں بنتی۔ کہانی بے لوث لذت سے لطف اندوز کرتی رہتی ہے تاہم صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں رومانیت کی مٹھاس زیادہ ہو گئی ہے جو کہیں کہیں کھلنے لگتی ہے۔

اورہاں صاحب، یہ بات ماننے کی ہے کہ قاسمی کے جن افسانوں کی ابتدائی سطور اوپر دی گئی ہیں وہ اس کے معروف اور کامیاب تسلیم کیے جانے والے افسانے نہیں کہلائے جا سکتے اور یہ بھی مان لیا جانا چاہیے کہ الحمد اللہ، کنجری، پرمیشر سنگھ، رئیس خانہ، بین، اور لارنس آف تھلیبیا وغیرہ جیسے قاسمی کے نمائندہ افسانوں میں اس طرح کا شعوری اہتمام نہیں ملتا۔

> ”شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹھ تھے کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دوگھوڑا بوسکی کی قمیض جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا..........“

(افسانہ ”الحمد اللہ“ / احمد ندیم قاسمی)

> ”سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، گلے کی رگیں پھول رہی تھیں، جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔“

(افسانہ ”کنجری“ / احمد ندیم قاسمی)

> ”اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب ......“

(افسانہ ”پرمیشر سنگھ“ / احمد ندیم قاسمی)

> ”پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں پلاش کے ایک تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کا جسم ڈھیر پڑا تھا۔......“

(افسانہ ”لارنس آف تھلیبیا“ / احمد ندیم قاسمی)

آپ نے دیکھا صاحب کہ پہلے ہی جملے سے کہانی کا قصہ سامنے آنے لگتا ہے۔ اس کے کردار متحرک ہو جاتے ہیں اور منظر واقعے سے جڑ جاتا ہے۔ قاسمی کے ان بڑے افسانوں کے ابتدائی جملوں میں وہ شعوری کوششیں کام نہیں کر رہی ہیں جو میں اس کے دوسرے اور قدرے غیر معروف افسانوں میں اوپر نشان زد کر آیا ہوں۔ تاہم جوں جوں آپ یہ معروف افسانے پڑھ کر آگے بڑھتے جائیں گے آپ محسوس کریں گے کہ قاسمی نے کہانی کو اپنی دھج سے آگے بڑھنے دیا ہے اور دونوں رویے غیر محسوس طریقے سے اسی بہاؤ میں آ کر آمیز ہو گئے ہیں۔ اس سارے معاملے سے میں نے اپنے تئیں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قاسمی دل سے قائل تھا کہ مجرد اور ٹھوس حقیقت نگاری سے تخلیقی عمل خام رہ جاتا ہے لہٰذا وہ بعض اوقات شعوری طور پر جملوں کی ساخت ایسی بنا لیا کرتا جو رومانیت پسندوں کو مرغوب رہی تھی۔ تاہم جہاں کہیں بھی دونوں رویے کسی شعوری کوشش کے بغیر بہم ہوئے کہانی مکمل ہو گئی اور تخلیق عمل اپنی دھج دکھا گیا۔

ایک اور چیز جس نے قاسمی کے افسانوں کی تخلیقی فضا کو مختلف کیا وہ اس کی دیہات نگاری ہے۔ یہ بات علم میں رہنی چاہیے کہ قاسمی اُنیس صد سولہ میں انگہ میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان کا ذریعۂ معاش کاشت کاری تھا اور اگر آپ نے تھل کے اس بارانی علاقے کو نہیں دیکھ رکھا تو آپ گمان بھی نہیں باندھ سکیں گے کہ اس دور میں ایک معمولی کاشتکار کی زندگی کتنی تلخ ہو سکتی تھی۔ خود قاسمی نے اپنی کہانی کہتے ہوئے جیسی جھلک دکھائی ہے اس سے جیسا گمان بھی بنتا ہے ویسی ہی تصویریں بنالیں تو بھی آنسوؤں کا آنکھ کی پتلیوں تک امنڈ آنا یقینی ہو جاتا ہے۔

> ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پر بہہ نکلتے......“

> ”پیاز یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی......“

تاہم تلخ ہو جانے والی اس زندگی کی اپنی ایک لذت تھی۔ سسکتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ فرد سے فرد کی وابستگی کا جو ماحول ہم قاسمی کے افسانوں میں دیکھتے ہیں اس کے پیچھے نفسیاتی سطح پر قاسمی کی اپنی زندگی کی اٹھان، وجود کے ریشے ریشے میں اتر جانے والا تجربہ اور گہرا مشاہدہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ اردو افسانے میں بلونت سنگھ کی دیہات نگاری بھی بہت اہم مگر اس کے ہاں دیہات کا سنگی چہرہ ابھرتا ہے۔ بیدی کے ہاں کا دیہات مجبوری میں پڑ چکے کرداروں کی لاچاری کے پیچھے رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کا اپنا لطف ہے مگر قاسمی نے نہ تو اپنی دیہات نگاری میں کردار سازی کو نظرانداز کیا ہے نہ کردار نگاری کی للک میں دیہات کا چہرہ مسخ یا مدھم ہوا ہے۔ یوں اس کے افسانوں کا دیہات اس آنگن اور ان گلیوں کا سا ہو جاتا ہے جو خود قاسمی کی زندگی کا حصہ تھیں:

> ”عالم یہ تھا کہ جب ہم بہن بھائی اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ چرخہ کاتتیں اور ہم پونیاں بناتے، وہ چکی پیستیں ہم مل کر گیت گاتے، وہ کوٹھے کی لپائی کرتیں اور ہم سیڑھی سے چمٹے کھڑے رہتے، بہر حال جب ہم اکٹھے ہوتے اور بارش ہونے لگتی تو اماں دہلیز کے پاس بیٹھ جاتیں۔ ہم تینوں ان کے آس پاس آ جاتے، باہر آنگن میں بلبلے ان گنت گنبدوں کا فرش بچھاتے اور آنگن کی بیریوں کے پتے اڑتے ہوئے اندر ہمارے پاس آ جاتے اور باہر گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے پرنالوں کے نیچے نہاتے اور چلاتے تو اماں ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتیں اور روتیں اور بڑے دکھ سے آپ ہی آپ کہتیں ’بوند بوند پانی کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے۔ اے فرشتو! خدا کے دربار میں جا کر مجھ دکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ بس میں نے جو دکھ بھوگے، سو بھوگے، ان

میرے بچوں کو کوئی دکھ نہ دینا میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے۔ ”

یاد رہے اس دکھیاری کا سرتاج انیس صد چوبیس میں مر چکا تھا۔ تو یوں ہے کہ قاسمی کے ہاں دیہات بھی اسی عورت کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کا خیال رکھنے والا مر چکا ہے، جس کے آنگن میں چھم چھم محبت میں گندھے رشتوں کی بارش ہو رہی ہے اور جس کے پرنالوں سے دکھ کا چھاجوں پانی برس رہا ہے۔ قاسمی کے افسانوں کے حوالے سے اس بات کو ریکارڈ پر لانا بہت اہم ہو جاتا ہے کہ کہانی لکھتے ہوئے قاسمی کے ہاں محض دیہات نگاری ہی اس کا مطمع نظر نہیں آتی بلکہ یوں تھا کہ کہانی کا بنیادی خیال، کردار نگاری اور دیہی ماحول ایک دوسرے کا لازمی جزو ہو جاتے تھے۔ قاسمی کے ایک معروف افسانے کا یہ ٹکڑا دیکھیے اس میں خدا بخش کے ساتھ اس کا یار ہے جو شہر سے آیا ہے۔ اس کا چہیتا نوکر بشکو بھی ساتھ ہے۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا مگر وہ نوکر تھا لہٰذا اس کی الگ سے شناخت ضروری تھی۔ بڑے ملک صاحب کے بیٹے نے اسے بشکو کہا اور یہی اس کی پہچان بن گیا۔ اسی بشکو کے بازو پر وہ باز ہے جس کا نام لارنس آف عریبیا کی طرز پر خدا بخش نے لارنس آف تھلیپیا رکھ چھوڑا ہے۔ کہانی کے اس حصے تک پہنچتے پہنچتے ہم جان چکے ہیں کہ یہ لوگ ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے سرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ بابا یارو کا گھر ہے جو بعد میں، بقول خدا بخش “بدذات، کنگلی اور قلاش” نکلی تھی۔ لارنس آف تھلیپیا کی قاتلہ۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ گھر کے قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ اس ٹکڑے میں دیکھیے کہانی کے کردار، منظر نامے اور معنی کا بہاؤ کیسا ایک دوسرے کا لازمی جزو ہو گئے ہیں:

> “ایک بار میں بشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا، مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہیں اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی، کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپ پھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔ ”

(افسانہ “لارنس آف تھلیپیا” / احمد ندیم قاسمی)

اسی طرح قاسمی کے ایک اور افسانے “کنجری” میں کرداروں کا تعارف کراتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ کمالاں کا دادا سہراب خان پچاس کے پیٹے میں پہنچا تھا تو ملتان کی ایک مشہور طوائف زرتاج کو بیوی بنا لایا تھا۔ گاؤں والے اس بارے میں بے خبر تھے کہ زرتاج کوٹھے والی تھی تاہم زرتاج کے ہاں سرور کی پیدائش کے موقعے پر موجود دایہ نے اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی ملتان والی کنجری تاجی تھی۔ بس پھر کیا تھا ایک لفظ سارے

گاؤں میں گونج گیا۔ قاسمی نے جس طرح سہراب خان کو گاؤں سے نکل بھاگنے پر مجبور کیا ہے اس میں کہانی اپنی حقیقی رفتار سے چلی ہے، کردار اپنی شباہت بناتے چلتے گئے ہیں اور دیہی زندگی کا چلن بھی پوری طرح اجاگر ہو گیا ہے۔

اب آیئے قاسمی کے افسانوں کے موضوعات کی طرف اور صاحب اس باب میں اس پر دوسری رائے تو ہو ہی نہیں سکتی کہ اس کے ہاں بنیادی قضیہ وہی طبقاتی تضاد بنتا ہے جو ترقی پسندوں کو حد درجہ مرغوب رہا مگر یہ بھی ماننا ہوگا کہ اجتماعیت نگاری اس کا بنیادی مسئلہ نہیں رہا اور شاید یہی سبب ہے کہ قاسمی کی ہر کہانی کے کردار بطور فرد بھی اپنی شناخت بناتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو قاسمی کے کئی کردار ایک موضوع کو کھولتے اور اجتماعی دکھ بیان کرنے کے جتن کرتے ہوئے ایک انسان کی کہانی بھی بن جاتے ہیں۔ ایک ایسی کہانی جس میں کردار محض کسی ایک طبقے کے نمائندہ نہیں رہتے کئی ہزار انسانوں کی نمائندہ علامت بن جاتے ہیں۔ یہ جو میں نے قاسمی کی کہانی کے علامت بن جانے کی بات کی ہے تو اس سے کسی غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے کہ قاسمی اس علامت نگاری سے بہت فاصلے پر رہا ہے جس کا چلن لگ بھگ دو دہائیوں کا مقبول فیشن رہا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا تاہم موقع نکل آیا ہے تو کہتا چلوں کہ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ علامت نگاروں کی پسپائی کے بعد علامت نگاری کے امکانات ختم ہو گئے ہیں اور بتاتا چلوں کہ قاسمی کو بھی اس کا احساس تھا جب میں نے تو اس نے ایک افسانہ نگار خاتون کی کتاب کے دیباچے میں اس کی ایک کہانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مکمل علامت بن جانے کی بات کی تھی۔ اور سچ پوچھیں تو اس باب میں یہ بات درست ہے کہ افسانہ اپنے خارج میں مکمل ہو اور اپنے باطنی بہاؤ اور بھید بھنوروں میں کسی بڑی صورت حال کی علامت بن جائے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی قاسمی کے افسانوں کے موضوعات کی، اس بارے میں اس کے افسانوں کے مجموعے ‘‘نیلا پتھر’’ کے آغاز میں موجود سطور کی طرف آپ کی توجہ چاہوں گا۔ قاسمی کا کہنا تھا

> ‘‘کسی بھی تخلیق کار کے لیے موضوعات کبھی کمیاب نہیں ہوتے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس موضوعات کم ہو رہے ہیں تو یہ کمی دراصل خود اس کے اندر ہوتی ہے۔’’

(گزارش/نیلا پتھر/احمد ندیم قاسمی)

قاسمی نے یہاں جو ‘‘کسی بھی تخلیق کار’’ کے الفاظ لکھے ہیں تو یقین جانئے اس سے مراد وہی تخلیق کار ہوں گے جو ساری عمر اپنے تخلیقی جذبوں کے ساتھ سچائی سے وابستہ رہتے ہیں۔ (میرے قلم نے ‘‘سچائی’’ کی جگہ ‘‘ایمانداری’’ کا لفظ لکھ دیا تھا مگر میرا ماتھا ٹھنکا کہ اس لفظ سے تو کئی بے ایمانوں کی جبینیں شکن آلود ہو سکتی تھیں لہٰذا اسے ‘‘سچائی’’ سے بدل لیا۔ ممکن ہے میری کوشش بھی خام نکلے کہ آج کل مطلق سچ کہیں نہیں

ہوتا۔ صرف اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے جو “زمینی سچ” ہو۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ زمین پر رینگنے والے سچ کا راستہ اور اس سچ کی زندگی کا مقدر کس طرح متعین کیا جاتا ہے)۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری تخلیق کاروں کی وابستگیاں انھیں محدود موضوعات سے آگے دیکھنے ہی نہیں دیتیں۔ تاہم قاسمی نے یہ کیا ہے کہ ان حدوں کو توڑا ہے لہذا تخلیق بھی آخری عمر تک اس پر مہربان رہی ہے۔ میں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اس خالص طرز عمل کیوجہ سے اس کے ہاں ایسے افسانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے جن میں کسی خاص نقطہ نظر کی تشریح کرنے کی بجائے کہانی کے اپنے وجود پر اکتفا اور اعتماد کرنے کا چلن اپنایا گیا ہے۔ اس سے قاسمی کے ہاں موضوعات کی رنگا رنگی کا سماں بندھ گیا ہے۔ کہیں رشتے محترم ہو گئے ہیں تو کہیں خود انسانی وجود، کہیں ظالم اس کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے تو کہیں وہ رویے جو جہالت کے مظاہر ہو گئے ہیں انھیں رد کیا گیا ہے۔ عورت کو بھی قاسمی صاحب نے بار بار اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ہر بار کم از کم میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ قاسمی مرد کرداروں کے مقابلے میں عورت کے ساتھ جا کھڑا ہوا ہے۔

صاحب اوپر میں کچھ افسانوں کو قاسمی کے کامیاب افسانے کہہ آیا ہوں اور کچھ کو اس درجے سے گرا دیا ہے تو یقین جانیے ایسا کرتے ہوئے میں نے قاسمی کی افسانہ نگاری کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے دل ہی کے فیصلے کا کہنا مانا ہے۔ میں ان افسانہ نگاروں میں سے نہیں ہوں جو قاسمی کے افسانے کا ذکر آنے پر اسے بہتر شاعر گردانے لگیں، نہ ان شاعروں کو مانتا ہوں جو قاسمی کی شاعری کا ذکر درمیان میں چھوڑ کر اس کے افسانے کا قصیدہ لے بیٹھتے ہیں۔

ایک سے زیادہ تخلیقی جہات رکھنا میری نظر میں ایک غیر معمولی عطا ہے اور قاسمی غیر معمولی تخلیق کار تھا۔ پھر اس نے جتنی تعداد میں افسانے لکھے یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ افسانوں کی اتنی بڑی تعداد میں سب کو ایک معیار کا نہیں کہا جا سکتا اور یہ بات ایسی نہیں ہے جو قاسمی کے قد کو گھٹا دے۔ کسی بڑے افسانہ نگار کے لیے اتنی بات ہی کافی ہوتی ہے کہ اس کے قلم سے چند ایسے فن پارے نکل آئیں، جن کے ذکر کے بغیر فن کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہو۔ تو یوں ہے صاحب کہ وہ افسانے جنھیں میں نے کامیاب کہا انھیں اس یقین کے ساتھ کامیاب مانا بھی ہے کہ ان کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ شاہین

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی مختلف جہتیں

ادب کو زندگی کا مفسر ہونے کا اعزاز حاصل ہے، زندگی کے تمام علوم کسی ایک جہت یا پہلو کا احاطہ کرتے ہیں مگر ادب میں زندگی کے سماجی، معاشی، تہذیبی، تاریخی، نفسیاتی، عمرانی، غرض تمام دھارے آ کر سمٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح تخلیق کار بعض اوقات زندگی کی کسی ایک قدر سے متاثر ہو کر خود کو محدود بھی کر لیتا ہے، لیکن عظیم ادب تب ہی تخلیق کیا جاتا ہے جب وہ آفاقی قدروں سے بحث کرے۔ یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ ہر بڑا ادب اور تنقید پہلے اپنے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے پھر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر کلاسیک کا درجہ اختیار کرتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم اور فعال رکن تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے فن کو ہنگامی حالات اور تقاضوں کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس طرح ان کا فن فطری توانائی اور رنا بندی کے ساتھ سامنے آ سکا۔ وہ پریم چند جیسے افسانہ نگار کی کڑی سمجھے جاتے ہیں اور ان کے ہاں بھی احساس اور تخیل گاؤں کی مٹی سے معطر ہے۔ بلکہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات کی پیشکش پریم چند سے کہیں زیادہ پُرلطف، رومان پرور اور دلکش ہے۔ ترقی پسند تحریک سے شدید وابستگی نے ان کے فطری تخلیقی ذہن کو جلا بخشی اور حساس دل و دماغ کا یہ فنکار افسانوی ادب پر گہرے نقش ثبت کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ ان کے ترقی پسندانہ افکار کے بارے میں رئیس قمر لکھتے ہیں:

> ”کتنے ہی ترقی پسند اور انقلابی دانشور ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں جیلوں اور تہ خانوں سے
> باہر آ کر یا تو صرف فنکار رہ گئے یا وہ بھی نہ رہے۔ ندیم ان چند ادیبوں میں سے ہے
> جس کی طبقاتی فکر اس آزمائش سے گزر کر کچھ اور روشن ہو گئی۔“

(مضمون، افسانہ نگار ندیم، مشمولہ، افکار، ندیم نمبر ۵۔ ۱۹۷۵۔ ص ۳۶۶)

۱۹۴۷ء سے اب تک کے افسانے کے بارے میں ایک بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ افسانہ کسی بھی عہد میں موضوع سے بیگانہ نہیں ہوا لیکن جدید افسانے کی روایت میں انمٹ نقوش چھوڑنے والے افسانہ نگار با آسانی گنے جا سکتے ہیں۔ قاسمی صاحب کے عموماً وہی افسانے موضوع بحث بنتے ہیں جن میں کہانی نمایاں ہے حالاں کہ انھوں نے تکنیک میں تمثیل، علامت اور اسلوب کے مروجہ انداز سے بغاوت بھی کی ہے۔ اگرچہ وہ

کسی نئے رجحان کے علمبردار دکھائی نہیں دیتے لیکن جاگیرداری نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں، زندگی کا فطری رنگ، احساس کی حدت، رواں اسلوب اور حقیقت نگاری کی بدولت ان کے افسانوں میں آفاقی قدریں نمایاں ہیں۔ دیہات سے جذباتی لگاؤ کے سلسلے میں انھوں نے خود لکھا ہے:

> ''مجھے تو بس اتنا معلوم ہے جب بھی میں اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، امنڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے۔''

(افکار ندیم نمبر۔ ص۹۲)

خارجی زندگی کا ہر منظر اور مظاہر فطرت کا ہر رنگ انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ ہر لحظہ اپنی ذات اور کائنات کے درمیان ربط کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں' 'چوپال' 'اور'' بگولے'' سے لے کر'' برگ حنا'' تک ان کے ہر افسانے میں کائنات کے دلفریب مظاہر اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک نمایاں جہت انسان دوستی ہے۔ وہ انسان کی فطری سادگی اور معصومیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں کا تار و پود محبت سے تیار ہوتا ہے۔ اس جنت کو تعمیر کرنے کے بعد وہ حقیقی، فطری اور امکانی انداز میں سماجی قوانین، سرمایہ دارانہ استحصال کی بھینٹ چڑھتے دکھاتے ہیں۔ اس جگہ جس فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں افسانہ طلائی مہر، کریا کرم، کپاس کا پھول، پہاڑوں کی برف، ثواب اور رئیس خانہ میں نظر آتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں اجتماعی شعور اور انفرادیت پسندانہ اصلاحی نقطۂ نظر میں تضاد ملتا ہے جلد ہی انھوں نے بیداری مغز سے اس اہمیت کو فنی بصیرت سے جوڑ دیا اور پھر ان کے افسانوں میں شعور و احساس کی ارتقائی شکلیں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔

دراصل فنکار خود کو ہنگامی تقاضوں سے جدا کرنے کے لیے بھی مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور پھر احمد ندیم قاسمی تو صحافی بھی رہے چناں چہ ان کے لیے ان تقاضوں سے بلند ہونا اور بھی مشکل تھا۔ ہماری عقل ہنگامی اور اتفاقی اشیاء کو براہ راست احساس و ادراک سے جاننا چاہتی ہے اور بالواسطہ عقل سے چوں کہ ہنگامی اشیاء کی تہہ میں بھی آفاقی اور لازمی اصول ہوتے ہیں جن کا ادراک عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے فرد کو ان تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے افعال کے دائرے میں قطعیت اور صداقت صرف آفاقی اصولوں کی سطح تک پائی جاتی ہے۔ فنکار ان بندھے ٹکے اصولوں سے تجاوز یا انحراف کر کے امکانی آراء کو ہوا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کیا ہے؟'' بحث کرتی ہے لیکن ادب یا فن کیا ہو سکتا ہے'' کے امکانات کو روشن رکھتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بھی ایسے ہی امکانات کی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ان کہانیوں میں معاشی

چکی میں پسے اور کچلے ہوئے انسانوں کے اعمال و افعال اور احساس و جذبات ملتے ہیں۔ الحمد اللہ، کفن دفن، پاگل، ہو چی ایسی مثالیں ہیں۔ ان افسانوں کی ایک منفرد جہت عمر رسیدہ لوگوں کے جذبات کا بے ساختہ اور فطری اظہار بھی ہے۔ ان کا اعتراف ہے کہ وہ اپنی ماں سے بے پناہ متاثر اور لگاؤ رکھتے تھے اس کے علاوہ دیہات کی زندگی میں بڑے بوڑھوں کا ایک خاص مقام و حصہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب کے افسانوں میں بوڑھوں کے احساسات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ ''وحشی عورت'' کی غیرت مند بڑھیا کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس کردار کو ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تہذیب و ثقافت کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔

> ''اپنے خیالات، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت، خواہ کیسی ہی بے رنگ و بے جان کیوں نہ ہو بہر حال اپنی ہیں اور اسی لیے وحشی عورت کو دل و جان سے عزیز ہیں، ----وہ بوڑھی اور کمزور سہی لیکن اس کا دل جوان اور توانا ہے۔ وہ پرانے خیال کی بوڑھی عورت ہے لیکن کسی نئی چیز یا نئی صورت حال سے بے سبب مرعوب و خوف زدہ نہیں۔''

(افکار ''ندیم نمبر'' ص ۳۶۳)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے کردار اور سیرتیں ہمارے اردگرد کی پیداوار ہیں، وہ امکانی اور فطری سطح پر ہمارے لیے مانوس ہیں۔ اس لیے ہم ان سے خود کو بآسانی ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پیش کردہ علامتیں اور تمثیلی رنگ بھی عام قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ وہ ماورائے عقل اور فطرت کہانیوں اور کرداروں کے قائل نہ تھے۔ وہ مادی حسن کو سراہنے اور محسوس کرنے کی صورت صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے کرداروں میں جوانی اور حسن کے حسین پیکر بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں پوری جزئیات، دلچسپی اور توجہ سے بیان کیا گیا ہے۔ ''رئیس خانہ'' کی مریاں، ''بیٹے بیٹیاں'' کی نازو ''نصیب'' کی رضیہ ایسی ہی نوخیز ادائیں ہیں جنھیں فنکار نے خوبصورتی سے سراہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی ایک شاعر کا دل و دماغ رکھتے ہیں چناں چہ ایسے مواقع پر ان کا اسلوب انتہائی وابستگی کے ساتھ اپنا جوہر دکھاتا ہے۔ ان کے کرداروں میں بنیادی نیکی اور معصومیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ معاشی مسائل سے دوچار اور مجبور ہو کر جسم بیچنے والی عورتوں کا بیان بھی بنیادی پاکیزگی کو ابھارنے کے لیے کرتے ہیں۔ افسانہ ''طلوع و غروب'' کی نرگس، رئیس خانہ کی ''مریاں' 'بدنام کی ''نوراں' 'سفید گھوڑا کی ''بلقیس'' ایسے کردار ہیں جو قاری کے دل میں شدید ہمدردی کو ابھارتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کی مقصدی جہت واضح ہوتی ہے۔ ان کے افسانے محض تفریح طبع، آرائش بیان، یا شدید جذبے کا برہنہ اظہار نہیں بلکہ انسانی اقدار، تہذیبی احساس اور تخیلی قوت کا نتیجہ ہیں۔ وہ اپنی کہانی کے حسن کو فضا آفرینی سے دوچند کر دیتے

کی صلاحیت رکھتے تھے۔ حقیقت نگاری میں فنی لوازمات کو اس طرح ملا لیتے تھے کہ شعوری کوشش کا شائبہ تک نہ ملتا۔ افسانہ 'کنجری' کا کردار ''کمالاں'' جو جسم بیچنے سے نفرت کرتی ہے مگر وقت اور حالات سے اس کی مدافعت جس طرح رفتہ رفتہ کمزور پڑ کر ختم ہونے لگتی ہے وہ نہایت فطری ہے۔ قاری منطقی ،فطری اور امکانی سطح پر اس کو قبول کرتا ہے۔

انسانی فطرت کا گہرا اور قریبی مطالعہ فنکار کے لیے لازمی شے ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ''ماتم''، بیٹے بیٹیاں اور ''کفن دفن'' نمایاں افسانے ہیں جن میں نفسیاتی جہت نمایاں ہے۔ ''ماتم'' میں ایک نوجوان بیوہ کے جذبات کو نفسیاتی پس منظر میں دکھایا گیا ہے۔ اپنی ازدواجی زندگی کی اہم نشانی ''پلیٹ'' کے ٹوٹ جانے سے وہ نوجوان بیوہ سکتے کے عالم سے باہر نکل آتی ہے۔ چینی کی پلیٹ جس پر ایک چینی لڑکی انگوروں کے خوشوں کے درمیان کھڑی مسکرا رہی تھی۔ یہ پلیٹ افسانے میں علامت اور استعارتی طور پر شامل کی گئی۔ یہ علامت ہے اس لطیف جنسی اور گہرے جذباتی تعلق کی جو عورت کا اپنے مرحوم شوہر سے تھا۔

احمد ندیم قاسمی نے افسانوی فن کے کئی ارتقائی مدارج طے کیے۔ اسی لیے وہ ناقدین جو پہلے ان کے فن کو قابل قدر نہ سمجھتے تھے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان کی فنی عظمت کو تسلیم کریں۔ ابہام، غیر ضروری علامت پسندی، نام نہاد جدیدیت کے زیر اثر کہانی کو ختم کرنے والوں کے لیے احمد ندیم قاسمی مشعل راہ ہیں۔ جدت پسندوں کو تجربات کا شوق سہی لیکن تجربہ روایت سے جدا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ قاسمی صاحب کے تمام افسانوی تجربات اپنی مٹی، تہذیب، روایت، تجربے اور جڑ سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ماضی کی روایت، حاصل کے تقاضوں اور مستقبل کے امکانات سے مزین دکھائی دیتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ بگولے۔ ادارہ ادبیات نو۔ لاہور ۱۹۶۷
۲۔ طلوع و غروب۔ مکتبہ اردو ادب۔ لاہور
۳۔ کپاس کا پھول۔ مکتبہ فنون۔ لاہور ۱۹۷۳
۴۔ سیلاب و گرداب، مکتبہ کارواں۔ لاہور ۱۹۶۱
۵۔ سناٹا۔ نیا ادارہ۔ لاہور ۱۹۵۹
۶۔ اردو افسانہ نگاری کے رجحانات۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی۔ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۰
۷۔ آج کل اور ادب کے پچاس سال۔ پبلی کیشنز ڈویژن۔ نیو دہلی۔ ۲۰۰۰
۸۔ افکار ندیم'' ۱۹۷۵

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

احمد ندیم قاسمی کے نسوانی کردار

احمد ندیم قاسمی پریم چند کی قبیل کے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دیہات کی زندگی کو تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا میں کردار اپنی چھوٹی چھوٹی محرومیوں کے لیے سسکتے اور نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ طبقاتی تفریق اپنا راج قائم کیے ہوئے ہے اور پسماندہ طبقہ سماج کی چکی میں پستا ہوا نظر آتا ہے۔

ان کی کہانیوں کی فضا، پنجاب کے دیہاتوں کی ہے۔ وہاں کی عورتیں، مرد، بچے جاگیردارانہ نظام کے تحت اپنی عصمتوں، خوشیوں اور خواہشات کی بلی چڑھاتے نظر آتے ہیں۔ قاسمی کے نسوانی کردار گہری معنویت کے حامل ہیں مگر ان میں فعالیت کی رمک قدرے کم ہے۔ کہیں تو وہ ''بین'' کی رانو اور ''لارنس آف تھلیبیا'' کی رنگی بن کر بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں مگر یہ بغاوت اس استحصال کے مقابلے میں بہت کمزور نظر آتی ہے۔

قاسمی صاحب نے خواتین کے کرداروں کو جس طرح پیش کیا ہے ان میں مماثلت اس قدر ہے کہ اگر نام نہ بدلیں تو کردار شاید ایک ہی شکل اختیار کر لیں مثلاً رنگی، عالاں، رانو، بیگماں اور مریم اپنے لازوال حسن کے باوجود ایک ہی مرقع بن کر سامنے آتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لباس کی تراش خراش بھی ایک سی ہے۔

> ''وہ رنگی تھی، نہ جانے اس کا اصلی نام کیا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے ـــــ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کی تہہ بند، کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے ـــــ اگر ایک بے رنگ چپلی سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لیے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔''(۱)

عالاں کے کردار کی پیش کش بھی اسی طرح سے کی گئی ہے۔

> ''عالاں دہلیز پر یوں بیٹھ گئی کہ اس کا ایک پاؤں باہر صحن میں تھا اور ایک کمرے کے

> اندر۔ نشست کے اس انداز نے اس کی نیلی تہ بند کو تان کر اس کی آدھی پنڈلیوں تک اٹھا دیا تھا۔ اس کے میلے پاؤں کے مقابلے میں اس کی پنڈلیوں کا رنگ کتنا مختلف تھا اور یہ پنڈلیاں کتنی سڈول تھیں۔ یونانیوں نے وینس کے بت کی جو پنڈلیاں بنائی تھیں وہ کیا عالاں کی پنڈلیاں دیکھ کر بنائی تھیں۔"(۲)

حسن کی اس پیش کش میں احمد ندیم قاسمی ایک مرد بن کر ہی سامنے آتے ہیں۔ ان کے حسن کا بیان بسا اوقات معیوب لگنے لگتا ہے مثلاً عالاں کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "اوڑھنی اس کے سر سے اتر گئی تھی اور کھلے بال چکی کے ہر چکر کے ساتھ اس کے چہرے کو چھپا اور کھول رہے تھے۔ اس نے ایک ٹانگ کو پورا پھیلا رکھا تھا اور نیلا تہہ بند اس کے گھٹنوں تک کھنچ گیا تھا۔ اگر ایسی پنڈلی کو کاٹ کر اور شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں سجا دیا جائے تو کیسا رہے؟"(۳)

"رئیس خانہ" میں بھی خوبصورتی کا بیان شاعرانہ جذباتیت کی وجہ سے اپنی حدوں سے آگے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

> "فضلو یہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کا پنجاب بھر میں کہیں جواب مل سکے گا تمہیں؟ مجال ہے ایسی کافر آنکھیں، ایسی گھنی اور لمبی پلکیں، ایسے قد، ایسا جسم، ایسا رنگ اور ایسی چال مل جائے ۔۔۔ میں تو جسے دیکھتا ہوں ایسے لگتا ہے جیسے ہومر پڑھ رہا ہوں۔ عورتیں ہیں سو وینس ہیں، مرد ہیں سو اپالو ہیں، ایسے تیکھے نقش تو انگرڈ برگمن کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ ایسی پامال کی دینے والی خوبصورتی تو ویلنٹیو کو بھی نہیں ملی۔"(۴)

جن وانس کی بیگماں کی خوبصورتی کا بیان بھی نیاز فتح پوری کی "سمن پوش" کی ہیروئن کی طرح نظر آتا ہے۔ جس کی خوبصورتی سحر انگیز ہے۔ اور پورے افسانے کی فضا میں کالی قیمت اور کالے تہ بند نے اس کی پر اسراریت اور خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔

افسانہ نگار ترقی پسند نظریے کا حامل ہو یا رومانوی رجحانات کا عکاس، دونوں صورتوں میں ہی خواتین کرداروں کے ذریعے کہانی کا تاروپود اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ مطلوبہ رزلٹ ایک فارمولے کی طرح حاصل ہو جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے بھی دیہات کی پسماندگی اور جاگیردارانہ نظام کے ہاتھوں غریب کی

پسپائی اور شہر کی کثافت پر دیہات کی سادگی کو ترجیح دینے کے لیے خواتین کے کرداروں کو ہی پیش کیا ہے۔

جاگیردارانہ استحصال کا شکار ہونے والی خواتین کسی مثبت بغاوت کی بجائے پاگل پن کا شکار ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں کیوں کہ یہ تمام کردار حالات کے خلاف لڑ نہیں سکتے اس لیے چیخ و پکار کی فضا پیدا ہوتی ہے اور لمبے ماتمی وقفے کے ساتھ ہی کہانی اختتام پذیر ہو جاتی ہے مثلاً بین میں رانو کا کردار تو اہم پرستی کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے اس اعتقاد کے سہارے مزار پر پڑی رہتی ہے کہ ایک دن پیر سائیں کی قبر میں سے ہاتھ نکلے گا جو اسے انصاف دلائے گا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ پھر وہ اپنے اس انصاف کو قیامت کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ اگر احتجاج کی کوئی صورت ملتی بھی ہے تو صرف اینٹ پتھر پھینکنے تک ہی محدود رہتی ہے۔ اور آخر کار اپنی جان اسی کمزور اعتقاد کے ساتھ دے دیتی ہے۔

''لارنس آف تھلیبیا'' میں رنگی کی بغاوت محض باز کا گلا مروڑ تک ہی محدود رہتی ہے۔ یہ دراصل قاسمی صاحب کا جاگیردارانہ سماج کے خلاف آواز بلند کرنے کا استعارہ بھی بن جاتی ہے لیکن بات رنگی کی فعالیت کی ہے تو وہ محض ایک مرد ادیب کے تخیل کی خوبصورت تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن افسانہ نگار اس کردار کی نفسیاتی الجھنیں، جو اس حادثے کی وجہ سے اور بڑھ جاتی ہیں، وہاں تک نہیں پہنچتا کیوں کہ اس کا مقصد محض جاگیردارانہ نظام کی قباحتیں پیش کرنا ہے ایک عورت کی نفسیات کو سمجھنا ہرگز نہیں ہے۔

''جلسہ'' میں بھی ذیلدار اور قول کے مولوی کے ہاتھوں ایک کسان کی بیٹی برباد ہو جاتی ہے تو وہ بھی حواس کھو بیٹھتی ہے۔ اس کا پاگل پن ''رانو'' کی حالت کے عین مطابق ہے یہاں تک کہ اس افسانے کا انجام بھی ویسا ہی ہے جیسا ''بین'' کا ہے کیوں کہ اس میں بھی دونوں باپ بیٹی پاگل ہو جاتے ہیں اور اس افسانے میں بھی اختتام ایسا ہی ہے۔ لیکن کہیں بھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی جو اس نظام کے خلاف آواز بلند کر سکے۔

> ''کہتے ہیں کہ وہ صبح کو مولوی کے چنگل سے نکل کر برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی میں بیٹھی رہی۔ لوگ اسے سمجھانے بجھانے آئے لیکن وہ وہیں پڑی رہی اس کے بال کھلے تھے، چولا پھٹا ہوا تھا۔ کوئی احساس نہ تھا کہ اس کا سینہ نظر آ رہا ہے اور اس کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔''(۵)

شہری عورت کا تصور بھی احمد ندیم قاسمی کی کہانیوں میں ملتا ہے لیکن قاسمی صاحب اپنا تعصب شہریوں سے چھپا نہ سکے۔ اس لیے انھوں نے افسانہ ''عورت صاحب'' اور ''بارڑ'' میں ایسی عورت پیش کی ہے جو تمام اقدار

کے منافی ہے اور صرف کلب ڈانسر یا سوسائٹی گرل بن کر شمع محفل تو بن جاتی ہے لیکن اس میں ایک مشرقی عورت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ''بندگی بیچارگی'' میں بانو اور امین کے کردار ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں لیکن امین کے نظریات شہر میں آ کر بدل جاتے ہیں اور وہ بھی اُسی رنگ میں رنگ جاتا ہے جو تہذیب کی قربانی دے کر ملتا ہے۔ یوں بانو کی معصومیت واضح کرتے ہوئے شہر کی کثافت کا بیان قاسمی کی دیہی عورت کی طرف جھکاؤ ایک متعصب رویہ بن کر سامنے آتا ہے۔

قاسمی نے خواتین کے نفسیاتی مسائل کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ پیچیدگی صرف کسی محرومی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور اکثریت میں شادی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہسٹریا کو سامنے لاتا ہے۔

''کلثوم'' سناٹا کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے دل میں جوانی کے بھرپور جذبات موجزن ہیں لیکن حالات اس کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ کہیں رک کر بھی سوچے، بڑھتی ہوئی عمر، وقت کے ہاتھوں مسخ ہوتے ہوئے نقوش، اور پھر گھر کی ذمہ داریاں یہ سب مل کر اس کے اندر ایک ایسی جھنجھلاہٹ پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے حواس کو قابو میں کیے بغیر دیوانہ وار چیخنا اور چلانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ کئی مرتبہ ٹھکرائے جانے کا کرب بھی محسوس کرتی ہے اور ماں کی بے بسی کو بھی جانتی ہے جو اس سے متمنی ہے کہ وہ ایک مشین کی طرح کام کرتی رہے کیوں کہ وہ غربت کے ہاتھوں بے بس ہے۔

سناٹا میں ایک کردار ''امینہ'' کا ہے جس کا ذہنی توازن نارمل نہیں ہے۔ وہ کلثوم کو روتے دیکھ کر انگارہ چبا لیتی ہے۔ گھر میں بیوہ بہن بھی موجود ہے جس کے بچوں کی ذمہ داری بھی کلثوم کے سر ہے لیکن تمام کردار اپنی ضروریات کے ہاتھوں کھلونا بن کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کلثوم کی ماں کہتی ہے۔

> ''جب تک میری یہ شیر بیٹی موجود ہے مجھے دنیا میں کسی کی پرواہ نہیں، اری میری کلثوم بیٹا! تو تو میری مرد بیٹی ہے۔۔۔۔ اور کلثوم یوں محسوس کرتی جیسے اس کی داڑھی مونچھ اُگ آئی ہیں۔ اس کی آواز میں مردانہ پن آ گیا ہے اور اس کی پیٹھ پر پڑے ہوئے بالوں کا ڈھیر جھڑ گیا ہے''(۶)

کلثوم جب ایک آدھ بار گھر میں شادی کا ذکر کرتی ہے تو اس کے جواب میں ماں کی گالیاں سننا پڑتی ہیں کیوں کہ وہ زندگی کے تلخ تجربوں سے گزر رہی ہے۔ مرد کے بارے میں ماں کی زبان سے قاسمی اس طرح کے خیالات کی ادائیگی کرواتے ہیں:

> ''اری وہ لفنگا تو تجھے دو چار دن استعمال کر کے پھٹے جوتے کی طرح کوڑے پہ
> ڈال دے گا۔ مجھ سے پوچھو ان مردوں کے چلن۔ تم نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا
> ہے۔۔۔ لڑکیوں کو پڑھا لیتی ہو تو کیا ہوا میں پڑھی لکھی ہوتی تو میں بھی پڑھا
> لیتی۔ مرد نے تجھے پڑھایا تو ساری فارسیاں بھول جائے گی۔''(۷)

جمال جو اس کے سکول میں کلرک ہے اس سے جذباتی وابستگی پیدا کر بیٹھتی ہے لیکن جب وہ گھر داماد بننے پر رضامند ہوتا ہے تو وہ رشتے سے انکار کر دیتی ہے کیوں کہ عورت کو پناہ لینے والا نہیں پناہ دینے والا مرد چاہیے ہوتا ہے۔

> ''میں جمال سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی'' اور
> کلثوم نے اپنے اوپر کے ہونٹ والے روئیں کو چھو کر کہا ''میں مرد بن چکی ہوں!'' اور
> پھر وہ بڑی بے پروائی سے انگلی اٹھا کر ہوا میں دستخط کرنے لگی''۔(۸)

اس ضمن میں قاسمی کا افسانہ 'ماسی گل بانو' بہت متاثر کرتا ہے کیوں کہ اس میں انھوں نے ایک عورت کی محرومیوں کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ اس کی تنہائی، اس کی بے بسی اور اس کی محرومی سب قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

گل بانو کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہوتی ہیں، اس کے ہاتھوں پر مہندی کے کئی لیپ کیے جا چکے تھے۔ تاروں کی چھاؤں میں بارات آنے ہی والی ہوتی ہے کہ معلوم پڑتا ہے کہ دولہا مر گیا ہے۔ اس خبر سے ڈھولک رک جاتی ہے۔ خوشی کے گیت ماتم میں بدل جاتے ہیں۔ گل بانو صرف اتنا کہتی ہے کہ

> ''کوئی عید کا چاند دیکھ رہا ہو اور دعا مانگ رہا ہو اور پھر ایک دم عید کا چاند کنگن کی طرح
> زمین پر گر پڑے تو کیسا لگے؟ کیوں بہنو کیسا لگے؟''(۹)

بخار اس کی شکل کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ باپ بھی مر جاتا ہے اور تنہائی کا کرب بڑھ جاتا ہے مگر گاؤں میں سب لوگ اُس کو آسیب سمجھ کر اس سے ڈرنا شروع کر دیتے ہیں۔

> ''گاؤں میں یہ خبر گشت کر گئی کہ اپنے منگیتر کے مرنے کے بعد گل بانو پر جن آ گیا ہے
> اور اب جن نہیں نکلا گل بانو نکل گئی ہے اور جن بیٹھا رہ گیا۔''(۱۰)

گل بانو کی تنہائی نے اس کی پراسراریت میں اور اضافہ کر دیا۔ اسی کہانی میں ایک اور کردار، تاجو میراثن

کا بھی ہے جو بہت فعال نظر آتا ہے۔ اس کو بھی ہسٹریا کے دورے پڑنے شروع ہوتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ماسی گل بانو کے جن اس پر آ گئے ہیں لیکن ماسی گل بانو کے کہنے پر اس کا باپ اس کی شادی کر دیتا ہے اور وہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تاجو کی آواز بہت سریلی تھی

> ”کئی بار ایسا ہوا کہ ماسی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے تاجو کا بازو پکڑا اور اسے اپنے گھر لے گئی۔ دروازہ بند کر دیا۔ تاجو کے سامنے گھڑا لا کر رکھ دیا اور خود بھائی بجانے بیٹھ گئی اور نمازوں کے وقفوں کو چھوڑ کر شام تک اس سے جہیز اور رخصتی کے گیت سنتی رہی اور ہنستے میں روتی رہی اور روتے میں ہنستی رہی۔“(۱۱)

”مامتا“ میں کہانی کا مرکزی کردار جب جنگ کے محاذ پر مقبوضہ عوام میں بوڑھی عورتیں دیکھتا ہے تو وہ سب میں اپنی ماں کی جھلک دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کی قیمض کا ٹوٹا ہوا بٹن دیکھ کر اُن میں سے ایک بوڑھی عورت کو اپنا بیٹا یاد آ جاتا ہے اور اپنی مامتا کی تسکین کے لیے اس کا بٹن ٹانکنے لگتی ہے۔

> ”اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی۔ بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی جھریوں میں آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آ کر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی ”قیدی ہو؟“ میں زبان سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولی میرا بیٹا جلدی میں تھا، میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ اس کی قیمض میں بھی تمہاری قمیض کی طرح ایک بھی بٹن نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر میری قمیض میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری مرے ایک گال پر بوسہ لیا اور میری قمیض سے آنسو پونچھ کر ہٹ گئی۔“(۱۲)

گویا ماں کا پیار، مامتا کا جذبہ آفاقی ہے۔ اس کو بھی سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ قاسمی کی یہ کہانی لافانی موضوع کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

”پرمیشر سنگھ“ میں پرمیشر سنگھ بھی اسی جذبے سے سرشار نظر آتا ہے جس میں وہ اختر کو اپنا کرتارا سمجھنے لگتا ہے لیکن اس کی بیوی اس کو قبول نہیں کرتی۔

قاسمی نے ماں کی محبت کو شوہر کی محبت پر غالب بھی دکھایا ہے۔ جس طرح ”ماں“ میں گلابو بیارتاج محمد کو

بھول کر اپنے بیٹے کی دوا کے لیے فوری طور پر خچر لے کر واپس گاؤں چل پڑتی ہے تو اس کی تیزی، پھرتی صرف اپنے بچے کی دوا کے لیے ہوتی ہے اور نمونیہ میں تڑپتا تاج محمد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ ولی محمد جب گلابو کی اس حرکت پر اعتراض کرتا ہے تو تاج محمد اسے جواب دیتا ہے کہ تیری بیوی کے کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے تم نہیں جانتے۔

''مامتا'' میں ماں کے کردار کی پیش کش بہت فطری انداز میں کی گئی ہے کہ کیسے وہ غربت جھیلتے ہوئے بھی بیٹے کو دور بھیجنا نہیں چاہتی لیکن قاسمی نے زندگی کی تلخیوں کے بیان میں بھی کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ اس لیے وہ معاشی ضروریات کے لیے بیٹوں کے دوریوں کو بھی برداشت کروانے کا حوصلہ بھی دے دیتے ہیں۔ ایسا ہی ماں کا کردار ''سپاہی بیٹا'' میں دکھایا گیا ہے۔ جس میں ماں غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر بیٹے کو محاذ پر بھیج دیتی ہے اور پھر اسی کی جدائی میں حواس باختہ ہوئی پھرتی ہے۔ بھرتی کرنے والوں سے کہتی ہے:

> ''بڑا شرمیلا ہے صاحب جی' عورت نے منت کے انداز میں کہا ''یہ پاس ہی میرا گھروندا ہے۔ آپ چند قدم چلیں گے اور مجھ مسکین کا بھلا ہو جائے گا۔ بیٹا جیتا رہا تو الاؤنس ملے گا۔ مر گیا تو پنشن بندھ جائے گی۔ ہر حالت میں روپیہ تو کہیں نہیں گیا، اور صاحب جی، مجھے تو گھن لگے چنوں نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔''(۱۴)

لیکن بھرتی کرنے والے جب اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچتے ہیں تو چلاتی ہے کہ وہ تو رنگون میں مارا جا چکا ہے۔

''گنڈاسا'' اور ''سناٹا'' میں ماں کا کردار بہت جذباتی انداز میں دکھایا گیا ہے لیکن ان کی جذباتیت زمانے کے ہاتھوں پیدا کردہ تلخیوں کی وجہ سے ہے۔ ''سناٹا'' میں کلثوم کی ماں اس کی شادی نہ کرنے پر معاشی ضروریات کی وجہ سے مجبور ہے جبکہ اس کی بیٹی اپنے عمر کی جذباتیت کے ہاتھوں فطری جبلتوں کی وجہ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی ماں اس موضوع سے گویا چڑتی ہے اور آخر میں وہ زمانے کے رواج کے مخالف حربے پر آمادہ ہوتی ہے کہ گھر داماد بنانے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ اس سب میں خودغرضی کی جو جھلک نظر آتی ہے اس کے پیچھے بھی دراصل معاشی ضروریات ہیں۔

''گنڈاسا'' میں مولا کی ماں کا غصہ اور باغیانہ رویہ اپنے سہاگ کے اجڑ جانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا اس کے سہاگ کے اجڑنے کا بدلہ لے۔ یہ کردار بھی اپنے ماحول کی صحیح

پیدا وار نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں خواتین کے موضوعات یا اس کی مظلومیت کا براہ راست ذکر نہیں ملتا لیکن وہ جب طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں عورت کا کردار بہت مسخ شدہ دکھایا جاتا ہے مثلاً جاگیردار طبقہ یا پھر سرمایہ دار طبقہ سب میں عورت کے کردار کو بہت واضح طور پر جبر و استحصال کا شکار دکھایا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، لارنس آف تھیلیبیا مشمولہ جب بادل اٹھے مرتبہ فتح محمد ملک، الحمراء پبلشنگ، اسلام آباد، ۲۰۰۲، ص ۲۹۴

۲۔ احمد ندیم قاسمی، عالاں مشمولہ افسانے مرتبہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳، ص ۴۶

۳۔ ایضاً، ص ۴۴

۴۔ احمد ندیم قاسمی، رئیس خانہ مشمولہ جب بادل اٹھے مرتبہ فتح محمد ملک، الحمراء پبلشنگ اسلام آباد، ۲۰۰۲ء ص ۲۹۵، ۲۹۶

۵۔ احمد ندیم قاسمی، جلسہ مشمولہ جب بادل اٹھے مرتبہ فتح محمد ملک، الحمراء پبلشنگ اسلام آباد، ۲۰۰۲ء ص ۵۱۱

۶۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا مشمولہ جب بادل اٹھے مرتبہ فتح محمد ملک، الحمراء پبلشنگ اسلام آباد، ۲۰۰۲ء ص ۲۲۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۸۔ ایضاً، ص ۲۶۴

۹۔ احمد ندیم قاسمی، ماسی گل بانو مشمولہ افسانے مرتبہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۸۷

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، مامتا مشمولہ افسانے مرتبہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۹

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، سپاہی بیٹا مشمولہ جب بادل اٹھے مرتبہ فتح محمد ملک، الحمراء پبلشنگ اسلام آباد، ۲۰۰۲ء ص ۳۰۱

☆☆☆☆

ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات کی پیش کش

احمد ندیم قاسمی کا شمار اردو ادب کے ان ادبا و شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانہ اور شاعری میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے قاسمی کی انفرادیت قائم ہے۔ آپ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن رہے۔ وہ اردو کے ان افسانہ نگاروں میں اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں جنھوں نے نہ صرف پریم چند کی افسانوی روایت کو تقویت بخشی بل کہ بیانیہ میں بھی بہتر تجربے کیے۔ قاسمی کا افسانہ عام طور پر دیہی زندگی اور دیہی زندگی میں بھی ان طبقوں پر محیط ہے جو مفلوک لحال اور ہزاروں سال سے استحصال کا شکار ہوتے آئے ہیں۔

قاسمی نے اپنے افسانوں میں شمال مغربی پنجاب کے دامن میں پھیلی دیہی معاشرت کو موضوع بنایا۔ کیوں کہ بنیادی طور پر قاسمی بھی دیہاتی اور پنجابی تھے۔ ان کا اوّلین مشاہدہ دیہات سے ہی متعلق تھا۔ دیہاتی طرزِ معاشرت پر لکھنے کا محرک اوّل یہی سوچ تھی کہ دیہات ہماری اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ ہمارا معاشرہ زرعی ہے اور زراعت پیشہ آبادی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی طور پر قاسمی نے اپنے افسانوں کے لیے پنجاب کے شمال مغربی علاقے کو منتخب کیا۔ پنجاب کے اس علاقے سے ان کی وابستگی سب سے زیادہ تھی ان کے بیش تر افسانوں کا پس منظر یہی علاقہ ہے کہتے ہیں:

> ”حقیقت یہ ہے کہ شمال مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے کسی اور حصے کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے دیہات کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا میں نے دیہاتی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی فرق نہیں پایا ہے، گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس میں بسنے والے انسان میرے کردار ہیں“۔(۱)

قاسمی نے پنجاب کے شمال مشرق میں اس علاقے کو موضوع بنایا جہاں اونچی نیچی خشک ریتلی پہاڑیوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے بے شمار گاؤں آباد ہیں۔ یہ وادی سون سکیسر کا علاقہ ہے۔ یہاں آمد و رفت کی کمی ہے۔ خشک پہاڑیاں ہیں۔ رزق کی نایابی ہے۔ قاسمی اسی وادی سون سکیسر کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے زندگی کے ابتدائی ایام ان پہاڑیوں کے دور افتادہ دیہات میں گزارے۔

اگر چہ قاسمی کی زندگی کا بیش تر حصہ بہاول پور، ملتان، پشاور اور لاہور میں گذرا لیکن

> وادی سون سکیسر سے ان کا تعلق قائم رہا۔ قاسمی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص خطے کے دیہات کو اردو افسانے میں پیش کیا۔ احمد ندیم قاسمی اگر چہ یہ کاوش نہ کرتے تو اردو دان طبقہ شاید اس ماحول سے واقفیت حاصل نہ کر سکتا۔ احمد ندیم قاسمی نے وادیِ سون کے جغرافیائی ماحول کا مشاہدہ پورے خضوع و خشوع کے ساتھ کیا ہے اور وہ ان اونچی نیچی پہاڑیوں کے بہت اچھے عکاس ہیں۔ (۲)

قاسمی کے افسانوں کی ایک خوبی حقیقت نگاری بھی ہے۔ انھوں نے دیہات کے پس منظر میں حقیقی مسائل و معاملات کو پیش کیا بل کہ دیہی زندگی کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کا دیہات، دیہی مسائل کی کامیاب ترجمانی ملتی ہے اس کی وجہ ان کا دیہات سے قلبی لگاؤ ہے جو ان کی زندگی میں مشاہدے کے ذریعے داخل ہوا۔ ان کے افسانوں میں دیہات کی نمائندگی انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ”احمد ندیم قاسمی پنجاب کی زندگی کے عکاس بن کر اُبھرے۔ چوپال اور بگولے ان کے ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن میں پنجابی زندگی کے خدوخال اُبھرآتے ہیں“۔ (۳)

قاسمی نے دیہات کے موضوع پر افسانے لکھ کر یہاں کے لوگوں کے مسائل اور ماحول کی عکاسی کی۔ علاوہ ازیں پنجاب کے دیہاتوں یہاں کے افراد کی زندگیوں کی مصوری کی۔ ان کے افسانوں میں دیہات کا پس منظر، پنجاب کے دیہات، پودے، دریا، چشمے اور جھرنے، پہاڑیاں، ریگستانی علاقے، جاڑے کا موسم، گرمی، برسات، جھرنوں کی گنگناہٹ، چرند، پرند، انسانوں کی رہائش، ان کی طرزِ زندگی کا بیان ملتا ہے۔ یہ تمام عناصر جو دیہات کو سنوارتے ہیں۔ ان کا شاید ہی کوئی افسانوی مجموعہ ان مناظر سے خالی ہو۔ ان کے افسانوں میں وادی سون سکیسر کی ہوائیں، سبزہ زار، ٹیلے، چراگاہیں سب کی خوشبو موجود ہے۔ فطرت اگرچہ انسان کے فن کا تکملہ کرتی ہے اور انسانی جذبات کو فطرت کے آئینے میں ایک نکھار بھی ملتا ہے۔

> ”جب پو پھٹنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغرب افق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی ...... ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلوؤں کو بہت سکون مل رہا تھا“۔ (۴)

یہ منظر ہمیں ایک ایسی فضا سے متعارف کرواتا ہے جس کے خارجی حسن کو فطرت نے خود سنوارا ہے۔ ان

کے افسانوں میں دیہات کے دل فریب مناظر اور حسن کبھی منظر کا کام کرتے ہیں اور کبھی پس منظر کا۔ جب قاسمی وادی سون سکیسر کی منظر کشی کرتے ہیں تو لفظ لفظ سے ادیب کا احساس، محبت اور لگاؤ دکھائی دیتا ہے۔

قاسمی کے افسانے دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرتے ہوئے اس کی بے لوث اور صداقت پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف دیہاتی افراد کے اقتصادی، جذباتی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی عمدگی سے کی ہے بل کہ ان کی خوشی و غم کی ترجمانی بھی کی ہے۔ افسانہ ''الحمدللہ'' کا مرکزی کردار مولوی اُبل ایک پس ماندہ گاؤں کی مسجد کا مولوی ہے جو اپنے محسن کی وفات پر اس لیے خوشی سے ناچنے لگتا ہے کہ اس کے جنازہ پڑھنے کے عوض چند روپے ملیں گے اور وہ ان روپوں سے اپنے نوزائیدہ نواسے کے لیے کپڑے خرید سکے گا۔

قاسمی پنجاب میں موجود مشترک تہذیبی روح سے آگاہ تھے۔ غربت، بھوک، بیماری، توہم پرستی، بے روزگاری، ناخواندگی، طبقاتی کش مکش، نچلے طبقوں کا استحصال، باوسائل افراد کا جابرانہ رویہ۔ یہ تمام مسائل پنجاب کے سبھی دیہاتی باشندوں کے ہیں۔ قاسمی کے بیش تر افسانوں کا موضوع پرانے توہمات کی مذمت، کورانہ عقیدوں پر طنز اور حقیقت کو منظر عام پر لانا ہے۔ افسانہ ''کوہ پیما'' میں ایک ایسے دیہات کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے باشندے جنات کے توہم میں مبتلا ہیں اور پہاڑ پر جا کر کبھی سچائی جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ قاسمی نے اس افسانے میں نہ صرف توہمات کا ذکر کیا ہے بل کہ توہمات کی حقیقت منکشف کر کے ان کو دور کرنے کے لیے بھی کردار تخلیق کیے ہیں۔ افسانہ ''کوہ پیما'' کا ایک کردار لکرالہ پہاڑ پر جا کر دوسری طرف آباد دیہی علاقے کے متعلق نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بل کہ پہاڑوں کے حوالے سے جنات کے واہمے کو بھی سادہ لوح دیہاتیوں کے ذہنوں سے دور کرتا ہے۔ چوں کہ پنجاب کی اکثریت ناخواندہ اور جدید تعلیمی سہولیات سے کوسوں دور ہے اسی لیے توہمات اور جادو ٹونے میں گرفتار ہیں۔ ان کے اکثر افسانے مشرقی پنجاب کی دیہاتی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ گاؤں میں قدیم قبائلی رسوم مذہبی جبر، ضعیف الاعتقادی اور جہالت ان کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات کی جزئیات چابک دستی سے بیان کی گئی ہے۔

اُنھوں نے دیہی افراد کی ذہنی عکاسی دل پذیر انداز میں کی ہے۔ کریم بوڑھے باپ سے دل کی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> ''کل مولبی جی کہہ رہے تھے میں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا۔ اس لیے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے''۔ (۵)

قاسمی کے افسانوں میں ایسے ضعیف الاعتقاد لوگ بھی نظر آتے ہیں جو ہر قسم کی بیماری کا علاج تعویذ گنڈوں سے کرتے ہیں۔ رانی گاؤں کی الہڑ، معصوم لڑکی تعویذ گنڈوں پر اس قدر یقین رکھتی ہے کہ جب اس

کے بابا کا کھانسی سے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے تو کہتی ہے:

> ''دوا دارو تو جی بہلاوے کے بہانے ہیں بابا! کہو تو کل پرسوں پیر جی سے تعویذ لے آؤں۔ کہتے ہیں ان کے تعویذ کی برکت سے مرنے والے بھی بنا کسی سہارے کے اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں''۔(۶)

قاسمی نے اپنے افسانوں میں دیہی زندگی کے حالات و واقعات، عورتوں کے مسائل، مرد کی نفسیات، معاشرتی ناہمواریوں، طبقاتی کش مکش، جنسی گھٹن، متوسط طبقے کی سفید پوشی، باوسائل طبقہ کی زیادتیوں، نفرت اور محبت کی آگ اور ہوسِ زر غرض کہ بے شمار حقائق کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے سنگین و پیچیدہ مسائل اور کسانوں کی زخمی زندگی کو نئے انداز میں بیان کیا۔ قاسمی اپنے افسانوں میں غریب طبقے سے ہمدردی رکھتے، متوسط طبقے کی سفید پوشی کو منظر عام پر لاتے اور امیر طبقے کی منافقت اور مظالم کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں کے مرکزی کردار دیہاتوں کے وہ مفلس افراد ہیں جن کو شدید مشقت کے باوجود وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ ان کی ڈھارس بندھانا اور زخموں پر پھاہا رکھنا قاسمی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

کرشن چندر لکھتے ہیں:

> ''اسے کسانوں سے محبت ہے۔ وہ اس ''طلائی دیوار'' کو جو زندگی اور اس کی خوشیوں کے درمیان کھینچی ہوئی ہے، اپنے زخمی سینے کی اُبلتی ہوئی لطافت سے شکستہ اور چکنا چور کر سکتا ہے''۔(۷)

انھوں نے ''چوپال'' سے لے کر ''پت جھڑ'' تک دیہی مسائل کی حقیقی ترجمانی کی۔ ان کے افسانوں میں تلخ زندگی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ سسکتی زندگی، افراد کی بے بسی کے پس منظر میں نفسیاتی سطح پر ان کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ بھی بول رہا ہے۔ افسانہ ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' میں قاسمی نے اپنے بچپن کے مفلسی کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے بچپن میں غربت دیکھی اس طرز کے افسانے لکھ کر اپنے درد کی ترجمانی کی۔

قاسمی کا فطری میلان اگرچہ دیہات کی طرف تھا۔ انھوں نے دیہاتی حسن کو اپنے افسانوں میں بیان کر کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ان افسانوں میں دیہاتوں کا فطری حسن اور زندگی کی خوب صورتی دونوں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق بھی اپنی جانب توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے دیہات میں اُجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

قاسمی نے اپنے افسانوں میں ان اُجڑے گھروں اور ان کے باسیوں کی مفلوک الحالی کو بیان کیا۔ قاسمی نے اپنے افسانوں میں تہذیب اور جدید علوم وفنون سے محروم دیہاتیوں کی ذہنی پس ماندگی کی داستان بھی بیان کی ہے۔ جو نئی سائنسی ایجادات پر ایقان نہیں رکھتے۔ توہمات اور اساطیر کے سحر میں گرفتار یہ افراد جامد اجتماعی لاشعور کے مالک ہیں۔ وہ نئی سائنسی ایجادات کو اجنبی ہونے کی بنا پر قبول نہیں کرتے۔ افسانہ ''ایک راستہ چوپال پر'' کا مرکزی کردار وحید خان تعطیلات پر گاؤں آتا ہے وہ چوپال پر دیہاتی لوگوں کو نئی سائنسی ایجادات کے متعلق بتاتے ہیں۔ لیکن کم علم دیہاتی نہ صرف اس کی باتوں کو جھٹلاتے ہیں مل کر اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

پنجاب کے دیہی علاقوں میں پیر پرستی غیر انسانی حدوں کو چھو رہی ہے۔ لوگوں سے نذرانے لیے جاتے ہیں۔ قاسمی پیروں کے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے لوٹ کھسوٹ کا افسوس ناک طریقہ کہتے ہیں جس میں نذرانے کے نام پر مفلس افراد سے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔ اس نوع کے افسانوں میں ''پیپل والا تالاب''، ''بین'' اور ''چبھن'' زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانے مصنف کے مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ جس میں سادہ لوح افراد پیر کی ستم گری کا شکار ہوتے ہیں۔

قاسمی ایک بڑے افسانہ نگار تھے اور ہر بڑا افسانہ نگار ماحول کی ہر برائی کو بیان کرتا ہے قاسمی نے اپنے افسانوں میں ظلم وستم اور ناانصافی کو موضوع بنایا علاوہ ازیں انھوں نے غربت، مفلسی پر بھی افسانے لکھے۔ ''طلوع وغروب''، ''کنگلے'' اس نوع کا افسانہ ہے۔ جس میں قحط کے بعد آنے والے مصیبت خیز اور دردانگیز حالات کو قاسمی نے اپنے افسانے میں پیش کیا۔ اس میں مفلسی کا ایک دل دوز منظر بیان کیا گیا ہے:

> ''حیات بولا ...... بھئی میرا خیال ہے ہم بھی کسی کھائی میں چھپ بیٹھیں۔ کوئی کھاتا پیتا گذرے تو دبوچ لیں اس میں آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے نا۔ مانگنے پر نہیں دیتے ہیں تو نہ سہی، کوئی سبیل تو چاہیے نا آخر''۔
>
> جلال ...... رہنے بھی دے حیات! کیا گندی تجویز سوچی تو نے، کسی کا پیٹ چاک کر کے اپنا پیٹ بھر لینا اس سے تو بہتر ہے کہ انسان طاعون سے مری ہوئی چوہیا کھالے''۔ (۸)

قاسمی قومی معاشرتی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے انھوں نے حقیقت کی آنکھ سے انسان اور انسانی مسائل کو دیکھا۔ ایک سچے فن کار کے مانند انھوں نے اپنے علم، بصیرت، مشاہدے اور عمدہ ذوق سے فن کو استوار کیا اور عالمگیر حقائق کو مشاہدے کی شدت اور تجربے کی واقعیت سے بیان کیا۔ سید وقار عظیم قاسمی کی تخلیقات میں

پرخلوص جذبے کوسراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان افسانوں کے ذریعے افسانہ نگار نے تہذیب اور فن دونوں کی جو خدمت کی ہے اس میں سب سے زیادہ دخل ان کے اس انہماک کو ہے جس کا عکس اس کے مشاہدے، مطالعے، فکر اور بیان ہر چیز سے نمایاں ہے''۔ (۹)

قاسمی کے افسانوں میں ''نیا فرہاد''، ''تسکین''، ''جب بادل اُمڈے''، ''الحمد للہ''، ''رئیس خانہ''، ''گنڈاسا''، ''آتش گل''، ان کے فنی انہماک اور توجہ کے مظہر ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعے قاسمی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور عصری حالات وواقعات کے ساتھ اپنا نقطہ نظر بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے دور کے تمنائی ہیں جہاں ہر طرف امن و آشتی کا پہرہ ہو، جہاں محبت کا راج ہو، کوئی جاگیردار کسی مزارع کا حق نہ لوٹے، کوئی اعلیٰ طبقے کا فرد کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کو کیڑے مکوڑوں کی طرح نہ کچلے۔ اسلوب احمد انصاری اپنے مضمون ''احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک اور انسانی فطرت کے پیچ وخم سے ان کی واقفیت بڑی دورس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر رنگین پردہ نہیں ڈالتے اور انسانوں کے عنصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے''۔ (۱۰)

قاسمی نے اگرچہ دیہات اور دیہاتی عناصر کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے دیہات کو بیک وقت ایک شہری اور دیہاتی کی نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کی۔ قاسمی زندگی کے دونوں منطقوں کے ترجمان ہیں یعنی وہ دیہات کی مسلمہ روایات واقدار کو بھی جانتے ہیں اور شہری زندگی کے مصنوعی آداب اور کاروباری رویوں کو بھی بیان کرتے ہیں انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہی معاشرے کے سنگین حقائق سے بھی قارئین کو آگاہ کیا اور سماجی مسائل اور مصائب کا فن کارانہ اظہار بھی کیا۔ انھوں نے پنجاب کے دیہاتوں کو موضوع تو بنایا ہی ہے، شہری زندگی کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کے افسانوں میں شہری غربت و بے روزگاری، مزدور، بھکاری، کلرک، افسر سب کے مسائل موجود ہیں۔

قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کی دھرتی کی خوشبو اپنے رنگ بکھیرتی ہے وہ انسانی جذبات کو فطری انداز اور تخلیقی آہنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسان اور انسانیت کی آواز ایک صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔ لیکن قاسمی اپنے شدید احساسِ بصیرت، گہری نظر اور بلند تخیل کی بنا پر زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی تلاش کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں ہمیں گھر سے گھر تک ماحول بھی ملتا ہے

کہیں سنگین حقائق سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ کہیں دور کپاس کے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں نیلا پتھر اپنی خوب صورتی دکھاتا ہے۔

حواشی

۱۔ احمد ندیم قاسمی، مرتبہ نند کشور وکرم ”عالمی اردو ادب“، دہلی ۱۹۹۴، ص ۱۲۷، ۱۲۸

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، ”اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش“ ابلاغ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۵، ص ۵۴

۳۔ پروفیسر وہاب اشرفی، اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲، ص ۱۳۳

۴۔ احمد ندیم قاسمی، ”طلوع و غروب“، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵، ص ۲۶، ۲۷

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ”بگولے“، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵، ص ۴۶

۶۔ احمد ندیم قاسمی، ”بازارِ حیات“، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵، ص ۱۲۷

۷۔ کرشن چندر (دیباچہ) ”بگولے“ از احمد ندیم قاسمی، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵، ص ۹

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ”چوپال“، اساطیر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵، ص ۶۰

۹۔ ایضاً......ص ۱۷

۱۰۔ اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ، مونتاج لاہور، سہ ماہی شمارہ ۹۰، اپریل تا جون ۲۰۱۰، ص ۱۷۴

☆☆☆☆

ڈاکٹر تحسین بی بی

’’احمد ندیم قاسمی کے تقسیم آزادی سے پہلے کے افسانوں میں سیاسی شعور‘‘

احمد ندیم قاسمی نے ادب کی دنیا میں جب قدم رکھا تو وہ ہندوستان میں سیاسی ابتری اور افراتفری کا دور تھا، جہاں آزادی کی تحریکیں پورے زور و شور سے اپنے عروج پر ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک بھی سامنے آئی، احمد ندیم قاسمی فطری طور پر ترقی پسند ادیب ہیں اور ہمیشہ ترقی پسند تحریک کی صف اوّل میں رہے کیوں کہ نہ صرف ترقی پسند تحریک کے تصورات کو شعوری طور پر قبول کیا بل کہ اس کے فروغ کے لیے کام کیا۔ اور اپنے افسانوں کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک:

> ’’ترقی پسندی کا مفہوم ان کے ذہن میں ایک ایسی تحریک نہیں جو وقت کے تقاضہ کو پورا کر چکی ہو اور نہ انجمن سازی ہے۔ بل کہ ایک ایسا فلسفۂ حیات جو ہر ملک اور ہر دور کے مسائل کی کلید ہے۔‘‘(۱)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے موضوعات ترقی پسندوں کی اس بنیادی فکر سے ماخوذ ہیں، جس کے مطابق معاشی ناانصافی اور طبقاتی جبر پر مشتمل نظام تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور قاسمی نے اس فکر کو تلخ حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرتے بل کہ انسانی زندگی کی معاشی ناہمواریوں، ظلم، بربریت، لوٹ کھسوٹ، ناکامیوں اور پریشانیوں پر قلم اٹھایا ہے۔ قاسمی نے معاش، سیاست، مذہب و تہذیب ہر حوالے سے مارکسی نظریے کو اپنا کر اپنی کہانیوں میں اس کی ترجمانی کی ہے اور اپنے عہد کے ہر اہم سیاسی و سماجی اور معاشی واقعے پر کہانی لکھی ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

> ’’ان کے ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی حادثے پر کی گئی ہے جو انسانی روابط کے ڈھانچے کو بہت دیر تک اور بہت دور تک متاثر کرتا ہے۔‘‘(۲)

احمد ندیم قاسمی معاشی بدحالی اور سماجی برائیوں کو اشتراکیت کے دوہرے جذبوں اور فلسفوں کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ معاشی سے زیادہ سیاسی مسلے بن جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک طرف

سیاسی اور معاشی تحریکات کے اثرات کی ترجمانی کی ہے تو دوسری طرف وہ پنجاب کے دیہاتوں سے قریبی لگاؤ کی وجہ سے وہاں کے مسائل، اور دیہاتی زندگی کی سادگی و معصومیت کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں گہرائی اور زندگی کی سفاک حقیقتوں کا بھی احساس ہے۔ جس کا اعتراف اسلوب احمد انصاری اس طرح کرتے ہیں:

> ”ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک، انسانی فطرت کے پیچ و خم سے ان کی فطرت بڑی دور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے۔“ (۳)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے کل اٹھارہ (۱۸) مجموعے ہیں جن میں سے سات (۷) آزادی سے پہلے اور گیارہ (۱۱) مجموعے آزادی کے بعد شائع ہوئے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ”چوپال“ (۱۹۳۹ء) ہے۔ اس میں شامل افسانوں میں قاسمی نے وادیٔ سون سیکسر کی فطری زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ کہ جہاں کے باسی انگریز کی جابرانہ سیاسی و معاشی پالیسیوں کی وجہ سے روٹی تک کو ترس جاتے تھے۔ اور وہاں کے کسانوں، محنت کشوں کی صورتحال کے علاوہ سرکاری افسران کی کارگزاریوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں رومانویت کے علاوہ دیہاتی زندگی کے مناظر رچے بسے ہیں۔ امتیاز علی تاج ”چوپال“ کے دیباچے میں قاسمی کے افسانوں کو دو حوالوں سے نئی چیز قرار دیتے ہیں:

> ایک تو اس اعتبار سے کہ پریم چند کے افسانوں کا تعلق یوپی کے دیہات سے تھا اور ندیم کے افسانے پنجاب کے دیہات سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں صوبوں کی دیہاتی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے اس حوالے سے کہ دیہات سے بے حد ہمدردی ہونے کے باوجود پریم چند اپنے اکثر افسانوں میں ایک شہری کے نقطہ نظر سے ان کی زندگی کو دیکھتے ہیں لیکن ندیم نہایت بے تکلفی سے دیہات کو دیہات کے نقطہ نظر سے منکشف کرتا ہے۔“ (۴)

چوپال کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کی رومانی فضا کے ساتھ وہاں کے کسانوں اور محنت کشوں کے حالات و واقعات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ان کا مشاہدہ واضح نظر آتا ہے۔ اس مشاہدے پر ان کے سیاسی نظریے کی عمارت ہے اور احمد ندیم قاسمی پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد حقیقت نگاری کی طرف آئے۔ دوسرے مجموعے ”بگولے“ (۱۹۴۱ء) کے افسانوں میں کربناک فکری تلخی ان کا

فکری شعور اور گرد و پیش کا ماحول باہم منطبق نظر آتے ہیں اور ان میں کسانوں پر ظلم و ستم، سرمایہ دارانہ استحصال، سماجی قوانین معاشرتی ناہمواریاں دوسری جنگِ عظیم کی موضوعاتی تبدیلیاں اور سرمایہ دار و کسان کی کشمکش نمایاں نظر آتی ہے۔

''بگولے'' کا اولین افسانہ ''طلائی مہر'' جبر اور کربناک تلخی کا نمونہ ہے۔ جس کا آغاز بڑی بے رحم حقیقت نگاری کے انداز میں ہوتا ہے: ''ہڈیاں چٹخیں، پسلیاں چرچرائیں اور سوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں۔''(۵)

اس افسانے میں پولیس کی دست درازیاں نظر آتی ہیں اور زمیندارانہ نظام کی تلخ حقیقت سرمایہ دار اور کسان کی کشمکش اور جبر و سفاک پن کا روپ ملتا ہے: ''تھانیدار اپنی پگڑی کا زاویہ بدلتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ یہ میرا حکم ہے اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔''(۶)

ان کا ایک دوسرا افسانہ ''کفارہ'' بھی سرمایہ دارانہ نظام کے بے رحم اور سفاک رویئے اور بے رحم حقیقت نگاری کا عکاس ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں زندگی کی حقیقی صورتوں کے علاوہ کڑوی و تلخ حقیقت اور ان کے منفی نتائج بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا زیادہ حصہ دیہی علاقوں میں گزارا اسی وجہ سے گاؤں کی سیاست، چوہدریوں کی سفاکیاں، وڈیروں کے ظلم و ستم، تعلیم کی کمی وغیرہ کی عکاسی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ قاسمی نے معاشرے کے نچلے ادنیٰ طبقے کے مسائل، ان کے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی اپنے افسانوں ''چوری''، ''قلی''، ''بھوت''، ''السلام علیکم'' اور ''ننھے نے سلیٹ خریدی'' وغیرہ میں خوبصورتی سے کی ہے۔ بقول ڈاکٹر صادق:

> ''انھوں نے اپنے افسانوں میں پسماندہ اور ادنیٰ طبقے کو اس کی تمام تر کمزوریوں، مجبوریوں، محبتوں اور نفرتوں کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کی مفلسی، جہالت اور بے حسی کی تصویریں پیش کی ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی کہیں کہیں اس طبقے کی جد و جہد اور استحصال کرنے والی طاقتوں سے اس کے تصادم کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن کا لازمی نتیجہ ان کی شکست ہی کے روپ میں سامنے آتا ہے لیکن یہ شکست اس عہد کے مروجہ نظام کی ناہمواریوں کو اجاگر کر دیتی ہے۔''(۷)

افسانہ ''چوری'' میں ندیم نے اس جبر و استحصال کی داستان بیان کی ہے، جہاں نچلے طبقے کے تمام انسان

اعتبار سے محروم ہوتے ہیں، اس افسانے کا تاثر ایک لحاظ سے اس لیے بھی بڑھ جاتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی انصاف داروں کے سامراجی اطوار تبدیل نہیں ہوئے۔ اور وہ اپنی ڈگر پر ہی چل رہے ہیں۔ افسانہ ''سرخ ٹوپی'' احمد ندیم قاسمی کے سیاسی شعور کی معنویت سے بھرپور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ تحریک خلافت کے دور کی یادگار ہے تحریک خلافت کی سیاسی ناکامی کی صورت میں بھی آزادی و انقلاب کا نعرہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس دور میں ترک مجاہد انور پاشا دنیا بھر کے محکوم و مظلوم مسلمانوں کے لیے آزادی و خودمختاری کی علامت بن کر سامنے آیا۔ سامراج نے اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا تھا جس کے بارے میں اقبال اپنی شاعری میں یوں اظہار کرتے ہیں:

ے ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سرخ ٹوپی'' اسی کلاہِ لالہ رنگ کی رسوائی کے احوال کا تذکرہ ہے۔ پنجاب کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں کی:

> کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی زنگ آلود میخ سے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکی رہتی تھی۔ جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند تارے کا نشان بھی تھا۔ (۸)

یہ ٹوپی دراصل گامو کا بابا تحریک خلافت کے دنوں میں لایا تھا۔ گاموں جب فوج میں بھرتی ہوا تو نمبردار نے 'سرخ ٹوپی' کے حوالے سے اس کی سیاسی وابستگی کی مخبری کی اور اسے نوکری سے خطرناک قرار دے کر نکال دیتا ہے:

> ''نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کا والد ''انت الہادی انت الحق'' پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر میں ابھی تک سرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے جس پر چاند تارے کا نشان ہے۔'' (۹)

تحریک خلافت ندیم کے ہاں آگ کی صورت میں سامنے آتی ہے جو کبھی نہ بجھائی جا سکی انگریز کے سیاسی و معاشی ظلم و ستم نے جب گلی بازار اور کھیت کھلیان میں اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا تو یہ نوجوانوں کے دلوں میں دہکنے لگی۔ افسانہ 'ارتقا'' میں یہ آگ نسل در نسل منتقل ہوتی نظر آتی ہے اور اسی کے زیر اثر تحریک خلافت تحریک پاکستان میں بدلتی ہے۔ افسانہ 'ارتقا'' واضح طور پر تحریک پاکستان سے متعلق ہے۔ جو برصغیر میں مسلم قومیت کے

احساس کو اجاگر کرتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک احمد ندیم قاسمی کے ان دونوں افسانوں کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ ''سرخ ٹوپی'' اگر تحریک خلافت کے سامراج دشمن رُخ کی، معنی خیز علامت ہے تو ''ارتقا'' کی پوری فضا میں ہندی مسلمانوں کا جداگانہ تہذیبی وجود سانس لے رہا ہے، اور چاند تارے کی علامت نے تحریک خلافت کو تحریک پاکستان سے آملایا ہے۔''(۱۰)

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوی مجموعوں ''طلوع وغروب''(۱۹۴۱ء) اور ''گرداب''(۱۹۴۳ء) میں شامل افسانوں میں پنجاب کے دیہی علاقوں میں طبقاتی تقسیم اور سیاسی وسماجی اور معاشی ناہمواریوں کو موضوع بنایا۔ جس کا اظہار ''طلوع وغروب'' کے دیباچے میں یوں کرتے ہیں:

> ''میں نے ان بے زبانوں کی نمائندگی کی جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مہر لگا رکھی ہے۔''(۱۱)

ان افسانوں میں قاسمی نہ صرف دیہاتی زندگی کی کش مکش کو پیش کرتا ہے بل کہ وہ عصری صورتحال کے اثرات بھی قبول کرتا ہے اور موجودہ نظام کی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فطرت کے حسن کی کشش انہیں انقلابی رومانیت کے راستے پر گامزن کرتی دکھائی دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اگر دیہاتی زندگی کی سادگی و معصومیت اور وہاں کے ماحول کو اجاگر کرتے ہیں تو ساتھ ہی شہری زندگی کے مسائل، مکاریوں اور عیاریوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ بقول عبادت بریلوی: ''موضوعات کے اعتبار سے ان کی افسانہ نگاری ایک اتھاہ سمندر ہے۔''(۱۲)

افسانہ ''کنگلے'' میں جاگیردار اور نمبردار کے ہاتھوں غریب ومحروم لوگوں کا استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس رومان پرور ماحول کے مسخ ہونے کی روداد ہے جس کی ذمہ داری ''کرسی نشین'' پر عائد ہوتی ہے۔ جو سرکاری تائید کے ساتھ جاگیردار یا نمبردار کے روپ میں استحصال کو اپنا فرض منصبی جانتا ہے۔

افسانہ ''جلسہ'' میں ایک مولوی کی ریاکاری کو پیش کیا گیا ہے کہ وہ کس طریقے سے غریب لوگوں کو لوٹتا ہے۔ اس افسانے میں جلسے کے منظر کو بیان کیا گیا ہے کہ جس میں مولوی، پنڈت جی اور اسمبلی کے ممبر وغیرہ صرف تقریروں سے کام چلاتے ہیں۔ مگر دیہاتیوں کی فلاح وبہبود کے لیے ان کے مسائل کو حل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اسی لیے دیہاتی آپس میں کھسر پھسر کرتے ہیں:

> ”ہماری سڑکیں برباد پڑی ہے، ہمارے لیے پانی کا انتظام نہیں، ہماری فصلیں تباہ ہیں مگر لگان معاف نہیں ہوا، تھانیدار ہمیں بیگار پکڑ کر تنگ کرتا ہے۔“(۱۳)

ذیلدار کا کارندہ انہیں سمجھاتا ہے کہ ملک بڑا آدمی ہے اگر وہ ایک بھی اشارہ کرے تو تم سب لوگوں کو حوالات میں بند کر دے گا اس لیے لمبی سڑکوں اور فصلوں وغیرہ کو چھوڑ کر تقریریں سنو۔ یہاں پر فتح محمد ملک احمد ندیم قاسمی کے اس افسانے کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ”انسانی حقوق کی بازیافت کی تمنا اور معاشی آزادی کا تقاضا ہماری سیاست پر چھائے ہوئے جاگیرداروں کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے۔“(۱۴)

افسانہ ”میرا دیس“ میں ندیم نے زندگی میں چاروں طرف پھیلے ظلم و نا انصافیوں محرومیوں اور پریشانیوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی نے غربت، بالائی طبقے کی استحصالی ذہنیت، معاشی تنگ دستی، نچلے طبقے کی محرومی کو اپنے افسانوں ”سونے کا ہار“، ”پکا مکان“، ”غریب کا تحفہ“، ”مہنگائی الاؤنس“، وغیرہ میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ”سیلاب“ میں شامل افسانہ ”آزاد منش غلام“ بھی سیاسی معنویت سے لبریز افسانہ ہے اور ”آنچل“ میں شامل افسانہ ”شعلہ نم خوردہ“ میں ندیم نے معصوم دہقانوں، گڈریوں پر جاگیرداروں اور افسروں کے ناجائز جبر اور حاکمیت کو بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح سے سادہ لوح عوام کو لوٹتے ہیں، اور پھر ان سے بیگار بھی لیتے ہیں:

> ”بہت غصہ آتا ہے مجھے ان جنگل کے داروغوں، پولیس کے سپاہیوں اور ان ذیلداروں پر۔۔۔۔ان سے کوئی پوچھے آخر غریب کا گھر تاکنے میں کون سی جوانمردی ہے۔“(۱۵)

اس افسانے کا انجام بے حد بلیغ ہے۔ ہر قسم کے جبر اور استحصال کے خلاف نعرہ اور ساتھ ہی احتجاج آمیز چپ بھی سادھی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ جبر کے دور میں وہاں آزادیِ اظہار کی علامت ہے جہاں جاگیرداریت کا دور دورا ہو۔

نظریوں کا زندگی سے گہرا ربط ہے اور ایک ادیب کا سیاسی شعور تاریکیوں کے بارے میں سوچ کر روشنی کی کوئی نہ کوئی لکیر تلاش کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں ہمیں یہی شعور نظر آتا ہے وہ اپنی ڈگر کو سیاست کے

تابع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی پارٹی سے گہری وابستگی بھی نظر آتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے دوسری جنگِ عظیم میں شدت اور دنیا بھر کی عسکری طاقتوں کی شمولیت نے جو تباہی و بربادی مچائی اس کی ہولناک تصویر اپنے افسانوں ''سپاہی بیٹا''، ''مامتا''، ''ہیرا''، ''آتش گل''، 'بابا نور' اور ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' میں پیش کی ہے۔ افسانہ 'ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد' خاص طور پر اہم ہے۔ اس افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اس جنگ نے نہ صرف کروڑوں جسموں کو خون و خاک میں ملایا بل کہ ہر طرف خوشیوں اور غموں کے معیار کو بھی بدل کر رکھ دیا یہ افسانہ کرب، اذیت اور احساس کی عبرتناک موت کا المیاتی اظہار ہے۔ فتح محمد ملک اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی نے یوں تو اپنے متعدد افسانوں میں اور اپنی ذہنی نشو ونما کے اہم موڑ پر جنگ کی ماہیت اور اثرات پر تخلیقی غور وفکر کیا ہے مگر طویل مختصر افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد'' میں انھوں نے اپنے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو جس ہمہ گیر انداز میں اور جس فنکارانہ صناعی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ندیم کے ہاں ہی نہیں بل کہ اردو افسانے میں اپنی مثال آپ ہے۔''(۱۶)

اس افسانے میں قاسمی نے پنجاب کے ایک گاؤں کی تصویر دکھائی، جس کے جوانوں نے جنگ عظیم میں حصہ لیا اور گاؤں کی مجموعی فضا پر جنگ کے اثرات طاری ہو کر وہاں کی ویرانی، تباہی اور اجاڑپن کو ظاہر کرتی ہے:

> ''چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا اور جنگ جاری تھی ...... عوام کی جنگ ...... جمہوریت کی جنگ ...... نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ۔''(۱۷)

یہاں پر ندیم نے اپنے معاشرے پر جنگ کے اثرات کو جس ہمہ گیر انداز میں پیش کیا ہے، اردو افسانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''دوسری جنگ عظیم پر شاید اتنا کامیاب افسانہ اردو میں کسی اور نے نہیں لکھا، اس افسانے میں بین الاقوامی شعور سے قطع نظر بے لاگ خارجیت اور وہ حقیقت نگاری

> ہے جو ان مسائل کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے اور افسانہ اپنی حدود سے نکل کر ایک وسیع مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔"(۱۸)

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں دیہات کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کر کے طبقاتی کش مکش اور فوجی بھرتی، انقلاب زندہ باد وغیرہ کو نمایاں کیا ہے۔ یوں ندیم انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کر کے سیاسی اور انقلابی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اختر حسین رائے پوری (دیباچہ) "آس پاس" از احمد ندیم قاسمی، مکتبہ فسانہ خواں لاہور ۱۹۴۸ء، ص: ۵
۲۔ اسلوب احمد انصاری، پروفیسر، "احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ" مشمولہ گفتگو، بمبئی جنوری۔ مارچ ۱۹۶۸ء، ص: ۱۲۶
۳۔ اسلوب احمد انصاری، پروفیسر بحوالہ "اردو فکشن" مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، اے ایم یو علی گڑھ ۱۹۷۳ء، ص: ۲۹۳
۴۔ امتیاز علی تاج (دیباچہ) مشمولہ چوپال از احمد ندیم قاسمی، اساطیر پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۲۲
۵۔ احمد ندیم قاسمی، "طلائی مہر" مشمولہ "بگولے" از احمد ندیم قاسمی، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۱ء، ص: ۳۵
۶۔ ایضاً، ص: ۳۵
۷۔ محمد صادق، ڈاکٹر، "ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ" اردو مجلس دہلی، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۷۴
۸۔ احمد ندیم قاسمی "سرخ ٹوپی" مشمولہ "بگولے" از احمد ندیم قاسمی، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۱ء، ص: ۲۷۴
۹۔ ایضاً، ص: ۸۹
۱۰۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، "احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۵۲
۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ "طلوع و غروب" نیا ادارہ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۹
۱۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "افسانہ اور افسانے کی تنقید" ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۲۴
۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، "جلسہ" مشمولہ طلوع و غروب، ایضاً، ص: ۹۶
۱۴۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، "احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار" ایضاً، ص: ۲۲۵
۱۵۔ احمد ندیم قاسمی "شعلہ نم خوردہ" مشمولہ "آنچل" ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص: ۲۶۷
۱۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، "انداز نظر" التحریر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص: ۳۹
۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد" مشمولہ "آبلے" از احمد ندیم قاسمی، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۴۶ء، ص: ۹۴
۱۸۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" علی گڑھ ۱۹۷۲ء، ص: ۲۰۰

☆☆☆☆

ساجد رضا خان

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری

پاکستانی ادب میں احمد ندیم قاسمی ایک معتبر نام اور مقام کی حامل شخصیت ہیں۔ قاسمی صاحب کا شمار پاکستان کے اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جو ادب میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف شاعری میں اپنا لوہا منوایا بل کہ بہت سی اصناف پر کام کیا اور اپنے دور کے دوسرے ادیبوں سے منفرد مقام حاصل کیا۔

قاسمی صاحب نہایت محتاط رویہ کے شاعر اور ترقی پسند ادیب تھے۔ اُن کی شاعری میں توازن اور اعتدال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں رومانویت اور ترقی پسندیت شامل ہے۔

قاسمی صاحب کا یہی طرز اُن کو دوسرے ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر قاسمی صاحب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف ایک پہلو پر کام کرنے والی شخصیت نہیں ہیں بل کہ وہ بیک وقت شاعر، کالم نویس، مضمون نویس اور ایک اعلیٰ سطح کے افسانہ نگار بھی ہیں۔

قاسمی صاحب نے افسانہ نگاری کا آغاز 1936ء میں کیا اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ”چوپال“ کے نام سے شائع ہوا۔

قاسمی صاحب شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کا ایک بہت بڑا اور اہم نام ہیں۔ سناٹا، کپاس کا پھول، برگِ حنا، گھر سے گھر تک، بگولے، آنچل، درودیوار، سیلاب وغیرہ قاسمی صاحب کے قابلِ ذکر افسانوی مجموعے ہیں۔

گاؤں میں زیست کرنا کتنا کٹھن ہے وہ قاسمی صاحب کے افسانوں سے صاف ظاہر ہے۔ یہ قاسمی صاحب کا خاص موضوع ہے مگر جبر اور ظلم کی داستانیں شہروں میں بھی عام ہیں۔ اس لحاظ سے قاسمی صاحب نے خود کو گاؤں کے جاگیردارانہ نظام، سوچ اور فکر تک محدود نہیں رکھا بل کہ انھوں نے محبت اور زندگی کے تمام اصول وضوابط اور ان کے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

قاسمی صاحب نے گاؤں میں رہتے ہوئے زندگی کی ترجمانی بہت ہی خوب صورت انداز میں کی ہے۔ اس میں آپ کا نقطۂ نظر سیاسی سے زیادہ تہذیبی اور فنی تھا۔ گاؤں کی زندگی کے وہ موضوعات، وہ مسائل جو کہ

ایک عام آدمی کے لیے بہت کٹھن ہوتے ہیں، قاسمی صاحب نے ان موضوعات کو بہت احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا دور کافی طویل ہے اور انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی بے شمار منازل کو طے کیا ہے۔ قاسمی صاحب نے اپنے افسانوں میں فرد کی کھلی زندگی کو پیش کیا ہے اور فرد کے کھوکھلے پن کو اپنے افسانوں میں دکھایا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہاں ایک عظیم لکھاری کا روپ دھارا اور دیہاتی لوگوں کی مسائل بھری زندگی کو ایسے پیش کیا جیسے یہ تمام مسائل مصنف پر گزر رہے ہیں۔

قاسمی صاحب کے افسانوں نے معاشرتی حالات کو بہت احسن طریقے سے پیش کیا ہے اور اُن کے افسانوں میں روزمرہ کے ہونے والے واقعات کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔

قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک مقام پر احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''احمد ندیم قاسمی افسانہ نگاروں کی صف میں بڑی منفرد جگہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلسل اچھے افسانے لکھے۔ آپ کا اس وقت کوئی ایک آدھا ہی افسانہ ایسا ہوگا جو دامنِ دل کو نہ کھینچتا ہو۔ موضوع کی بصیرت، مواد پر قدرت، آپ کو جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے آپ ایک مکمل افسانہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔''

اگر احتشام حسین کی اس رائے کو مدِ نظر رکھا جائے اور انصاف اور ایمان داری کا ترازو لگایا جائے تو قاسمی صاحب واقعتاً ایک اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار ہیں۔

اُن کے افسانوں کے موضوعات، موجودہ مواد، قصہ، لفاظی، حُسنِ بیان اور ان تمام عناصر کو برتنے کا فن شاید ہی کسی کے پاس ہو اور ان کے تمام افسانوں میں شاید ہی ان کا کوئی ایسا افسانہ ہو جو کہ تمام کوششوں کے باوجود بھی ڈھیلا ڈھالا ہو وگرنہ اُن کے تمام افسانے فنی و فکری لحاظ سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے ہیں۔

افسانوں میں موجود عناصر جن کی وجہ سے افسانوں کو افسانے کا نام دیا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب جیسے اُن پر قدرت رکھتے ہیں کیوں کہ پلاٹ، مکالمہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطۂ نظر، زمان و مکان ان تمام عناصر کو قاسمی صاحب اپنے افسانے میں برتنے کا فن جانتے تھے۔

قاسمی صاحب کے افسانے ''سفارش'' سے لیا گیا حصہ:

> ''وہ تو چلی گئی بابو جی۔' فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔
>
> میں نے کہا۔ ''جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتال میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہوگا، روپیا بھی ضائع ہوگا۔''
>
> فیکا بولا: ''بابو جی کیا پتا آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولہا بُجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتا کوئی چنگاری سُلگ رہی ہو۔''

''سفارش'' قاسمی صاحب کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ افسانے کے اس حصے میں منظر نگاری اور مکالمہ نگاری تو کمال کی ہے مگر اس میں مزید بھی کچھ خوبیاں ہیں جن کو منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ اس افسانے میں پنجابی لفظوں کا ایک حسین امتزاج ہے جیسے بڈھے، روپیا، کھدرے، بھورا وغیرہ ساتھ میں ان الفاظ کو استعمال کرتے وقت کتنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

ان کے افسانوں میں منظر نگاری اس انداز سے کی گئی ہے کہ جیسے افسانے میں بیان ہونے والا سارا قصہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور خوب صورت لفاظی کی مدد سے کھینچا گیا منظر کبھی کبھی پڑھتے ہوئے قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور وہ اس منظر نگاری میں جزوی حقیقت دیکھنے لگتا ہے۔ ان کے کردار ہمیشہ افسانے میں زندگی کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں کوئی اضافی چیز نہیں ہوتی جس سے افسانے کے ذائقے میں پھیکا پن نظر آتا ہے۔

کرشن چندر ''بگولے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو زبان میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے متعلق صحیح اور جامع مرقع کشی سب سے پہلے منشی پریم چند نے ترتیب دی اور موجودہ دور میں جن ادیبوں نے دیہات کے موضوع کو نہایت کامیابی سے اپنایا ہے، اس پر ذاتی تجربے اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام پیش پیش ہے۔''

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ کبھی بھی احمد ندیم قاسمی کے نام کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ فی الواقعہ انھوں نے اردو افسانہ نگاری میں جو کام اور کمال کیا ہے یہ کسی اور افسانہ نگار سے نہ ہو سکا ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکے گا۔

ایم۔ خالد فیاض

احمد ندیم قاسمی کے آخری عہد کے افسانے

(افسانوی مجموعہ ”کوہ پیما“ کے حوالے سے)

افسانوی دنیا میں احمد ندیم قاسمی کی وجہِ شہرت اُن کی دیہات نگاری اور رومانوی و حقیقت نگارانہ اسلوبِ نگارش کی آمیزش سمجھی جاتی ہے۔ کوئی اسی مناسبت سے اُن کا مقابلہ پریم چند سے کرتا ہے اور کوئی اُنہیں کرشن چندر کا مقلد بتاتا ہے۔ پھر اُن کا شاعر ہونا بھی اُن کے افسانوں میں شعریت کے ثبوت فراہم کرنے میں ناقدین کی کافی مدد کرتا ہے اور وہ اس پہلو کو اُن کے افسانوں میں بالعموم منفی حوالوں سے ہی دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں ابھی بحث طلب ہیں، اگر کوئی انہیں حرفِ آخر سمجھتا ہے تو یہ اُس کا مسئلہ ہے ہمارا نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری پر اوّل تو خاطر خواہ تنقید ہوئی نہیں، جو ہوئی ہے اُس کا زیادہ تر معاملہ اصل میں اُن کی ابتدائی افسانہ نگاری تک محدود رہا ہے، یعنی افسانوی مجموعہ ”سناٹا“ سے پہلے کی افسانہ نگاری تک، اُس میں سے بھی زیادہ فوکس پہلے دو افسانوی مجموعوں پر ہی رہتا ہے جب کہ یہ احمد ندیم قاسمی کا بہت کمزور افسانوی عہد ہے۔ بہت کم ناقدین ”سناٹا“ تک آئے ہیں اور ”سناٹا“ کے بعد تو ناقدین پر گویا سناٹا ہی چھایا نظر آتا ہے۔ کوئی ایک آدھ مضمون یا کچھ انتہائی چنیدہ افسانوں کا سرسری ذکر اور بس۔ جب کہ احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کے چار اہم ادوار بنتے ہیں۔ پہلا دور افسانوی مجموعہ ”سناٹا“ سے پہلے کا؛ دوسرا دور ”سناٹا“ کے افسانوں کا؛ تیسرا دور ”سناٹا“ کے بعد سے افسانوی مجموعہ ”نیلا پتھر“ تک کا اور چوتھا دور ”کوہ پیما“ کے افسانوں کا۔ جب تک ان چاروں ادوار کا مکمل جائزہ نہ لیا جائے اور گہرا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ نہ کیا جائے، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری سے متعلق کسی مجموعی رائے کا قائم کرنا بہت سے مغالطوں کو جنم دینے کا باعث ہو سکتا ہے۔

یہاں فی الوقت اُن کے تمام ادوار کے افسانوں کا تاریخی تسلسل میں تجزیہ کرنا تو ممکن نہیں مگر اُن کے آخری عہد (جسے میں اُن کی افسانہ نگاری کا چوتھا عہد کہتا ہوں) کے افسانوی مجموعہ ”کوہ پیما“ کے افسانوں کا تجزیہ کرنے کی ضرور کوشش کی گئی ہے جن پر میری دانست میں ہماری تنقید نے انتہائی کم توجہ دی ہے۔ یہ

افسانوی مجموعہ احمد ندیم قاسمی کے اس سے پہلے مجموعہ ''نیلا پتھر'' (سن اشاعت ۱۹۸۰ء) سے کوئی پندرہ برس بعد (۱۹۹۵ء میں) شائع ہوا۔ اس سے پہلے احمد ندیم قاسمی کے کسی دو مجموعوں کے درمیان اشاعت کا اتنا طویل دورانیہ نہیں آیا۔

''کوہ پیما'' کے افسانوں میں ایک تبدیل شدہ فضا اور رنگ ملتا ہے۔ تحیّر اور اسرار کے عناصر بڑھ گئے ہیں، بیانیہ کے ساتھ کسی حد تک علامتی طرز کی آمیزش ہو گئی ہے، طنز اور Irony کی کاٹ اور شدّت میں بڑھوتی ہوئی ہے اور خود کلامی کی تکنیک حاوی تکنیک بن گئی ہے۔ بنیادی افسانوی برتاؤ بے شک وہی ''قاسمی برتاؤ'' ہی ہے مگر اس کے باوجود ''قاسمیت'' کی ایک نئی جہت بھی دکھائی دیتی ہے۔ کچھ افسانے کم زور ہیں (بل کہ کچھ زیادہ ہی کم زور ہیں) مگر کچھ اہم ہیں۔ بے شک ان اہم افسانوں کا مقابلہ ''سناٹا'' کے افسانوں یا قاسمی کے دیگر بڑے کلاسیک افسانوں سے نہیں کیا جا سکتا مگر اپنی نئی جہت کی بنیاد پر یہ قابلِ ذکر بھی ہیں اور بلا شبہ احمد ندیم قاسمی کی بدلی ہوئی فنی حیثیت کے نمائندہ افسانے بھی ہیں۔

میرے نزدیک 'بین'، 'کوہ پیما'، 'پیپل والا تالاب'، 'عاجز بندہ' اور 'ٹریکٹر' اس مجموعہ کے نمائندہ اور اہم ترین افسانے ہیں۔

'بین' کا موضوع اگرچہ نیا نہیں لیکن اُس کی پیش کش، اُس کا بیانیہ، اُس کا ٹریٹمنٹ قابلِ توجہ ٹھہرتا ہے۔ واحد متکلم اور خود کلامی کی تکنیک میں ایک ماں کے بین کا بیانیہ، جس میں بین بذاتِ خود ایک تکنیک بن کر افسانے کو متاثر کن بناتا ہے۔ ایک مرد افسانہ نگار کے ہاتھوں نسائی متکلم کا اس قدر کامیاب بیان اپنی جگہ خود ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس افسانہ میں ایک ماں کے باطنی کرب و درد کو جس طرح آشکار کیا گیا ہے وہ احمد ندیم قاسمی کا خاص کمال ہے۔ مذہبی استحصال کے گھناؤنے پن کو دکھانے کے لیے یہاں عوام کی سادہ لوحی اور پیروں یا مجاوروں کی عیاری و مکاری کو سیدھے سادے انداز میں بیان نہیں کیا گیا جس سے یقیناً افسانوی خوبی کا خون ہو جاتا بل کہ انتہائی خوب صورتی سے ماں کے بیانیہ میں ڈھکے چھپے انداز میں افسانوی تقاضوں کو نبھایا گیا ہے جس سے افسانوی ہنر کا ثبوت ملتا ہے۔ موضوع میں جذباتیت کے امکانات کافی تھے مگر نسائی متکلم کی تکنیک اس کو ہضم کر گئی، اسی لیے ایسی تکنیک کا انتخاب کیا گیا۔ اصل میں یہی انتخاب اس افسانے کو قابلِ ذکر بناتا ہے۔

'بین' کی ایک اہم خوبی درد کا بیان بھی ہے۔ ایک ماں کے درد کا دردناک بیان، جس پر تخلیق کار کی فنی گرفت بے حد مضبوط رہی ہے۔ پورا افسانہ درد کی جس فضا کو تخلیق کرتا ہے وہ ہم سب کو اُس ماں کا ہم درد بنا

دیتا ہے۔ جب آخر میں وہ کہتی ہے کہ ”میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمھیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔“ تو اس فقرے کے ساتھ ہم بھی اُس درد کو محسوس کرنے لگتے ہیں، جسے وہ ماں جھیل رہی ہے۔

افسانے میں اپنے عوام کی توہم پرستی اور جہالت پر چوٹ کرنے کی بجائے اُسے اپنے سماج کے ایک عنصر کے طور پر پیش کرنے کا رویہ ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عوامی توہم پرستی کو اپنی ثقافت میں رکھ کر دیکھنے کا انداز اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس پورے مجموعہ میں لوگوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو سماج کے ایک لازمہ (یعنی ایک ثقافتی لازمہ) کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ ’بین‘، ’کوہ پیما‘ یا ’عاجز بندہ‘ سب میں یہی رویہ موجود ہے۔

اسی حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ’عاجز بندہ‘ ایک مخصوص سماج، کلچر اور اُس کلچر کی ذہنی صورت کا تخلیقی اظہاریہ بن جاتا ہے۔ حنیف جو ہمارے سماج کے عاجز بندوں کی نمائندگی کا فریضہ ادا کرتا ہے، اپنی مخصوص ذہنیت کی وجہ سے معاشرتی طبقاتی اور استحصالی صورت کو سمجھنے کے باوجود انجان بنے رہنے پر مجبور ہے۔ ’بین‘ کی ماں اُس مذہبی استحصال کو سمجھنے سے قاصر ہے جس کا شکار اُس کی بیٹی ہوتی ہے (یہ الگ بات کہ اُس کے بین سے ہم ضرور ساری صورتِ حال سے آگاہ ہو جاتے ہیں) مگر حنیف کم سے کم اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ بارش سے صرف اُس کی اور اُس جیسے دوسرے خدا کے عاجز بندوں کی ہی چھت گرتی ہے مگر عاجز بندہ ہونے کے ناتے وہ اس سے زیادہ کا خیال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

حنیف، جس کی بیوی بچہ شادی کے ایک سال کے اندر اندر انتقال کر جاتے ہیں، اس دنیا میں اکیلا ہے۔ اس تنہائی سے بچنے کے لیے وہ اپنی چھت کے مگ سے نظر آنے والے ایک ستارے کو اپنا دوست بناتا ہے جو اُس کے خیال میں، مولا تک اُس کی رسائی کا وسیلہ ثابت ہوگا۔

شہر میں شدید بارشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بارشیں پہلے اُس کے مکان کی دیواریں اور آخر میں چھت بھی گرا دیتی ہیں مگر اُس کی قناعت پسندی اور اپنے مولا پر اُس کا اعتقاد (جس میں اُس کی بے بسی کا بہت بڑا ہاتھ ہے) اُسے عاجزی کا رستہ ہی سجھاتا ہے کہ اس کے سوا اُس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں۔ یہاں اس افسانے میں بھی اصل خوب صورتی تکنیک سے پیدا ہوئی ہے۔ خود کلامی کی تکنیک، جو حنیف جیسے عاجز لوگوں کی ذہنیت کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہے اور یہی اس افسانے کا بنیادی مقصد بھی ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے جن سے حنیف کا عقیدہ، اُس کا غصہ (جس میں اُس کے شعور کی چنگاریاں بھی سلگ رہی ہیں)، اُس کا ایمان، اُس

کا خوف، اُس کی بے بسی اور نتیجتاً اُس کی عاجزی عیاں ہے۔

> ''وہ یہ سوچ کر مسکرایا کہ اُس کا مولا اس پر کتنا مہربان ہے کہ بارشوں میں کچی چھتیں ٹپکتی تو ہیں اور اسی لیے اس کے کوٹھے کی چھت بھی ٹپک رہی تھی اور وہ آدھی چھت جس کے نیچے میاں حنیف کی چارپائی بچھی تھی، بالکل محفوظ تھی۔۔۔وہ سوچتا رہا۔ 'اُس نے حکم دیا ہوگا کہ میرے اس عاجز بندے کی چھت کا وہ حصہ محفوظ رہے جس کے نیچے وہ صبح کی اذان تک سوتا ہے۔''

یہی سوچتے سوچتے وہ سو جاتا ہے کہ ایک خوف ناک آواز سے اُس کی آنکھ کھلتی ہے۔ یہ آواز اُس کے کوٹھے کی آدھی چھت گرنے کی ہے۔

> ''ایک بار پھر بجلی چمکی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے کوٹھے کی گری ہوئی آدھی چھت کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا۔ 'واہ رے میرے مولا' وہ بڑبڑایا۔ 'تو نے اپنے اس عاجز بندے کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا نا جو تو دوسروں کے ساتھ کرتا ہے۔ میرے کوٹھے کی آدھی چھت گرانے کے بعد بجلی چمکاتا ہے کہ دیکھ لے اپنے آدھے گھر کا ملبہ۔ واہ رے میرے مولا!'
>
> پھر یکا یک وہ خوف زدہ سا ہو کر ہٹا اور چارپائی پر جا بیٹھا۔ سردی کی بجائے وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ 'میں نے یہ کیا بک دیا میرے مولا۔' وہ کہ رہا تھا۔ 'تیری بارش نے چھت کے اس حصے کو تو ذرا سا بھی نہیں چھیڑا نا جس کے نیچے تیرا یہ عاجز بندہ سو رہا تھا۔ تُو نے دنیا کو یہ تماشا دکھا دیا کہ ضروری نہیں پوری کی پوری چھت بیٹھ جائے۔ آخر اپنے مولا کے عاجز بندے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت بھی تو ضروری ہے۔ اور تُو نے اپنے اس عاجز بندے کو محفوظ رکھا۔ تیری حکمتیں کب کسی کی سمجھ میں آئی ہیں میرے مولا!''

حنیف جب نماز پڑھنے جاتا ہے تو باقی کی آدھی چھت بھی گر جاتی ہے۔ وہ پناہ لینے مسجد کی طرف چل پڑتا ہے۔ مسجد کے قریب پہنچنے پر بادل اور بجلی انتہائی زور سے کڑکتی ہے تو:

> ''میاں حنیف نے رک کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ 'کیا تجھے بہت غصہ آ رہا ہے

> اپنے اس عاجز بندے پر میرے مولا! اُس کا تو ایک ہی کوٹھا تھا۔ اس کی چھت تو تیری بارشوں نے برابر کر دی۔ اب تیرا بادل کیوں دھاڑ رہا ہے؟ مجھ پر بجلی گرانا باقی ہے تو وہ بھی گرا دے۔ اے بادل! چل دھاڑ--- دھاڑ' اور وہ دیر تک آسمان کی طرف غصے سے دیکھتا رہا--- جب وہ محراب کے پاس دیوار کا سہارا لے کر بیٹھا تو بیٹھتے ہی رونے لگا۔ 'یہ سب کچھ تو میں نے غصے میں بک دیا تھا میرے مولا، اور غصہ تو حرام ہوتا ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مولا کریم۔ اپنے اس عاجز بندے کو معاف کر دے میرے مولا۔'
>
> بارش سارا دن برستی رہی۔ وقفے وقفے سے کچی دیواریں گرنے کی آواز آتی تو میاں حنیف چونکتا۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ 'تیری ذات کتنی بے پروا ہے میرے مولا۔ جو کچے مکان ہیں وہ گر رہے ہیں۔ جو پکے مکان ہیں وہ تنے کھڑے ہیں۔ تیری حکمتوں کا حساب کون کرے میرے مولا۔"

اور پھر افسانے کا اختتام انتہائی بامعنی انداز سے ہوتا ہے جب حنیف کو مسجد کی چھت کے مگ سے اکٹھے چار ستارے نظر آتے ہیں تو وہ کہتا ہے:

> "ایک دم چار ستارے! میرا مولا مجھے بہلا رہا ہے، پر میرے مولا! میں تجھ سے روٹھا ہی کب تھا۔ تیرا یہ کرم کیا کم ہے کہ میرے کوٹھے کی چھت کا باقی حصہ اس وقت گرا جب میں اس چھت کے نیچے موجود نہیں تھا۔ مجھے تو تجھ سے کوئی شکایت نہیں میرے مولا۔ پھر تُو نے اکٹھے چار ستارے کیوں بھیج دیے مجھے منانے کو۔ میں تیرا عاجز بندہ تو عمر بھر تیرے ایک ہی ستارے سے بہلا رہا ہوں۔"

یہ اقتباسات اس افسانے کے ہی نہیں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے اہم افسانوی اقتباسات میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ ذہنی کش مکش کو اور 'جی کے بہلاوے کو یہ خیال اچھے ہیں' کی صورت کو جس طرح تخلیقی اظہار عطا کیا گیا ہے وہ احمد ندیم قاسمی کی توانائی اور تخلیقی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ طنز یہاں بین السطور چلتا ہے۔ اور بلاشبہ افسانوی متن میں بین السطور طنز کو پیش کرنا ایک مشکل آرٹ ہے۔ اس افسانوی مجموعہ میں اکثر افسانوں میں طنز کا یہی انداز ملتا ہے جو تخلیق کاری کی پختہ کاری کی واضح علامت ہے۔

”کوہ پیما“ اسرار اور تحیر کی فضا کو قائم کرتا Irony کی سطح کو چھوتا ایک اہم افسانہ ہے۔ واحد متکلم (راوی) گاؤں کے لوگوں کے توہمات کی جڑ کاٹنے اور اُن کے خوف کو دور کرنے کے ارادے سے ٹکرالہ کی چوٹی سر کرنے کی ٹھانتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے دوست کی سرخ بشرٹ لے جاتا ہے کہ جب وہ پہاڑ سر کر لے گا تو یہ سرخ بشرٹ لہرا کر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑے گا۔ سخت ترین کوہ پیمائی کے بعد جب وہ چوٹی کی بلندی پر پہنچ کر ایک لاٹھی کے ساتھ وہ سرخ بشرٹ باندھتا ہے تو اُسے وہاں دوسرے گاؤں سے آیا ہوا ایک لڑکا ملتا ہے جو اُس کی پھڑ پھڑاتی بشرٹ کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے اور کہتا ہے:

”میں نے پہلی بار کسی کو اس طرح کپڑے سکھاتے دیکھا ہے!“

جو عمل راوی کے لیے انتہائی فخر کا باعث تھا وہ ایک لڑکے کے لیے محض ہنسی کا موجب بن گیا۔ اصل میں پہاڑ کے اس جانب لوگوں کے عقائد اور طرح کے ہیں اور اُس جانب اور طرح کے، جس کی وجہ سے یہ Ironic Situation ظہور میں آئی۔ اور یہی اس افسانے کا علامتی مفہوم بھی ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک قبیلے، ایک گروہ یا ایک قوم کا کارنامہ کسی دوسرے گروہ یا قوم کے لیے ایک ٹھٹھول سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ مسئلہ پہاڑ کے اِدھر اُدھر سے بے خبری ہے۔ ہم بالعموم پہاڑ کی ایک جانب سے ہی آگاہ ہوتے ہیں، دوسری جانب سے نہیں، اور ہماری یہی بے خبری اکثر صورتوں میں ہمارا مضحکہ بن جاتی ہے۔

”پیپل والا تالاب“ بھی اپنے معاشرے پر بہت خوب صورت طنز ہے۔ تقسیم اور آزادی سے اس خطے میں محض چہرے بدلے، کردار بدلے، نام بدلے مگر نہ عمل بدلے، نہ عقائد اور نہ جہالت کی صورتیں بدلیں۔ لہٰذا وہی استحصال، وہی گم راہی اور جہالت کی پیدا کردہ وہی توہم پرستی معاشرے کا دائمی عنصر رہتی ہے۔ اس بات کو بتانے کے لیے گاؤں کی دو تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ ایک تقسیم سے پہلے اور دوسری تقسیم کے بعد کی۔ تقسیم سے پہلے پیپل والے تالاب پر ایک ہندو سادھو کا ڈیرہ تھا جو لوگوں کو اولاد کی نعمت سے نوازتا تھا اور تقسیم کے بعد سائیں جمالے شاہ نے وہاں ڈیرہ جما لیا لیکن کام اُس کا بھی بے اولادوں کو اولاد دینا ہی ٹھہرا۔ مزے کی بات یہ کہ جب وہاں ہندو سادھو کا قبضہ تھا تو اس پیپل والے تالاب سے متعلق چندر گپت موریا کا قصہ مشہور تھا مگر جب سائیں جمالے شاہ آئے اور یہ گاؤں پاکستان کا حصہ بن گیا تو اب اس ڈیرے سے متعلق اورنگزیب عالم گیر کی حکایت مشہور ہو گئی۔ یہاں بھی احمد ندیم قاسمی وہی بین السطور طنز سے کام لے کر ہمیں اپنی سوسائٹی کا تماشا دکھاتے ہیں اور خوب دکھاتے ہیں۔

اس افسانے میں بظاہر تکنیک سیدھی سادی لگتی ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس افسانے کا حسن اور معنویت اُس دو منظری تکنیک کی بنیاد پر ہے جس پر ہماری نظر فوراً نہیں جاتی۔ مزید براں دو متضاد منظروں کے ساتھ جڑی دو متضاد حکایتوں کا بیان، بہت سی معاشرتی حقیقتوں کو کھولنے کے ساتھ ساتھ طنز اور Irony کو بھی جنم دیتا ہے۔ اور ان سوالات کو بھی ذہنوں میں بیدار کرتا ہے کہ سچ کہاں ہے؟ کیا سچ کہیں ہوتا بھی ہے؟ اور سچ ہوتا ہے یا سچ بنایا جاتا ہے؟ اگر سچ بنایا جاتا ہے تو وہ کون بناتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ اس مجموعہ کا ایک اہم افسانہ بن جاتا ہے۔

”ٹریکٹر“ خالص دیہاتی افسانہ ہے۔ یہ اصل میں مشینی عہد میں انسانی رشتوں کے ٹوٹنے بننے اور انسانی استحصال میں مشین کے کردار کی کہانی ہے۔ یہ اُس عہد کی کہانی ہے جب دیہاتوں میں ٹریکٹر ابھی نیا نیا آیا تھا۔ چاچا مراد کے گاؤں میں بھی شاہ جی ٹریکٹر لے آتے ہیں اور یہیں سے نہ صرف استحصال کی نئی طرز کا آغاز ہوتا ہے بلکہ چاچا مراد اپنے پیٹ کی خاطر اپنے بیٹوں جیسے کسانوں سے بے وفائی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ اُسے لالچ کے جھانسے میں پھانس کر اُس کے بازو اور ٹانگیں (یعنی اُس کے کسان بیٹے) کاٹ دی جاتی ہیں۔ اس موقع پر چاچا مراد اپنے زمین دار شاہ جی سے کہتا ہے:

> ”آپ مالک ہیں۔ آپ کو ٹھیک ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آپ ایسا نہیں کریں گے تو آپ میں اور مجھ میں فرق کیا رہے گا۔ رہا میں، تو میرے چاروں بچوں کو مجھ سے جدا کر کے آپ نے میرے بازو بھی کاٹ لیے اور ٹانگیں بھی توڑ دیں۔ اب تو میں ایک لوتھ کی لوتھ ہوں۔ پھر آپ کا نمک بھی کھایا ہے اور آپ کی زمینوں کی مٹی بھی پھانکی ہے۔ آپ کے در پر پڑا ہوں۔ ہشکارتے رہیے اور اپنا کام لیتے رہیے۔“

ٹریکٹر کی وجہ سے چاچا مراد کا رشتہ اپنے کسان بچوں سے ٹوٹتا بھی ہے اور اسی کی بدولت یہ رشتہ دوبارہ اُستوار بھی ہوتا ہے۔ یہ افسانہ وہاں بھی ختم کیا جا سکتا تھا جہاں چاچا مراد لالچ اور مجبوری میں اپنے بچوں سے روتے ہوئے منہ موڑتا ہے اور بعد میں شاہ جی کے دھوکے سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ چاچا مراد کا اچھا المیہ بنتا اور ہم اسے ایک حقیقت پسند افسانہ گردانتے جو انسانی فطرت، اُس کی مجبوری اور استحصال زدگی کا خوب صورت اظہاریہ بنتا مگر تخلیق کار کا وژن انسان کے بارے میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشین سے انسان ناکارہ ہی نہیں ہوتا نئے دور میں جینے کے قابل بھی بنتا ہے، مشین اگر انسان کے پرانے رشتوں کو توڑتی

ہےتو نئے حالات میں اُنہی رشتوں کو اُستوار بھی کرسکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ تصور کرنا کہ مشین ہر حال میں انسان سے انسانیت چھینتی ہے یا انسان کو مار دیتی ہے، پورے طور پر درست نہیں۔ مشینی، سائنسی، صنعتی یا صارفی کلچر کیسے ہی غیر انسانی معاشروں کو جنم کیوں نہ دے دے انسانیت مکمل طور پر نہیں مرسکتی۔ اسے بے شک آپ تخلیق کار کی آئیڈیلسٹک اپروچ کہیں مگر اس میں حقیقت اور سچائی کا عنصر اس قدر بھی معدوم نہیں جس قدر ہم نے سوچ لیا ہے۔ لہٰذا یہ افسانہ بے شک بڑا المیہ نہیں بن سکا مگر امید کا بڑا پیغام بہ ضرور بن گیا ہے۔ ہمیں ایک مثبت سوچ دینے اور اس عہد میں، جسے غیر انسانی کہہ کہہ کر جینے کے قابل نہیں چھوڑا گیا، جینے کا حوصلہ دینے میں کامیاب رہا ہے۔

چاچا مراد کا کردار بھی بہت اچھا پینٹ کیا گیا ہے اور شاہ جی کا بھی، کہ اس میں احمد ندیم قاسمی کو یوں بھی مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہاتی کردار اُن کے قلم کی زد میں آتے ہی جان دار ہوجاتے ہیں۔ یہی یہاں بھی ہوا ہے۔

”چبھن“ بھی کسی حد تک اچھا افسانہ کہا جاسکتا ہے مگر ”چرواہا“، ”ایک یک لباس آدمی“، ”اخبار نویس“ اور ”مچھلی“ سراسر کم زور افسانے ہیں۔ اس قدر کم زور کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں احمد ندیم قاسمی کا تخلیقی زوال عیاں ہے۔ ”چرواہا“ انتہائی جذباتی افسانہ ہے جب کہ ”ایک یک لباس آدمی“ اور ”مچھلی“ انتہائی ادنیٰ موضوع پر مبنی افسانے ہیں۔

آخر میں فقط یہ کہنا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے آخری عہد کو سمجھنے اور اُن کی افسانہ نگاری کے بارے میں کلیت میں رائے قائم کرنے کے لیے اُن کے اس افسانوی مجموعہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسے نظر انداز کرکے ہم اُن کی افسانہ نگاری سے متعلق مجموعی آرا مرتب کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔

☆☆☆☆

جلیل عالی

ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں

احمد ندیم قاسمی ایسے شعرا کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جن کی تخلیقات کے پیچھے ایک مرکزی تخلیقی واردات کارفرما ہوتی ہے۔ اور زندگی، معاشرے اور کائنات کے بارے میں جن کے جملہ رویے اور افکار اسی کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں۔ ندیم کو خود بھی اس کا احساس ہے۔

اپنے باطن کا ترجمان ہوں میں　　میرا ہر شعر واردات مری

اردو میں اس نوع کی سب سے بڑی مثال اقبال کی عظیم شعری واردات ہے، جو حیات و کائنات کی اک ایسی جامع، مربوط اور ہم آہنگ تعبیر سامنے لاتی ہے کہ جس سے انسان حیاتی و کائناتی پیراڈاکسوں کے درمیان ایک فعال و متحرک وجود میں ڈھل جاتا ہے۔ شاید نفسِ مطمئنہ ایک صحت مند اور تعمیری اضطراب کی حامل ایسی ہی ذہنی و روحانی آسودگی کا نام ہے۔ اقبالی روایت کے تسلسل میں ندیم کے کلام میں بھی کثرت سے ایسے اشارے مل جاتے ہیں جو اس کی اپنی سطح پر ایک مربوط فکری و احساساتی نظام کا پتہ دیتے ہیں۔ اقبال سے جذبہ و احساس اور فکر و نظر کا یہ تعلق خاص اقبال پر لکھی ہوئی اس کی نظم 'بخدمتِ اقبال' میں بھی پوری طرح جھلکتا ہے۔

چمک اٹھتی ہے بلندی پہ تری پیشانی
جب کبھی پھیلنے لگتا ہے نشیبوں میں دھواں
جس قدر امتِ مسلم پہ کرم ہیں تیرے
اتنے ہی ملتِ آدم پہ ہیں تیرے احساں
عہدِ فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی
تیرے شعروں سے چنیں جائیں گے اس کے عنواں
رومی و سعدی و غالب میں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں

مجھ کو دعویٰ ہے کہ اس دور کا شاعر ہوں میں
شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرماں
”ہرکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست
اے زخود رفتہ تہی شو زنوائے دگراں“

کلامِ ندیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی طرح وہ بھی ایک ایسے کلّی تصورِ صداقت سے وابستہ ہے، جو روح و مادہ کی ثنویت کی بجائے وحدت کا شعور ابھارتا ہے۔

دنیا اور خدا کا رشتہ جانے کون   جس کا تماشا ہے وہ آپ تماشائی

شاعری کا سنجیدہ قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ندیم کی خدا پرستی، اس کی نعت گوئی، اس کی انسان دوستی، اس کی ترقی پسندی، اس کی انقلابیت، اس کی ناقابلِ شکست رجائیت اور اس کی مستحکم پاکستانیت اسی جامع نظریۂ حیات و کائنات سے ہم رشتہ ہے، جس کی تعبیرِ نو اقبال کے فکر و احساس کی صورت میں ہوئی ہے۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ یہ ہمارا تہذیبی المیہ ہے کہ اقبال نے جس مذہب کو ملاؤں سے چھین لیا تھا، ہمارے آزاد خیال اور ترقی پسند دانشوروں نے اسے پھر سے ان کی جاگیر بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں اقبال کی اس روایت کا تسلسل سوائے ندیم کے کسی اور کے ہاں کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ ندیم نے تو سجاد ظہیر کی طرف سے مذہب سے پیچھا چھڑانے کے مطالبے پر یہ کہہ کر اپنی مذہب دوستی کا برملا اظہار کر دیا تھا کہ میرا مذہب مجھے محنت کشوں اور زیر دستوں کی حمایت سے نہیں روکتا۔ اس حوالے سے اپنے شروع کے شعری مجموعے ’جلال و جمال‘ کے دیباچے بعنوان ”میرا فنی نظریہ“ میں درج ندیم کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

> ”انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انھیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو یہ ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب ہمیں بد اخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا۔۔۔۔ مادہ کی قوت مسلّم لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ جو ایک غیر محسوس حسن کارفرما ہے اس سے ایک سچا شاعر قطعاً

> منکر نہیں ہو سکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالم گیر حسن کا احساس ہے۔"

اسی تحریر میں وہ ایک جگہ اپنی عزیز تمناؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "مذہبی رنگ کی شاعری مولانا ظفر علی خان اور پھر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی بازگشت تھی، اسلامی لٹریچر بہت وسیع ہے اور مجھے اس کے گہرے مطالعے کے وافر مواقع نہیں ملے، اس لیے میں اس صنف میں کسی نوع کی انفرادیت نہ پیدا کر سکا۔ مگر آئندہ چل کر اس رنگ میں نہایت بھرپور انداز میں لکھنا میری عزیز تمناؤں میں شامل ہے اور کیا عجب ہے کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں آئندہ اپنی نظموں میں پیش کر سکوں۔۔۔۔۔ میں نے جو کہا، وہ احساس کی اس خاص رَو سے مجبور ہو کر کہا جسے "روحانی نغمگی" سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا۔"

نوجوانی میں جس شاعر کی حسرتوں اور جس کے آدرشوں کا یہ عالم ہو وہ آخر ان سے کتنا دور جا سکتا ہے!

چناں چہ یہی زاویۂ نگاہ اس کی بعد کی وضاحتی تحریروں میں بھی نمایاں ہوتا رہا۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

> "ترقی پسند تحریک کی معاشی ناہمواریوں کے خلاف جد و جہد سے میں بہت متاثر ہوا اور اس سے مرے عقائد پر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اس کی رکنیت قبول کی۔ اس کے عہدوں پر فائز رہا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میں ترقی پسند ہوں۔ میں کمیونسٹ کبھی نہیں رہا اور اس کی وجہ مرے اردگرد پھیلا ہوا مذہبی ماحول تھا۔ میں خدا کا منکر نہیں ہوں اور رسولِ کریم کو خاتم النبیین مانتا ہوں۔ جو ادیب بھی طبقاتی کشمکش اور ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، میں اسے ترقی پسند سمجھتا ہوں"

صوفیا حقیقتِ اولیٰ کو حسنِ مطلق سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام مظاہرِ کائنات میں اسی کی جلوہ گری دیکھتے ہیں جیسے میر درد کہتا ہے۔

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بے شک فکری سطح پر اس میں وحدت الوجودیت کا پرتو بھی موجود ہے مگر اس تجربے کی نفسیاتی و احساساتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے ہاں بھی اس کی دونوں جہتیں نمایاں ہوئی ہیں۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو   لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

ندیم کی ایک رباعی دیکھیے:

عکس اس کا بہر رنگ نظر آتا ہے   ہر شے پہ طلسم بن کے منڈلاتا ہے
اے نرم ہواؤ، کلیو، غنچو   یہ کون جھلک دکھا کے چھپ جاتا ہے

کلاسیکی تنقید میں حسن و جمال سے تعلق، لگاؤ، وابستگی اور محبت کے حوالے سے عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں، اور وہی شاعری بڑی شاعری قرار پاتی ہے جو عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف عمودی اور ارتقائی سفر کا سراغ دیتی ہے۔ جس میں حسنِ مجازی بھی حسنِ حقیقی و مطلق کی جھلک دکھاتا ہے۔ ندیم کے ہاں کثرت سے ایسے اشعار موجود ہیں جو اپنی معنویت میں وسیع سے وسیع تر اور ارفع سے ارفع تر ہوتے ہوئے احساسِ جمال کے نفسیاتی و روحانی تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں   تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا

وہ مرا کفر بھی ہے وہ مرا ایمان بھی ہے   اس نے لوٹا ہے مجھے اس نے بسایا ہے مجھے

ہماری روحانی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں بستا ہے۔ ندیم کے ہاں اس تجربے کا والہانہ اظہار دیکھیے:

خورشید بدست جستجو کی   لیکن تو کہیں نظر نہ آیا
ہم دل کا دیا جلا کے لائے   جب جا کے ترا سراغ پایا

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے   اترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

اللہ تعالیٰ کی ذات بے حدود و بے قیود ہے۔ ہر دن اس کی نئی شان سے طلوع ہوتا ہے۔ حالی نے اس ذاتِ لامحدود سے اپنے تعلق کو یوں بیان کیا ہے۔

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا   بہت وسعت ہے میری داستاں میں

ندیم کے ہاں اس بصیرت افروز احساس و تجربے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے   مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ذاتِ باری سے زندہ تعلق کی استواری کی ایک صورت شکر گزاری بھی ہوتی ہے۔

اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں   غم دیے ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی

قرآن میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ خود کو ظاہر کرے گا اور خلق براہِ راست اس کے جلوے سے فیض یاب ہو گی۔ اس پہلو سے ندیم کے فکر و احساس کے رنگ دیکھیے۔

اس توقع پہ میں اب حشر کے دن گنتا ہوں   حشر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو تُو ہو گا
اگر ہے موت میں کچھ لطف تو بس اتنا ہے   کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم

خودی کے پیامبر اقبال نے خدائے واحد کے حضور خود کو جھکا دینے کی نفسیاتی و روحانی برکتوں کی طرف اپنے ایک مشہور شعر میں یوں اشارہ کیا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے   ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ندیم بھی اسی تصورِ توحید سے قوت لیتا ہے اور صاحبانِ اقتدار کے جبروت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتا ہے۔

ہم نے سجدہ کیا صرف ایک خدا کے در پہ   ہم سر افراز گزرتے رہے درباروں سے

تصوف میں ’باخدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار‘ کا قرینہ بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اس کے مطابق خالق و مالک کے ساتھ صوفی و شاعر بعض اوقات شکوہ و شوخی کر جاتے ہیں مگر رسولِ پاکؐ کے حضور ایسی جسارت کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ خدا سے شوخی کے معاملے میں اقبال جیسی مذہبی گہرائی رکھنے والا شاعر بھی کبھی کبھی عالمِ دیوانگی و وارفتگی میں ’بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے‘ سے بھی بڑھ کر یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ:

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل   آپ بھی شرم سار ہو مجھ کو بھی شرم سار کر

ندیم کے کلام میں بھی اس کے اپنے نفسی و جذباتی دائرے میں خدا سے شکوہ و شکایت اور شوخیوں کی صورتیں موجود ہیں۔

تیری رحمت تو مسلم ہے مگر یہ تو بتا   کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی
پھٹے پھٹے سے ہیں کیوں ہونٹ میرے کھیتوں کے   اگر خدا کے تصرف میں سب خدائی ہے
اُس کا ہونا مرے ہونے سے ہے   میں نہ ہوتا تو خدا کیا کرتا

مگر ندیم جب سنجیدگی سے انسان کے فکر و عمل پر نگاہ ڈالتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ انسان اپنی گمراہی اور سرکشی سے نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مشکلات پیدا کرتا اور اپنے بلند مرتبہ و مقام سے گر کر حقیقی کامیابیوں سے محروم رہتا ہے۔

زخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں   صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے تیرے

اقبال کی طرح ندیم بھی مجہول مذہبیت پر کڑی تنقید کرتا ہے۔

ندیم اس عہد کا یہ المیہ ہے   موحد نے خدا کو بُت بنایا

حالی نے کٹر پن کے نمائندہ مولویوں پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی جباری و قہاری پر زور دیتے اور عذاب دوزخ کا نقشہ کھینچتے رہتے ہیں، اس کے رحمان و رحیم ہونے کا تذکرہ کم کرتے ہیں۔ یوں ان کی اپنی شخصیت عفو و درگزر اور شفقت و محبت سے عاری ہو کر خوف و غضب کا پیکر بن جاتی ہے۔

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے   یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ندیم اس بات کا تمنائی ہے کہ ذاتِ باری کی رحمتوں، شفقتوں اور محبتوں کا ذکر زیادہ سے زیادہ کیا جائے تا کہ اس سے اس کے ساتھ شکر گزاری اور قربت کا تعلق پیدا ہو۔

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الٰہی کا ثبوت   پھول بھی دشت میں تھے حشر بھی جذبات میں تھے

اس لیے وہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور یہ امید رکھتا ہے کہ:

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل   میں کہ ہوں ایک مدح خوانِ جمال

رب کریم نے انسان کو بہترین فطرت پر پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ "تخلقو باخلاق اللہ" کے حوالے سے اقبال کے کلام میں انسان کے خلیفتہ اللہ یا نائب الٰہی ہونے کے منصب و مقام کی طرف جگہ جگہ اشارے ملتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز

ندیم کے اپنے لب و لہجے میں اس تصور کا اظہار یوں ہوا ہے۔

یہ راز مجھ پہ کھلا اس کی حسن کاری سے   کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتو

یوں خود شناسی صحیح معنوں میں خدا شناسی کا زینہ بن جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ ندیم نے اس حوالے سے ایک اور نفسیاتی و شعری پہلو نکالا ہے۔

اپنا ادراک ہے دراصل خدا کا ادراک   شاید اس خوف نے خود مجھ سے چھپایا ہے مجھے

حیات و کائنات میں انسان کے اعلیٰ مرتبہ و مقام کے ناتے ندیم کے ایک شعر میں تفاخر اور سرخوشی کا ایسا

اظہار ہوا ہے کہ یہ زبان زدِ عام ہو گیا ہے۔

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں   کہ کائنات کا دولھا ہوں میں ندیم ہوں میں

قرآنی تعلیمات کی رُو سے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اور تحصیل علم کی خاطر زمیں پہ چلنے پھرنے اور مشاہدہ کرنے کو ہمارے فرائض میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اقبال نے انسان کے آفاق گیر اور کائنات شکار جوہر کی نشان دہی کرتے ہوئے کیسے کیسے غیر معمولی اشعار کہے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے   کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ندیم نے بھی خلائی تسخیر کے حوالے سے انسانی کامیابیوں پر فخر و انبساط کے تاثرات کو اپنے اسلوب خاص میں یوں شعر کیا ہے۔

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پا لوں صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے
(مراجعت)

دنیا کی ہر ادبی روایت میں ایک مثالی انسان کا تصور موجود ہے جس کے پیچھے کسی نہ کسی مقدس ہستی کا پرتو جھلکتا ہے۔ مسلم دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کے مرکزی مثالی انسان کے پیکر میں جناب رسالت مآبؐ ہی کی سیرت کے عکس جلوہ گر ہیں۔ مسلمان شعرا نے جہاں کہیں زندگی کے مختلف احوال کے تناظر میں اخلاق و فضیلت کے حامل انسانی رویوں اور عظمتِ کردار کی عکاسی کی ہے وہاں بالواسطہ آپ ہی کی صفاتِ مبارکہ کی جھلکیاں نمایاں ہوئی ہیں۔ مثلاً اقبال کے ایسے کئی اشعار یاد آنے لگتے ہیں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ   سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اسی طرح ندیم جب یہ کہتا ہے کہ

انسان کو انسان سمجھنا بھی تو سیکھو   اچھا ہے سو اچھا ہے برا ہے سو برا ہے

تو دھیان خود بخود اس حدیث پاک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے مطابق رسولؐ اللہ نے ظالم سے بھی محبت کا درس دیا ہے۔ جب آپ سے استفسار کیا گیا کہ ظالم سے محبت کے کیا معنی ہیں تو آپؐ نے فرمایا اس کو اس کے ظلم سے بچانا۔ ندیم کی غزلوں اور نظموں میں ایسے بہت سے مضامین موجود ہیں جن میں حضورِ پاکؐ کی سیرت اور تعلیمات کے عکس اجاگر ہوئے ہیں۔

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک   تو ہر انساں کو سینے سے لگایا
میرے فن کا کام حیات افروزی ہے   صحراؤں کی وسعت میں لالے کی طرح

مگر حضورِؐ اکرم سے ندیم کی محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اس نے باقاعدہ نعتیں بھی لکھیں اور ایسے ایسے اشعار کہے جو اردو کی نعتیہ شاعری میں وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اے مرے شاہِ شرق و غرب نانِ جویں غذا تری   اے مرے بوریا نشیں سارا جہاں گدا ترا
ہر آدمی کو تشخص ملا ترے دم سے   جو بے شمار تھے ان کو شمار تو نے کیا
ظلمتِ دہر میں میں جب بھی پکاروں اس کو   وہ مرے قلب میں قندیل جلا دیتا ہے

وہ اپنے فنِ شعر میں بھی آپؐ کے طرزِ کلام سے فیض یابی کو اپنا اعزاز قرار دیتا ہے۔

میرا معیارِ غزل خوانی ہے   حرفِ سادہ میں بلاغت انؐ کی

وہ رزم گاہِ حیات میں آپؐ ہی کے کرم سے سر اٹھا کر جینے کی جوت جگاتا اور جابر و ظالم حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ پاتا ہے۔

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم   مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
دربارِ شہ میں بھی میں اگر سرکشیدہ ہوں   اس کا ہے یہ سبب مرا پندار آپؐ ہیں

ہماری تہذیبی تاریخ گواہ ہے کہ ہم پر جب بھی کبھی مشکل وقت پڑتا یا کوئی بحرانی صورتِ حال سامنے آتی ہے ہم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے اور حضورِ پاکؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ندیم کے ہاں بھی ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں عصری بحرانوں میں آپؐ کو یاد کیا گیا ہے۔

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ   راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا
وہی سر سبز کرے گا مرے ویرانوں کو   آندھیوں کو بھی جو کردارِ صبا دیتا ہے
غم تو اس دور کی تقدیر میں لکھے ہیں مگر   مجھ کو ہر غم سے نمٹ لینے کا یارا دے دے

زندگی اور کائنات میں خیر و شر کے درمیان ایک ازلی پیکار جاری ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے قرآنی ہدایت اور اپنی سیرتِ پاک کے ذریعے ہمیں جس نظریۂ حیات و کائنات سے رُوشناس کرایا ہے اس کے مطابق اس رزم گاہِ حیات میں سوائے ان کے جو کتاب و سنت کی روشنی میں خیرِ کثیر کا راستہ اپناتے ہیں؛ ’’بے شک انسان خسارے میں ہے۔‘‘ چناں چہ اللہ کا عطا کردہ جذبۂ خیر نہ صرف ہمارے اندر جاری نیکی و بدی کی کشمکش میں ہمیں اپنی کمزوریوں پر غلبہ پانا سکھاتا ہے بل کہ سیاسی و معاشرتی ظلم و جبر میں سچ کی گواہی دینے اور شر کے خلاف مزاحمت پر ابھارتا ہے۔ اس سے ہماری تخلیقی و فنی دنیا میں 'شاعری جزویست از پیغمبری' کے نصب العین کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے اخلاقی و روحانی نظریۂ فن کے پیچھے یہی تصورِ خیر کارفرما ہے جو شاعرِ رنگیں نوا کو دیدۂ بینائے قوم بناتا اور شرق و غرب سے بیزار ہوئے بغیر ہر شب کو سحر کرنے کا عزم ارادہ بیدار کرتا ہے۔ مجید امجد بھی کہتا ہے کہ 'میں کائنات میں جاری عملِ خیر کے تسلسل میں شاعری کرتا ہوں۔' ندیم کا فکر و فن بھی اسی عظیم روایت سے رشتہ جوڑتا ہے۔

یوں تو ہے شعر کا جمال لفظ کا لے سے اتصال   میں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیمبری کے بھی
یہ جو ندیم مرے شعروں میں سازِ محبت بجتا ہے   گونج کچھ ایسی ہی تو سنی تھی روزِ ازل کی اذانوں میں
اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا   تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤں
جی چاہتا ہے فلک پہ جاؤں   سورج کو غروب سے بچاؤں

مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گمھا گھمیوں کا پیامبر ہوں
مجھے بچاؤ کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کروں کی کائناتِ بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو خدا کا گھر ہوں

(بیسویں صدی کا انسان)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نزدیک اعلیٰ ترین ادب اعلیٰ ترین فضیلتوں کا پاس دار ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ ادبِ عالیہ کے لیے درج ذیل تین عناصر لازمی قرار دیے ہیں۔

(1) معانی یا خیال میں جمالیاتی تاثیر موجود ہو۔

(2) بیان یا اظہار میں جمالیاتی تاثیر موجود ہو

(3)   یہ جمالیاتی تاثیر کسی دوسری فضیلتِ عالیہ سے متصادم نہ ہو۔

ان کے مطابق اسلامی فکری وتہذیبی روایت میں عدل کو 'اُم الفضائل' ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ ندیم بھی ایسے ادب وفن کو رد کرتا ہے جو خیر کے فروغ سے بے رشتہ ہو کر حق وانصاف کی گواہی سے گریز کرے اور بُرائی کی مختلف معاشرتی وتہذیبی اور سیاسی ومعاشی صورتوں کے خلاف مزاحمت سے کترائے۔ وہ ایسے فن کاروں کو انسانیت کے دشمن قرار دیتا ہے اور ان کے بیمار خیالات کو ''منفیت کے منشور'' کا عنوان دیتا ہے۔

چلو کچھ اور سوچیں/لفظ سے مفہوم کی دولت اُچک لیں/اور اسے پتھر بنا ڈالیں/زبانیں نوکِ نشتر کی طرح سینوں میں گاڑیں/نغمگی کو چیخ میں بدلیں/سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں/وادیوں میں دلدلیں بھر دیں/چلو کچھ اور سوچیں/اب یہی سوچیں/کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے/وہ سب کفر ہے/اور حق فقط یہ ہے/کہ جو کچھ ہے/نہیں ہے/واہمہ ہے/خواب ہے/اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں۔

اس کے برعکس ندیم کا منشور جرأت وبے باکی کے ساتھ سچ کی گواہی دینا ہے۔ وہ جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو سب سے بڑا جہاد سمجھتا ہے۔ اس کے کلام میں اس جہاد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ٹوٹا تو کتنے آئنہ خانوں پہ زد پڑی   اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
یہ کیا کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں   اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ ذکرِ شب نہ کریں

مرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی/راز کیوں کھولتی ہے/میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا/رات دن رولتی ہے/یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا/اپنے پَر تولتی ہے/اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر/بوند بھی بولتی ہے   (پابندی)

ندیم جب اپنے زمانے میں عالمی سطح پر حق وانصاف کی قدروں کو پامال ہوتے، بڑے بڑے دانشوروں کے افکار ونظریات کو استحصال کا آلۂ کار بنتے اور قلم کاروں کو مصلحتوں اور مفاہمتوں کا بیوپار کرتے دیکھتا ہے تو اس کا دل شدتِ کرب سے بلبلا اٹھتا ہے۔ ہمارے شاعر مغلیہ سلطنت کے زوال، انگریزوں کی لُوٹ کھسوٹ اور معاشرے کے ادبار وانتشار کے حوالے سے شہر آشوب لکھتے رہے ہیں۔ ندیم نے اپنی شاہکار نظم 'پتھر' کی صورت میں انسانیت کے عالم گیر اخلاقی وتہذیبی زوال پر عہد آشوب قلمبند کردیا ہے۔

ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں

کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا

جتنے معیار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے میری زباں پتھر ہے
ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار

ہماری فکری تہذیب کی روایت میں انسان دوستی ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو دنیا بھر کی فکری وتہذیبی روایات میں انسان دوستی کے حوالے سے بہت سے مشترکات موجود ہیں اور یہ تمام انسانوں کے باطن میں وہبی طور پر ودیعت کیے گئے عالمگیر اشتراکِ خیر کا پتہ دیتے ہیں۔ تاہم انسان دوستی کے جذبے کے متحرک ومنظم ہونے کے لیے کسی نہ کسی مربوط نظامِ فکرواحساس کی اساس ناگزیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجرد انسان دوستی کوئی شے نہیں ہوتی۔ حقیقی انسان دوستی خلا میں بروئے کار نہیں آتی بل کہ کسی نہ کسی مربوط نظامِ فکرواحساس پر استوار ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر نظریۂ حیات اور فکری وتہذیبی روایت میں انسان دوستی کی جہت لازمی طور پر موجود ہوتی ہے اور ہر فرد یا گروہ کی انسان دوستی کی نوعیت، گہرائی اور گیرائی کا تعین اس کے نظریۂ حیات ہی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ندیم کے ہاں انسان دوستی کے ان خیالات، جذبات و احساسات اور رویوں کا اظہار ہوا ہے، ان سے اس کے سرچشمۂ فیض کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے   محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پر
میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا   ایک ذرہ بھی تو بیکار نہیں ہو سکتا

ندیم کا ایک اور شعر دیکھیے جس میں اس کی آفاقی انسان دوستی اپنی فکری تہذیبی روایت کی واضح شناخت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔

انساں کا محبت بھرا دل تھا مرا مسکن   مشرق تھا نہ مغرب تھا عرب تھا نہ عجم تھا

کیااس شعر کے پسِ پردہ حضورؐ اکرم کا یہ فرمان اپنی واضح جھلک نہیں دکھا تا کہ 'تمام انسان برابر ہیں۔ کسی گورے کو کالے پر یا کسی کالے کو گورے پر، کسی عربی کو عجمی پر یا کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ ایسی انسان دوستی کی اگلی منزل سچی عوام دوستی ہے جو لوگ اردگرد کی معاشی، معاشرتی سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے کسی ماورائی قسم کی انسان دوستی کی باتیں کرتے ہیں ندیم ان کے اس رویے کو رد کرتا ہے اور عوام سے سچی اور عملی وابستگی کو ضروری قرار دیتا ہے۔

آسمانوں کی طرف مت دیکھو
تم زمیں پر ہو تو اس تک حدِ امکانِ رسائی پھیلاؤ
اس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں، دماغوں میں، دلوں اور
ضمیروں میں کئی رنگ کے افلاک لیے پھرتی ہے
انہی افلاک کو چھونے کا کوئی چارہ کرو
اپنی بھرپور توانائی کو
آسمانوں کے سرابوں میں نہ آوارہ کرو (افلاکِ زمینی)

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

وہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی عوام کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھاتا ہے تو معاشرے کی مفاد پرست استحصالی قوتیں اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کر کے اسے بے اثر بنانے کی مذموم کوشش کرتی ہیں۔

وہ اٹھے قافلہ در قافلہ پورب سے پچھم سے
وہ لپکے کارواں در کارواں اقصائے عالم سے
ملوں سے مرغزاروں سے بنوں سے کوہساروں سے
دکانوں سے گھروں سے علم و دانش کے اداروں سے
مرا فن ان کی عظمت کا جب استقبال کرتا ہے
تو استحصال مجھ پہ کفر کا الزام دھرتا ہے

(ادب و سیاست)

محنت کش عوام سے اس کی سچی کومٹ منٹ اس کے سارے کلام میں ایک فعال اور متحرک رَو کے طور پر جگہ جگہ اپنا احساس دلاتی ہے۔

میں تمہارا ہوں
تم میں سے ہوں
آج سے زندگی کا پجاری ہوں
محنت کشوں کی جبینوں کی تابندگی کا پجاری ہوں
میں زندگی کے لیے اپنے فن کا فسوں نذر لایا ہوں
تابندگی کے لیے اپنا خوں نذر لایا ہوں
رخشندگی کے لیے اپنا سوزِ دروں نذر لایا ہوں   (میں تمہارا ہوں)

وہ عوام کی اجتماعی قوت وتوانائی کو انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد گردانتا ہے اور محض ادبی وفنی حوالے سے اپنی برتری کے زعم میں مبتلا اصحابِ فن پر زندگی کو اپنی محنت اور عمل سے آگے بڑھانے اور سنوارنے والے صاحبانِ عمل کو فوقیت دیتا ہے۔

ندیم جن کے ارادوں میں ڈھل رہی ہے حیات   ہم ایسے فن کے اماموں سے وہ عوام بھلے

ندیم کی عوام دوستی اپنی فکری وتہذیبی روایت کی اعلیٰ ترین فضیلت یعنی 'عدل ومساوات' کو عملی اور حقیقی طور پر جیتی جاگتی زندگی میں کارفرما دیکھنا چاہتی ہے۔

کوئی سورج سے پوچھے عدل کیا ہے حق رسی کیا ہے   کہ یکساں دھوپ بٹتی ہے صغیروں میں کبیروں میں

معاشرے میں عدل ومساوات کی قدروں کے پامالی دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ جرأت وبے باکی سے جبر واستحصال کی ذمہ دار بالادست قوتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

مال چوری کا جو تقسیم کیا چوروں نے   نصف تو بٹ گیا بستی کے نگہبانوں میں

اس اندازِ اظہار پر استحصالی قوتوں کی برہمی لازمی ہے۔ اور وہ ایسی آواز کو دبانے کے لیے ہر طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں سے کام لیتی ہیں۔

ندیم ہم کو تو اس جرم کی ملی ہے سزا   کہ عدل مانگنے کو ہاتھ کیوں اٹھا بیٹھے
حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم   زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے

مگر ندیم کی حق پرستی کسی طرح جبر و اکراہ کو خاطر میں نہیں لاتی اور اظہار و بیان پر پابندیوں کے زمانوں میں بھی وہ سچ کہنے کا کارِ خیر انجام دینا ضروری جانتا ہے۔

اک بغاوت ہے ایک نیکی ہے جس میں موجۂ ہوا ہوتا

ندیم کی شعری واردات کی ایک نہایت اہم جہت اس کی سچی اور مستحکم پاکستانیت ہے۔ وطنِ عزیز سے اس کی گہری اور عاشقانہ محبت کا اظہار اس کے کلام میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ پاکستان اس کے لیے محض زمین کے ایک ٹکڑے کا نام نہیں۔ یہ اس کے آدرش اور خوابوں کی علامت ہے۔ وہ اپنے فکری و تہذیبی تشخص کی سلامتی کے ساتھ نہ صرف قومی سطح پر اسے حسن و خیر کے سپنوں کی تعبیر بنانا چاہتا ہے بلکہ عالمی تاریخی عمل میں بھی اپنے عظیم نصب العین کے حوالے سے اس کے بامعنی اور نتیجہ خیز کردار کے درخشاں امکانات کا ولولہ انگیز یقین رکھتا ہے۔ پاکستان کے یومِ آزادی کے حوالے سے اس کے ذوق و شوق اور جذبۂ جوش کی ایک جھلک ملاحظہ کریں۔

مجھ کو اس دیس کی اک ایک گلی پیاری ہے
مجھ پہ اس دیس کا احسان بہت بھاری ہے
میں تجلی کا پیامی ہوں جلاؤ شمعیں
آج ہر طاق پہ ہر گھر میں جلاؤ شمعیں

(جشنِ چراغاں)

دیکھیے ایک دعائیہ نظم میں گہرے جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ ساتھ پاکستانی تشخص کے خصوصی خدوخال کس خوبصورتی سے اجاگر ہوئے ہیں اور اس کے بین الاقوامی کردار کو کیسے نمایاں کیا گیا ہے۔

یا رب مرے وطن کو اک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے
ہر فرد میری قوم کا اک ایسا فرد ہو
اپنی خوشی وطن کی خوشی پر جو وار دے
یہ خطۂ زمین معنون ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

(دعا)

ندیم نے تحریکِ پاکستان میں عملی طور پر جس جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور اقبال اور قائدِ اعظم کی مسلم لیگ کے لیے دن رات جس تن دہی سے کام کیا وہ ایک الگ تفصیلی جائزے کا موضوع ہے۔ قائدِ اعظم نے کہا تھا پاکستان اسی روز بن گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ ڈاکٹر کنیز یوسف کے منہ سے اسلام آباد تھنکرز فورم کے ایک اجلاس میں پاکستان کی تاریخی وتہذیبی اہمیت کے حوالے سے دریا کو کوزے میں بند کرتا ہوا ایک ایسا ہی پُرمغز اور بلیغ جملہ ادا ہوا۔ انھوں نے کہا "تشکیلِ پاکستان، چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں کی دوسری بڑی کامیابی ہے۔" بے شک تخلیقِ پاکستان تاریخی وتہذیبی معنویت کے اعتبار سے ایک بے مثال جوہری پیشرفت ہے۔ لیکن حصولِ پاکستان کے عظیم مرحلے کے سر ہو جانے اور قائدِ اعظم کے آنکھیں بند کر لینے کے بعد جس طرح اصل مقاصد سے رُوگردانی کی گئی اور ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، اس دکھ کو ہر دردمند شاعر نے شدت سے محسوس کیا اور اس صورتِ حال کے حوالے سے صرف فیض نے ہی یہ کہہ کر اپنی تشویش اور اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر   وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

بہت سے دوسرے معتبر شاعر بھی اس صورتِ حال سے اپنے عدمِ اطمینان کو سامنے لائے۔ اور تو اور ہمارے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری نے اپنا ردِعمل یوں ظاہر کیا۔

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے   یہ مری رات کا سویرا ہے
قافلہ کس کی پیروی میں چلے   کون سب سے بڑا لٹیرا ہے

ان حالات میں ندیم کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چناں چہ اس نے بھی اپنے اسلوبِ خاص میں صورتِ حال پر یوں تبصرہ کیا۔

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے   ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر   آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

مگر جس طرح فیض نے دل شکستہ ہونے کی بجائے وطنِ عزیز میں امن ومحبت اور عدل ومساوات کے حصول کی جدوجہد جاری رکھنے کا پیغام دیا۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی   چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اسی طرح رجائیت کے پیکر ندیم نے بھی وطنِ عزیز میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کو اپنی قلبی

گہرائیوں سے محسوس کر کے اپنے پرخلوص اور دردمندانہ سروکار کا ثبوت دیا ہے ۔ کیوں کہ اس کے نزدیک ملکی حالات نادرست ہونے کے باوجود

بیزار ہے جو جذبۂ حب ا لوطنی سے   وہ شخص کسی سے بھی محبت نہیں کرتا

ندیم وطنِ عزیز پاکستان کو صرف ایک جغرافعیائی قومی خطۂ زمین نہیں سمجھتا تھا وہ اس کے اسلامی تہذیبی تشخص کو بڑی اہمیت دیتا تھا ۔ اور یہ بات اس کے آدرش کا لازمی حصہ تھی ۔ اس کا یقین تھا کہ:

> ”اگر آج بھی ہم اپنے افکار و خیالات کو تخلیق و اجتہاد سے روشناس کر دیں اور اس جرأت مندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی ، سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنا دیں ، جس کے باطن میں جلال و جمال برابر تناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے ۔“

ستمبر 1965 میں برپا ہونے والی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں پاکستانی شاعروں نے بہت کچھ لکھا ۔ اس دوران تخلیق ہونے والے رزمیہ نغموں ، غزلوں اور نظموں میں پاکستان کا قومی تشخص اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ۔ اور اس ہنگامی نوعیت کی شاعری میں بھی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل بہت سی ایسی تخلیقات سامنے آئیں جو ہمارے شعری ادبی سرمائے کا مستقل حصہ بن گئیں ۔ اس وقت ندیم نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے کالموں اور اور دیگر نثری تحریروں میں بھی اپنے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار کر کے دفاعِ وطن میں فعال کردار ادا کیا ۔ یہاں تک کہ اس نے ریڈیو پاکستان کے ذریعے بھارتی شاعروں ، ادیبوں اور دانشوروں سے خطاب کیا اور کشمیر پر بھارت کے ناجائز قبضے کے حوالے سے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا ۔ ان دنوں ندیم نے پُرخلوص حب الوطنی اور جذبہ و جوش میں ڈوبی ہوئی جو شاعری کی اس میں اس کی نظم ”چھ ستمبر“ تو زبان زدِ عام ہو کر ہمیشہ کے لیے لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہو گئی ۔

چاند اُس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود
ایسے خوں رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش

ایسے بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اس رات کی سفاک سپاہ
دودھ پیتے ہوئے بچوں کو پرو لائی تھی

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں اجالا ہوں سحر ہوں میں حقیقت ہوں میں
میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں افلاک کی دہشت ہوں میں

پھر 1971 میں سقوطِ ڈھاکہ کے المیے کے حوالے سے اس نے جہاں اپنے نثری اظہاریوں میں امریکہ کے ساتھ ساتھ روس کے پاکستان دشمن کردار کی بھی مذمت کی وہاں اس دلدوز سانحے پر وطن کے حضور اپنے اشعار میں خون کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن میں روتا ہوں
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزت، باعصمت ماں
تیرے دامانِ دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت وغم میں دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن میں روتا ہوں (میں روتا ہوں)

اور خدا کے حضور گڑگڑاتے ہوئے اپنے جذبہ واحساس میں تمام ہم وطنوں کو یوں شامل کیا۔

شاید اس نظارے سے رب دو جہاں چونکے   آؤ اپنے ملبے پہ بیٹھ کر دعا مانگیں

مگر یہ ندیم کی نا قابلِ شکست رجائیت کا کمال ہے کہ غم واندوہ کے اتنے سیاہ بادلوں میں بھی وہ

آفتاب امید کی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتا اور اہلِ وطن کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے ۔

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
جہاں سے پھول ٹوٹا تھا وہیں سے کلی سی اک نمایاں ہو رہی ہے
جہاں بجلی گری تھی اب وہی شاخ نئے پتے پہن کر تن گئی ہے
خزاں سے رک سکا کب موسمِ گل یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ----

(اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کیمپوں میں زندگی گزارنے والے بہاری پاکستانیوں پر عالمی ریڈ کراس والوں نے یہ پابندی عاید کر رکھی تھی کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کو پچیس الفاظ سے زیادہ عبارت کے خطوط نہیں لکھ سکتے ۔ انسانی دکھ کو ہڈیوں کے گودوں تک محسوس کرنے اور کروانے والے ندیم نے جس شدتِ احساس سے پچیس پچیس الفاظ کی بہت سی نظمیں لکھ کر ستم زدہ بہاریوں کے درد و کرب میں شرکت کی اس سے اردو شاعری میں ایک نئی صنف متعارف ہوگئی۔ اس سلسلے کی دو نظمیں دیکھیے ۔

شہرِ ٹیگور کے اک بازار میں
تین سو میری عصمت کی بولی پڑی
آخری بولی جس شخص نے دی
وہ ٹیگور کا کتنا ہم شکل تھا

بھیا جب تم مجھ کو لینے آنا
اردو کا اک لفظ نہ کہنا
چپکے رہنا
مجبوراً کچھ کہنا پڑے تو اتنا
"میں گونگا ہوں" (25۔الفاظ)

قائدِ اعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ اس کی معنوی گہرائی تک پہنچنا تو کجا دنیا بھر کی قومی آزادیوں کی تحریکوں پر نظمیں لکھ کر اظہارِ یکجہتی کرنے والے ہمارے بیشتر شاعروں نے تحریکِ آزادیِ کشمیر کو لائقِ اعتنا نہیں جانا اور اس جد و جہد میں لاکھوں جانوں اور ہزاروں عصمتوں کی قربانیوں نے ان کے دلوں میں کوئی درد نہیں جگایا۔ ندیم نے جس جس طرح اس تحریک کو اپنے فن کا موضوع بنایا، اقوامِ متحدہ کے مجرمانہ کردار کو بے نقاب کیا اور پاکستانی مؤقف کو شعری قالب میں ڈھالا ہے، اس سے بھی اس کی مثالی پاکستانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھیلا ہوا ہاتھ برہمن کا اس چاند کا مستقل گہن ہے
جلتے ہوے گھر سنے ہوئے کھیت ہر شخص وطن میں بے وطن ہے
سنتے ہیں سمندروں کے اس پار اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق ظالم ہے وہی جو خستہ تن ہے
آج اس کی بلند مسندوں پہ ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
سچ کہتی ہیں غریب قومیں یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے
(کشمیر)

پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے تعیش اور مفادات کی خاطر وطنِ عزیز کو معاشی اعتبار سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ خود انحصاری کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے ہمیں دوسروں کا محتاج بن کر جینے پر مجبور کر دیا گیا جو کوئی بھی برسرِ اقتدار آیا اس نے کشکول توڑ دینے کے دعوے تو بہت کیے مگر عملی طور پر ملک کو پہلے سے بھی زیادہ مقروض کر دیا۔ ایسے میں ندیم نے شدتِ کرب سے مجبور ہو کر حکمرانوں کے گھناؤنے کردار کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہِ جامۂ بانات چھپا رکھا تھا
اور چہرے پہ انا تھی
جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی

لاکھ انکار کرو لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے (بھیک)

عالمی سامراجی قوتوں نے نام کی آزادی حاصل کرنے والے ممالک کو جس طرح سیاسی، معاشی اور عسکری لحاظ سے اپنا دست نگر بنا رکھا ہے، ندیم کے نزدیک یہ بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے۔ دیکھیے تضحیک و بے چارگی کا یہ دکھ اس کے ایک مشہور شعر میں کس طرح دل دوز چیخ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی تاج سر پہ رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

اور عالمی سامراج کے شیطانی مقاصد کی تکمیل میں معاون آمریتوں کی طرف سے اظہار و بیان پر لگائی جانے والی قدغنوں سے قوم کے تہذیبی جسد میں جو زہر پھیلتا ہے اس کے احساس سے ندیم کی روح تڑپ اٹھتی ہے اور وہ کہتا ہے۔

خدا نہ کردہ کسی قوم پر وہ وقت آئے کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینے میں

ندیم کی شاعری میں پاکستان کی روح بولتی ہے۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مجید امجد کی نسبتاً پیچیدہ دانشورانہ شاعری کو چھوڑ کر پاکستانی قوم اور معاشرے کی روزمرہ عوامی زندگی سے لے کر اس کے فکری و تہذیبی جوہر تک کی جتنی موجود اور امکانی صورتیں، جس تنوع، وسعت، گہرائی اور سہولتِ ابلاغ کے ساتھ ندیم کے ہاں منعکس ہوئی ہیں کسی دوسرے شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتیں۔

احمد ندیم قاسمی کو قدرت نے لمبی عمر عطا کی۔ کئی ایک شعبوں میں امتیازی صلاحیتوں اور توانائیوں سے نوازا۔ اس کی تخلیقی و تحریری سرگرمیوں کا دورانیہ پون صدی پر محیط ہے۔ اس کی شاعری، اس کے افسانے، اس کے تنقیدی و تجزیاتی مضامین۔ اس کے کالم، اس کے اداریے اور اس کا حسنِ ادارت، سب میں فکر و احساس کی وحدت موجود ہے۔ اور یہ وحدت دراصل اس کی مرکزی شعری واردات ہی کی دین ہے۔ شعر و ادب اور اظہار و بیان کے اتنے منطقوں میں ایسے عمدہ معیار کا اتنا بہت سا کام کر جانے والا شخص بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ

ایک دیا ہوں جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے اب میں چلتا ہوں

☆☆☆☆

خاور نقوی

پورے قد سے میں کھڑا ہوں

’’جمال‘‘ احمد ندیم قاسمی کا نعتیہ مجموعہ ہے جب ہم اردو نعت گوئی کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں نعت گو شعرا کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں بعض شعرا کی نعتیں اپنے تخلیقی جوہر کی بدولت بہت مقبول ہوئیں۔ لیکن کئی شعرا کے ہاں عربی و فارسی تراکیب کی ثقالت، تلمیحات کی کثرت یا محض قافیہ بندی کی بنا پر تخلیقی عنصر دب گیا ہے۔ ندیم کی نعت میں تغزل کا جو رچاؤ اور زبان و بیان کا جو بہاؤ ملتا ہے وہ دیگر اردو نعت گوؤں کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔ ندیم نے سادہ اور رواں زبان و بیان میں تغزل کی رنگ آمیزی سے نعت کے لب و لہجے کو اس طرح سنوارا اور نکھارا ہے کہ قاری ایک گونہ سرمستی و سرشاری سے دوچار ہوتا ہے۔ ندیم کے نزدیک نعت گوئی کا یہ وصف رسول اکرم، پیغمبر اعظمؐ کے ارشادات کی سادگی و دلکشی کا مرہونِ منت ہے۔

میرا کمالِ فن ترے حسنِ کلام کا غلام
بات تھی جاں فزا تری، لہجہ تھا دل ربا ترا
ہے میرے لفظ لفظ میں گر حسن و دلکشی
اس کا یہ راز ہے، مرا معیار آپؐ ہیں
ہر دائرہ آواز کا لفظ محمدؐ بن گیا
میرے لیے تو قبلۂ صوت و صدا بھی آپؐ ہیں

ندیم کی نعت کی انہی صفات کی بنا پر ان کے اشعار قاری کے حافظے کا جز بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اے مرے شاہ شرق و غرب! نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریا نشیں! سارا جہاں گدا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا
شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا

قرآنِ پاک انؐ پہ اتارا گیا ندیم
اور میں نے اپنے دل میں اترا ہے ان کا نام

رب کائنات کے بعد آپ کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ عالم انسانیت میں کوئی آپ کی مثال نہیں۔ یہ مضمون نعت گوشعرا نے کثرت سے باندھا ہے۔ لیکن ندیم نے اسے منفرد رنگ و آہنگ کے ساتھ سلکِ شعر میں پرو دیا ہے۔

اس خدا سے مجھے کیسے ہو مجالِ انکار
جس کے شہ پارۂ تخلیق کا عنواں تو ہے
وہ بشر ہے، کہ یہی اس کا ہے ارشاد، مگر
اس جہانِ بشریت میں ہے یکتا بھی وہی

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے۔ لاقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ۔ بے شک تمہارے لیے رسولؐ کی زندگی بہترین نمونہ عمل ہے۔ آپ کی حیات طیبہ میں ایک ایک جامع اور کامل نظام حیات ملتا ہے جو معاشرے کے کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے فرد کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ بہت نمایاں موضوع ہے جسے مشاہیر نعت گوشعرا نے اپنے اپنے لب و لہجے میں بیان کیا ہے۔ یہ موضوع ندیم کے ہاں سادگی اور پرکاری کے امتزاج سے پھوٹا ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک خاص قسم کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔

شانِ خدا بھی آپؐ، محبوب خدا بھی آپؐ ہیں
تجسیمِ حق بھی آپؐ ہیں اور حق نما بھی آپؐ ہیں
اپنے رفیقوں کے لیے پتھر بھی ڈھونڈے آپؐ نے
اور دشمنوں کے حق میں مصروفِ دعا بھی آپؐ ہیں

پتھروں میں بھی لہو دوڑ گیا
اس قدر عام تھی رحمت انؐ کی
آج ہم فلسفہ کہتے ہیں جسے
وہ مساوات کی عادت انؐ کی

رنگ کی قید، نہ قدغن کوئی نسلوں کی
جس کے در سب پہ کھلے ہیں وہ دبستاں تُو ہے

مجھے قسم ہے تری سیرتِ منزہ کی
کہ تاج و تخت پہ اک طنز تھی چٹائی تری

حضرت ختمی مرتب کی ذات والا صفات سے اپنے آپ کو نسبت دے کر مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہونے کا عزم، تاریکیوں میں چراغ جلانے کا حوصلہ، عقل و شعور کی جلا اور دین و دنیا میں کامیابی کا اصول نعت کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ ندیم نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر اس تیور کے ساتھ کے یہ موضوع گل نو رستہ کے مانند تازہ اور شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقش کف پا تیرا
پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

اس نعت کا آخری شعر صیہونیت کے خلاف عالم اسلام کے دل کی صدا بن گیا ہے۔

ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا

ایک اور نعت کے چند اشعار دیکھیے جس کی پوری فضا تغزل میں رچی ہوئی اور حضورؐ سے والہانہ محبت کی آئینہ دار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے شاعر آپ کی بے پایاں رحمت کے ایک ایک اشارے کو بچشم خود دیکھ رہا ہے اور جہاں آپؐ کے لطف و کرم سے فیض یاب ہو رہا ہے وہاں جذب و کیف کے عالم میں اپنا دامن نیاز پھیلائے آپؐ کے دربار دُربار سے شفقت و رفعت کے گہرہائے آب دار سمیٹنے کے لیے بے تاب بھی ہے:

اس قدر کون محبت کا صلہ دیتا ہے
اس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے
جب اترتی ہے مری روح میں عظمت اس کی
مجھ کو مسجود ملائک کا بنا دیتا ہے
رہنمائی کے یہ تیور ہیں کہ مجھ میں بس کر
وہ مجھے میرے ہی جوہر کا پتہ دیتا ہے
وہی نمٹے گا مری فکر کے سناٹوں سے
بت کدوں کو جو اذانوں سے بسا دیتا ہے

وہی سیراب کرے گا میرے ویرانوں کو
آندھیوں کو بھی جو کردار صبا دیتا ہے

ایسے دور میں جب امن وآشتی اور تہذیب وشائستگی کے نام پر ظلم وجبر اور قتل وغارت کا بازار گرم ہو، جمہوریت کے پردے میں آمریت کا دور دورہ ہو، مادیت پرستی، خودغرضی اور نا انصافی نے خوفناک جال پھیلا رکھا ہو۔ آپ کی بارگاہ عدل ہی کا سہارا دل میں شمع امید روشن کرتا ہے۔ ان پر آشوب حالات میں ندیم آپؐ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

قافلے نکلے ہیں قصد چمن آرائی ہے
یہ وہ انساں ہیں جو دل سوختہ لب دوختہ ہیں
آپ ہی قدر کریں، آپ ہی فیصلہ کریں
فقط احساس کی بیداریاں اندوختہ ہیں
ان کے ہونٹوں سے برستے ہیں مساوات کے گیت
اور محلوں میں شہنشاہ برا فروختہ ہیں

اس مختصر سے نعتیہ مجموعے میں ندیم نے اس قدر متنوع مضامین جس تخلیقی گہرائی اور فنکارانہ مہارت سے پیش کیے ہیں ان کی بنا پر یہ مجموعہ بڑے بڑے ضخیم نعتیہ مجموعوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندیم نے اس مجموعے کی ابتداء میں بارگاہ ایزدی میں اپنے کلام میں الہامی اثر کی جو دعا مانگی اس کی قبولیت کے لیے درِ اجابت وا ہوا، جس کے نتیجے میں ان پر حرف وبیان کے دریچے روشن ہو گئے ہیں:

اے خدا!
میری دعا ہے
کہ مجردم کی پراسرار فضاؤں میں
ترا نطق
کسی شاخ برہنہ پہ اترتی ہوئی چڑیا کی طرح
میرے دل میں
کسی بے نام سے احساس مسرت سے
مسلسل ----
چہکے!

خاور اعجاز

احمد ندیم قاسمی کی غزل

موضع انگہ، ضلع خوشاب میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہُوئے۔ اصل نام احمد شاہ تھا اور اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی پائی جس کی شروعات مسجد میں قرآن پاک کے درس سے ہُوئی۔ پھر والد کی وفات کے بعد اپنے چچا کے پاس کیمبل پور چلے گئے جہاں سے مڈل پاس کیا۔ میٹرک شیخو پورہ سے اور بی اے بہاول پور سے کیا۔ محرر اور ایکسائز انسپکٹر کی معمولی نوکریوں کے بعد لاہور میں فاقہ کشی کی زندگی بھی گذاری لیکن اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ ”تہذیبِ نسواں“ اور ”پھول“ کی ادارت (۱۹۴۳ء) سے پیشتر محکمۂ آبکاری ملتان اور اوکاڑہ میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بعد ازاں ”ادبِ لطیف“ (۱۹۴۳ء) اور ”سویرا“ (۱۹۴۷ء) کی ادارت سنبھالی اور ریڈیو پشاور میں بھی ملازم رہے۔ ادارۂ فروغِ اردو کے تحت محمد طفیل کے ساتھ مل کر ”نقوش“ نکالا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں بطور جنرل سیکرٹری کام کیا۔ روزنامہ ”امروز“ کے ایڈیٹر (۱۹۵۳ء) بھی رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ ”فنون“ کا اجرا اُن کی زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ ڈائریکٹر مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کی حیثیت سے ۱۹۷۴ء سے لے کر آخر دم تک کام کیا۔ بحیثیت شخص خلیق، ملنسار، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ فراخ دل، سیر چشم، نیک سرشت غرض یہ کہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔

شاعر، ادیب، صحافی، مدیر اور کالم نگار کی خصوصیات یک جا کریں تو پاکستان میں احمد ندیم قاسمی کا نام چوٹی کے چند لوگوں میں شامل ہوگا۔ ان کے معاصرین میں چراغ حسن حسرت صحافت، ادارت اور کالم نگاری میں، فیض شاعری میں اور منٹو افسانہ نگاری میں ایسے نام ہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں نہایت نمایاں ہیں لیکن چراغ حسن حسرت اور فیض کو افسانہ نگاری سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، منٹو فاعلاتن فاعلات سے واقف تھے یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن صاحب وہ واحد شخص نظر آتے ہیں جن کی تخلیقی جہتوں نے ان سب ناموں کی موجودگی میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔

افسانے کے ساتھ غزل اور نظم ان کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ قطعات کی طرح ان اصناف کا

بھی ایک ایک مجموعہ دے کر خاموش ہو بیٹھتے ۔ ۱۹۴۲ء کے بعد بھی اگر چہ وہ قطعات لکھتے رہے لیکن اس صنف پر وہ پہلا سا التفات بعد میں نہ کر سکے ۔ ان کی اولین شناخت گو ایک شاعر کی حیثیت سے ہی ہُوئی جب مولانا محمد علی جوہرؔ کی وفات پر ان کی مرثیہ نما نظم ۱۹۳۱ء میں روزنامہ سیاست، لاہور میں شائع ہُوئی لیکن مَیں سمجھتا ہُوں کہ وہ شاعر سے زیادہ افسانہ نگار تھے ۔ میری یہ گذارش محض اس لیے نہیں کہ شعری مجموعوں کے مقابل ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے یا شعری مجموعہ (دھڑکنیں،۱۹۴۱ء) سے پہلے ان کا افسانوی مجموعہ (چوپال،۱۹۳۹ء) شائع ہُوا بل کہ جو مصوری انھوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے اس نے ایک طرف تو ان کی اس خواہش کو پورا کیا کہ ''مَیں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہُوں، ساتھ ہی مصور اور مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں'' (ماہنامہ افکار، ندیم نمبر۔ ص ۲۶۷) اور دوسری طرف تین چوتھائی دیہی زندگی کی ترجمانی میں شاعری (خصوصاً غزل) کی نسبت زیادہ حق ادا کیا۔ بہر حال اس وقت چوں کہ ندیمؔ کی غزل نگاری پر بات ہو رہی ہے اور ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا موازنہ مقصود نہیں لہٰذا اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

ندیمؔ صاحب نے شاعری میں اخترؔ شیرانی اور عبدالمجید سالکؔ سے مشورہ کیا ۔ بحیثیت شاعر پہلا شعر ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں کہا۔ سیاسی نظر بندیاں برداشت کیں ۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے اثرات قبول کیے۔ وہ قومی سطح کے نمایاں ترین شعرا میں شامل تھے ۔ فیضؔ کے مقابلے میں ان کی سیاسی ژرف نگاہی اگر چہ کم رہی لیکن اپنے مضامین کی وسعت اور مرقع سازی میں اپنے ہم عصروں میں نمایاں رہے ۔ اُن کی غزل عدمؔ، فیضؔ اور رئیسؔ امروہوی جیسے شعراؔ کی موجودگی میں بھی اپنا الگ تشخص قائم کرتی ہے جس میں اپنے عصر کی تقریباً ہر تصویر دیکھی جا سکتی ہے ۔ وہ ایک کمٹڈ شاعر تھے، خیر کے ساتھ کمٹڈ ۔ اسلام کی انقلابی تعبیر، سامراج دشمنی، قوم پرستی اور اِنسان دوستی ان کی شاعری کے بنیادی مسائل ہیں، اِسی لیے ان کے اشعار میں کائنات کو اِنسان کے حوالے سے دیکھنے کا رویّہ پایا جاتا ہے ۔ انسان سے محبت ان کا مسلک تھا ۔ انسان دوستی ندیمؔ کی فکر کا سب سے بڑا ستون اور آدرش ہے ۔ اسی کے بطن سے خود آگہی نے جنم لیا اور ندیمؔ کو حیات کی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملی اور وہ روایتی عشق، معاملہ بندی، غمِ جاناں سے ہوتے ہُوئے معاشرے اور غمِ دوراں کی منزل پر پہنچتے ہیں جہاں ان کی غزل کے آفاق اور کشادہ ہو جاتے ہیں اور وہ ارتفاع کی منزلیں طے کرنے لگتے ہیں ۔ ان کی شاعری عظمتِ آدم کے گیت گاتی ہے۔

اس حوالے سے کہ شہپارۂ تخلیق ہے وہ
مجھ کو انسان سے خوشبوئے خدا آتی ہے (۱)

تُو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
مَیں نے اِنساں سے محبّت کی ہے
اللہ ! مرے کفر سے تُو قطعِ نظر کر
مَیں تیری جھلک دیکھتا ہُوں نورِ بشر میں (۲)
سب خد و خال خدا کے ہیں مصور جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں ، تصویریں ہیں (۳)

در گذر کرنے کی عادت سیکھو
اے فرشتو! بشریت سیکھو

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک
انسان کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک (۴)

ان کا نظریۂ فن روحِ عصر کا آئینہ دار ہے لیکن وہ فن کو حکمت کے درجے پر فائز نہیں کرتے ۔

فِکر، فن کے لیے لازم مگر اچھے شاعر
اپنے فن کو کبھی حکمت نہیں بننے دیتے (۵)

امیؔر مینائی اور داؔغ دہلوی کے بعد اقباؔل کے ترتیب دیے ہُوئے سانچوں میں غزل کہنے والوں کے لیے ایک چیلنج موجود تھا جس سے دوسروں کے ساتھ ساتھ ندیؔم بھی دوچار ہُوئے ۔ اسی لیے ان کی اولین غزلیہ شاعری میں امیؔر و داؔغ کے رجحانات کم کم اور اقباؔل کے اثرات زیادہ ہیں ۔ فکرِ اقبال سے متاثر ہونے کے سبب ندیؔم بھی تحرک اور عمل کے قائل رہے ۔ اسے کلاسیکی روایت سے نیم جدیدیت کی طرف پیش قدمی بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں ندیؔم کے ہاں جہاں جہاں امیجری نے ظہور پایا ہے وہاں وہاں وہ کلاسیکی روایت سے اپنا الگ راستہ بناتے ہُوئے نظر آتے ہیں جس میں فکر و اظہار دونوں میں نیا پن محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اس نئے پن کے اجزا میں وطنیت ، آفاقیت اور رجائیت نمایاں ہیں ۔

ہم تو وہ دشت نوردانِ محبت ہیں ندیؔم
ایک ہی گل سے دو عالم کو معطر دیکھیں (۶)

مَیں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا
ایک ذرّہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا (۷)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
مَیں تو دریا ہُوں سمندر میں اتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہُوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا (۸)
ظلمت مِرا ماحول تجلّی مِری منزل
مَیں شب کا مسافر ہُوں ، مگر شمعِ سحر ہُوں (۹)

ندیمؔ میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
مَیں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا (۱۰)

ندیمؔ کے ہاں مثبت رویوں سے انسلاک اور اپنی اِس وابستگی کا برملا اظہار نمایاں ہے، اس لیے کہ یہ ان کی طبیعت میں روزِ اول سے ہی موجود تھے۔ ان کی شخصیت میں جو برائے نام شوریدہ سری تھی بھی وہ بھی، کسی منفی سوچ کے بغیر، اسلامی فکری تہذیبی اقدار پر بے جا تنقید کرنے والوں کے خلاف تھی۔ یہاں اس امر کی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بچپن کی صالح تربیت آگے چل کر کیسے شخصیت کی ڈھال بن جاتی ہے۔ ندیمؔ ترکِ دُنیا کر دینے والے باپ، ایثار پرور ماں اور عاقبت اندیش چچا کی گود میں پل کر جوان ہُوئے۔ اس تکون نے ان کی ہشت پہلو ذات کو ہمیشہ ایک روحانی تحفظ مہیا کیے رکھا اور وہ کسی فکری انتشار کا شکار ہُوئے بغیر تہذیبی اقدار کے سب سے بڑے منبع سے جُڑے رہے۔ اسی جڑت نے ان کے ہاں انسان کی عظمت کو پہچاننے، کائنات کو گہری تیکھی نظر سے دیکھنے اور خدا سے قربت حاصل کرنے کے سہ جہتی رویوں کا جنم دیا۔ ان سہ جہتی رویوں کو اگر ان کی ذہنی پرداخت میں کارفرما اس تکونی رشتے کے پس منظر میں دیکھا جائے جس کا ذکر ابھی مَیں نے کِیا ہےتو ان کی ذات میں گُھلے مِلے عناصر کو الگ الگ اور پھر ایک لڑی میں پروئے ہُوئے، دونوں صورتوں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ بہت فعال قوتِ متخیلہ رکھنے والے شاعروں میں سے تھے۔ ان کی غزل میں رومان، انقلاب اور صوفیانہ عناصر کے ساتھ ساتھ سیاسی اشارے بھی موجود ہیں۔ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود شاعری میں منفی ردِ عمل نہیں ہے۔ فیضؔ کے ہاں زندگی کے وسیع تجربوں کا نچوڑ ملتا ہے جب کہ ندیمؔ کے تجربوں میں تنوع ہے۔ وہ ان شعرا میں اولیت رکھتے ہیں جن کے ہاں ۱۹۴۷ء کے واقعات اور فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی ہمدردی اور درمندی نظر آتی ہے اور یہ ان کی مثبت انسانی اقدار پر یقین کی دلیل ہے۔ ترقی پسندی کے شوق میں ندیمؔ نے تہذیبی روایات کو خیر باد نہیں کہا اور اپنی ثقافتی قدروں سے رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ اشتراکیت کے کندھے سے کندھا ملانے کے باوجود دوسرا کندھا دین و مذہب سے ملائے رکھا اور یہی ندیمؔ کا امتیاز ہے۔ ندیمؔ کی شاعری ان کے عہد کی تفہیم میں بڑا کردار ادا کرتی ہے کہ انھوں نے سیاست اور معاشرت کی تصویر کشی بڑے پُرخلوص طریقے سے کی ہے۔ جدید اردو شاعری میں ان کا نام ایک معتبر حوالہ ہے۔ فیضؔ کی ایمائیت کو نہ پہنچتے ہُوئے بھی وہ فیضؔ کے ہم عصروں میں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہَوا کا تھا (۱۱)

جب ترا حکم مِلا ترکِ محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی (۱۲)

یہ ارتقاً کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پُرانے لوگ نئے آدمی سے ڈرتے تھے (۱۳)

مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
مَیں تو شامل ہُوں محبت کے گنہ گاروں میں (۱۴)

چاند جب دُور افق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی (۱۵)

ایک دیا ہُوں جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے ، اب میں چلتا ہُوں (۱۶)

مَیں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہُوں
مِرے ہمراہ دریا جا رہا ہے (۱۷)

ندیمؔ آزادیٔ اظہار کے قائل تھے اور کسی ایسے نظام کو قبول نہیں کرتے تھے جس میں انسان کی شخصی آزادی پر حرف آتا ہو۔ وہ آزادیِ تحریر وتقریر کو انسانی آزادی کا عنوان قرار دیتے تھے لیکن قائدِ اعظم کی وفات کے بعد پاکستان میں اسی آزادی کو سلب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ جاگیرداری کے متوالوں نے قائد کے رخصت ہوتے ہی اپنی آنکھیں بھی بند کرلیں اور دیدہ ودانستہ ان راہوں سے فرار اختیار کیا جو قائد نے دکھائیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سلطانیِ جمہور کی ترکیب دوٹکڑے ہوکر رہ گئی۔ جمہور کو تو کسی نے پوچھا نہیں صرف سلطانی ہی سلطانی نظر آنے لگی۔ کبھی سول اور کبھی فوجی مارشل لاؤں نے لکھنے والوں کو رمز واشارہ کا قیدی بنادیا اور الفاظ کو قرغلوں میں نہ لپیٹنے کے عادی بھی اسی زنداں کی ایمائی کھڑکی سے اپنی فنی مہارت اور حق گوئی کی داد دینے پر مجبور نظر آنے لگے حتیٰ کہ ندیمؔ بھی۔

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے (۱۸)

فصلِ بہار میں بھی تھی وہ بیتِ خزاں
دستِ دعا بنی رہی پتّی گلاب کی
سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے تاحدِ نظر منظرِ دار

گھر ڈوب رہے ہیں تیرگی میں
قبروں پہ مگر دیے جلاؤں

تاہم اس جبر و استبداد کی فضا نے غزل سمیت ادب کی ہر صنف میں اظہار کے ایک نئے لہجے کی تشکیل کی جو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو لینے اور قلمکار کے جگر میں قلم اتر جانے کے مترادف ہے۔

وطن سے محبت ندیمؔ کا موضوع ہی نہیں ایمان کا حصہ بھی رہی ہے۔ ۶۵ء اور ۷۱ء کے واقعات نے ندیمؔ کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، بالخصوص سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں یہ شعر دیکھیے

کیا خبر تھی یہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے سوتوں کو جگانے والے (۱۹)

اس شعر میں ایک ایسے ملال کی کیفیت ہے جو بڑے سانحات کے رونما ہونے پر رجائی لب و لہجہ رکھنے والوں کے ہاں بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ شعر کے پردہ پر بیدار کرنے والوں کی خوابِ غفلت میں کھنچی ہوئی تصویر ہے اور پسِ پردہ وہ غم ہے جو ایسے بے خبری کے زمانے آ جانے پر دردِ دل رکھنے والوں کی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے

جب سے ہم تقسیم ہوئے ہیں نسلوں اور زبانوں میں
حائل ہیں کتنے آئینے آپس کی پہچانوں میں (۲۰)

ندیمؔ کا نسلوں اور زبانوں میں تقسیم ہو جانے کا دُکھ ایک مشترکہ دُکھ ہے جس نے آئینہ میں صاف نظر آنے والے چہرے کی پہچان کو گم کر دیا ہے۔ مغربی سامراج کی اس سازش اور فکری تہذیبی دیوار میں دراڑ پڑ جانے پر ندیمؔ کا دل خون کے آنسو روتا ہے

بدن آزاد ہیں اندر مگر زنجیر بجتی ہے
کہ مَیں آزاد ہو کر بھی بِکا جاؤں اسیروں میں

ندیمؔ کے ہاں فکری اور کسی حد تک مقصد کی بالادستی نظر آتی ہے جسے اقبالؔ کا فیضان گردانا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری رومان کی نزاکتوں سے بھی بخوبی آشنا ہے۔ عشق ہر انسان کی گھٹی میں پڑا ہے البتہ ندیمؔ سے لے کر اقبال، رومیؔ، منصورؔ، اور ان شخصیات سے آگے بھی، اس کی جہتیں مختلف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں عشق شخصی سطح تک محدود ہے اور کہیں کائناتی اور آفاقی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ندیمؔ کے عشق کی ابتدا بھی گوشت پوست کی

ایک غریب دیہی لڑکی سے ہوتی ہے

تُو پکارے تو چمک اُٹھتی ہیں آنکھیں میری
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ (۲۱)

لیکن جلد ہی وہ اس حقیقت کو بھانپ لیتے ہیں کہ

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں (۲۲)

یہ مرحلہ غیر سے اپنی طرف اور پھر اپنی طرف سے حسنِ ازلی کی طرف متوجہ ہو جانے کا ہے

دریا ہو ، صبا ہو یا خیالات
ہر چیز تری طرف رواں ہے (۲۳)

یہاں سے مابعد الطبیعات کی وہ سرحد شروع ہوتی ہے جس کی طرف سفر کا آغاز ندیم کی دیہی زندگی کے ابتدائی عشق سے ہُوا تھا۔ ندیم نے اپنے عشق کے عناصر کو وقت اور عمر کے ساتھ تبدیل کیا ہے اور بالائی فضاؤں کی طرف جاتے ہُوئے ایک پتنگ کی طرح فالتو سامان کو اپنی ذات سے الگ کرتے چلے جاتے ہُوئے اگلی منزلوں کی طرف گامزن رہنے کو ترجیح دی ہے۔ ان کی اسی سرگرمی نے ان کو محض ایک دیہاتی لڑکی کے زمینی عشق سے بلند ہو کر انسان، کائنات اور خدا سے محبت کے گُر سکھائے۔

اِس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تُو سامنے ہے اور تصور خدا کا ہے

ندیم صاحب نے بہت لکھا۔ ان کے شعری مجموعے میں دھڑکنیں (قطعات ۱۹۴۱ء)، رم جھم (قطعات / رباعیات ۱۹۴۴ء)، جلال و جمال (۱۹۴۶ء)، شعلۂ گل (۱۹۵۳ء)، دشتِ وفا (۱۹۶۳ء)، محیط (۱۹۷۶ء)، دوام (۱۹۷۹ء)، لوحِ خاک (۱۹۸۸ء)، جمال (نعت ۱۹۹۲ء)، بسیط (۱۹۹۵ء) ارض و سما (۲۰۰۷ء) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سترہ کے قریب افسانوی مجموعے اور تحقیق و تنقید، ترجمہ اور بچوں کے لیے ملا جُلا کر کوئی ایک درجن مزید کتب موجود ہیں۔ اعزازات میں تین آدم جی ایوارڈ، حکومتِ پاکستان سے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی (۱۹۶۸ء)، ستارۂ امتیاز (۱۹۸۰ء) اور نشانِ امتیاز (۱۹۹۹ء) کے امتیازات حاصل تھے۔ علاوہ ازیں اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۷ء میں کمالِ فن ایوارڈ سے نوازا۔ انھیں ما کے باعث

حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ (۲۴)

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، ارض و سما، لاہور مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۹
۲۔ احمد ندیم قاسمی، جلال و جمال، لاہور، اساطیر، جون ۲۰۰۰ء
۳۔ احمد ندیم قاسمی، لوحِ خاک، لاہور، اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۱ء
۴۔ احمد ندیم قاسمی، دشتِ وفا، راول پنڈی، خالد اکیڈمی، ۱۹۶۳ء
۵۔ احمد ندیم قاسمی، دوام، لاہور، اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۵ء
۶۔ ایضاً
۷۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، لاہور، التحریر، ۱۹۸۳ء
۸۔ ایضاً
۹۔ ایضاً
۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، لوحِ خاک، لاہور، اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۱ء
۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، لاہور، التحریر، ۱۹۸۳ء
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، دشتِ وفا، راول پنڈی، خالد اکیڈمی، ۱۹۶۳ء
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، لوحِ خاک، لاہور، اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۱ء
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، محیط، لاہور، التحریر، ۱۹۸۳ء
۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، دشتِ وفا، راول پنڈی، خالد اکیڈمی، ۱۹۶۳ء
۲۲۔ ایضاً
۲۳۔ ایضاً
۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، ارض و سما، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر تسنیم رحمان

احمد ندیم قاسمی کی تمثال کاری

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے ایک اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ترقی پذیر اقوام کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ نچلے اور پس ماندہ طبقے کے مسائل ان کی شاعری میں منعکس ہوتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اور اشتراکیت کے حامی تھے مگر دیگر ترقی پسند شاعروں کی طرح انھوں نے اپنی شاعری کو پراپیگنڈا نہیں بننے دیا بل کہ نعرہ زنی سے بالاتر ہو کر اعتدال و توازن کی وہ فضا قائم کی جو زیادہ تر ترقی پسند شعرا کے ہاں مفقود ہے۔ ان کا کلام سطحی موضوعات اور فوری تاثرات کے ابلاغ کی بجائے واقعات و حادثات کے گہرے اور دیرپا اثرات کا مظہر ہے۔ عزیز حامد مدنی ان کی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہیں:

> ”عصرِ جدید کی فکر جو مختلف نئے علائم کی آگہی سے زندگی کی پوری کلیت پیدا کرتی ہے، محض سطحی نہیں ہے۔ اس میں سیاسی، معاشی، نامیاتی و نفسیاتی عناصر کی کئی تہیں اپنی تہذیب و روایات سے اردو شاعری کے ایک نئے مزاج میں ڈھل گئی ہیں۔ اس رخ سے بھی ان کے کلام میں ایک متوازن اور گہری سوچ ملتی ہے۔۔۔ندیم کی منفرد آواز اس دور سے آج تک ہمارے ساتھ ہے، جس میں فکر جدید کی پوری آگہی ہے۔ اپنے معاشرے کے سپید و سیاہ و نیک و بد کا ادراک ہے۔“ [۱]

احمد ندیم قاسمی اپنی نظموں میں انسان سے غیر مشروط اور بلا تفریق محبت کے قائل ہیں۔ ان کی اس محبت کی جھلک ان کی تمام شاعری میں جلوہ گر ہے اور یہی وہ زاویہ ہے جس نے ان کی شاعری کو انفرادیت بخشی ہے۔ اس حوالے سے فتح محمد ملک کی یہ رائے بہت اہم ہے:

> ”ندیم کے خیال میں محبت انسان کا سب سے بڑا حسن اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ انداز نظر ندیم کی عشقیہ شاعری میں وہ ندرت، نکھار اور توانا نزاکت پیدا کرتا ہے جو اردو شاعری میں ناپید ہے۔“ [۲]

طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ایک بڑا موضوع ہے۔ ترقی پسند عقاید کے مطابق موجودہ نظام کو بدلنے کی خواہش کا اظہار بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ معاشرتی انقلاب کے خواہاں تھے، تاکہ پسے ہوئے عوام سکھ کا سانس لے سکیں۔ جبر و استحصال اور بے ضمیری پر ان کے احساسات کرب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جلیل عالی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''ندیم جب اپنے زمانے میں عالمی سطح پر حق و انصاف کی قدروں کو پامال ہوتے، بڑے بڑے دانش وروں کے افکار و نظریات کو جبر و استحصال کا آلۂ کار بنتے اور قلم کاروں کو مصلحتوں کا شکار ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا دل شدتِ کرب سے بلبلا اٹھتا ہے۔''[ع]

موجودہ دور کی صنعتی ترقی کے تحت معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلی، اقدار کی شکست و ریخت اور سائنس کے نت نئے انکشافات بھی ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ گویا انھوں نے اپنی شاعری میں عصرِ حاضر کو سمو دیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ایک پُرگو اور باخبر شاعر ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات پر ان کے اندر کا انسان جو ردِ عمل ظاہر کرتا ہے، اسے خوبی سے شعر کا جامہ پہناتے ہیں۔ فتح محمد ملک کے بقول:

> ''ندیم اس اعتبار سے عصرِ رواں کے منفرد فن کار ہیں کہ ایٹمی دور میں قوموں کی مسابقت سے دنیائے انسانیت کو جو بھیانک خطرات لاحق ہیں وہ ان کے ہاں نت نئے انداز میں موضوعِ سخن بنتے چلے آ رہے ہیں۔''[ع]

وہ اپنے احساسات و کیفیات کے بیان کے لیے دل کش شعری وسیلوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جب شاعر اپنے تجربات کو ذہن کے لاشعور سے ابھرنے والی تصویروں کی صورت میں محسوس کرے اور ان کا شعری اظہار کرے تو تمثال جنم لیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں تمثال کاری کی مثالیں موجود ہیں۔ نظم ''پناہ'' کی تمثال کاری دیکھیے:

خزاں میں پتھروں پر کہر جمتی ہے
تو آئینے بکھر جاتے ہیں
تا حدِ بصارت
سنگ زاروں میں

اور ان میں آسماں کے عکس
بٹ جاتے ہیں ٹکڑوں میں
ابابیلوں کے پر اک آئینے میں سے گزرتے ہیں
تو دھڑ اک اور میں سے
اور خودرو جھاڑیوں کے ننھے منے پھول
اونچے آسمانوں اور فضا میں چار سو اُڑتی

ابابیلوں پہ
اتنے ٹوٹ کر ہنستے ہیں
جیسے رفعتوں نے
وقت کی یلغار سے بچنے کو
آغوشِ زمیں میں سر چھپایا ہو　　　　"پناہ" ۵

کہر، ابابیلیں، آئینے اور ننھے منے پھول ایسی علامتیں ہیں جنھوں نے اس نظم کی تمثال کاری کو کثیر سطحی (Multi Dimensional) بنا دیا ہے۔ یہ نظم ان علامتوں کے استعمال سے علامتی تمثال کاری (Symbolic Imagery) کا عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔ نظم کی تمام تمثالیں مرئی ہیں۔ مرئی تمثال میں شاعر موضوع کی مناسبت سے جو تصویریں تخلیق کرتا ہے وہ واضح متعین اور ٹھوس ہوتی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ "Concrete Image" کی تخلیق کو تمثال کاری کے ضمن میں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے ٹھوس تمثالیں تخلیق کرنے کے لیے فطری مظاہر کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ تمام مظاہر: پتھر، آئینے، ابابیل، سنگ زار اور ننھے پھول؛ ٹھوس وجود رکھتے ہیں اس لیے ان سے تخلیق پانے والی تمثالیں بھی مرئی ہیں۔

مذکورہ بالا نظم میں شاعر نے ترقی پسندی کے موضوع انقلاب کو تمثالوں میں بیان کیا ہے۔ ابابیل سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا پرندہ ہے، جو قدیم عمارتوں میں مقیم ہوتا ہے۔ یہ ابابیلیں دراصل نظامِ کہن کی علامت ہیں۔ ماحول پر طاری جمود کی سانیت کے بیان کے لیے خزاں کے باعث پتھروں پر جمی کہر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہی جمود جب ٹوٹے گا تو اسی طرح نظامِ کہن کے پرخچے اڑا دے گا جس طرح کہر کے آئینوں نے

ابابیلوں کے عکس کو ٹکڑوں میں منقسم کر دیا ہے۔ یہ نظامِ کہن جو اس وقت اتنا شان دار اور پُر عظمت لگتا ہے جتنی آسمانوں میں پرواز کرتیں یہ ابابیلیں۔ عوام جو خودرو جھاڑیوں میں کھلے، ننھے پھولوں کی صورت میں منعکس ہے، ان پر ہنس رہے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رفعتیں وقت کی یلغار کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔

پتھروں پر جمتی کہر ساکن تمثال ہے جب کہ آئینوں کا بکھرنا، آسمانوں کے عکس کا بٹ جانا، ابابیلوں کے پروں اور دھڑوں کا الگ الگ آئینوں سے گزرنا، ننھے منے پھولوں کا ہنسنا اور رفعتوں کا وقت کی یلغار سے بچنے کے لیے زمین کی آغوش میں سر چھپانا متحرک تمثالیں ہیں۔ رفعتوں کا آغوشِ زمیں میں سر چھپانا تجرید کی تجسیم کا عمل ہے۔ یہ تمثال کیفیات کے امتزاج سے نظم کو ندرت عطا کر رہی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

ہوا چلے تو دماغوں میں لہلہائیں سوال
ہوا چلے تو کسی چیخ کا جواب آئے
ہوا چلے تو پہاڑوں کو گونج کی سُوجھے

''ہوا کی دعا'' [۶]

دماغوں میں سوال کا لہلہانا ایک طرف تو متحرک تمثال ہے اور دوسری طرف مجرد شے کو کیفیت دے کر تخلیق کی گئی مرکب تمثال ہے۔ مندرجہ بالا مصرعوں کی بصری، سمعی اور حرکی تمثالوں میں شاعر کا فن عروج پر ہے۔ حسیاتی تمثالوں کی یہ مثالیں اپنے اندر ندرت اور تازگی رکھتی ہیں۔ ہوا کا نہ چلنا ماحول کے جمود کو ظاہر کرتا ہے۔ ہوا انقلاب اور تبدیلی کی علامت ہے۔

منجمد کہر کو چٹخائے گی سورج کی کرن
ان دھندلکوں کے کلیجے میں اتر جائے گی
سایے سمٹیں گے کہ ظلمت پہ کوئی آنچ آئے
تیرگی چھائے گی لیکن نہ اماں پائے گی
سینۂ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گل زار
اتنی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

''بہار آئے گی'' [۷]

منجمد کہر، سورج، سایے، ظلمات، تیرگی اور سینۂ سنگ سے گل زار کی نمود؛ ترقی پسند شعرا کے ہاں تو اتر

سے استعمال ہونے والی علامتیں ہیں اور ان کا معنوی دائرہ بھی طے شدہ ہے، جیسا کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''رات، سحر اور اسی قسم کی بعض علامتیں ندیم کے ہاں ملتی ہیں۔ ان علامتوں کے استعمال میں ندیم کے ہاں بھی فیض کا اثر ہے۔ وہی مخصوص تکنیکی حوالہ ملتا ہے۔ ترقی پسند شاعروں کے ہاں استعمال ہونے والی یہ علامتیں واضح معنویت رکھتی ہیں۔ ان کی معنویت کا تعین ان کا معنوی دائرہ محدود کر دیتا ہے۔'' ۸

انقلاب کی آمد سے صدیوں سے طاری جمود کا خاتمہ اس نظم کا موضوع ہے۔ نظم میں بصری اور حرکی تمثالیں موجود ہیں، جن کی مثالیں منجمد کہر کو چٹخانا، دھندلکوں کے کلیجے میں اترنا، سایوں کا سمٹنا، ظلمت پر آنچ آنا، تیرگی کا امان نہ پانا اور سینۂ سنگ کی حدت سے گل زار کھلنا ہیں۔ دھندلکوں کے کلیجے، ظلمت پر آنچ اور تیرگی کا امان نہ پانا؛ اشیا و کیفیات سے تخلیق کی گئی تمثالیں ہیں، جن میں مجرد اشیا کی تجسیم کی گئی ہے۔ تمثالوں کی یہ سطح اگرچہ علامتی ہے مگر کثرتِ استعمال کے باعث ان علامتوں میں جدت اور تازگی باقی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمثالیں سریع الفہم ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی زیادہ تر شاعری بیانیہ ہے۔ ان کے ہاں عمدہ تمثالوں کے نمونے ملتے تو ہیں مگر بہت کم۔ ان کی تمثال کے عمل میں وہ تہہ داری اور رمزیت زیادہ تر موجود نہیں جو امیجزم کے اثرات کے نتیجے میں اردو شاعری میں رواج پا چکی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری (حصہ دوم)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص:۸۳
۲۔ فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور: مکتبۂ فنون، ۱۹۷۳ء، ص:۲۲۶
۳۔ جلیل عالی، ''ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں'' مشمولہ ادبیات، سہ ماہی، خصوصی شمارہ، اسلام آباد: جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۰۶ء ص ۱۲۴
۴۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی ـــــ شاعر اور افسانہ نگار، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۲۳۱
۵۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں، جلد اول، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۳۹
۶۔ ایضاً، ص:۴۳
۷۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں، جلد دوم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۷۶۲
۸۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۲

☆☆☆☆

ڈاکٹر سعدیہ طاہر

احمد ندیم قاسمی کے افریشیائی موضوعات

I have attempted to high-light, in this essay, to present a crictical appraisal of Afro-Asian consciousness as reflected in the poetry of Ahmad Nadim Qasmi. Apart from his creative endeavour, Ahmad Nadim Qasmi has also played a leading role in promoting Afro-Asian causes through his political struggle. He was the Secretary General of the Progressive Writers Association as well as the Chairman of the Afro-Asian organisation (Pro-China) in Pakistan. These political activities had a positive and dynamic impact in his poetry. This article is an attempt to trace the impact of Afro-Asian consciousness in Ahmad Nadim Qasmi's poetry.

احمد ندیم قاسمی کے ہاں افریشیائی ممالک کی غلامی کو آزادی میں بدلنے کی تمنا اپنے معاصرین کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اس جذبہ و احساس کی بدولت اُن کی نظم و نثر میں کثیر تعداد میں گراں قدر تخلیقات موجود ہیں۔ یہاں چوں کہ فقط شاعری میں افریشیائی شعور و احساس سے غرض ہے اس لیے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے میں اُن کی شاعری کے حوالے سے بحث کی جائے گی۔

اُن کے پہلے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' کی تقریباً تمام تخلیقات قیامِ پاکستان سے پیشتر وجود میں آئیں۔ اس لیے دو عالمی جنگوں کے بھیانک اثرات کے موضوع پر جتنی نظمیں اس مجموعۂ کلام میں جلوہ گر ہیں ان جتنی اور اُن جیسی نظمیں اُن کے کسی اور معاصر کے ہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ پنجاب کے ایک ایسے علاقے میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے جو انگریزوں نے جان بوجھ کر اس لیے پس ماندہ رکھا تھا کہ یہاں سے برطانوی افواج کو غریب اور ان پڑھ مسلمانوں کی بھاری تعداد میسر آئے گی۔ نتیجہ یہ کہ دو عالمی استعماری جنگوں کے بھیانک ترین اثرات اس علاقے کے باشندوں پر مرتب ہوئے۔ ''جلال و جمال'' میں ''سیاسی مورچے میں'' اور ''سپاہی کی واپسی'' کی سی نظموں نے جہاں احمد ندیم قاسمی کے آبائی علاقے پر، اس علاقے سے دور، بہت دور ہر دو عالمی جنگوں کے محاذوں پر کام کرنے والوں اور کام آنے والوں کے مقدر

پر موثر نظمیں ملتیں ہیں وہاں انھیں عالمی جنگی محاذوں پر سامراجی نظام کی بقا کی خاطر جان دینے والوں کی جان کی قربانی کو "صحرائے لیبیا" کی سی نظم میں درد و غم کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ان کی بے مقصد موت کو بڑے طنزیہ، رجزیہ اور المیہ انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ نظم بڑی حد تک اُن دو حریف جنگ جوؤں کے مابین مکالمے سے پھوٹی ہے جو میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے ہوئے کام آئے تھے مگر جنگ کے فریقین نے اپنے اپنے اِن ہر دو سپاہیوں کو دفن کرنے کی مہلت نہ پاکر (صحرا) ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ صحرا میں جب تیز ہوا چلی تو یہ لاشیں اُڑتے اُڑتے ایک دوسرے کے قریب آ گئیں اور یوں مرنے کے بعد ہی سہی، ہر دو حریف جنگ آزما حلیف بن گئے۔ رنگ و نسل کا امتیاز مٹ گیا۔ یہ دو لاشیں ایک تو فرنگی کی نئی لاش تھی جو سیاہ فام سپاہی کے پرانے ڈھانچے کے قریب آئی اور فرنگی کی لاش سے سیاہ فام سپاہی کی لاش نے کہا:

"تو نے افرنگ کی شاہی کی قسم کھائی تھی
میں نے شاہی کی تباہی کی قسم کھائی تھی
متفق کون نہیں اس پہ کہ ہم دونوں نے
ایک مجبور سپاہی کی قسم کھائی تھی (۱)

نظم کے آخر میں شاعر اپنا آفاقی انسانی نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے ہر رنگ اور ہر نسل کے انسان کو برابر انسانی حقوق دلانے کا دم بھرتا ہے:

"رنگ اور نسل کا یہ سحر تو ٹوٹا لیکن
اسی شدت سے ہے قائم تری بیگانہ روی
کتنا شاداب نظر آئے یہ صحرائی مزار
چاکِ ہستی کی اگر مل کے کریں بخیہ گری"

"ایک ہی قطرے کا اعجاز نہیں فوارہ
ایک گھر سے نہیں بستا کوئی قریہ، کوئی شہر
سات رنگوں کے مرکب سے کرن بنتی ہے
ایک ہی رنگ نہیں باعثِ رنگینیٔ دہر" (۲)

اسی طرح اپنی طویل مگر نامکمل نظم "مشرق و مغرب" میں وہ رنگ اور رُت کے باعث انسانوں میں بود و باش اور رنگ و نسل کے تنوعات کو بھی انسانی وحدت اور فنی آفاقیت تک پہنچنے میں رکاوٹ نہیں سمجھتے اور پوری

دُنیا میں بسنے والے انسانوں میں انسانیت کے مشترک ورثے کو زندگی کی آفاقیت اور انسانیت کی وحدت کا ایک جیتا جاگتا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اِس طویل مگر نامکمل نظم کے آخری دو بند ندیم کے آفاقی اندازِ نظر کے شاہد ہیں:

سوچتا ہوں ……(میں سوچ لیتا ہُوں)
چاند جو میرے گھر میں نکلا ہے
تیرے ایوان میں بھی جھانکے گا
جس زمیں پر میں ایستادہ ہوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اُٹھتی، لچکتی جاتی ہے
اور بن کر ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے
سوچتا ہوں …… کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لیے حقیر ہُوں میں
کہ یہاں دُھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لیے عظیم ہے تُو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اُڑاتی ہے؟

رنگ اور رُت نہیں مدارِ حیات
رنگ سُورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رُخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دُھوپ
تیرے چہرے کا رنگ، برف تری
تو مری دُھوپ کو ترستا ہے

میں تری برف کے لیے بے چین

(۴)

دو مُسافر ہیں……ایک رستہ ہے

یہ نظم ۱۹۴۶ء کی تخلیق ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک مغربی سامراج کے پنجۂ استبداد میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ قومی آزادی کی تحریکیں بھی مسلسل زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ یہ اُمید مسلسل توانا سے توانا تر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی سامراجی قوتیں کمزور پڑ جائیں گی اور یُوں آزادی کی تحریکیں کامرانی سے ہمکنار ہو جائیں گی اور اس کے نتیجے میں ایک نیا اور آزاد افریشیا طلوع ہو سکے گا۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک مثال الجزائر ہے جو فرانسیسی سامراج کی مضبوط گرفت میں سسک رہا تھا۔ الجزائر میں آزادی کی تحریکوں کو جس سفاکی کے ساتھ فرانس نے کچلنے کی کوشش کی اُس سے خود فرانس کے اندر الجزائر کی آزادی کے حق میں آواز بلند ہونے لگی۔ سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے بھی ژاں پال سارتر کی قیادت میں سیاسی عمل کو آگے بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ ادیبوں اور فنکاروں کی زوردار آواز تھی جس نے فرانس کے اندر تحریکِ آزادی الجزائر کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اُردو ادب میں بھی تحریکِ آزادی الجزائر ایک اہم ترین موضوع بن گیا۔ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ساتھ فن برائے فن کے قائل ادیبوں نے یادگار تخلیقات پیش کیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے مجلّہ ''ہم قلم'' تک نے الجزائر نمبر شائع کیا جس میں انتظار حسین جیسے سیاست سے کنارہ کش افسانہ نگار نے ''جلوس'' کے عنوان سے ایک انتہائی جذباتی سیاسی افسانہ شائع کیا۔ اسی شمارے میں جمیل الدین عالی کے وہ دوہے بھی شائع ہوئے تھے جو الجزائر کی تحریک آزادی کے دوران ہمارے ہاں خاص و عام کی زبان پر رواں رہنے لگے تھے۔ یہاں اُن میں سے ایک دوہے کا فقط پہلا مصرع دے دینا کافی رہے گا جو یُوں ہے:

جو نہ لکھے الجیریا بانی اُس پر شعر حرام

ہفت روزہ ''لیل و نہار'' اور روزنامہ ''امروز'' کے سے اخبارات و جرائد تو تھے ہی نامور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے انتظام میں۔ چناں چہ یہاں بھی تحریک آزادیء الجزائر پر خوب لکھا گیا۔ الجزائر کی تحریکِ آزادی میں مردوں سے بڑھ چڑھ قربانیاں دینے والی لڑکی جمیلہ بوپاشا پر متعدد نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم 'جمیلہ' اس زمانے کی منظومات میں سب سے زیادہ مقبول نظم ثابت ہوئی تھی:

باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہُوا بھی تو ہمارا لبِ اظہار کہاں!

اے طلبگارِ صباحت! مرے گھر کی سرحد
ساحلِ قلزمِ خوں ہے، خطِ گلزار کہاں!

مُجھ پہ اُٹھا ہوا خنجر ترے دل میں اُترا
جا کے ٹوٹا ہے، ستمگر، ترا پندار کہاں! (۴)

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک افریشیائی بیداری کی لہر بہت بلند ہو چکی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اس بیداری کو اُردو ادب میں بھی خوب منعکس کیا۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے بڑی منظم منصوبہ بندی سے بھی کام لیا۔ اس کی ایک مثال سات فروری ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے مختلف شہروں میں اپنے ہفتہ وار ادبی اجلاسوں میں اُن چھ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کی یادمنائی جنھیں اٹھارہ سال پہلے سات فروری ۱۹۳۱ء کو چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت نے ترقی پسندی کے جرم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اس موقع پر لاہور میں پڑھی جانے والی طویل نظموں میں احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری کی نظمیں نمایاں رہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب مارکسیت کے زیرِ اثر ترقی پسند ادیبوں نے امن عالم کے حق میں زبردست تنظیمی اور تخلیقی مہم چلا رکھی تھی۔ روس کی ترمیم پسندی (Reneionism) اور چین کی بنیاد پرستی (Dgmatenision) کا جھگڑا شروع نہیں ہوا تھا اور سارے ایشیا میں رُوس نواز مارکسیت سرگرم کار تھے۔ ظہیر کاشمیری نے اپنی نظم بعنوان ''ایشیا'' میں ایشیا کے عروج و زوال کی کہانی اس انداز میں بیان کی کہ اب ماوزے تنگ کی قیادت میں ایشیا اپنا مقدر سنوارنے میں مصروف ہو چکا ہے۔ جہاں تک ایشیا کے ماضی کا تعلق ہے ظہیر کاشمیری نے ایشیا کی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ایشیا کی سیاسی کامرانیوں اور تہذیبی فتوحات کی ایک طویل تاریخی پس منظر میں خوب داد دی ہے۔ اِس عروج کے بعد ایشیا کے زوال اور غلامی کے دور کو بڑے طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کے اس حصے میں یورپ کی غلامی کے دور میں ایشیا کے کرب کو بڑی نزاکتِ احساس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں رُوسی اشتراکیت کے زیرِ اثر سیاسی بیداری اور اس بیداری کو ایشیا میں اشتراکی انقلاب کا محرک ثابت کیا گیا ہے۔ نظم کے اِس آخری حصے میں ماوزے تنگ کی قیادت میں چین کے لانگ مارچ سے پیدا ہونے والی صورت حال کو پورے ایشیا کے لیے ایک نہایت نیک فال ثابت کیا گیا ہے:

ماؤزے کی قیادت میں یے نان سے سرخ طوفان اُٹھا
جس کے سرکش تھپیڑے پرانے پہاڑوں کو جڑ سے گرانے لگے

جس کے بیباک ریلے، چٹانوں کے دل چیر جانے لگے
جاں بلب، چینیوں کے ہجوموں میں یک رنگیِ فکر پیدا ہوئی
ان کے شورِ بغاوت سے مینارِ قصرِ جم و کے لرزنے لگے
ان کے جوشِ تہور سے شاہوں کے چہرے اترنے لگے
وہ نئے مورچوں اور فصیلوں سے کہنہ حریفوں کو نخچیر کرنے لگے
وہ نئی زندگی اور نیا دور تعمیر کرنے لگے
وہ پیاماتِ سن یات کوچہ بہ کوچہ سنانے لگے
وہ شہیدوں کا بدلہ چکانے لگے
وہ مروّت کے روشن الاؤ، بہر سنگِ منزل جلانے لگے
وہ ہر اک خطۂ شور کو آشتی کے گلوں سے معطر بنانے لگے
وہ جوانان چیں کے لبوں کا تبسم بڑھانے لگے
وہ نگارانِ چیں کو حسیں تر بنانے لگے (۵)

یہاں یہ کہنا کچھ ایسا نامناسب نہیں ہے کہ ظہیر کاشمیری چین کے اشتراکی انقلاب سے بڑے جذباتی اور رُومانی انداز میں متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے انقلاب چین کو پورے ایشیا کے انقلاب کا رہبر و رہنما قرار دیا تھا۔ آج یوں دکھائی دیتا ہے کہ ظہیر کاشمیری کے نئے ایشیا کے یہ خواب پادر ہوا ہوئے۔ اس کی ایک مثال برصغیر میں تلنگانہ کی آزادی کی تحریک ہے۔ ظہیر کاشمیری اس پر بہت خوش تھے:

آج ارضِ تلنگانہ کے گوشے گوشے میں کمیون بننے لگے

نصف صدی سے تلنگانہ کی آزادی کی تحریک جاری ہے۔ اس تحریک کا بول بالا کرتے ہوئے ظہیر کاشمیری نے کہا تھا:

آج مردِ تلنگانہ تجدیدِ مشرق کا مژدہ سنانے لگا

تجدیدِ مشرق تو بہت دور کی بات ہے تلنگانہ اپنی آزادی کی منزل تک بھی نہیں پہنچ پایا اور آج بھی بھارت کے اندر ایک مجبور و محکوم اقلیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی طرح ظہیر کاشمیری نے اپنی اس طویل ترین نظم کے آخری بند میں ماؤزے تنگ کو جو خراجِ تحسین پیش کیا تھا اُس پر آج کے چین میں بھی سوال اُٹھائے جا رہے ہیں:

ایشیاء مردِ نو کی ولادت پہ مسرور ہو
یہ وہی ہے، جسے مظہرِ نورِ فطرت کہیں

یہ وہی ہے، جسے پاسدارِ رموزِ حقیقت کہیں
یہ وہی ہے، جسے فاتحِ عہدِ ظلمت کہیں
یہ وہی ہے، جسے وارثِ عظمتِ آدمیت کہیں
ایشیاء...... اپنی تخلیق تازہ پہ مغرور ہو
ایشیاء...... مرد نو کی ولادت پہ مسرور ہو (٦)

احمد ندیم قاسمی کی طویل نظم بعنوان ’’نیا ایشیا‘‘ یوں ہے:

زندگی کے ہیولے بناتا رہا ایشیا
زندگی سے بہت دُور جاتا رہا ایشیا
ایشیا ایک ایسا کھلونا رہا جس میں یورپ سدا کوک بھرتا رہا
ایشیا کے ذخیروں میں غلّے کے بدلے فرنگی سدا بُھوک بھرتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا
ایشیا ایک ایسے خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
جس میں مفلس کی پرچھائیں دھجّی سی بن کر لٹکنے لگے
جس میں مجبور کی آہ کانٹا سا بن کر اٹکنے لگے
جس میں دہقان جائے تو اپنے لہو سے گلستانِ شاہی سجاتا پھرے
جو بھی انسان جائے وہ انسانیت کی ہزیمت کا پرچم اُڑاتا پھرے
جس میں بچے کی چیخیں کھٹکنے لگیں
جس میں عورت کی آہیں چھلکنے لگیں
جس میں بیوہ کے آنسو نگینے بنیں
جس میں عصمت کے ملبے دفینے بنیں
جس میں نمرود جھانکے تو عود اور عنبر کی خوشبو کا سیلاب گانے لگے
جس کو مزدور چھو لے تو کژدم اڑیں اور اژدر کی پھنکار آنے لگے
ایشیا اک نہایت خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا (۷)

ایشیا پر یورپ کے ان طویل مظالم کے ذکر کے بعد شاعر ان عظیم فنکاروں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جنھوں نے اس دورِ ستم میں ایشیا کی نجات کی خاطر اپنی جانیں تک نذر کر دی تھیں۔ نظم کے درج ذیل اختتامی حصے میں شاعر ایک نیا عہد نامہ پیش کرتا ہے۔ اس نئے عہد میں وہ اُن فنکاروں کی روایت کو آگے بڑھانے اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کا عہد کرتا ہے:

اے رفیقو، تمھی سے فنا گاہِ عالم میں رنگ دوام آئے گا
اب تمھارے لہو کا جو قطرہ گرے گا وہ نسلوں کے کام آئے گا
پھر افق کی کماں میں تناؤ سا ہے
قلبِ انساں میں پھر ایک گھاؤ سا ہے
ایشیا منتظر ہے کہ انسانیت اس کے رمنوں میں گانے لگے،
چہچہانے لگے
آؤ آؤ قدم یوں اُٹھاؤ، کہ لاکھوں کروڑوں شہیدوں کی
محنت ٹھکانے لگے! (۸)

احمد ندیم قاسمی نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ شعور عام کیا ہے کہ صدیوں کی ذلت بھری زندگی کو پیچھے چھوڑ کر افریقہ اب آزادی اور خودمختاری کے دور میں داخل ہو چکا ہے اور یہ اُمید پیدا ہو چلی ہے کہ اب زمین کا نیا محور افریقہ ہے:

دھرتی نے بدل لیا ہے محور
صحراؤں پہ برف گر رہی ہے
قطبین پہ ریت اُڑ رہی ہے
یورپ کے اُفق پہ...... لڑکھڑاتی
اِک فوج سیاہ سُورجوں کی
گر گر کے غروب ہو رہی ہے
شب رنگ جبینِ افرقہ سے
اک صبح طلوع ہو رہی ہے
حبشی نے زمیں کی باگ تھامی
اعزاز بنی سیاہ فامی (۹)

تحریکِ آزادیٔ فلسطین بھی تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی مانند ہمارے جدید ادب کا ایک اہم موضوع ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اردن میں مقیم فلسطینی مجاہدین کا قتلِ عام مسلمانوں کی جدید تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش سانحہ ہے:

ربِ عظیم! پیغمبروں کی اس سرزمیں کا واسطہ
خدائے جلیل! اپنے حبیب ﷺ کا واسطہ
ہمیں خود ہمارے بیٹوں کے خنجروں سے بچا
کہ وہ جس لہو کے پیاسے ہیں
وہ خود اُن کا لہو ہے
ہم سب لہو کے اس دشت میں کھڑے سوچتے ہیں
جو ہاتھ ہم پہ اُٹھے
ہمارے ہی ہاتھ تھے
مگر اُن میں کس کے خنجر تھے؟
کس کے خنجر تھے؟
کس کے خنجر تھے؟
کس سے پُوچھیں!
چلو، چلیں آئنوں سے پُوچھیں (۱۰)

جنوری ۱۹۸۳ء میں جب فلسطینی پناہ گزینوں کے ٹھکانوں پر اسرائیل نے انتہائی سفاکی کے ساتھ حملوں سے تباہی و بربادی پھیلائی تو بھی احمد ندیم قاسمی نے اپنی نظم ''چاند گھبرا گیا'' میں اسے ایک ایسا انسانیت سوز سانحہ قرار دیا تھا کہ جس کی تاب نہ لا کر چاند بھی بادلوں میں چُھپ گیا تھا:

بادلوں میں مگر
اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا
اس کے اشکوں کی چاندی چمکتی رہی
اور فلسطین کی خیمہ گاہوں میں
تہذیب کے پاسبانوں کے دلال

منظر کے دھبے مٹانے میں
انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں
مصروف تھے! (۱۱)

ایشیا اور افریقہ سے مغربی استعمار کے براہِ راست غلبے کے خاتمے کے بعد بھی مغربی سامراج نے پسپائی قبول نہیں کی اور بالواسطہ طور پر آج بھی افریشیا میں غارت گری میں مصروف ہے۔ مجلس اقوام کے بعد اس کی جانشین عالمی انجمن "اقوامِ متحدہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اقوام متحدہ کا کردار بھی افریشیائی تاریخ میں متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے۔ کشمیر اور فلسطین کے سے تنازعات کو بڑی حد تک سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی نظم کشمیر میں جہاں کشمیریوں کی غلامی سے پھوٹنے والے مصائب پر بڑی دردمندی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے وہاں انھوں نے کشمیری حریت پسندوں کی ثابت قدمی اور جرات و ایثار کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہاں اقوامِ متحدہ کی "شیطنت" کو بھی بے نقاب کیا ہے:

سنتے ہیں..... سمندروں کے اُس پار
اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق
ظالم ہے وہی، جو خستہ تن ہے
آج اس کی روایتوں کی رُو سے
رہبر ہے وہی، جو راہزن ہے
آج اس کی بلند مسندوں پر
ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
حق بات تو خیر، جُرم تھا ہی
حق مانگنا بھی دوانہ پن ہے
سچ کہتی ہیں سب غریب قومیں
یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے (۱۲)

اقوام متحدہ کی سامراج دوستی اور اقوام غالب کی مجرمانہ خاموشی کے باوجود کشمیریوں کی تحریک مزاحمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے وقت بالآخر اس تحریکِ آزادی کو بڑے منفرد انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ نظم کا

اختتامی بند درج ذیل ہے:

زخموں سے اٹے ہوئے بدن پہ
یزداں کا جلال ضو فگن ہے
ہیں برق فشاں سلے ہوئے لب
کاٹا ہوا ہاتھ، تیغ زن ہے
ہر سمت پہاڑ کٹ رہے ہیں
ہر فرد شبیہ کوہ کن ہے
ہر دل میں گڑا ہُوا ہے تیشہ
لیکن یہی عشق کا چلن ہے
جو موت ہو زندگی کی خاطر
وہ زندگی کا کمالِ فن ہے (۱۳)

ویت نام میں امریکہ کی غارت گری کی مذمت میں احمد ندیم قاسمی نے ایک نادر ڈرامائی انداز اختیار کیا۔ ان کی نظم بعنوان "ویت نام کا دعوت نامہ" میں امریکہ کے شاعروں اور فنکاروں کو ویت نام کی سیر کی دعوت دی گئی ہے:

یہاں بھی آؤ
جہاں چراغوں میں عصمتوں کی لویں ہیں
دیوار و در پہ ان لڑکیوں کے سر ہیں
جنھیں تمھارے شکاریوں نے
ڈری ہُوئی ہرنیاں سمجھ کر ہدف بنایا
تپائیوں پر ہزاروں بچوں کی گول آنکھیں سجی ہیں
جو اپنی حیرتوں کے حصار میں گھومتی ہیں
اور ڈھونڈتی ہیں اپنے بدن کے ٹوٹے ہوئے کھلونے (۱۴)

ویت نام میں امریکہ کی وحشت و بربریت کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے شاعر امریکی حکمرانوں کو والٹ وٹمین کی امن و محبت کی پیغام بر شاعری کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ پوری نظم کا لہجہ طنزیہ ہے اور اس طنز کا نکتہ عروج نظم کے آخری مصروں میں جلوہ گر ہے جہاں امریکی عوام کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ

امریکہ کی حقیقی تہذیب نہ جنگ وجدل ہے اور نہ جنگِ زرگری۔ اس کے برعکس امریکہ کی حقیقی تہذیب اُس کے شاعروں کے محبت بھرے انسانیت نواز ترانے ہیں۔

حواشی

۱۔ ندیم کی نظمیں، جلد دوم، احمد ندیم قاسمی، صفحہ ۸۰۳۔
۲۔ ایضاً، صفحہ ۸۰۳-۸۰۴
۳۔ ندیم کی نظمیں (جلد اوّل)، احمد ندیم قاسمی، صفحہ ۵۰۳-۵۰۴۔
۴۔ ایضاً، صفحہ ۵۸۰
۵۔ عظمتِ آدم، ظہیر کاشمیری، ص ۱۱۴۔
۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۶
۷۔ ندیم کی نظمیں، جلد دوم، صفحہ ۷۰۳-۷۰۴۔
۸۔ ایضاً، صفحہ ۷۱۲
۹۔ ندیم کی نظمیں، جلد اوّل، صفحہ ۲۷۵۔
۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۷۴-۳۷۵
۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۴۶-۴۷۔
۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۴۶۰-۴۶۱
۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۶۱-۴۶۲۔
۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۸۴

☆☆☆☆

شازیہ اکبر

”احمد ندیم قاسمی کا تصورِ خدا“

تصورِ خدا بھی عجب شے ہے۔ انسانی ذہن کی تمام تر تنگ نظری اور محدودیت سے لے کر معرفت و آگہی کی وسعتوں میں بلند پروازی تک ہر جگہ فٹ آ جاتا ہے۔ ہر کس و ناکس نے اُس ذاتِ واحد کو سوچا، مقدور بھر نے سمجھنے کی کوشش بھی کی، کچھ تو کشش کے حلقے میں گرفتار ہو کر اپنی گردشِ حالات کے محور سے نکل گئے اور کچھ اَن دیکھے احساس کی ڈور سے بندھے کاروبارِ حیات میں مشغول رہے۔

کوئی نابغۂ روزگار شخصیت ہو یا اَن پڑھ جاہل و چرواہا۔ ہر کسی کا تصورِ خدا اور رشتۂ خدا کا انداز دوسرے سے مختلف ہے۔ گفتگو کے آداب الگ ہیں۔ بے تکلفی کی حدود اپنی ہیں۔ حکایتِ رومی کے چرواہے کی طرح جو تنہائی میں بیٹھا اپنے خالق سے اپنے ظرف و نظر کے مطابق اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ وہ اُس ذاتِ برحق کو راضی کرنے کے لیے اپنی بکریوں کے دودھ کی نذر دینا چاہتا تھا۔ وہ اُس کی مہمان نوازی کا خواہاں تھا۔ وہ اُس کے بالوں میں کنگھی چوٹی کرنے کا متمنی تھا۔ مگر موسیٰ نے اپنے پیغمبرانہ ادراک کے مطابق جب تعارفِ خدا پیش فرمایا تو وہ سادہ لوح چرواہا مارے خفت کے، خوفِ جلالِ خدا سے لرزاں، اپنی گستاخی و کج فہمی پر شرمسار روتا ہوا جنگل کو نکل گیا۔

تب موسیٰ سے فرمایا گیا کہ تم نے ہمارے محبت کرنے والے انسان کو ہم سے دُور کر دیا ہے۔ بے شک تم اس کی قلبی کیفیت و عقیدت کا ادراک نہیں کر سکتے تھے۔

تصورِ خدا دراصل رشتۂ خالق و مخلوق کی تفہیم ہے۔ جہاں انسان اپنے خالق سے مخاطب ہوتا ہے۔ دل کے دُکھ درد بانٹتا ہے۔ گلے شکوے ہوتے ہیں، اعتراضات دھرے جاتے ہیں۔ مصلحتوں کے واشگاف اظہار کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ نہ سمجھ آنے والے حالات و واقعات پر جھنجھلا کر شاکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا جاتا ہے اور مطالبات دہرائے جاتے ہیں۔ دھرنے دیے جاتے ہیں۔ ضد سے ایڑیاں رگڑی جاتی ہیں۔ رو رو کر منایا جاتا ہے۔ اکیلے میں بڑبڑایا جاتا ہے۔ کبھی سرگوشیوں میں گفتگو ہوتی ہے۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا جوہر عطا فرمایا ہو اُن کے طرزِ تخاطب میں بھی کوئی خاص ادا ہوتی ہے۔

کبھی وہ جوہر شعر کی صورت تو کبھی نثر کے پیرائے میں جھلکتا ہے۔ کبھی رنگوں اور لکیروں میں بولتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے ایک شعر نے مجھے چونکایا اور پھر اس کی تفہیم و تصدیق کے لیے، اُن کی شاعری کا مطالعہ بھی کرتی چلی گئی۔ پہلے شعر دیکھیے:

ابھی گن کہتے کہتے رہ گیا ہوں
محبت میں عجب عالم ہوا ہے

یہ جرأتِ اظہار، یہ نُدرتِ خیال، یہ احساسِ تفاخر اور یہ عالمِ بے خودی۔ بلا شبہ ایک بڑے ذہن کی علامت ہے۔ اُن کا ایک مشہورِ زمانہ شعر ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی وہ تخلیق کار ہے جس نے اپنے زرخیز ذہن میں اُبھرنے والے کچی مٹی کے سوندھے تصورات، اپنے خیال کے چاک سے اُتار کر جذبات کے آوے میں پکانے کے بعد ادب کے وسیع آنگن میں پورے اعتماد سے لا کر سجا دیے۔

ان چاک سے اُترے مترنم مصرعوں، جچے تُلے فقروں، روایت سے جُڑے حوالوں، مٹی کی محبت میں گوندھے افسانوں میں اُن کی اُنگلیوں کی ماہرانہ جنبش کے پیچھے ایک انتہائی حساس، منفرد، سنجیدہ، ذمہ دار انسانی ذہن کام کر رہا تھا۔ جو قرضِ حیات کو چکانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔

وہ اپنی مشہور نظم ’’انسان‘‘ میں کہتے ہیں:

یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب کام ہے میرا
زمیں مری ہے، فضا بھی مری، خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیمِ ماورا بھی مرا
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولہا ہوں میں، ندیم ہوں میں

ہر تخلیق کار کا اپنا اسلوب، اپنی فکر ہوتی ہے۔ جس کے حوالے سے وہ یاد رکھا جاتا ہے اور اُس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ جس نے اپنی ذات کو پہچانا، اُس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اور جس انداز، جس زاویۂ فکر و نگاہ سے کوئی اپنے رب کو پہچانتا ہے وہ انداز اُس کے اظہار میں ہر صورت جھلکتا ہے۔

یہ وہ احمد ندیم قاسمی ہیں جنھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کی پہلی نظم میں کہا تھا کہ:

الٰہی خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز آ بسا ہے
وہ پردے اُٹھے، وہ کوئی مسکرایا، مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

اور

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

اور دیکھیے کہ کس خوبی سے عالمِ بے خودی میں خواہش کرتے ہیں:

اُس حسن کو آغوش میں لینے کا جنوں ہے
جو حسن مجھے حدِ نظر تک نظر آئے

اُن کے ہاں یہ حسن قابلِ پرستش ہے۔ کیوں کہ وہ اُس لازوال خالق کا حسنِ خیال ہے۔ دراصل وہ اُسی خالق کے حسن کی جھلک ہے۔ اُس کی صفت کا ثبوت ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے ہاں تلاشِ خدا کی تشنگی ہی نہیں جلوۂ خدا اور قربِ خدا کے پُراعتماد دعوے بھی نظر آتے ہیں۔ جن کا برملا اظہار اُن کے اشعار میں ملتا ہے:

نیلگوں آسماں کے محلول سے
دے رہا ہے مجھے کوئی آواز

کہیں کہیں اقبال کا سا اسلوب اور فکر بھی جھلکتی ہے۔ وہی بے باکی و بے ساختگی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں شاہ ولی اللہ کے نظریات کی تائید بھی فرماتے رہے۔

وہ انسانی فکر کی پستی اور شخصی خامیوں کا بھی بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ جو کہ ہر صحت مند ذہن کا خاصا ہے۔ اپنی ایک نظم "نفی" میں وہ منصبِ انساں کو گھناتی سوچوں اور رویوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں
اور سمجھتے ہیں
ہمارے دم سے سچ کا بول بالا ہے
سبھی شمعیں بجھاتے جا رہے ہیں
اور کہتے ہیں
ہمارے بعد اُجالا ہی اُجالا ہے

وہ جلوۂ حسن سے مبہوت ہو کر گنگ نہیں ہو جاتے۔ نہ ہی ہوش گنوا بیٹھتے ہیں۔ بل کہ وہ اس نظارے کے لیے اپنی نظر کی رفعت پر بھی نازاں نظر آتے ہیں۔ اور اپنے فن کا استعمال کرتے ہوئے اُس لمحۂ ادراک کو خوب صورت اور یادگار بنا دیتے ہیں۔

ہم ہیں ترا نقشِ خود نمائی
پندار ہمیں ہے کیوں خدایا
تخلیقِ زمیں کا طنز مت کر
ہم نے ترا آسماں بنایا

اور

دنیا ترے حسن کی قسم ہے
میں عرش سے عرش پہ گرا ہوں

اور

میں سرِ عرش بھی پہنچا تو سرِ فرش رہا
کائناتوں کے سب امکاں میرے اندر ضم ہیں

اور

دوزخ سے ڈرا رہا ہے اُس کو
جنت بھی ہے جس کی دیکھی بھالی

بچھڑ کر بھی میں ترے پرتوِ وصال میں ہوں
جہاں بھی جاؤں ترے ہالۂ جمال میں ہوں

اوراحمد ندیم قاسمی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں کہ:

اے خدا اب ترے فردوس پہ حق ہے میرا
تُو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

ایسے بہت سے اشعار اُن کے ہاں ملتے ہیں جن میں مقامِ انساں اورمعرفتِ الٰہی کے ادراک کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ جس کے اظہار میں وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے۔

عجب جہانِ طلسمات میرے اندر تھا
میں مُشتِ خاک سہی روح کا سمندر تھا

☆☆☆☆

نازیہ خلیل عباسی

”میں شب کا مسافر ہوں مگر شمعِ سحر ہوں“

ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک احمد ندیم قاسمی نے اگر چہ اظہار کے لیے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانوں کو بھی وسیلہ بنایا مگر ایسے دور میں جب جذباتی پراگندگی ہر سو عقائد کو نئے نظریات میں تیزی سے بدل رہی تھی۔ قاسمی صاحب اپنی ہی ڈگر پر ایک تعمیری طرزِ فکر کی چھوٹی بڑی عمارتوں کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے۔ اگر چہ ان کے عہد میں مختلف فکری تحریکیں بہت سے قلمکاروں کو مقصدیت کے لبادے پہنا کر ان کی انفرادیت اور جدت کی روح کو گھائل کر رہی تھیں مگر ترقی پسند تحریک سے تعلق کے باوجود قاسمی صاحب کی شاعری میں قدیم ادبی چاشنی، جدید فکری رجحانات اور عصرِ نو کے تقاضے بھی پوری زندگی کے ساتھ گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

اگر چہ قاسمی صاحب کی شاعری کی بے شمار جہتیں ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ ان کے ہر رجحان اور موضوع کا احاطہ کرنا گنتی کے چند صفحوں یا سطور میں ممکن نہیں۔ اک فکر کا بحرِ بیکراں ہے۔ خیالات و مضامین کی بل کھاتی لاتعداد موجیں ہیں اور کچھ موجیں تو اس قدر ردیوہیکل ہیں کہ ان کا مقابلہ اک ایسا ملاح ہی کمال مہارت سے کر سکتا ہے جس کی تمام زندگی ہی ان موجوں کے سینے پر ہچکولے کھاتے گزری ہو۔ احمد ندیم قاسمی نے لفظوں کے موتیوں کو زندگی کے دھاگے میں ایک تسبیح کی طرح پرو دیا۔ ان کے جذبوں میں عقیدت، رکھ رکھاؤ، لحاظ، بھرم اور درد و الم کی ملی جلی کیفیات بہت سے نامور شعرا سے یکسانیت کے باوجود ان کو اک ممتاز مقام سے نوازتی ہے۔ سیاسی و انقلابی موضوعات بھی اگر چہ ان کے احاطۂ قلم میں آئے لیکن انھوں نے زندگی میں پائی جانے والی عمیق لطیف نزاکتوں سے بے اعتنائی نہ برتی بلکہ وہ کمال مہارت کے ساتھ ان کے بیان میں بھی قدرت رکھتے تھے۔

قاسمی صاحب کا حساس دل اپنے دور میں پائے جانے والے سیاسی انتشار پر کڑھتا تھا۔ فلسطین میں ظلم و بربریت کا نشانہ بننے والے مسلمان، ایشیا اور افریقہ میں آزادی کے علمبرداروں کی صعوبتیں، دنیا میں ہونے والے ادبا کا قتل، غرض قاسمی صاحب جیسا حساس دل کا شاعر کب ان حقائق کو نظر انداز کر سکتا تھا۔

غمِ دوراں کا تذکرہ ہو یا غمِ جاناں کی سرگذشت، احمد ندیم قاسمی نے ہر غم کو اظہار کے قالب میں اس طرح ڈھالا کہ پڑھنے والا ان کی ندرتِ خیال سے واقف ہوتے ہی زندگی کے ان ممکنہ گوشوں کی سیر بھی کرتا ہے جن کا وجود تو اک یقینی کیفیت کے ساتھ موجود ہوتا ہے مگر وہاں تک رسائی اک عام انسان کے خیال کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ یہ انکشاف پڑھنے والے کو ورطہء حیرت میں ڈال دیتا ہے اور وہ ان گنت لمحوں تک اس کیفیت کے سحر سے باہر نکل نہیں پاتا۔ ان کی شاعری میں جا بجا سماجی رویوں کے خلاف شکایت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ شکایت صرف حرفِ شکایت ہی نہیں رہتی۔ ان کے الفاظ اس دور کے منافق انسانوں کو آئینہ بھی دکھاتے ہیں اور زندگی کی صحیح اقدار اور معیار سے آشنا بھی کرواتے ہیں۔

اب بھوک سے کوئی کیا مرے گا
منڈی میں ضمیر بک رہے ہیں

اس دور سے کی وفا کی امید
کیوں دن کو چراغ جل رہا ہے

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

آج کے دور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
روح مر جائے مگر جسم بچایا جائے

انسانی منافقت، جھوٹ، فریب، دہرے معیار اور روح کا جسم کی قید میں ہوتے ہوئے بھی مفادات کے بت خانے میں تحلیل ہو جانے کا دکھ قاسمی صاحب کو بے چین رکھتا ہے۔ اور بلا شبہ یہی بدلتے معیار انسانی معاشرے کی ناہمواریوں، بے اعتدالیوں اور بے اعتباریوں کا اصل موجب ہیں۔

اس نے انسانوں سے سیکھا تو کیا سیکھا ندیم
پربتوں کی دوست ہے، تنکوں کی دشمن ہے ہوا

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

یوں بظاہر سب کے ہونٹوں پر تھی توصیفِ حرم
نیتیں پرکھیں تو ہر انسان اک بت خانہ تھا

حساس دل رکھنے والا یہ شاعر نا صرف ان تلخ حقائق کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آیا ہے بل کہ کہیں تو وہ اس دور کے منصفو کو اپنے کرب سے آگاہ کرتے ہوئے لبوں پر قفل توڑ کر انصاف کے چند بول ادا کرنے کی درخواست کرتا اور کہیں خالقِ کائنات کے حضور دست بدعا دکھائی دیتا ہے۔

منصفو! کچھ تو کہو کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

الٰہی اب کوئی آندھی عطا ہو صحراؤں کو
سمندروں پہ تو گھر کر برس گئی ہیں گھٹائیں

اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تونے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

یارب! مجھے اس کربِ مسلسل سے رہا کر
مسجودِ ملائک ہوں تو کیوں خاک بسر ہوں

احمد ندیم قاسمی احساس کی سولی پر لٹک کر سوچ کے بحرِ بیکراں سے جو موتی چن کر لانے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان موتیوں کی آب وتاب نے ان کی زندگی میں ہی اک جہاں کو منور کیا۔ وہ اپنی اس خاصیت اور ادبی خدمت سے بہر طور واقف بھی تھے۔

دیارِ عشق کھنڈر اور دشتِ دل سنسان
مگر ندیمؔ کی رنگینیِ بیاں نہ گئی

اس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیمؔ
دل کی شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

ذرہ ہوں بظاہر میں دکھائی نہیں دیتا
مجھ میں کبھی جھانکو تو میں تا حدِ نظر ہوں

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ، سرِ رہگزار ہوں

نارسائی کا دکھ اور جدائی کا کرب، درد و سوز و آرزومندی کی متاع کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں جدائی کا تذکرہ اپنی تمام تر نزاکتوں اور دھیمی آنچ کے ساتھ فروزاں ہے۔

ہے میرے لمس میں اب تک ترے بدن کی مہک
تری جدائی کا حق مجھ سے کیا ادا ہوگا

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

لمحوں میں سمٹ گیا ترا وصل
برسوں پہ بکھر گئی جدائی

اردو شاعری کے سفر میں ہر دور میں کچھ مضامین ایسے ضرور تھے جن کے ناقدین نے روایتی ہونے یا نہ ہونے کی بحث سے قطع نظر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ شاعر خواہ کسی دور کا بھی ہو ایک سچا کھرا شاعران جذبوں کے اظہار سے روگردانی کر ہی نہیں سکتا جن سے سفرِ عشق میں وہ دوچار ہوتا ہے۔

دیکھتے دیکھتے تارا ٹوٹا
تیرا پیمانِ وفا یاد آیا

اس وقت کا میں حساب کیا دوں
جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے

ہاں میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں، پھول بتایا جائے

یہ فخر بھی تو بہت تھا کہ جو ہنسے ہم پر
وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

قاسمی صاحب کے ہاں کچھ خیالات کی تکرار بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خیالات کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا بلکہ جو احساس شاعر کو شدت سے گھیرتا ہے وہ اسے بے ساختہ مختلف زاویوں سے بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ بات صرف تشفی ہو جانے کی ہے۔

دیکھ کر قبر سے اگتا ہوا پھول
اپنا معیارِ وفا یاد آیا

نکلیں گے لحد سے پھول بن کر
پل بھر کے نہیں ہیں مہماں ہم

دلوں سے آرزوئے عمر جاوداں نہ گئی
کوئی نگاہ پسِ گردِ کارواں نہ گئی

مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم
بن جائیں گے گردِ کارواں ہم

روح میری شجر کی چھاؤں بنی
جسم گردِ سفر کے کام آیا

احمد ندیم قاسمی کی شاعری کے بکھرے رنگوں میں اک حسین رنگ معنوی اور واضح تلمیحی اشارے ہیں۔ ماضی کی گرد میں چھپے واقعات کو موجودہ دور کے قالب میں اس طرح ڈھالنا کہ ماضی و حال ایک ہی دہلیز پر

آ کھڑے ہوں، قاسمی صاحب کا خاصہ ہے۔

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

یوں تو ہر دور میں گرتے رہے انسان کے نرخ
ان غلاموں میں کوئی یوسفِ کنعاں نہ ہوا

دھن تو مجھ کو قیس کی سی تھی مگر اس دور میں
پھول اتنے تھے کہ صحرا کا کوئی رستہ نہ تھا

آج اناء الحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں
مومنو! دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے

نکل کے خلد سے بھی آدمی نہ پچھتایا
زمیں پہ بھی چمن آرائیِ گماں نہ گئی

حسنِ محبوب کے تذکرے بھی قاسمی صاحب کے ہاں نہایت لطیف پیرائے میں ملتے ہیں۔

لب دشمن کو بھی شیریں کر دیں
اس کے حسنِ نمکیں کی باتیں
عام سے تیرے خدوخال کہیں مل نہ سکے
یوں تو دیکھی ہیں کئی صورتیں پیاری پیاری

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں
اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

تمام تر تلخ حقائق کے احساس کے باوجود احمد ندیم قاسمی کی عظمت اس میں تھی کہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ وہ نا مساعد حالات کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ بسا اوقات شکایات بھی زباں کی نوک پر آتی ہیں مگر بالآخر امید کی لو گھٹا ٹوپ اندھیرے کو مٹا دیتی ہے۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی کو زندگی سے بھرپور شاعر کیا جا سکتا ہے اور وہ امید کی قندیلیں روشن کیے اپنا کردار نبھائے چلے جاتے ہیں۔

ظلمت مرا ماحول، تجلی مری منزل
میں شب کا مسافر مگر شمع سحر ہوں

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ سورج ہے سیاہ
اس کو اک روز صداقت کا ملے گا انعام

حالات کی ابتری کو وہ اک عارضی وقفہ گردانتے ہیں اور پر امید ہیں کہ امید کے آسمان پر چمکتا دمکتا سورج بہت جلد طلوع ہوگا۔ قاسمی صاحب کی نظم "وقفہ" اسی امید کی غمازی کرتی ہے۔

راستہ نہیں ملتا
منجمد اندھیرا ہے
پھر بھی باوقار انساں
اس یقیں پہ زندہ ہے
برف کے پگھلنے میں
پو پھٹنے کا وقفہ ہے
اس کے بعد سورج کو
کون روک سکتا ہے

غالب سے لے کر اقبال تک اور پھر اس کے بعد کے شعرا کے کلام سے احمد ندیم قاسمی نے فیض اٹھایا اور

پہلے سے مستعمل تراکیب کو اک نئے آہنگ سے نوازا۔

یہ جی میں آتا ہے تخلیق فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کر رگِ سنگ میں اتر جاؤں

ساری دنیا متلاطم نظر آتی ہے ندیم
مجھ پہ اک طنز ہوا، روزنِ زنداں نہ ہوا

قدرت سے ودیعت ہیں مجھے رنگ بھی رس بھی
ارزاں ہوں کہ میں شاخِ بریدہ کا ثمر ہوں

فنا اور بقا کے موضوعات پر بھی قاسمی صاحب نے نہایت اچھوتے انداز میں قارئین کی فکر کو اک نئی اچھوتی منزل سے آشنا کرتے ہیں۔ اور نادر خیالات کے بیان میں سرگرمِ سخن رہے۔

پیراہن شب نہ جل رہا ہو
مشرق پہ بکھر رہی ہے لالی

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

قاسمی صاحب کی شاعری کے یہ چند رنگ اس قدر تھے جیسے کسی بحر بیکراں میں انگلی ڈبو کر جس قدر پانی حاصل کیا جائے۔ ایک عظیم شاعر، افسانہ نگار اور ایک بہت بڑی شخصیت کو اگرچہ ہم سے بچھڑے دس سال کا عرصہ ہونے کو ہے مگر آج بھی اور آنے والے وقتوں میں بھی ان کے افکار دلوں کو گرماتے رہیں گے۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

* * *

اسد عباس خان

احمد ندیم قاسمی کی شاعری

اردو اور پنجابی کے خلاق شاعر اور دانش ور نذیر قیصر نے لکھا ہے کہ: ”کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جو مُردہ لفظوں کو چھو کر انھیں زندہ کر دیتے ہیں اور کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جو زندہ لفظوں کو چھو کر انھیں مردہ کر دیتے ہیں۔ “احمد ندیم قاسمی شعرا کی اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو مردہ لفظوں کو چھو کر انھیں زندہ کر دیتے ہیں لیکن ایسے شاعر ہوتے بہت کم ہیں جن کے ہاتھوں میں یہ تخلیقی لمس موجود ہوتا ہے جس سے مردہ لفظ زندہ ہو جاتے ہیں اور لفظ چلنے پھرنے لگتے ہیں اور روشنی ہونے لگتی ہے، زندہ الفاظ سے ہی خدا کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ زندہ الفاظ ہی سے تازہ اور زندہ تخلیقات ظہور پاتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے شاعری کا ایک نیا نظام ترتیب دیا۔ اپنی غیر معمولی دانش اور فکر کے ساتھ انھوں نے اردو شاعری کو ثروت مند بنایا اور اپنے باطن میں انھوں نے ہمیشہ شاعری کو قائم اور برقرار رکھا جو کسی معجزے سے کم نہیں ہے، سادگی اور سہولت کے ساتھ شعر کہنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ نئی تراکیب، تازہ ترین امیجری، الفاظ کا عالمانہ استعمال، شیریں بیانی، جدید فلسفۂ شعر اور دل پذیر جداگانہ اسلوب ان کی ادبی شناخت بن گیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی نشو ونما میں گراں قدر حصہ لیا اور اپنی شعری اور نثری توفیقات سے اردو زبان و ادب کے ذخیرے میں غیر معمولی اضافہ کیا جس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ توفیق کو حضرت سلطان باہو نے ”نورِ توفیق“ کہا ہے۔ یعنی قاسمی صاحب کو بھی اللہ نے اس نور سے بھر دیا تھا اور یہ اسی سے کائنات کو دیکھتے اور سمجھتے تھے اور اپنی ذات اور کائنات سے حاصل ہونے والے گراں قدر مشاہرات سے تجربات، محسوسات، باطنی واردات سے نئی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ گویا اس لحاظ سے ان کی شاعری عارفانہ مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور عالم گیر فکر سے وابستہ ہے۔

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں تو مجھے
دشتِ آغوشِ فنا لگتا ہے

”آغوشِ فنا“ ایک عمدہ ترین ترکیب ہے، لیکن ترکیب سے قطعِ نظر! فنا کیا ہے اور بقا کیا ہے، بقا کو سمجھے بغیر آدمی فنا کو نہیں سمجھ سکتا اور فنا کو سمجھے بغیر آدمی بقا کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرے نزدیک عالم انسان کے اندر موجود

ہے، یعنی دل اور دل، دل دریا سمندروں ڈونگھے" دشتِ آغوش فنا لگتا ہے۔ یہ ایک الگ کیفیت کا مصرع ہے جو یقیناً قاسمی صاحب نے اپنے اندر بسر کیا ہے ورنہ اس معنویت کے ساتھ شعر نہیں نکلتے۔ حضرت وارقؒ نے فرمایا تھا کہ "منتہی کے دو نہایات ہیں ۱۔ فنا کے اعتبار سے ۲۔ بقا کے اعتبار سے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ علمِ زبان میں یا زبان دانی میں فنا کے اور بقا کے معنی اور ہیں جب کہ علمائے ظاہرہ کے پاس ان کے معنی اور ہیں اور صوفیا کے قریب ان کے معانی و مطالب یکسر بدل جاتے ہیں۔ مگر قاسمی صاحب کے اس شعر میں "تصوف" کے ساتھ شعری فلسفہ بھرا ہوا ہے جو قاری کو باطن کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں سے علمائے ظاہرہ کے فنائے جسم اور فنا کے معنی نہیں کھل رہے بل کہ صوفیا کے معنی کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ اب اس کے ساتھ یہ شعر:

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں گِلہ لگتا ہے

یہ شعر قاسمی صاحب کی بصیرت، وسیع المطالعگی اور عمدہ تفکر کا تجزیہ ہے۔ اس میں ایک پورا فلسفہ موجود ہے۔ ان کے ہاں مضامین کا تنوع ملتا ہے۔ سادگی اور پُرکاری کے ساتھ ان جیسا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ یہ تمام عمر شعر میں جیے اور شعر پر مرے۔ شاعری ان کا عشق تھا اور قاسمی صاحب شاعری کا عشق تھا جو اپنے اندر بے پناہ وسعت اور امکانات رکھتے تھے اور امکان کے تمام دروازے انھوں نے اہلِ ادب پر کھولے جو ہمیشہ کھلے ہی رہیں گے۔ گویا شاعری سے انھوں نے ایک کائنات تخلیق کی ہے۔ یہ ہمیشہ تخلیق پر قادر رہتے تھے۔ مطلب اللہ پاک نے انھیں اتنی قدرت عطا کی تھی۔ یہ شعر کو کہتے تھے کہ "ہوجا" اور شعر ہو جاتا تھا۔ افسانے کو کہتے تھے کہ "ہوجا" اور افسانہ ہو جاتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی غزل کی کن فکانی آواز ہیں۔ اس عہد کی سب سے معتبر آواز۔ اس لیے ان کی شاعری میں عرب و عجم کا روایتی، سماجی اور تاریخی شعور کارفرما رہتا ہے۔ جس سے ہماری عصری غزل کا نیا منظر نامہ ترتیب و تشکیل پاتا ہے۔ ان کی شاعری سے سچ اخلاص اور الفاظ کا سورج طلوع ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی اختراعی صلاحیت سے اردو غزل کا دامن بھر دیا اور اس کی تہذیب کی فروغ کاری میں نمایاں حصہ لیا۔

حیرت ہے اس نے اپنی پرستش ہی کیوں نہ کی
جب آدمی کو پہلے پہل آئینہ ملا

غالب نے اپنی لازوال شعریات میں لفظ آئینہ کو اس عمدگی سے برتا ہے جو صرف اسے ہی زیب دیتی تھی۔ قاسمی صاحب نے بھی اس شعر میں آئینے کے ایسے ہی معانی بیان کیے ہیں کہ اس شعر میں بل کہ اس شعر کے لفظ لفظ میں آدمی اپنے آپ کو جیتا ہوا اور جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہے بھی یہ بہت حیرت کی بات جو انتہائی شعری اور فکری سہولت کے ساتھ قاسمی صاحب نے بیان کردی ہے۔ بس بقول غالب۔

طوطی کو ششش جہت سے مقابل ہے آئینہ

عابد علی عابد نے کسی جگہ لکھا ہے کہ آئینہ آئین سے مشتق ہے اور اسے اسباب زینت کہا ہے مگر قاسمی صاحب کے ہاں آئینہ اسبابِ زینت نہیں ہے بل کہ اسبابِ حیرت ہے! یہاں اگر دیکھا جائے تو قاسمی صاحب نے لفظوں کی بالکل نئی سطح دریافت کی ہے اور ساتھ ہی نئی معنویت اُجاگر کی ہے۔ ان کی پوری شاعری کا نظام اسی دریافت کی ترتیب سے جُڑا ہوا ہے کہ نئے انسان کو ان کی شاعری میں آئینہ در آئینہ اپنا ہی معنوی چہرہ نظر آتا ہے۔ کہیں حیرت کے ساتھ کہیں زینت کے ساتھ مگر ہر سطح پر قاسمی صاحب نے اجتماعی طور پر اردو زبان کو ثروت مند بنانے کے لیے نئی لفظی اور معنوی وضع اختیار کی ہے کیوں کہ یہ اس سے کم پر بالکل قناعت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ دوسرا قدرتِ کاملہ نے اس عظیم کام کے لیے ہی انھیں پیدا کیا تھا۔ یہ شعر کو آفاقی سطح پر سوچتے اور اخذ کرنے کے قائل رہے اور زندگی کے نئے پہلوؤں کو ہمیشہ اپنے شعر میں لے آتے جو یقیناً ان کی انفرادی شعری استعداد اور قدرت تھی۔ انھوں نے جدید طرزِ احساس (ان کی ترقی پسندی) کے ساتھ نئی شعری اور فکری احساس مہیا کی جس کا پہلا اور آخری حوالہ نیا انسان ہے۔ یعنی انھوں نے نئے انسان کو ایک نئی شعری متھ منتقل کی:

بہار کتنی ہی بے رنگ ہو بہار تو ہے
جو گُل نہیں تو کوئی زخم ہی کھلا ہوگا
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا

ان دونوں شعروں کی ذاتی صورتِ حال کھلے تو پتہ چلتا ہے کہ قاسمی صاحب کی شاعری کائنات کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا عمل ہے اور اپنے دل ودماغ میں اتارنے کا اور پرکھنے کا عمل ہے۔ یہ معانی کی بہت سی جہات کو قاری پر انتہائی سہولت کے ساتھ کشف کردیتے تھے۔

ولیم ورڈزورتھ نے کہا تھا کہ اعلیٰ درجے کی شاعری عام روزمرہ کی زبان بل کہ یوں کہیے کہ چرواہوں کی

زبان میں کی جاسکتی ہے۔ قاسمی صاحب کی شاعری میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ گہری علمیت اور مشاہدے کے ساتھ عام زبان میں اور روزمرہ کی ہی زبان میں نہایت سادگی اور پُرکاری کے ساتھ شاعری کی۔ یوں ان کا ایک ایک مصرع دلوں میں اتر جاتا تھا اور اترتا رہے گا۔ ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی شاعری میں صوفیانہ تجربات اور مشاہدات کا تعین کیا ہوا تھا جبھی تو اس جیسے شعر کہا کرتے:

اے خدا! اب ترے فردوس پہ حق ہے میرا
تُو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

احمد ندیم قاسمی پر ایسے صوفیانہ تخیلات اور مشاہدات اِلقا ہوتے رہتے تھے اور یہ ہمیشہ ہی شعری کیفیات اور بھیدوں سے سرشار ہو کر تخلیق کاری میں مگن رہتے تھے۔ ان کے معجز نما قلم سے جو افسانہ نکلا، جو شعر نکلا اس نے زمانوں اور قرنوں کے ساتھ روشنی کی رفتار کی طرح سفر کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کو روایت سے بالکل ہٹ کر تخلیقی انداز میں استعمال کیا۔ جس سے انھوں نے اپنا جداگانہ اور سحر انگیز اسلوب بنایا اور پھر اسی اسلوب نے ان کو پوری ادبی دنیا میں ممتاز مقام عطا کیا۔ اس لیے ان کا نظریۂ شعر ہمیشہ خاصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ آج جب قاسمی صاحب ہم میں نہیں رہے، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب ان کا روئے سخن چہار جانب ہے اور وہ پورے تسلسل کے ساتھ شعر کہہ رہے ہیں۔ لحہ لحہ مجھ پر ان کے شعر "اُتر" رہے ہیں اور ان کے شعروں سے ایک بھید بھری خوشبو اُٹھ کر تمام زمین کو معطر کر رہی ہے۔ درخت اور پرندے مل کر ان کا یہ شعر گنگنا رہے ہیں اور ہوا حیرت سے سُنتی جا رہی ہے۔

شاعری روزِ اول سے ہوئی تخلیق ندیمؔ
شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا

☆☆☆☆

یوسف حسن

ندیم کی ترقی پسندی

احمد ندیم قاسمی کی آئیڈیالوجیکل شناخت ترقی پسندی ہے، جس کا اظہار و اثبات اور دفاع وہ اپنی ساری ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں تسلسل کے ساتھ کرتے رہے۔

ترقی پسندی کیا ہے؟

ندیم نے ترقی پسندی کی مرکزی خاصیت کا شعری زبان میں یوں اظہار کیا ہے کہ:

> ''ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اُکسانے آئے ہیں۔ضمیرِ ارتقا میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں اور غیر شعری زبان میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی اولین اور اساسی طور پر ہر انسانی فرد کے انسانی جوہر ۔۔۔اس کی تخلیقی اہلیت اور فعلیت ۔۔۔ کے اقرار و اثبات کا اور اس فردیت کے ہمہ جہت اور آزادانہ نشوونما کا سماجی فکر و عمل ہے اور پھر یہ نشوونما ہی انسانی فرد کی فردیت کی آفاقیت کے امکان کو حقیقت پذیر کرنے کا سماجی پروسیس ہے۔''

ندیم نے انسانی فرد کی انسانی فطرت کو اپنے ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ؎

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری

انسانی فرد کی تخلیقی اہلیت اور فعلیت کا یہ انسانی جوہر اور اس کی فردیت کے آفاقیت پذیر ہونے کی انسانی فطرت کسی مجرد انسانی فرد کی حیثیت سے نہیں ہے بل کہ ایک سماجی انسانی فرد ہونے کے سبب سے ہے اور سماجی تاریخ کے ارتقا میں اس کے فعال کردار کی دین ہے۔

عمومی ترقی پسندی کے تعقل کی یہ مختصر سی توضیح جو انسانی فرد کے حوالے سے کی گئی ہے اس پر بہت سے دوست شاید حیران ہوں کہ ہمارے ترقی پسند تو زیادہ تر اجتماعیت کے حوالے ہی سے ترقی پسندی کو پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ انسانی فرد کی فردیت اور انفرادیت ترقی پسندی میں کہاں سے آ گئی؟ اس ذیل میں عرض ہے کہ

اگر ہمارے بزرگ ترقی پسندوں سے ترقی پسندی کی تعریف وتوضیح میں کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے تو ہم اس کوتاہی کو اپنا مستقل نظریاتی ورثہ بنانے کے پابند نہیں ہیں۔ میں نے ترقی پسندی کی یہ مختصر سی تعریف وتوضیح ترقی پسندی کے مستند جدید عالمی ماخذوں سے استفادہ کرتے ہوئے پیش کی ہے۔

اس سلسلے میں ندیم کے دو مضامین ''موضوعات محدود کیوں' ' اور ''ادب میں انفرادیت'' مشمولہ کتاب ''معنی کی تلاش'' بھی بہت اہم ہیں جن میں انھوں نے شخصی اور فنی انفرادیت کا اثبات فطری اور سماجی مظاہر کے وسیع تر تجربات ومشاہدات اور مطالعات سے مشروط کیا ہے۔ وہ انفرادیت کی نفی کرنے کے رویے کو بھی مسترد کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت کے متاثر ہو جانے کے ڈر سے خود بھی سکڑ کے رہنے کے رویے کو بھی غیر انسانی رویہ قرار دیتے ہیں۔ ندیم کی تائید میں مارکسی ترقی پسندی کا نظریاتی مؤقف یہ ہے کہ:

> ''کسی فطری یا سماجی معروض کے تبدیل کرنے کا سماجی عمل بیک وقت Doing بھی ہے، Being بھی ہے، Becoming بھی ہے Knowing بھی ہے اور اس کے ساتھ انسانی فرد کی Uniqueness یکتائی میں اضافہ کرنے والا بھی ہے۔''

ہر انسانی فرد کی ذات کے ہمہ جہت آزادانہ اظہار واثبات کا امکان طبقہ واری سماج کے خاتمے ہی سے حقیقت پذیر ہو سکتا ہے اور اس کی سب سے زیادہ ضرورت خود محنت کش طبقات کو ہے اور جب ہم لکھنے پر آتے ہیں تو پھر سوشلزم اور کمیونزم کے نظریاتی مباحث سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ اور یہ سوال فیض کے ساتھ ساتھ ندیم کے بارے میں بھی بار بار اٹھایا جاتا ہے۔

فیض نے اپنے کمیونسٹ ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا اور اپنے مسلمان ہونے کا ہمیشہ اقرار کیا۔ ندیم نے اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا بار بار اعلانیہ اظہار کیا اور سجاد ظہیر سے اپنے کمیونسٹ نہ ہو جانے کا اظہار اُس جواب کے ساتھ کیا کہ میرا اسلام مجھے اس سے نہیں روکتا۔ گویا ان کے تصورِ اسلام سے کمیونزم کے، آزادی اور مساوات کے اور غیر طبقاتی سماج کے تصورات متصادم نہیں ہیں اور وہ کمیونسٹ بنے یا کہلائے بغیر بھی ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے مجموعۂ مضامین ''تہذیب وفن'' میں سے ایک اقتباس دیکھیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ اسے خالص اسلام کہہ لیجیے، اسلامی سوشلزم کہہ لیجیے، اشتراکیت جمع ذاتِ کبریائی، کچھ بھی کہہ لیجیے، مگر پاکستان کا یہی بنیادی تصور ہے اور ہمارے ذہنوں میں

> اس تصور کو یوں واضح ہونا چاہیے کہ ہم مساوات اور جمہوریت کے علم بردار ہیں۔ ہم افلاس کو منشائے الٰہی کہنے کے بجائے بعض معاشی رشتوں کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ ہم دوسرے انسانوں سے نفرت نہیں کرتے کیوں کہ یہ سب انسان اُسی آدم کی اولاد میں سے ہیں جو مسجودِ ملائک ہے۔ ہم انھی مقاصد کے حصول کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں اور ہماری نسلیں بھی اسی مقصد کے لیے جد وجہد کرتی رہیں گی۔”

(تہذیب وفن، اپریل 1967ء، ص:116)

مزید یہ کہ انھوں نے سوویت یونین کی بعض سیاسی پالیسیوں سے ضرور اختلاف کیا اور خاص طور پر مشرقی پاکستان کے مسئلے پر وہ اس پر بہت برہم تھے۔ یہاں تک کہ سوویت یونین کی مختلف زبانوں میں ان کی تخلیقات کے جو تراجم شائع ہوتے رہے ان کی رائلٹی کی کثیر رقم وصول کرنے کے لیے بھی سوویت یونین جانا گوارا نہ کیا۔ لیکن جہاں تک سوشلزم اور کمیونزم کے سماجی افکار و نظریات کا تعلق ہے، ان کے خلاف انھوں نے کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ جب کہ اپنے سیاسی اور ادبی کمیونسٹ رفقا کی خدمات پر توصیفی مضامین لکھے۔ جن میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سیکرٹری جنرل فیروز الدین منصور اور محنت کش راہ نما مرزا محمد ابراہیم بھی شامل ہیں۔ اسی حوالے سے میں اپنے ساتھ ان کے سلوک کی طرف صرف اشارہ ہی کروں گا کہ میں جو 1969ء سے 1975ء تک قیامِ لاہور کے دوران میں تقریباً روزانہ ہی ان کی خدمت میں دفترِ فنون میں حاضر ہوتا تھا گویا ادبی زندگی میں انھی کے زیرِ تربیت تھا۔ مگر میری سیاسی مصروفیات کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں رہتی تھیں۔ ندیم نے نہ اس وقت اور نہ اس کے بعد کبھی ان سرگرمیوں سے اور مارکسزم کے مطالعے سے روکا ٹوکا۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی ایک نئی صورتِ حال میں کمیونسٹ ترقی پسندوں سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئیں، ان پر فتویٰ بازی کا سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے لیکن ندیم نے ان کوتاہیوں کی تشخیص اور تجزیہ سماجی، نفسیاتی سیاق و سباق میں حقیقت پسندی کے ساتھ کیا اور ان کے اپنے کوتاہیوں کے اعتراف اور اصلاح کو سراہا۔ ان معاملات پر ان کی گفتگو کا لہجہ وہ نہیں ہے جو ان کے بعض مداحوں نے ابھی تک اپنا رکھا ہے۔

ندیم کی عمومی ترقی پسندی اپنی اسلامی شخصی اور پاکستانی قومی شناخت کا اعلان و اثبات کرتے ہوئے سارے عالمِ انسانیت کے، کسی امتیاز کے بغیر، مسلسل ارتقا و ارتقاع کا آفاقی و سماجی آئیڈیل اپنے اندر سموئے

ہوئے ہے۔

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

ندیم کی ترقی پسندی کے اپنے شخصی کردار ہیں۔ اظہار پر کئی مضامین لکھنے کی ضرورت ہے۔ فی الحال ان کی ترقی پسندی کے لسانی فن میں اظہار پر مختصراً عرض ہے کہ ان کی ادبی ترقی پسندی متعدد شعبوں پر محیط ہے۔ یعنی:

ادبی تخلیق کاری،
ادبی تنقید نگاری
ادبی نظریہ سازی اور
ادبی ابلاغیات

اوران سب کے ساتھ کئی نسلوں کے ادیبوں کی ادبی تخلیقی تعلیم وتربیت۔ ادبی ترقی پسندی کے سارے شعبوں میں ان کی ترجیح فنی حقیقت پسندی کا منہاج ہے۔

فنی حقیقت پسندی کا علمیاتی حقیقت پسندی کے ساتھ یقیناً گہرا تعلق ہے مگر جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حقیقت کو جانا جا سکتا ہے اور ہمارا عالم حقیقت کا انعکاس بھی ہے اور ہمارے سماجی عمل کی تشکیل بھی۔ فنی حقیقت پسندی، ایک عمومی فنی منہاج ہے۔ جس کی متعدد ذیلی صورتیں ہیں۔ اور جو مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ ندیم کی فنی حقیقت پسندی، تخلیقی، تنقیدی اور نظری تینوں شعبوں میں مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ اورانھوں نے ترقی پسندی کی اسی جدید فنی حقیقت پسندی کے منہاج میں متعدد نثری اور شعری اصناف میں ایسے شاہکار تخلیق کیے جو آنے والی نسلوں کی بھی ترقی پسندانہ فکری، فنی اور جمالیاتی تہذیب وتربیت کے مستقل واسطوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پاکستان میں 1956ء تا 1966ء کے دس گیارہ برس ادبی جدیدیت پسندی کے ابھار کے برس تھے۔ جن میں ایک موضوعیت پسندانہ موَقف سے بالخصوص ترقی پسندانہ علمیاتی حقیقت پسندی اور فنی حقیقت پسندی دونوں کو شدت سے مسترد کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں جن اہلِ قلم نے ادبی ترقی پسندی کا مستحکم اور مسلسل دفاع کیا ان میں ندیم کا نام اور کام سب سے بلند ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے آٹھویں عشرے (1971ء تا 1980ء) سے عالمی سماج مابعد جدیدیت کے دور میں ہے اور پرانے ادبی جدیدیت پسند اب مابعد جدیدیت پسند ہو گئے ہیں، جن کی زد پر ہر نوع کی حقیقت

ہے اور حقیقت پسندی بھی۔ اس صورتِ حال میں حقیقت پسندی کی نئی نشو ونما بھی ہو رہی ہے اور اس نئی نشو ونما کے لیے اپنے جس ترقی پسند ادبی ورثے سے استفادہ ہمارے لیے ناگزیر ہے، اس میں ندیم کی کثیر تخلیقی، تنقیدی اور نظری تحریریں بھی شامل ہیں۔

میرا اپنا تعلق 1970ء کے ترقی پسندوں کی نسل سے ہے، میں نے 1975ء میں ندیم پر اپنا پہلا مختصر سا مضمون ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں پڑھا تھا جس کے آخری پیرے کے ساتھ اس تحریر کو ختم کرتا ہوں کہ:

> ”نئی نسل کے ترقی پسندوں کی اکثریت کی تخلیقات میں پاکستان اور پاکستان کے عوام سے محبت اور ان کی انقلابی جدوجہد میں شرکت کا جو جذبہ اتنا کارفرما نظر آتا ہے، احمد ندیم قاسمی کی ذات سے الگ اس کی مکمل طور پر پہچان نہیں ہو سکتی اور سب جانتے ہیں کہ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔“

میری ہر نیکی روشن ہے میرے عوام کے چہروں پہ
میرے گناہوں کی فہرستیں ہیں شاہی فرمانوں میں

(ندیم)

☆☆☆☆

ڈاکٹر صلاح الدین درویش

احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند نظم۔۔۔ چند وضاحتیں

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی ترقی پسند سوچ اور اس کے مقاصد کے تعین کے لیے فکری اعتبار سے مربوط اور جامع جب کہ اسلوبیاتی لحاظ سے قدرے کمزور بیانیہ سامنے آیا۔ یہ بیانیہ دراصل ایک افسانوی مجموعہ تھا جو ’’انگارے‘‘ کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ قومی، نسلی، مذہبی اور ثقافتی سطح پر موجود تہذیبی بیانیوں کی ایک زبردست ردِ تشکیل اس مجموعے کا داخلی موضوع بنا لیکن سجاد ظہیر کی کتاب ’’روشنائی‘‘ تک آتے آتے ترقی پسند تحریک کا معنوی سطح پر معروضی حوالوں یا مجبوریوں کے باعث دائرہ وسیع کرنے کے لیے بعض سیاسی مقاصد کے حصول کی قیمت پر قومیت، نسلیت، مذہبیت اور ثقافتیت کے کھوکھلے بیانیوں کو ترقی پسند مصنفین نے اپنے لیے روا اور کافی حد تک کارآمد بنا لیا۔ تقسیم ہندوستان سے لے کر قراردادِ مقاصد کی تشکیل تک کے سارے دورانیے میں ترقی پسند تحریک کے گنجائشی بیانیوں نے خوب راہ ہموار کی۔ دوسری طرف خالص لال سلام والے لوگ تھے کہ جن کا انقلابی تیقن پاکستان کے سیاسی و سماجی سٹرکچر کو خاطر میں لائے بغیر ایک عظیم سرخ سویرے کے انتظار میں کم از کم 30 سال تک سویا رہا۔ یہ لوگ جدیدیت کے عالمی خواب کے اسیر تھے اور تبدیلی کے لیے ان کے بڑے بیانیے کا نام سوشلزم تھا، اس بیانیے کی ردِ تشکیل کو یہ لال سلام والے بھائی دیگر بڑے بیانیوں کے حاملین کی طرح گناہ سمجھتے تھے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں موجود کسی قدر متروک اور کافی حد تک ایسے پختہ ترقی پسند ضرور مل جاتے ہیں کہ ان سے اب بھی جب قومی، نسلی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی اقدار و روایات کے حامل مہابیانیوں کی ردِ تشکیل کی بات کی جاتی ہے تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ قومی، نسلی، یا مذہبی افتخار کو وہ ابھی تک اپنی پولیٹیکل سٹریٹیجی کا لازمی نشان سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عظیم قوم، ہماری عظیم نسل، ہمارا عظیم ثقافتی ورثہ، ہماری عظیم تہذیب، ہمارا عظیم ماضی اور ہمارا عظیم مذہب جیسے الفاظ ایک ایسی آئیڈیالوجی کے ظہور کا باعث بنتے ہیں کہ جس کو استناد کے درجے تک پہنچانے کے لیے علامہ محمد اقبال کی شاعری کا حوالہ ان کی ترقی پسندی کو چٹخارنے کے کام آ جاتا ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ کارل مارکس، فریڈرک اینگلز اور ولادی میر لینن کا بیشتر علمی کام کلاسیکی فلسفے اور اس کے طریقہ کار کی زبردست ردِ تشکیل کے باعث منظر عام پر آیا ہے۔ یہ تینوں حضرات خود تو ایسے دانش مند تھے کہ جنھوں نے ضروری سمجھا کہ جب تک نسلی، گروہی، طبقاتی، تاریخی، فلسفیانہ، مذہبی، معاشی اور ثقافتی اقدار و روایات اور ان کے محافظ و نگران اداروں کو نہایت معقول لیکن سخت

زبان میں چیلنج نہیں کیا جائے گا۔ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی بدبختی کی اصل وجوہات تک رسائی ممکن نہیں ہو سکے گی لیکن حیرت ہے کہ خود ان تینوں دانش مندوں کی تعلیمات پر ایمان لانے والے پاکستانی سوشلسٹوں اور ترقی پسندوں نے غربت، بے بسی اور غلامی کی زنجیروں میں بندھے عوام کے تہذیبی، ثقافتی، نسلی اور مذہبی مہابیانیوں کی ردِ تشکیل کو غیر ضروری سمجھا، ان کا خیال تھا کہ سرخ پھریرے کی طاقت باقی معاملات خود طے کر لے گی۔

احمد ندیم قاسمی کا تعلق بھی ترقی پسندوں کے ایسے گروہ سے ہے جنھوں نے اپنی جاگیردارانہ اخلاقی و ثقافتی قدروں اور ان قدروں کو تحفظ فراہم کرنے والے بیانیوں کی طرف رجوع کرنا بے کار جانا اور سمجھا۔ وہ نظام کو بدلنے کی شدید آرزو رکھتے تھے اور ان کی یہ آرزو لائق صد احترام بھی ہے لیکن غلامی، غربت اور بے توقیری کے خاتمے کے لیے جن قدروں کی ردِ تشکیل کو انھوں نے بے کار جانا، یہی وہ بنیادی قدریں تھیں کہ جن کو ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے استحصال سے پاک معاشرے کے قیام میں ایک زبردست مزاحمتی قوت سمجھا۔ اس مزاحمت کو براہ راست دفاع کی ضرورت اس لیے بھی نہ تھی کہ ہندوستانی یا پاکستانی تہذیب و ثقافت میں یہ مستقل قوت ہمیشہ آزاد رہی۔ اب یا تو جاگیردارانہ معاشرت کو تحفظ فراہم کرنے والے مہابیانیوں کی آفاقی اور ارضی اپیل کو ترقی پسند حضرات دل و جان سے بجا اور معقول سمجھتے تھے یا ان مہابیانیوں کی اجارہ دار امارتوں اور عمارتوں سے ڈرتے تھے، لیکن اس حکمت عملی کا فکری سطح پر نقصان یہ ہوا کہ پاکستان میں مقامی سطح پر بڑھنے والی سرمایہ کاری اور تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے لبرل علوم کے نتیجے میں ابھرنے والی روشن خیالی کے خلاف مذہبی، نسلی، ثقافتی اور قومیتی مہابیانیوں کے حاملین مسلسل تنہائی کا شکار رہنے اور اپنی شناختوں پر اٹھنے والے سوالات کا جواب نہ ہونے کے باعث بتدریج متشدد ہوتے چلے گئے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں متشدد فکری رجحانات کی آبیاری میں خود ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، وکیلوں، صحافیوں اور دانشوروں نے بھی اپنے حصے کا کردار ادا کیا ہے۔ ترقی پسندوں کی اسی مجرمانہ غفلت یا حکمت عملی کے باعث پاکستانی معاشرے پر یہ اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ اب ہر نسلی، مذہبی، ثقافتی یا قومیتی گروہ اپنے متشدد فکری رجحانات کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے کا جمہوری حق رکھتا ہے، یہ تشدد پسندی اب اجتماعی رجحانات میں تبدیل ہو چکی ہے کہ جس کی وجہ سے انتظامی، عدالتی اور قانونی بندوبست ریاستی سطح پر ایک مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہابیانیوں کی متشدد روایات اور تعلیمات سے انسانی حقوق کو الگ کرنے والی تنظیموں، اداروں اور افراد کو بدترین تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں اگر لیفٹ کی سیاست کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہوتی چلی گئی ہے تو اس کا ذمہ دار خود لیفٹ ہے۔

1950ء تک آتے آتے بشمول دو عالمی جنگوں اور امریکہ کے ایٹمی دھماکوں کے مغربی معاشرے جاگیردارانہ اور شاہی اقدار و روایات اور ان کے محافظ مہابیانیوں سے الگ اور جدا ہو کر خالص سیکولر بنیادوں پر

سرمایہ داری نظام کو مضبوط اور موثر بنا چکے تھے۔ صنعتی نظام تمدن کے ارتقاء اور اس کی فعالیت کے لیے جمہوریت اور جمہوری اداروں کی تشکیل میں کامیاب ہو چکے تھے، یہاں تک کہ عالمی سطح پر نئے سیاسی اور معاشی بندوبست کے لیے تیسری دنیا میں موجود اپنی نوآبادیات یا معاشی منڈیوں کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ جمہوری قدروں میں رہتے ہوئے وہاں نئے انسان کا ظہور ہو چکا تھا کہ جس کی شخصی آزادیوں پر پڑی تمام زنجیروں کو توڑ دیا گیا۔ سائنس کے علوم اور ٹیکنالوجی نے پیداواری شعبوں میں انقلاب برپا کر دیا اور نئے عالمی تمدن کی ضروریات میں اپنی صنعتی پیداوار کے حصول کو نئے طرز زندگی کی سچائی اور مجبوری بنا دیا۔ تیسری دنیا کے ممالک کو نئے زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ یورپ کے پیداواری کلچر کے مقابلے میں صارفی کلچر میں تبدیل ہو جائیں۔ پیداواری کلچر کے فروغ کے لیے جن شخصی آزادیوں اور مہابیانیوں کے متوازی علمی و تحقیقی توسعات کی ضرورت ہوتی ہے، صارفی کلچر جدید اشیائے صرف کے استعمال کے باوجود آزادیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی تھر تھر کانپنے لگے گا۔

احمد ندیم قاسمی کی اردو نظم کا مطالعہ اپنے مجموعی تاثر اور نتائج میں یہ بات سامنے لاتا ہے کہ مغرب کی آزاد اور ترقی پسند وہ سوچ کہ جس نے سرمایہ داری نظام میں سر اٹھایا، اس سوچ نے انسان کو انسان کی اہلیت اور لیاقت پر مکمل اعتبار کرنے کی راہ سجھائی اور وہ تمام مہابیانیے جو انسان کو ایک لاغر، بے توقیر اور بے مایہ وجود قرار دیتے تھے، مغرب کا وہ انسان ان مہابیانیوں کے تسلط اور خوف سے آزاد ہو گیا، اس کا فائدہ نئے انسان کو یہ ہوا کہ وقتی، ضروری، ٹھوس، مناسب اور بر وقت فیصلوں کے لیے سیاسی، سماجی اور کاروباری یا معاشی مقاصد کے حصول کو چھوٹے لیکن خالص عملی اقدامات پر مبنی بیانیوں سے رجوع کرنا شروع کر دیا، یہ چھوٹے بیانیے انسان کی عقلِ عیار کی ٹھیک ٹھیک پیمائشوں کے حامل تھے، ان کے مقابلے میں میں انفس و آفاق کی باطنی، روحانی یا وجدانی خیال آرائیوں کو بروئے کار لانا اب مغرب کی تمدنی ضرورت سے باہر ہو چکا تھا، احمد ندیم قاسمی جب اس نئے انسان کی مداحی کرتے تھے تو وہ حیرت انگیز طور پر اس بات سے اپنے فکری نظام کو الگ رکھتے تھے کہ اس نئے آزاد اور ترقی پسند انسان کا وجود پاکستانی معاشرے میں کسی ایلین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ انھوں نے اپنی نظم کے پورے بیانیے میں پاکستانی معاشرے کے انسان کی بے بسی، بے توقیری اور غربت و استحصال کی وجوہات کو خود پاکستانی معاشرے کی اقدار و روایات میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، زیادہ سے زیادہ جاگیرداری نظام کی مخالفت کی ہے لیکن اسی جاگیرداری نظام کی ردِ تشکیل کے لیے جن مذہبی، ثقافتی، تاریخی، نسلی اور قومیتی مہابیانیوں پر قلم نقد اٹھانا ضروری تھا، ان سے صرفِ نظر کر گئے۔ یہ بات کہنے میں کیا عار ہے کہ انہیں اپنے تہذیبی بیانیے میں کوئی ایسی کوتاہی نظر نہیں آئی کہ جو ان کے حالات کی شکست کا باعث ہو، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی نظم کے اسلوب میں اشرافیہ کی حاکمیت پسند لفظیات مثلاً حمیت، غیرت، ضمیر وغیرہ بہ سہولت متن کا حصہ بنتے چلے گئے ہیں۔ مغربی سرمایہ داری نظام کی عالمی معیشت اور سیاست میں برتری

کے نفسیاتی دباؤ سے نکلنے کی یہ ایک تدبیر تھی جو مختلف لفظوں میں اپنے متبادل معنی کو منظر عام پر لاتی ہے:

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے
مگر کون خریدے گا مجھے
وہ مری غیرت و معیار حمیت کو کہاں بیچے گا
یہ وہ اجناس ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں (غیرت اور ضمیر)
تم نے جب زیر زمیں جوہرِ ذرہ توڑا ...... تو اسی اثنا میں
موتی بننے کے لیے سیپوں میں جتنے بھی قطرے اترے
وہ چمکتے ہوئے جرثومے بنے
کہ جب انسان کا دماغ
اپنی ہی نسل کو جرثومہ بنا کر رکھ دے
سیپیاں، موتیوں کے نور کا ناموس بچائیں کیسے! (ترقی یافتہ)
یہ ہے وہ سمت کہ جس پر مرے ٹیپو کے نقوشِ کفِ پا
چاند ستاروں کی طرح روشن ہیں
اور اس سمت سفر کرنے کی یہ شرط ہے
ہم ظلمت مغرب کو بتا دیں
کہ ہمیں صبح کے وارث ہیں کہ ہم شرق ہیں

پاکستان کے تہذیبی مہابیانیے کے پیشِ نظر مندرجہ بالا تمام افکار قاری کے جوش کو تو بھڑکا سکتے ہیں لیکن ان افکار کی تہ میں جس مہابیانیے کا دفاع ہے، اسے اگر احمد ندیم قاسمی ترقی پسند سمجھتے ہیں تو اس بات کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی تخت و تاج سے محروم بادشاہ ذہنی طور پر تا دمِ مرگ اپنے آپ کو حاکم و مختار ہی سمجھتا رہتا ہے۔ مغرب کی سیاسی اور معاشی بالا دستی اور زور آوری پر تنقید کون نہیں کرتا لیکن مغربی علوم و فنون کی عالمی سطح پر پذیرائی کو اپنی غیرت و حمیت کے خلاف ایک سازش سمجھنا اور اپنے لوگوں کو اس سے ہوشیار کرنے کے لیے اپنے مہابیانیوں کی لفظیات کا سہارا لینا آخر قدامت پسندی میں پناہ ڈھونڈنا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

دوسری طرف درانتی اور ہتھوڑا جس ملک کا ٹریڈ مارک بنا یعنی محنت کش مزدوروں اور کسانوں کی حاکمیت کا خواب، پاکستان کے ترقی پسندوں کو اس خواب کی سُرخ فضا بہت بھائی، چناں چہ احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسندی بھی اسی خواب کے حصار سے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی، لیکن وہ بھول گئے کہ روس میں آنے والا انقلاب جاگیردارانہ، شاہانہ اور نیم سرمایہ دارانہ مہابیانیوں کی ردِ تشکیل کے باعث جہانِ امکان میں داخل ہوا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی نظموں میں جب ایک طرف پاکستان کے ثقافتی، مذہبی اور قومیتی مہابیانیوں کا دفاع نظر آتا ہے تو

دوسری طرف ان مہا بیانیوں کی ردِ تشکیل کے بغیر ہی جب مزدوروں، کسانوں، بھوکوں، ننگوں اور استحصال کے شکار لوگوں کی حمایت میں سوشلزم کا پرچم اٹھایا جاتا ہے تو یہ حمایت ایک لفظی اور نمائشی سچائی کے سوا کچھ نہیں رہتی:

مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے (ادب اور سیاست)
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے
کہ آج بھی تو اسی شانِ بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تک اس کی چمک نہیں موقوف
کہ اب نظامِ کہن بھی اسی کی زد میں ہے (درانتی)
مگر یہ ٹھوکریں کھاتا ہوا غریب انساں
تہی شکم ہے، تہی دست ہے، تہی دل ہے
بڑے ادب کے بجائے بڑا سوال یہ ہے
کہ اس کے ہاتھ سے نوچے ہوئے نوالوں کو
کوئی نگل نہ سکے
نگل سکیں تو یہ بن جائیں ایسے انگارے
جنھیں اگل نہ سکیں (فن برائے فن)

یہ ایک طرح کی نمائشی روشن خیالی تھی کہ جب کسی شاعر کو ترقی پسند قرار دے دیا جائے، اس پر لازم آجاتا تھا کہ وہ انسان کی عظمت کے گیت گائے، مزدور کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر احتجاج کرے، مساوات کا نعرہ لگائے اور آدمیت کی بات کرے، اسی ترقی پسند روشن خیالی کا ایک مضحکہ خیز پہلو یہ بھی تھا کہ عقیدہ پرستی کو توہم پرستی قرار دے کر اسے نظامِ کہن پر ایک شدید کاری ضرب قرار دیا جائے، چناں چہ احمد ندیم قاسمی نے بھی متعدد نظموں میں عقیدوں کو ترک کر دینے کی تعلیم دی ہے، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اپنی ہر تیسری چوتھی نظم میں مسجودِ خلائق کی عظمت کے ترانے گانے والا عقیدوں کے ترک کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے:

میں اگر بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہوں
تم عقیدوں کے غبارے مجھے لا دیتے ہو
میرے ملبوس کے پُر ہول شگافوں کے عوض
کتنی تقدیس سے فرمانِ حیا دیتے ہو (جبر و اختیار)

احمد ندیم قاسمی مغرب کے انسان کی بیداری، آزادی اور تحقیق و جستجو کے بڑے مداح ہیں اور عالمی سطح پر اس نئے انسان کے تصور کو پاکستان میں بھی معروف بنانا چاہتے ہیں لیکن یہ انسان جس عظیم بیانیے یعنی

جاگیردارانہ اور شاہی اقدار و روایات کی رد تشکیل کے نتیجے میں ابھرا سے احمد ندیم قاسمی اپنے معاشرے میں کسی بھی نوع کی بڑی سطح پر فکری تبدیلی کے بغیر ہی اپنا لینا چاہتے ہیں لہٰذا اپنے تہذیبی بیانے پر فخر و افتخار ان کی شاعری میں بڑی تمکنت اور زوربیاں کے ساتھ خود بخود چلا آتا ہے:

کل بھی تہذیب و اخلاق کی مشعلیں پر توِ ایشیا سے فروزاں رہیں
برق و جوہر کے اس دورِ تاباں میں نوعِ انسان کا عہدِ شباب ایشیا　　　(ایشیا)

جسے تہذیبِ حاضر نے نکالا اپنی محفل سے
پھر اسی جوشِ جنوں کو دین و ایمان کر دیا میں نے　　　(گناہِ بے گناہی)

دوسری طرف تہذیب حاضر یعنی مغربی تہذیب کے سخت ناقد بھی ہیں، اس تنقید کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کی خرابیوں یا کوتاہیوں کی نشاندہی کی جا سکے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے تہذیبی بیانیے کی عظمت کو مغرب کی ترقیاتی توسیع پسندی کے مقابلے میں اعتماد کے ساتھ کھڑا کیا جا سکے۔ اس حوالے سے ان کا طنزیہ بیانیہ مغرب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کرنے سے احتراز کرتا دکھائی دیتا ہے:

یہ عصرِ حاضر کی دانش بے پناہ ہے
جس نے مری دنیا کو
ایک گرے سے ایک ذرّہ بنا دیا ہے　　　(کمالِ دانش)
''ا'' سے ایٹم ہے-----
''ب'' سے بم ہے
پڑھو کہ بم اٹل ہے
بم کائنات کا آج اور کل ہے

مغرب کے سرمایہ داری نظام پر تنقید کا جواز ہمارے ہاں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ تاریخی اعتبار سے جو زمانہ سرمایہ داری نظام سے پہلے کا تھا اس میں بڑی شرافت، پاکیزگی، نیکی، محبت، اخلاص اور سادگی پائی جاتی تھی یہ ایک مخصوص ناسٹیلجیا ہے کہ جو شاہانہ عہد کی جنگوں، ظلم و ستم، غلامی، قتل و غارت گری، مذہب اور نسل پرستی کے متشدد رجحانات کو دماغ سے محو کر دیتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اپنی نظموں میں سرمایہ دارانہ عہد سے پہلے کی جس تہذیب پر نازاں ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ان مسلمان فاتحین کی تاریخ کو تو ضرور پڑھا ہے کہ جن کی ہیبت سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے لیکن مقبوضات کی اس تاریخ کو نہیں دیکھا جو آزادیوں کے بعد مفتوح مورخین نے لکھی ہے ------ اسی طرح مغربی سرمایہ داری نظام کے فروغ اور استحکام کا باعث بننے والے وہ تمام لبرل علوم جو پاکستان کے تمام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جا رہے ہیں کہ جن پر دسترس پاکستان کے ہر شہری کا حق ہے، ان علوم کو ایشیا، مشرق یا پاکستان کی سرحدوں سے باہر کیوں نہیں

نکال دیا جاتا کہ جن کی تحصیل کا مقصد سرمائے کی آزادانہ گردش اور منڈی کا نظامِ معیشت ہے۔ تمام ادارے، افراد اور تنظیمیں انھی لبرل علوم وفنون کی پروردہ ہیں۔ انسانیت، نیک نفسی، دیانت داری اور سچائی ان اداروں، افراد اور تنظیموں کے طے شدہ مقاصد اور اہداف کا حصہ ہیں یہ اہداف اور مقاصد سے الگ کسی اعلیٰ وارفع جہانِ معنی کا حصہ نہیں ہیں۔

مغرب میں انصاف، عدل، قانون، شہری آزادیوں، کارخانوں، معیشت کاری، سیاسی وسماجی اداروں کے قیام، تعلیم، صحت اور روزگار کے حوالے سے جو اقدامات کیے گئے، ان پر لعنت بھیجنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن احمد ندیم قاسمی اپنے جس تہذیبی، ثقافتی، نسلی، مذہبی اور تاریخی پیرایے پر فخر کرتے ہیں پھر اس میں رہتے بستے ہوئے اپنی نظموں مثلاً تیر انداز، ایک تالاب کی کہانی، آشوب، یہ گونج کیا ہے، رشتے اور تغیر وغیرہ میں مایوس اور دل گرفتہ کیوں ہیں؟ ایسی تمام نظموں میں آدمِ نو کی نوید سنانے کے کیوں مشتاق ہیں؟ شدید غصے اور جھنجلاہٹ میں نئی تہذیب پر طنز کے نشتر کیوں کھول دیتے ہیں؟ کسی محبت، عشق، یقین اور وجدان کی جستجو کو نسخہ کیمیا کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟ جب کہ یہاں مشرقی اور بالخصوص پاکستانی معاشرے میں بقول ان کے نہ عدل ہے، نہ سچائی، نہ دیانت داری نہ وضع داری، غریب مر رہا ہے، حکمران ظالم اور لٹیرے ہیں۔ یہاں تو ابھی اپنے تہذیبی مہابیانیوں کی رِدِ تشکیل کا پہلا مرحلہ بھی نہیں آیا، جو زبان کھولتا ہے اسے اپنے معاشرے کا باغی اور غدار سمجھا جاتا ہے، ایسے کسی بھی شخص سے کون کہے کہ بھائی ”تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو“ لیکن احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسندی کا نمائشی اعلامیہ بھی یہی ہے:

اب بساطِ محبت لپیٹو
جہاں سے بھی مل جائے دولت ـــــ سمیٹو!
غرض کچھ تو تہذیب سیکھو!

☆☆☆☆

ڈاکٹر روش ندیم

احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند نظم

اردو نظم اور ترقی پسندی کا آپس میں گہرا رشتہ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جو ترقی پسند شاعر اپنی وسیع تر پہچان اور قبولیت بنا سکے ان میں آج احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض ہی اہم ترین ہیں۔ قاسمی صاحب اپنی بے شمار جہتوں میں سے بطور تخلیقی فنکار جن اصناف سے داخلی طور پر ہم آہنگ تھے شعری سطح پر ان میں سے نظم ہی ایسی تھی جو حالی و اقبال کے بعد جدید تر فکری اظہار میں خاص ہو گئی تھی۔ سرسید و اقبال کی طرح ترقی پسندوں نے بھی اسے ہی شعری اظہار کا بنیادی وسیلہ بنایا تھا کیوں کہ حالی و اقبال کے بعد ترقی پسند نہ صرف شعری سطح پر تہذیبی فکری روایت کا اگلا پڑاؤ تھے بل کہ بہت سے حوالوں سے اقبال کا تسلسل بھی تھے۔ کیوں کہ فکری و قومی شاعری کے ساتھ ساتھ "اقبال کا یہ انداز کہ 'کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو' ترقی پسندوں کے یہاں بہت نمایاں ہوا"(۱) ترقی پسندوں میں قاسمی صاحب نے اقبال سے خصوصی استفادہ کیا۔ جبکہ بقول جلیل عالی "ترقی پسندوں کے گروہ میں اقبال کی اس روایت کا تسلسل سوائے ندیم کے کسی اور کے ہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔"(۲)

آغاز میں تو قاسمی صاحب کا تعلق بلند آہنگ لہجے میں سیاسی و نظریاتی شاعری کے مقابلے میں ترقی پسندوں کے "نرم اور مدھم لہجہ کی نیم رومانی اور نیم فکری شاعری جس میں رمزیت کا انداز نمایاں" تھا کے شعری رجحان سے تھا۔(۳) جبکہ بقول شمس الرحمن فاروقی ۴۲ء کے لگ بھگ فیض کے رومانوی اور علی سردار جعفری کے بلند آہنگ ترقی پسند شعری رجحان کے مقابلے میں "احمد ندیم قاسمی کا اسلوب شعر ان دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر لگی۔"(۴) بعد ازاں فیض صاحب اور قاسمی صاحب کے ہاں نمایاں ہوتی انفرادی شناختوں کا یہ اختلاف حقیقت نگاری اور رومانویت کی صورتوں میں ظاہر ہوا۔

ایک شاعر کے لیے حقیقت نگاری کی بنیاد پر شاعری کرنا ہماری شعری فضا اور روایت میں ایک خطرہ رہا ہے۔ کیوں کہ رومانویت نے اردو قارئین و سامعین کی جمالیاتی نفسیات کا جو ڈھانچہ صدیوں میں تشکیل دے دیا ہے اس کے خلاف جا کر قبولیت حاصل کر لینا مشکل کام ہے۔ لیکن اگر پھر بھی کوئی ایسی ہمت کر رہا ہے تو وہ نہ صرف بہت حوصلے والا ہے بل کہ نظریاتی طور پر انتہائی پرخلوص بھی ہے۔ قاسمی صاحب نے یہ خطرہ مول لے کر یقیناً اپنے حوصلے اور خلوص کا اظہار کیا۔ بقول انیس ناگی "احمد ندیم قاسمی شاعری میں تخیل کی بجائے استدلال کو بنیاد بناتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر شعریت اور نغمگی پرواز کر جاتی ہے احمد ندیم قاسمی کی بیشتر غزلیں (بھی) یہی واقعاتی اور منطقی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جو اپنے طور پر اردو غزل کی روایت میں انفرادی

جگہ نہیں بناتیں۔"(۵) آج اگر فیض صاحب لازوال شہرت کے عروج پر ہیں تو اس میں ان کی شاعری کے رومانوی رویے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس دوام کے باوجود انھیں محدود فکری وموضوعاتی دائرے میں رہنے کا الزام بھی سہنا پڑ رہا ہے۔ حقیقت نگاری ترقی پسندوں کے فکری اظہار کی اساس تھی۔ بہت آغاز ہی میں منٹو نے قاسمی کو لکھا تھا کہ "زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ وہ جیسی ہوگی یا جیسی ہونی چاہیے۔"(۶) شاید یہی بات انھوں نے ہمیشہ کے لیے پلے باندھ لی۔ چوں کہ بقول لوکاچ حقیقت نگاری کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ تخلیق کار" کا تخیل، تعقل سے جا ملے۔"(۷) لہٰذا بقول صدیق کلیم، قاسمی صاحب "ذہن کو ماورائیت سے مادیت کی طرف رجوع"(۸) کرنے میں کوشاں رہتے ہیں یوں "معروضیت ندیم کے فن کا قیمتی عنصر"(۹) بن گئی۔ قاسمی صاحب کی نظم نگاری میں اپنے کسی بھی ہم عصر ترقی پسند کے مقابلے میں ہر حوالے سے تنوع اسی کی دین ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک "ہم سے روح عصر کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں جو ہماری سرزمین پر سے گزر رہے ہیں۔"(۱۰) ان کی نظم میں اپنے عہد کی زندگی اور مسائل کے حوالے سے موضوعاتی رنگارنگی کی شہادت تو ڈاکٹر قمر رئیس بھی دیتے ہیں بل کہ وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "ان۔۔۔ کے یہاں عظمت آدم کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بنی نوع انسان کے حوالے سے اقبال کی فکر سے آگے کی راہ دکھاتا ہے۔"(۱۱)

حیات وسماج کے زوال آمادہ مظاہر کی ناقدانہ تصویر کشی کے حامل شہر آشوب اور حالی وشبلی کی وطن پرستی و آزادی کی حامل نظم نگاری کے بعد یہ ترقی پسند ہی تھے جنھوں نے سماجی تبدیلی کی حامل قوتوں کی نشاندہی کے علاوہ قومی، عالمی اور عوامی تحریکوں کے ساتھ مل کر ایک نئی انسانی یک جہتی کے تصور کے ذریعے اردو نظم کو ارتقا کے اگلے مرحلے میں داخل کیا۔ اقبال اس سلسلے کی اہم کڑی تھے۔ لیکن لفظیات اور امیجری کے حوالے سے نظم کو غزل سے آزاد کروانے میں قاسمی صاحب کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ان کی حقیقت نگاری کا خاصہ تھا اور اپنے قاری کو محدود کرنے کا خطرہ مول لے کر روایتی غزلیاتی جمالیات سے دامن چھڑانے کا یہ حوصلہ مند تجربہ یقیناً اہم ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں فیض صاحب اپنی رومانیت پسندی کے تحت اردو غزل کی جن لفظیات سے استفادہ کر رہے تھے وہ یقیناً ملائمیت، غنائیت اور استاد سودا کی طرح کے ایک خاص طنطنے کے باعث ان کی قلمرو کو وسیع تر کرنے میں معاون رہے۔ لیکن پاکستانی اردو زبان کا ارتقا مختلف اللسان عوامی طبقات کے زیر اثر جس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اس میں فارسیت پسند اردو کا احیا خود بھی ایک رومانوی رویہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک 'اردو سپیکنگ' کی بجائے 'اردو یوزرز' کے نظری، تہذیبی، سماجی سیاسی اور ثقافتی" باہمی تعامل سے اب تک اردو کا ایک نیا لہجہ، منفرد آہنگ اور جدا اسلوب وضع ہو چکا ہے۔"(۱۲) بقول فتح محمد ملک "جب پاکستانی اردو کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اس اردو زبان سے ہوتی ہے جو پاکستان کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو ہماری (پاکستانی) سماجی، معاشرتی نیز تہذیبی روایات کا حصہ

ہے۔"(۱۳) قاسمی صاحب نے دیہی وعوامی لہجوں اور لفظیات کی آمیخت سے اپنی نظموں کی جو زبان تشکیل دی وہ ان کی ترقی پسندی ہی کی ایک جہت ہے، جس میں ان کی دیہی زندگی کی زبان اور تجربات نے اپنی سادگی، ابلاغ اور عوامی قربت کے ذریعے نئے لہجے، ذخیرہ الفاظ، کیفیات اور آہنگ کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ریئلزم سے انحراف لامحالہ رومانس سے جڑت کی بنیاد بنتا ہے۔ لیکن ہر حقیقت نگاری کی اپنی ایک جہت ہوتی ہے جیسے مجید امجد کے ہاں یہ انفعالیت کا شکار ہے اور فیض کے ہاں اس کے عناصر ایسی فضا بناتے ہیں جس سے تصویر دھندلی سی رہتی ہے۔ اس سب کا اثر شعری زبان اور امیجز پر بھی پڑتا ہے لہذا جب بھی realism dynamic or active کی طرف حرکت ہوگی تو پھر آنا تو قاسمی صاحب کی نظمیہ زبان کی طرف ہی پڑے گا جو ان کی نظموں میں زندگی کی رنگ برنگ تصویریں نت نئے زاویوں سے سامنے لاتا ہے۔

قاسمی صاحب کی حقیقت نگاری ان کی نظم میں ان کے شخصی وسماجی آئیڈیل کا آمیزہ نہیں بننے دیتی کیوں کہ "وہ انفرادی احساسات کو کم سے کم اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔"(۱۴) البتہ غزل کی جبریت کہیں کہیں شعر میں یہ رنگ لے آتی ہے جیسے:

انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

یہاں انقلاب اور محبوب دونوں ایک ہی معنویت میں پروئے گئے ہیں۔ رومانیت کا پہلو جب شخصی آئیڈیل کے حوالے سے حاوی ہوتا ہے تو عمومی طور پر فریق محبت کے ساتھ مساویانہ طرز عمل کے باوجود ہجر ووصال کے مرحلوں میں شاعر کی اپنی کیفیات وپیچیدگیوں کا اظہار بار ہا ملتا ہے لیکن فریق ثانی کے متعلق ایک بے خبری نہیں رہتی ہے۔ یہاں بھی قاسمی صاحب کی حقیقت نگاری محبوب کو محض ایک بت کے طور پیش کرنے کی بجائے جاندار، متحرک اور برابر کی سطح کا جانتے ہوئے اس کے داخلی وخارجی اظہارات کی ترجمان بھی بنتی ہے۔

قاسمی صاحب میں سے کسی ایک کے محبوب تر ہونے کے حوالے سے پاکستانی لیفٹ کی اپنی ترجیحات رہی ہیں۔ قاسمی صاحب کی تھیوریٹیکل اور آئیڈیالوجیکل لائن ایک ہی تھی۔ وہ پاکستانیت اور مسلم نیشنلزم کے پکے حامی تھے لیکن مارکسی ترقی پسند نہیں بل کہ مسلم ترقی پسند تھے۔ یہ الگ بات کہ شخصی جہات وتحرک کے حیران کن توازن کی مثال قاسمی صاحب نے ان نظریاتی موضوعات پر براہ راست لکھا اور بے شمار لکھا۔ یوں بھی قاسمی صاحب زیادہ vocal تھے اور نثر نگار تو وہ تھے ہی۔ بطور مسلم ترقی پسند ان کی شاعری میں مذہبی عناصر انتہائی نمایاں ہیں۔ وہ محض ڈیموکریٹ نہیں بل کہ ترقی پسند عوام دوست ڈیموکریٹ ہیں۔ وہ اشتراکی تخلیق کار نہیں بل کہ عدل، مساوات اور آزادی جیسی آفاقی اقدار کے شارح ہیں جنھیں وہ اسلامی علامتوں، استعاروں اور دیگر فکری وادبی عناصر کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ترقی پسند تحریک کی معاشی ناہمواری کے خلاف جدوجہد سے میں بہت متاثر ہوا اور اس

> سے میرے عقائد پر کوئی زد بھی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اس کی رکنیت قبول کی۔ اس کے عہدوں پر فائز رہا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میں ترقی پسند ہوں۔۔۔ میں کمیونسٹ کبھی نہیں رہا اور اس کی وجہ میرے اردگرد پھیلا ہوا مذہبی ماحول تھا۔۔۔ میں خدا کا منکر نہیں ہوں اور رسول کریم کو خاتم النبین مانتا ہوں۔۔۔ جو ادیب بھی طبقاتی کشمکش اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہو میں اسے ترقی پسند سمجھتا ہوں۔ (۱۵)

۱۹۹۷ء کے اپنے ایک خط میں قاسمی صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ:

> ترقی پسندوں پر 'الزامات' میں سے ایک الزام تو ان کی سوویت روس پسندی تھا اور میں نے روسی امپریلزم کی ہمیشہ مخالفت کی کہ روس نے کشمیر کو ہمیشہ بھارت کا حصہ قرار دیا اور پاکستان پر حملوں کے لیے روس بھارت کے ہوابازوں کی تربیت کرتا رہا۔ دوسرا الزام یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ترقی پسند دوست الحاد کی طرف مائل تھے مگر میں خدا کی حمد اور رسول کی مدحت کرتا تھا اور یہ وہ مقام ہے جہاں میں نے سجاد ظہیر مرحوم اور سبط حسن مرحوم سے بھی اختلاف کیا تھا۔ چناں چہ میں نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول نہ کی۔ میں نے دوسرے ترقی پسند دوستوں کی رفاقت اس لیے اختیار کی کہ میں بھی ان کی طرح صدیوں کے جبر اور غلامی اور ذلت اور انسان کی بے وقاری کا مخالف تھا اور کچلے ہوئے عوام کو خود آگاہی اور خودنگری کی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ (۱۶)

ایک اور خط میں انھوں نے لکھا کہ "میں نہ کمیونسٹ ہوں، نہ مارکسسٹ ہوں اور نہ سوشلسٹ ہوں۔ ایک سیدھا سادا مسلمان ہوں اور

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے مرے طرز مسلمانی میں" (۱۷)

منٹو کا کہنا تھا کہ "کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے" (۱۸) اس کے ساتھ ہی قاسمی صاحب کے ممدوح اور نظریاتی رفیق پروفیسر فتح محمد ملک کا ایک جملہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ "میں خود کو ترقی پسند سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان اس کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا" (۱۹) اس جملے کی اس خوبی کے علاوہ کہ اسے اگر الٹا کر پڑھیں تو بہت سے ترقی پسندوں کا احترام دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی بہت سے مسلمانوں کا احترام دل سے جاتا بھی ہے، یہ جملہ قاسمی صاحب کی مسلم ترقی پسندی کی بنیاد بھی ہے جس کی قومی سطح پر وضاحت وہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

> "اگر آج بھی ہم اپنے افکار و خیالات کو تخلیق و اجتہاد سے روشناس کر دیں اور اس

جرأت مندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنا دیں جس کے باطن میں بڑی فراخی ہو اور جس کے ظاہر میں جلال و جمال برابر برابر تناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے۔"(۲۰)

حوالہ جات

۱۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء، ص ۴۷۹
۲۔ جلیل عالی، ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں مشمولہ سہ ماہی ادبیات، جلد ۱۷، شمارہ ۷۳، اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۱۱۳
۳۔ رئیس، ڈاکٹر، عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، ص ۴۷۸
۴۔ شمس الرحمن فاروقی، "قاسمی صاحب" مشمولہ سہ ماہی ادبیات، ص ۲۴
۵۔ ناگی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کی تاریخ، ۲۰۰۴ء، لاہور، جمالیات، ص ۷۷
۶۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کے خطوط، لاہور، کتاب نما، ۱۹۶۲ء، ص ۲۷
۷۔ مظفر علی سید، افسانہ ساز منٹو مشمولہ سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ، مرتب ڈاکٹر انیس ناگی، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۷۴
۸۔ کلیم، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۹
۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بکڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۴۴۴
۱۰۔ ندیم قاسمی، تہذیب و فن، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵
۱۱۔ رئیس، ڈاکٹر، عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، ص ۴۸۲
۱۲۔ درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۷۰
۱۳۔ درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اردو، ص ۱۷
۱۴۔ ناگی، پاکستانی ادب کی تاریخ، ص ۷۶
۱۵۔ قد آور ادیب احمد ندیم قاسمی (مرحوم) کے منفرد خیالات، انٹرویو، اصغر عبداللہ، مونتاج، نذر ندیم، شمارہ ۱، جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء، شمارہ ۲، مئی تا اگست ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۔۲۱۶
۱۶۔ ندیم قاسمی بنام راقم، ۱۱ جولائی ۱۹۹۹ء
۱۷۔ ندیم قاسمی بنام راقم، ۱۷ جنوری ۱۹۹۷ء
۱۸۔ حسن منٹو، منٹو نامہ، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۱۶۔
۱۹۔ فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱
۲۰۔ اسلامی تہذیب پاکستانی تخلیقی فنکار اور اجتہاد مشمولہ سہ ماہی فنون، خاص شمارہ ندیم نمبر، مدیر حیات قاسمی ڈاکٹر ناہید قاسمی، شمارہ ۱۲۸، دسمبر ۲۰۰۸ء تا دسمبر ۲۰۰۹ء، لاہور، ص ۱۳۸

ڈاکٹر طارق ہاشمی

مثالی انسان کا آدرش اور احمد ندیم قاسمی کی نظم

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی اردو کی ادبی تاریخ میں یوں بھی اہم خیال کی جاتی ہے کہ اس کے دوران میں ایک ایسی تحریک نے ظہور کیا جس نے معاشی بنیادوں پر سماجی بیداری کے لیے ادب کو رہنما بنانے کے لیے جامع کوششیں کیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس پلیٹ فارم سے اس تحریک کے نظریہ سازوں نے انسان کی عصری صورتِ حال کی تفہیم کے لیے تاریخ اور اُس میں معیشت کی بنیاد پر طبقاتی کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کی اور مستقبل کے لیے ایک ایسا نظامِ فکر تشکیل دیا جو موجود اور آئندہ نسلوں کی خوشحالی کی ضمانت دے۔

اس تحریک سے وابستہ شعرا نے اپنی شعری تخلیقات میں انسان کو تاریخ کے مذکورہ اقتصادی حقائق کی روشنی میں دیکھا اور خوشحالی کی اس امید کو نظم کیا جو کارل مارکس کی معاشی جدلیات کے نظریے میں انسانیت کو دلائی گئی تھی۔

اہلِ قلم کی اگرچہ ایک بہت بڑی تعداد ہے جو ترقی پسند تحریک کے منشور کے فروغ کے لیے کوشاں معاشرے میں عدل اور امن کے خواب دیکھ رہے تھے تاہم جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری اور احمد ندیم قاسمی ایسے شعرا ہیں جنھیں اہم نمائندہ آوازیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند تحریک کے فکری نظام کو پوری طرح اپنے باطن میں جذب نہیں کیا تاہم یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو نظم میں جن شعرا نے اپنی تخلیقات میں انسان پر اپنی خاص توجہ مرکوز کی اُن میں احمد ندیم قاسمی اپنے پورے فکری نظام اور موضوعاتی بنیادوں پر نمایاں ہیں۔

ترقی پسند شعرا نے ایک نئے جہان کا خواب دیکھا ان کا یہ آدرش بہت عظیم تھا لیکن ان کی یہ امید بعض خارجی حقائق اور داخلی سطح پر فکری فرسودگی نیز جمود کے باعث پوری نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جہانِ نو کے خواب اور اُن کی تعبیرِ حقیقی کی امید دھری کی دھری رہ گئی اور یہ حقیقت ہے کہ اپنی حالتِ موجود میں انسان شدید کرب سے دوچار ہے۔ اس تناظر میں احمد ندیم قاسمی کی نظم کا جائزہ لیں تو وہ اُن اسباب و علل سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ جن کے باعث انسان آلام میں گھرا ہوا ہے۔ اپنی اصل میں انسان ایک ایسی ہستی ہے جسے قدرت نے

رفعتوں سے نوازا ہے اور جس کے وجود میں امکانات کی ہزاروں کائناتیں آباد ہیں۔ انسان کے وجود ہی سے کائنات نے نمو پائی اور اس ہنگامہ زار کو رنگ و بو نصیب ہوئے۔ اس لیے کائنات کی بے کراں وسعتوں میں جو کچھ ہے۔ اس پیکرِ خاکی کے لیے ہے۔ انسان مالکِ بحر و بر ہے اور کائنات کے خشک و تر پر دسترس رکھتا ہے۔
"جلال و جمال" کے دیباچے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> "یہ ہماری زمین، یہ چاند کی محبوبہ، یہ خلا کی رقاصہ، جسے مشرق و مغرب نے ماں کے مقدس لقب سے یاد کیا۔ یہ ہمارا ازلی و ابدی وطن۔ آخر ہم اس سے دور رہ کر صرف کارخانوں اور آمد و خرچ کے حسابوں اور مردم شماریوں وغیرہ میں کیوں کھو جائیں۔ یہ زمین اور ہوا، اور خلا سے پرے۔ بے شمار دنیاؤں کی بے کنار خلائیں، یہ سب کچھ انسان کا ہے۔"(۱)

انسان نے نہ صرف کاکلِ گیتی کو سنوارا بل کہ عناصر کائنات کو بھی خدا آشنا کیا۔ اس نے نہ صرف تزئینِ حیات کی بل کہ وہ ذات جو عینِ حیات ہے۔ اس سے بھی عناصرِ حیات کو آگاہ کیا۔ یعنی انسان کو اگر نہ پیدا کیا جاتا تو تمام موجودات اپنے خالق سے بے خبر رہتے اور خدا کی پہچان کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ انسان نے اپنی تخلیق کے بعد نظامِ کائنات کو منقلب کر دیا اور ہر شے کی کایا پلٹ دی۔ زمین پر موجود عناصر جو خدا سے بیگانہ تھے۔ انھیں خدا سے شناسا کیا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی تخلیق سے پہلے خدا کا وجود زمین پر نہ ہونے کے مترادف تھا کہ یہاں اس کا کوئی شناسا ہی نہ تھا۔ سو انسان نے وجود پانے کے بعد زمین اور خدا میں تعلق استوار کیا اور وہ خدا جو عرش نشیں تھا اسے فرش پہ لے آیا۔ قاسمی اپنی نظم "انسان عظیم ہے" میں یہی احساس خدا کو دلاتے ہیں:

اس نے تجھے عرش سے بلایا
انسان عظیم ہے خدایا
تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو نور ہی نور بن رہا تھا وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایا
انسان عظیم ہے خدایا
تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے تو آگ ہے اور وہ اجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ تو دشت ہے وہ چراغ لالہ
اس نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا
تو عینِ حیات ہے مگر وہ تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا
تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے وہ حسن ہے رنگ ہے صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا (۲)

ممتاز حسین نے شعلۂ گل کے دیباچہ میں احمد ندیم قاسمی کی اِس نظم کے حوالہ سے لکھا ہے:

> ”یہاں احمد ندیم قاسمی کی فکر علامہ اقبال کی فکر سے زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔“ (۳)

ممتاز حسین کے اس تنقیدی دعوے پر فتح محمد ملک کا یہ تبصرہ قطعی طور پر درست ہے کہ:

> ”یہ محض اُن کی خوش فکری ہے جو ترقی پسند نظریۂ ادب سے وفاداری بشرطِ استواری کی دلیل ہے“۔ (۴)

ممتاز حسین کی خوش فکری اپنی جگہ لیکن شاعر کو اپنی فکر کی ترسیل کے لیے اپنے اسلوب پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اگر انسان اتنا ہی عظیم ہے تو خدا سے مخاطب انسان کے لہجے میں وہ اعتماد بھی ہونا چاہیے جو عظمت پر

متمکن کسی ہستی کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اقبال جب ''یزداں بکمند آور'' یا ''دامنِ یزداں چاک'' کا نعرۂ مستانہ لب پر لاتا ہے تو اُس کے اندازِ گفتار میں وہ طنطنہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ جو خدا سے مقابل ہونے کے لیے چاہیے۔ جب کہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں اس انسان کا لہجہ اتنا گھگھیایا ہوا ہے کہ لگتا ہے جیسے خدا سے فریاد کر رہا ہے۔ ایسے میں یہ خوش فہمی کہ احمد ندیم قاسمی کی فکر اقبال سے بلند ہو گئی ہے، قدرے مضحکہ خیز لگتی ہے۔ کم و بیش ایسا ہی لب و لہجہ قاسمی کی نظم ''مجاز'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

ایک مٹی کا دیا لو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی اٹڈ آیا ہے
اے بلندی کے خدا، تو نے بنا کر پستی
کیا فقط جذبۂ تخلیق کو بہلایا ہے

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے ترا ساغرِ شب
میری قسمت میں فقط ایک چراغِ مردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکوں چبتا ہے
فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزردہ

شکوہ سنجی مرا مقصود نہیں ربِّ کریم
خود ترا حکم ہے اخفائے حقیقت نہ کروں
تو تجلی کو جو آلودۂ پستی نہ کرے
ایک مٹی کے دیے سے بھی محبت نہ کروں (۵)

انسان کی ذلت اور رسوائی میں صرف ''شائبہ، خوبیِ تقدیر'' ہی نہیں۔ بلکہ زمین پر کچھ طبقے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے مفاد کے تحفظ کی خاطر زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا ایمان محض ہوسِ زر ہے۔ جو اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے لاکھوں انسانوں کی جان سے کھیلنا بھی جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جسے ''پیرانِ کلیسا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان پردے حائل رکھتے ہوئے وہ اس فکر کی ترویج و اشاعت میں رہتا ہے کہ آدمی سے خدا بہت دور ہے اور بقول جمیل ملک:

> ”یہ لوگ کشف و کرامات کے ذریعے عرشِ بریں کی خبر لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس انسان کو بھول جاتے ہیں جس کی صورت گری خدا نے اپنے جلال و جمال سے کی ہے اور جو اس کا شہ پارۂ تخلیق ہے۔“(۶)

یہ طبقہ خدا کو بہت عظیم مگر انسان کو نشیب کا کیڑا خیال کرتا ہے۔ قاسمی کے خیال میں یہ وہ تصور ہے جو انسان کے ذہن میں بٹھا دیا گیا ہے۔ جس کے باعث وہ روز بروز شعوری و لاشعوری طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا ہے اور اپنے اس احساسِ کمتری کا علاج تلاشنے کے لیے وہ اپنی راہ اور اپنے مقام سے بھی بھٹک گیا ہے۔ اپنی پہچان کی خاطر مختلف حوالوں سے انسان تقسیم ہو رہا ہے۔ اپنی نظم ”آشوب“ میں قاسمی خدا کو پکارتے ہیں:

خدا کو بلاؤ
کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے
میں مٹی کا انساں ہوں
میں آسماں کا فرشتہ نہیں
اس لیے معتبر بھی نہیں
خدا اپنی آنکھوں سے دیکھے
کہ وہ سر جو صدیوں کے سجدوں سے زخمی ہیں
اب آسماں کی طرف اٹھ رہے ہیں
وہ دیکھے کہ آنکھوں میں اب حسن دریافت کرنے کی ساری چمک بجھ چکی ہے
کھنڈر کے دریچوں سے آخر کھنڈر کے سوا کیا نظر آ سکے گا
خدا کو بلاؤ
کہ اس کا یہ شہکارِ فن
اپنے محور سے ہٹنے لگا ہے
وہ چھوٹوں، بڑوں اور نیکوں بدوں کے قبیلوں میں بٹنے لگا ہے
وہ جو عرش تک پھیل جانے کے گُر سوچتا تھا
سکڑنے لگا ہے، سمٹنے لگا ہے

وہ آشوب، جو اس نے اپنی ذکاوت سے پیدا کیا تھا
اسی سے نمٹنے لگا ہے (۷)

احمد ندیم قاسمی کے نزدیک زمین پر انسان سے انسان کا بُعد صرف اِس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ انسان، انسان سے محبت کرے کہ یہی اس کا منصب ہے۔ ندیم انسانی زندگی کو عشق کرنے کا بہترین وقت قرار دیتے ہیں لیکن افسوس انسان اس لمحے کو ضائع کر رہا ہے۔ ندیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے کدورت کا شدید جذبہ رکھنے لگا ہے۔ اور اب سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے۔ انسان اس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ ''جنگ'' کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے۔ ندیم اپنی نظم میں یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو انسان سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اب وہ قیامت کاٹے گا اور انسان ایک دن اپنی تباہی کا خود باعث بنے گا۔ ندیم یہ آرزو کرتے ہیں:

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمیں پر، نہ فضا میں بمبار

لاکھ طوفان اٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عشق چاہے تو شجر کیا، کوئی پتہ نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب، اسے پہچانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو! (۸)

انسان کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا نقطۂ نظر اپنے معاصر اور ہم خیال شعرا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن اپنی تخلیقات میں انھوں نے انسان کو خیر کی علامت کے طور سے دیکھا ہے اور اسی میں وہ حسنِ بشر کے متلاشی بھی ہیں۔ بقول محمد علی صدیقی:

''قاسمی انسان کو تجرید و تجسیم دونوں صورتوں میں امکاناتِ خیر و برکت کا پتلا سمجھتے ہیں۔

انسان ان کے یہاں ایک جمالیاتی صوت وصورت وآہنگ بن کرا بھرتا ہے۔“(۹)

احمد ندیم قاسمی اور ترقی پسند تحریک کے دیگر شعرا پر اِس لحاظ سے بہت تنقید ہوئی کہ انھوں نے شعر کی جمالیات پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس نقطۂ نظر سے اتفاق یا اختلاف کی گنجایش بھی موجود ہے لیکن اُن کے منشور میں زندگی کی ابدی جمالیات کا آدرش یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جمالِ حیات کے معنی سے آگاہ اور اس کے متلاشی و داعی تھے۔ ان شعرا کے تصورِ انسان میں بھی یہی زاویۂ نظر غالب ہے۔ اپنی منظومات میں ترقی پسند شعرا نے زندگی کے اصل مسائل سے آگہی کو اولین ترجیح دی۔ طبقاتی شعور کو اجاگر کیا اور اپنے تخلیقی سفر کے ہر پڑاؤ پر انسانی مساوات وعظمت کی اشاعت کی۔

احمد ندیم قاسمی کا شعری سفر اپنے مثالی انسان کے آدرش کی جستجو کی روداد ہے۔ انھوں نے اپنی استعداد کو اسی جستجو میں صَرف کیا۔ ان کی استقامت پر کئی ایک اطراف سے سوالات بھی موجود ہیں لیکن ان کی نظم کا تخلیقی سفر اپنی داخلی شہادتوں کی روشنی میں مذکورہ سوالات کا جواب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، ”جلال وجمال“، لاہور: التحریر ۱۹۶۹ء(بار دوم) ص ۳۳
۲۔ احمد ندیم قاسمی ”شعلۂ گل“ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۵ء(بار دوم) ص ۷۰۔۶۹
۳۔ ممتاز حسین، دیباچہ ”شعلۂ گل“ ص ۱۹
۴۔ فتح محمد ملک، ”احمد ندیم قاسمی کا آدمِ نو“ افکار (ندیم نمبر) ص ۴۰۶
۵۔ ”شعلۂ گل“ ص ۳۸
۶۔ جمیل ملک ”رباعی کی چار دیواری اور ندیم“، ”ندیم نامہ“ (مرتب محمد طفیل۔ بشیر موجد)، ص ۲۵۷
۷۔ احمد ندیم قاسمی، ”دوام“ لاہور: اساطیر ۱۹۹۱ء(بار دوم) ص ۷۵۔۷۲
۸۔ احمد ندیم قاسمی، ”محیط“ لاہور: التحریر، ۱۹۷۸ء(بار دوم) ص ۱۲۳
۹۔ محمد علی صدیقی، ”توازن“ کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۹

☆☆☆☆

نصیر احمد ناصر

احمد ندیم قاسمی اور فنون کی نشاۃ ثانیہ

احمد ندیم قاسمی صاحب سے میری صرف تین ملاقاتیں ہوئیں۔ تینوں اتفاقیہ۔ پہلی ڈاکٹر امجد پرویز کے ساتھ ان کے دفتر میں، دوسری جم خانہ کے ایک مشاعرے میں اور تیسری بشریٰ اعجاز کی بیٹی کی شادی پر۔ پہلی دو ملاقاتیں سرسری تھیں، تیسری طویل اور مفصل تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، بشریٰ کی بیٹی، بیبا، کی شادی پر سینکڑوں مہمانوں میں ہم صرف تین ادیب تھے، مستنصر حسین تارڑ، احمد ندیم قاسمی اور میں۔ تارڑ صاحب تھوڑی دیر ہمارے ساتھ رہے پھر مداحوں اور شناساؤں کے جھرمٹ میں گم ہو گئے لیکن میری اور قاسمی صاحب کی ''دو رکنی'' ادیبانہ محفل تقریب کے اختتام تک ایک ہی جگہ جمی رہی، جس میں زیادہ تر قاسمی صاحب گفتگو کرتے رہے۔ میں حیران تھا کہ ذاتی تعلقات اور ملاقاتیں نہ ہونے کے باوجود وہ میرے بارے میں مکمل آگہی رکھتے تھے۔ میں ان دنوں میرپور، آزاد کشمیر میں رہتا تھا۔ قاسمی صاحب نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے میرپور سے ایک صاحب آئے اور اپنا کلام سنایا اور فنون کے لیے بھی دیا، کلام فنی لحاظ سے درست ہونے کے باوجود ابتدائی نوعیت کا تھا اور فنون کے معیار کا نہیں تھا، میں نے اسے مشورہ دیا کہ شاعری کے موجودہ رجحانات سمجھنے کے لیے اچھے ادبی رسالے پڑھا کرو اور وہاں آپ کے میرپور میں ایک شاعر ہوتے ہیں نصیر احمد ناصر، ان سے ملا کرو۔ وہ شخص حیران ہوا کہ میرپور میں ایسا کون شاعر ہے جسے قاسمی صاحب اتنی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں جب کہ وہاں اس نام کے شاعر کو کبھی دیکھا نہ سنا۔ بعد میں اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی جب ایک روز وہ صاحب ڈھونڈتے ڈھانڈتے پوچھتے پچھاتے میرے گھر آ گئے اور قاسمی صاحب سے اپنی ملاقات کا پورا احوال سنایا۔ مجھے ان کا نام بھول گیا ہے لیکن وہ غالباً میرپور تعلیمی بورڈ میں ملازم تھے۔ میرے لیے یہ نہ صرف غیر معمولی خراجِ تحسین اور خوشی کا امر تھا بلکہ قاسمی صاحب کی شخصیت کا ایک بڑا پہلو بھی تھا۔ پھر قاسمی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فنون کے لیے نظمیں کیوں نہیں بھیجتے؟ میں نے کہا کہ کوئی خاص وجہ نہیں۔ عام طور پر میں انہی جرائد میں تخلیقات بھجواتا ہوں جن کے مدیران ان کے طلب دار ہوں، فنون کے لیے ایک دو بار چیزیں بھجوائی تھیں مگر آپ کی طرف سے جواب نہ آیا۔ قاسمی صاحب حیران ہوئے، پھر منصورہ کے حوالے سے کچھ تحفظات کا اظہار کیا اور مجھے نظمیں بھجوانے کے لیے کہا۔ یہ تاکید بھی کی کہ خط کے اوپر ''قطعی ذاتی'' کے الفاظ ضرور لکھ دوں۔ اس دن 'فنون' سے جو رشتہ استوار ہوا وہ قاسمی صاحب کے انتقالِ پر ملال تک برقرار رہا۔ اگر کبھی مجھ سے

نظم بھیجنے میں دیر یا کوتاہی ہو جاتی تو قاسمی صاحب خود خط لکھ کر یا فون کر کے یاد دہانی کرا دیتے۔

قاسمی صاحب میں کئی مدیرانہ خوبیاں تھیں جو آج کل کے مدیروں میں عنقا ہیں۔ میری ایک نظم ''ہم ستارہ'' کے عنوان کی ترکیب انھیں سمجھ میں نہ آئی تو پوچھنے میں اور میری وضاحت قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ یہ مدیرانہ بڑا پن وزیر آغا صاحب میں بھی تھا۔ آغا صاحب چوں کہ نقاد تھے اس لیے تفصیل سے بات کرتے یا لکھتے تھے۔ جب کہ قاسمی صاحب مختصر بات کرتے یا چند سطروں کا مقصد کے مطابق خط لکھتے تھے۔ قاسمی صاحب نثری نظموں کو شاعری تسلیم نہیں کرتے تھے نہ انھیں فنون میں شائع فرماتے تھے۔ ایک بار ان کی ایک تعلق دار نے انھیں نثری نظمیں اشاعت کے لیے دیں تو انھوں نے مجھے بجھوا دیں کہ آپ انھیں 'تسطیر' میں شائع کر دیجیے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد، ہر بڑے رسالے کی طرح، فنون بھی بند ہو گیا۔ اگر چہ 'شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ' لیکن یہی سنا کہ اس کے اثاثوں کی وراثت کا جھگڑا پڑ گیا۔ حالاں کہ ایک ادبی رسالے کے اثاثہ جات مدیر کی ادبی خدمات اور علم و ادب کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی منہ بولی بیٹی، ان کی نائب مدیرہ اور اپنے وقت میں فنون کی ''آل اِن آل'' منصورہ احمد نے اپنا الگ رسالہ 'مونتاج'' نکال لیا جو فنونِ ثانی یعنی فنون کی ہو بہو کاپی تھا، لیکن ظاہر ہے فنون نہیں تھا۔ مونتاج کے گیارہ شمارے نکلے۔ منصورہ کے، تکلیف دہ حالات میں، انتقال کر جانے کے بعد مونتاج بھی بند ہو گیا۔ اس دوران قاسمی صاحب کی حقیقی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نواسے نیر حیات قاسمی نے شمارہ 128 سے فنون کو دوبارہ شروع کیا۔ جسے ''فنون'' کی نشاۃِ ثانیہ بھی کہا سکتا ہے۔ نیر کے پاس ماں کا علمی و ادبی تجربہ بھی ہے اور حقیقی وراثت بھی، جواب فنون کے ہر شمارے سے عیاں ہے۔ کاش سلیم آغا قزلباش بھی 'فنون' کے وارثان کی طرح 'اوراق' کو جاری رکھتے جسے وزیر آغا صاحب نے اپنی زندگی ہی میں خرابیٔ صحت کے باعث بند کر دیا تھا۔ سلیم کے پاس نہ وسائل کی کمی ہے نہ علم اور تجربے کی۔ فنون اور اوراق بظاہر تمام تر اختلافات کے باوجود شعر و ادب کی آبرو اور معیار سمجھے جاتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا دونوں صاحبان کی کمٹمنٹ ادب سے تھی، 'فنویے' اور 'اوراقیے' کی اصطلاحات اردگرد کے حاشیہ برداروں کی بنائی اور پھیلائی ہوئی تھیں، ذاتی طور پر میں نے ان دونوں کے ذہنوں اور رویوں میں ایسی کوئی تفریق نہیں پائی۔ میں اوراق میں بھی شائع ہوتا تھا اور فنون میں بھی اور دونوں نے اس پر کبھی کسی تحفظ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آغا صاحب سے میرے قریبی دوستانہ مراسم تھے اور یہ قاسمی صاحب کو بھی معلوم تھا، لیکن انھوں نے کبھی اس بنیاد پر فنون کے دروازے بند نہ کیے اور ہمیشہ میری تخلیق کو اہمیت دی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ابرار احمد

احمد ندیم قاسمی۔ ایک مستقل مزاج مدیر

احمد ندیم قاسمی ایک پورے اور شاندار عہد کا نام ہے۔ ترقی پسند تحریک، قیام پاکستان اور اس کے بعد نئے ملک میں بسنے اور اپنی شناخت کا تعین کرنے جیسے عوامل نے اردو ادب میں تخلیقی تحرک کی ایک ایسی مثال کو جنم دیا جو اس سے پہلے کہیں موجود نہ تھی۔ اس زمانے میں ایسے بڑے ادیبوں کا ظہور ہوا جن کے تذکرے کے بغیر ہمارے ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ انہی میں سے ایک بڑا نام احمد ندیم قاسمی کا تھا۔ وہ شاعر تھے۔ بے مثال افسانہ نگار تھے، صحافی تھے اور ان حیثیتوں کے علاوہ ایک بڑے عہد ساز مدیر بھی۔ کتاب پر ادبی جریدے کو اس حوالے سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ انفرادی کام ہے جبکہ ادبی پرچہ ایک پورے عہد کے کسی مخصوص حصے کی تصویر دکھاتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنے نظریات کی ترویج کر سکتے ہیں۔ ابھرتے اور مٹتے ہوئے رجحانات اور نئے پرانے ناموں اور ان کے کام سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ادب کی رفتار اور معیار کا اصل تعین ادبی جرائد ہی کیا کرتے ہیں۔

ندیم ترقی پسند تحریک کے فعال رکن اور کئی برس سیکرٹری جنرل رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی کاٹیں لیکن اس قدر فعال رہ چکنے کے بعد وہ اس تحریک سے لاتعلق بھی ہو گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ وہ الگ سے ایک پورا موضوع ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر نکلنے والے تمام پرچوں کے وہ مدیر رہے۔ اور غالباً ہر مرتبہ پہلے مدیر۔ یہ بات اس سمت اشارہ کرتی ہے کہ ایک تو ان کی شخصیت میں کشش اور صلاحیت دونوں متناسب انداز میں موجود تھیں۔ اور وہ سب کے لیے قابل قبول تھے لیکن اس سے زیادہ اہم عنصر یہ تھا کہ قاسمی نے ادب و صحافت کو اپنے واحد ذریعہ معاش کے طور پر اپنا رکھا تھا۔

نقوش، سویرا اور ادب لطیف کی ادارت کے زمانے زیادہ طویل نہیں ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ''فنون'' کا باقاعدہ اجراء کیا جس کے وہ مالک بھی تھے۔ افکار کے ندیم نمبر میں مسعود اشعر لکھتے ہیں:

> ''ندیم صاحب نے اچھے ادبی رسائل نکالنے کی طرح ڈالی اور جو رسالہ بھی نکالا اسے تحریک بنا ڈالا۔ ادب لطیف، سویرا، نقوش اور اب فنون ادب میں تحریک کا کام کر

> رہے ہیں۔ رسالہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے ایک اور بڑی خدمت کی ہے
> اور وہ ہے نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی۔ وہ جس شخص میں بھی ذرا سی بھی صلاحیت
> دیکھتے ہیں اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔''

(مسعود اشعر)

'فنون' کا آخری شمارہ ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ یوں اس جریدے کا دورانیہ ۴۴ برس بنتا ہے۔ جو عمر بھر کے عرصے پر محیط ہے۔ اور اس مختصر تحریر میں اس کا احاطہ کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ پھر بھی بحیثیت مدیران کے تاریخی کردار پر تھوڑی بہت بات تو ہو ہی سکتی ہے۔

مدیر طاقت ور انسان ہوتا ہے، مثبت اور منفی ہر دو طرح سے۔ اسی لیے اس پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اُس دور کے مدیران پر ایک نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ندیم ہوں یا وزیر آغا، انتظار حسین یا محمد سلیم الرحمٰن یہ سب ایسے لوگ تھے جن کا ادب میں اپنا ایک متعین مقام تھا۔ اور وہ پرچے کی شناخت قرار پائے۔ مطلب یہ کہ ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں ان کے مدیر ہونے کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔

ادبی پرچہ نکالنا اور اسے تواتر اور تسلسل سے معیاری انداز سے شائع کرتے چلے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پرچہ لکھنے والوں کے تعاون سے چلتا ہے، ان کی تحریروں کے معیار سے معتبر قرار پاتا ہے۔ اور مدیر کو یہی کام کرنا ہوتا ہے کہ وہ معیاری اور نمائندہ تحریریں حاصل کرنے کے لیے لکھنے والوں سے عملی روابط استوار کرے، انھیں متحرک کرے اور پھر انھیں باعزت طور پر اپنے پرچے میں جگہ دے۔ ندیم ملنسار اور کشادہ دل انسان تھے اس لیے روابط قائم کرنے اور لکھنے میں ان کی یہ خوبیاں بہت کام آئیں۔ انھوں نے اپنے سینئر، اپنے معاصرین اور دیگر شاعروں، ادیبوں سے تو رابطہ قائم کیا ہی لیکن جیسا کہ اوپر مسعود اشعر نے لکھا ہے، ان کا سب سے قابل قدر کارنامہ نئے باصلاحیت لکھنے والوں کی دریافت اور پھر انکی اسی طور پذیرائی ہے کہ جس نئے اور قابل نام کو انھوں نے چن لیا، وہ جلد یا بدیر ایک معتبر شاعر اور ادیب قرار پا گیا۔ احمد فراز سے لے کر پروین شاکر اور نجیب احمد تک سب کا اعتبار قائم کرنے میں 'فنون' نے کلیدی کردار ادا کیا۔ نئی قابلیت کے حوالے سے ندیم نے خصوصاً غزل میں کلیدی اہمیت کا کام کیا۔ غزل پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ پھر اُس زمانے میں غزل لکھنے والوں کی تعداد بھی نظم نگاروں کی نسبت زیادہ تھی۔ نئے رجحانات بھی سر اٹھا رہے تھے لیکن ندیم نے اس معاملے میں کسی قسم کی رعایت کو روا نہیں رکھا۔ ان کے اپنے ٹھوس معیارات تھے جس پر وہ کسی بھی تخلیق کو

پر کھتے اور پھر فنون میں جگہ دیتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ ان کا استحقاق تھا۔ اسی لیے ۶۰ء کی دہائی میں لسانی تشکیلات اور جدیدیت کے زیر اثر تخلیق کی جانے والی شاعری کو 'فنون' میں جگہ نہ مل سکی۔ اور نہ ندیم نے اس نوع کی شاعری کو کبھی درخور اعتنا سمجھا۔

ادبی جرائد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو چند قابل ذکر باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً 'نقوش' کے محمد طفیل اپنی نوع کے منفرد مدیر تھے۔ وہ دوٹوک طریقے سے صرف ان لکھنے والوں سے معاملہ کرتے تھے جو پہلے ہی بڑے نام تھے۔ نئے لکھنے والوں کی ارسال کردہ چیزیں ان کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوا کرتی تھیں لیکن کبھی کبھی جب وہ کسی نئے ادیب، شاعر کو پسند کرتے تھے تو خود رابطہ کر کے چیزیں منگواتے اور اہتمام سے نقوش میں شائع کرتے تھے۔ انتظار حسین چناؤ کے معاملے میں محتاط اور نسبتاً کم لچک رکھنے والے مدیر رہے۔ اسی طرح مشفق خواجہ اپنے پرچے 'تخلیقِ ادب'، (جس کے چند شمارے ہی شائع ہو سکے) میں حفظ مراتب کا پیمانہ عمر کے بجائے تخلیق یا تحریر کے معیار کو مقرر کیا کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی گو کہ ایک باریک بین اور ادب شناس مدیر تھے لیکن ساتھ ہی وہ مجلسی آدمی بھی تھے اور مشاورت پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے 'فنون' کے لیے کچھ کام دوسروں کے حوالے بھی کر رکھا تھا۔ مثلاً افسانوں کا حصہ مرتب کرنے کی ذمہ داری ہاجرہ مسرور کے ذمے رہی۔ اسی طرح ان کی مشاورت میں علی عباس جلالپوری، محمد کاظم اور فتح محمد ملک شامل رہے اور آخری دو عشروں میں یہ جگہ منصورہ احمد نے سنبھالے رکھی۔ مشاورتی عمل میں کمی کوتاہی کا امکان موجود رہتا ہے اور انفرادی تعصبات کے روبہ عمل ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اور 'فنون' کے معاملات بھی استثنائی حیثیت نہیں رکھتے۔

'فنون' قاسمی صاحب کی ترقی پسندی کے زمانے کے بعد کا فنامنا ہے۔ گو مزاجاً یہ پرچہ ترقی پسندانہ فکر کے قریب ضرور رہا لیکن اسے کسی طور پر بھی نظریاتی پرچہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل قاسمی جدیدیت کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے اس تحریک میں رجحان کے خلاف ایک غیر اعلانیہ جنگ جاری رکھی تھی۔ دوسری جانب، فنون اور ندیم کے مضبوط ترین معاصر ادبی پرچے اوراق اور وزیر آغا باقاعدہ جدیدیت کے علمبردار تھے۔ اسی لیے راولپنڈی اور اسلام آباد میں جب نئے افسانے کا آغاز ہوا جسے ۷۰ کا افسانہ بھی کہا جاتا ہے تو اس علامتی افسانے کو 'اوراق' نے نہایت کھلے دل سے اپنے صفحات پر جگہ دی۔ اور یوں علامتی اور تجریدی افسانہ نگاروں کا رخ 'فنون' کی طرف کبھی نہ ہو سکا۔ انور سجاد، رشدی امجد، احمد داؤد، احمد جاوید، مرزا حامد بیگ،

یوسف چوہدری۔ یہ سب باکمال اور جدید افسانہ نگار 'فنون' سے فاصلے پر رہے اور فنون بھی ان سے بے گانہ ہی رہا۔ منشا یاد چوں کہ بیانیہ اسلوب کے افسانہ نگار تھے اور اپنے تخلیقی مواد کے حوالے سے بھی قاسمی صاحب کے مزاج سے خاصی مطابقت رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں 'فنون' نے اپنے صفحات پر باعزت طور پر جگہ دی۔ نتیجے کے طور پر ندیم نے کم صلاحیت اور استعداد کے حامل نئے افسانہ نگاروں کے ذریعے اس خالی جگہ کو پر کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بعد۔ 'فنون' کا افسانہ ہمیشہ کمزور ہی رہا۔

'فنون' کا ایک کمال یہ بھی رہا کہ یہ غالباً پہلا ادبی جریدہ تھا جس نے دیگر فنون لطیفہ کو ادب سے ہم آہنگ کرنے کی سنجیدہ اور مربوط کوششیں کیں۔ اس کے خاصے صفحات کلچر اور آرٹ کے موضوعات کے لیے مخصوص رہے۔ مصوروں کو نمائندگی دی گئی، ان پر مضامین لکھے گئے۔ اس طرح منیر احمد شیخ نے نئی گلوکاراؤں مثلاً نیرّہ نور اور طاہرہ سید کو متعارف کروانے کے مضامین لکھے۔ موسیقی پر ایک آدھ مقالہ تقریباً ہر شمارے میں موجود رہا۔

پھر 'فنون' ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے 'اختلافات' کا عنوان قائم کر کے مختلف ادیبوں، شاعروں کی آراء کو خطوط کی صورت میں پرچے میں شامل کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا۔ خطوط ایسا وسیلہ ہیں جن کے ذریعے پرچے میں شامل تخلیقات پر بحث ہوتی ہے جو تخلیق کار کی نہ صرف حوصلہ افزائی کا سبب بنتی ہے بل کہ اس کی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ 'فنون' کے اس گوشے میں بہت سے اہم مسائل پر نہایت بامعنی اور مثبت مکالموں نے جگہ پائی۔ یوں اس خصوصی گوشہ کے حوالے سے 'فنون' نے ادب کی ناقابلِ فراموش خدمت کی۔ اور اپنے زمانے کے ادب اور اس سے منسلک نظری مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوفناک احساس شکست کے حوالے سے ندیم نے مباحث کو تحریک دی۔ نتیجے کے طور پر اتنے متنوع اور پر مغز خطوط کا سلسلہ چلا نکلا کہ ان مباحث کو سمیٹنے کے لیے بھی ایک پورا دفتر درکار ہے۔

تحقیق کے معاملے میں 'فنون' انفرادی مقام رکھتا ہے۔ ۴۴ برس کے اس طویل دورانیے میں نہایت قابل قدر تحقیقی مقالے فنون کے ابتدائی صفحات کی زینت بنتے رہے ہیں۔

ندیم کی اصل کمزوری گویا مضبوطی اس کی شاعری تھی اور وہ بھی غزل کی روایت کا نہایت واضح اور گہرا ادراک تھا۔ اور اچھی غزل کی جانب وہ بے اختیار ہو کر لپکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی ایک پہلو سے ہم 'فنون' کو تمام دیگر معاصر پرچوں سے باخوف تردید ممتاز قرار دے سکتے ہیں تو وہ اس کا حصہ غزل ہے۔ غزل کی

اشاعت میں ہمیں کہیں کوئی کم زوری یا کوتا ہی دکھائی نہیں دیتی اور تین نسلوں کے غزل گو شعرا نے فنون میں بھر پور نمائندگی حاصل کی۔ نئی نسل کے نہایت شاندار غزل گوؤں کی ایک پوری کھیپ ۷۰ء کی دہائی میں سامنے آئی۔ لیکن اس بابت نظریہ سازی اور نشان دہی کا کام 'فنون' کی وساطت سے نہیں ہو سکا۔ غزل کی نئی تنقید کچھ ایسے پیمانوں پر استوار کی گئی کہ 'فنون' کے غزل گو پس منظر میں چلے گئے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جب ۷۰ء کی دہائی کی غزل کی بات آتی ہے تو سوائے ایک آدھ کے 'فنون' کے کسی غزل گو کا نام ہمیں اس فہرست میں دکھائی نہیں دیتا۔ 'فنون' سے جدا ایک متوازی تنقیدی اور تخلیقی لہر بھی اس عرصے میں موجود تھی۔ غزل کے اس مختلف منظرنامے کی تشکیل میں محمد خالد اور غلام حسین ساجد کی مرتب کردہ انتھالوجی ''نئی پاکستانی غزل'' نئے دستخط، اور محمد اظہار الحق کے پہلے شعری مجموعے 'دیوارِ آب'' کے دیباچہ از مرزا حامد بیگ نے کلیدی کردار ادا کیا۔

مدیران کرام اکثر اوقات اپنے پرچے کو ذاتی پروجیکشن کے لیے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ن م راشد نے ایک تحریر میں ندیم پر صاف الزام بھی لگایا ہے لیکن 'فنون' کا بغور مطالعہ اس تاثر کی نفی کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو 'فنون' سے خارج تو نہیں کیا کہ ایسا ممکن ہی کیونکر ہے، لیکن انھوں نے اپنی ذات کو 'فنون' کے مجموعی مزاج پر اس طور پر حاوی نہیں ہونے دیا کہ وہ محض ندیم کی ''عظمت'' کا اشتہار بن کر رہ جائے۔ 'فنون' کے وابستگان کی ایک طویل فہرست ہے، ان لوگوں سے ندیم کے ذاتی تعلقات استوار رہے، وہ محبتیں بانٹتے رہے نتیجے کے طور پر یہ ضرور ہوا کہ انھی لوگوں نے اپنی محبت ندیم کے لیے وقف کیے رکھی اور ان کے نام کا جھنڈا بھی بلند کیے رکھا۔ اور یہ جو جشنِ ندیم' یا ندیم کی سالگرہ منانے کی سالانہ رسوم ہوا کرتی تھیں تو ان میں ان کے چاہنے والوں کا ہاتھ، ندیم کی ذاتی خواہش سے کہیں زیادہ پر زور اور پر جوش دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی تقریباً نصف صدی تک تواتر سے شائع ہونے والے پرچے کی پیشانی پر، احمد ندیم قاسمی، درج ہوتے رہنا، بذاتِ خود ایک شاندار تعارف سے کم نہیں جب کہ پرچے نے اپنی افادیت اور معیار کا لوہا بھی منوا رکھا ہو۔ ندیم بطور مدیر اپنے سے سینئر، معاصرین اور جونیئر تمام لکھنے والوں سے باقاعدہ رابطے میں رہا کرتے تھے۔

محمد خالد اختر 'افکار' کے ندیم نمبر میں لکھتے ہیں کہ وہ لکھنا تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ جب ندیم نے ذاتی سطح پر دل چسپی لے کر انھیں پھر سے اس جانب متوجہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میرے بعض تبصرے ندیم کو اچھے اور متوازن نہیں لگے ہوں گے۔ تاہم وہ کسی قطع و برید اور ایک لفظ حذف کیے بغیر چھپے۔ اس طرح میرے ادبی کیریئر کا پھر سے آغاز ہوا۔''

'فنون' کے مختلف مراحل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مجھے یاد ہے اس نے بعض اچھی اور اعلیٰ پائے کی کہانیوں کو محض اس لیے اپنے رسالے میں چھپنے نہ دیا کہ ان میں جنسی اعضاء اور ان کی کارکردگی کا ذکر تھا...... ندیم کی خط و کتابت کافی وسیع تھی ...... اس کی بیشتر مکاتیب نگار غالباً خواتین ہوتی ہیں۔ ذوق ادب وسخن میں مشق کرنے والی عورتیں، نوعمر، ٹین، ایجرز جن کی ادبی تمنائیں ہیں اور جو 'فنون' میں اپنا نام دیکھنا چاہتی ہیں۔ ندیم دراصل جدید پود کے جذباتی اور بے جھجک اظہار سے خوش نہیں (وہ کہتا تھا) یہ عصمت وعفت مآب کیوں نہیں ہوسکتیں۔"

ترقی پسند ندیم کی بابت اس نوع کی رائے ہضم کرنا ذرا دشوار ہے لیکن حقیقت یہی ہے اور بعض دیگر مضامین میں بھی اس جانب اشارے ملتے ہیں کہ وہ اپنی اصل باطنی سچائی کی جانب لوٹ آئے تھے۔

فہمیدہ ریاض کا مضمون بھی محمد خالد اختر کی رائے کی تائید کرتا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ ندیم صاحب شریف آدمی تھے اور بے تحاشا نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ لکھتی ہیں:

> "جب پہلی بار میں نے ندیم صاحب کو اپنی ایک نظم بھیجی تو ان کا جواب آیا 'نظم ذرا ڈھیلی ہے، کوئی دوسری ہو تو بھیجیں۔'' تب میں انٹرمیڈیٹ میں تھی۔ اگلے خط میں، میں نے نظمیں بھیجنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا۔ تو ان کا جواب آیا ''یہ نظمیں تو بہت اچھی ہیں۔ کیا آپ واقعی کالج کے دوسرے سال میں ہیں؟'' میں نے ان کو لکھا، ''آپ فنون کے ٹائٹل پر، اعلیٰ ادب کا پیمانہ، کیوں لکھواتے ہیں۔ یہ تو خالص گھی کا اشتہار معلوم ہوتا ہے'' انھوں نے لکھا '' آپ ٹھیک کہتی ہیں میں یہ الفاظ ہٹادوں گا۔'' اس طرح انھوں نے ایک لکھنے والی کو جس نے محاورتاً ابھی قلم پکڑنا بھی نہیں سیکھا تھا، سر پر چڑھالیا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کبھی کبھی ایک چور خیال دل میں آتا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں لڑکی ہوں؟ لیکن پہلی نظم بھیجتے ہوئے بھی تو میں لڑکی تھی۔ بات صاف تھی، ندیم صاحب کے لیے ایک بالکل گم نام مبتدی شاعر کی رائے میں بھی وزن تھا۔"

(فہمیدہ ریاض ''افکار'' ۔ ندیم نمبر)

خواتین سے منہ بولے رشتوں کے حوالے سے ندیم پر سخت ترین اعتراض راشد نے کیا اور وہ جو ایک

شائستہ اور وضع دار ندیم تھا، پہلی مرتبہ شدید طیش میں آ گیا اور انھوں نے نہایت درشت اور سخت الفاظ میں اس بات کا جواب دیا۔ خیر اس بابت تفصیلی بات کی نہ ضرورت ہے نہ موقع۔

'اوراق' اور فنون، دو معاصر اور اہم ترین ادبی پرچے تھے اور ابتداء میں ندیم اور وزیر آغا کے درمیان تا دیر دوستی کے تعلقات قائم رہے۔ کوئی ایسا بڑا نظریاتی تنازعہ بھی ان کے درمیان موجود نہیں تھا اور میں ذاتی طور پر دونوں کو جانتے ہوئے یہ پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ دونوں نہایت ملنسار، خوش خلق، وضع دار اور صلح جو انسان تھے۔ پھر ان دونوں کے درمیان اتنی طویل، غیر ادبی اور ادنیٰ سطح کی شخصی چپقلش کیوں چلی؟ آپ 'فنون' میں شائع ہوتے ہیں تو اوراق اور اوراق میں شامل شاعت ہوتے ہیں تو فنون کے دروازے بند ہو جاتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے اختلاف کی پہلی اور ٹھوس اینٹ احمد فراز نے رکھی۔ پھر وہ لوگ جن کے اپنے اپنے مفادات تھے، اس جھگڑے کو ہوا دیتے رہے اور ان سادہ لوح لیکن بڑے ادیبوں اور ان کے رسائل سے اپنے اپنے فوائد حاصل کرتے رہے۔ ندیم کے پاس 'مشاعرہ' میں شرکت کرانے کا زیادہ اختیار حاصل تھا۔ کئی شاعروں نے ندیم کی ہمدردیاں اس مقصد کے لیے بھی حاصل کیں اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مشاعرے پڑھ پڑھ کر مشہور ہوتے چلے گئے۔

احمد ندیم قاسمی جذباتی ہونے کی حد تک ایک خالص قوم پرست پاکستانی تھے۔ انڈیا کے ادیبوں، شاعروں سے انھوں نے بہت کم رابطہ رکھا۔ اور فنون کی ترسیل بھی انڈیا کے کچھ مخصوص حلقوں تک ہی محدود رہی لیکن اے ء کی جنگ کے بعد تو یہ سلسلہ انھوں نے بالکل بند کر دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اردو پڑھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد انڈیا میں بھی موجود ہے۔ اور یوں وہ اعلیٰ ادبی سرگرمیوں کو محدود کر رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل کی بنیاد تو ظاہر ہے ایک مثبت حب الوطنی کا جذبہ تھا لیکن اس کو اردو ادب کے تناظر میں منفی ہی قرار دیا جائے گا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ لکھنے والے جو 'فنون' تک محدود تھے، باصلاحیت ہونے کے باوجود انڈیا میں تعارف تک حاصل نہ کر پائے۔ خود قاسمی کے مقام و مرتبے کی شناخت اور تعین میں اس روش نے رکاوٹ ڈالی۔ بہت دیر بعد انھیں اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ اور گلزار کی نظمیں 'فنون' میں نہ صرف باقاعدگی اور اہتمام سے شائع ہونا شروع ہو گئیں بل کہ ان کے درمیان عملی روابط کا آغاز بھی ہو گیا۔ انڈیا کے شاعروں، ادیبوں سے ان روابط کا ہی نتیجہ تھا کہ زبیر رضوی نے انڈیا سے اپنے پرچے 'ذہن جدید' کا 'احمد ندیم قاسمی نمبر' نکالا۔

اوپر غزل کے حوالے سے فنون کے 'غزل نمبر' کا تذکرہ رہ گیا۔ ادبی پرچے خصوصی شمارے مرتب کرتے

رہتے ہیں۔ لیکن قاسمی کا یہ ایک منفرد کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسا ضخیم، نمائندہ اور معیاری غزل نمبر شائع کیا جو تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور پاکستان میں اردو غزل کے مربوط اور عہد بہ عہد مطالعے میں نہایت مفید اور معاون ثابت ہوتا ہے۔

’فنون‘ کا آخری عشرہ، ندیم کی علالت کا عشرہ ہے۔ اس عرصے میں پرچے کے زیادہ تر معاملات منصورہ احمد کے ہاتھ آتے چلے گئے۔ آغاز ہی میں منصورہ احمد نے اعزازی پرچہ ارسال کرنے کی روایت کو ترک کر دیا۔ اور پرچے میں شائع ہونے والے ادیبوں، شاعروں کو بھی سالانہ خریدار بننے کو کہا۔ بات گو پرانی ہے لیکن یہاں شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ایک زمانے میں ن م راشد اور مظفر علی سید نے باقاعدہ مہم چلائی اور اعلان کر دیا کہ وہ معاوضے کے بغیر، خواہ وہ چند روپے ہی کیوں نہ ہو، کسی پرچے کو اپنی تخلیق یا تحریر ارسال نہیں کریں گے اس معاوضے کا نام انھوں نے ”حق الخدمت“ رکھا۔ معاملہ یہ ہے کہ ہمارے مدیران کرام، تخلیق کاروں کو اس طرح اور اس ادا کے ساتھ اپنے پرچوں میں جگہ دیتے ہیں جیسے احسان کر رہے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پرچے کا نام اور معیار ان لکھنے والوں ہی کے دم قدم سے ہے۔ خیر ’فنون‘ کی اس روش کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کمزور، گمنام اور نسبتاً کم سطح کے نئے ادیبوں، شاعروں نے یہ سوچ کر سالانہ خریداری حاصل کر لی کہ ان کی تحریریں یوں ’فنون‘ میں جگہ پائیں گی۔ لیکن ہمارے اکثر سینئر اور معتبر لکھنے والے اس طرز عمل سے سخت بددل بھی ہو گئے۔ ساتھ میں ایک اور عمل کا آغاز ہوا کہ کم پڑتے اثر و رسوخ اور پذیرائی نے دیگر ”محبان قاسمی“ کو بھی بددل کر دیا۔ گو احمد ندیم قاسمی کی ذات سے ان کی محبت اور احترام میں تو کمی واقع نہیں ہوئی لیکن ’فنون‘ سے بہر حال وہ ایک محتاط فاصلے پر چلے گئے۔ دراصل یہ سب لوگ اس قدر باہم مربوط اور قاسمی و فنون سے وابستہ رہ چکے تھے کہ انھیں ”فنون گروپ“ کے نام سے آج بھی پہچانا جاتا ہے۔ خالد احمد نے تو ’بیاض‘ کے نام سے ایک بے سروپا ادبی پرچہ بھی جاری کر دیا جو تا حال جاری ہے۔

قاسمی صاحب کے بطور مدیر کردار پر روشنی ڈالنے کے لیے شاید یہاں چند ذاتی حوالے بھی مددگار ثابت ہوں۔

میں ۱۹۸۸ء کے آخری مہینوں میں راولپنڈی سے لاہور منتقل ہوا۔ راولپنڈی کا ادبی ماحول افسانے کا ماحول تھا اور یہ وہی افسانہ تھا جو ’اوراق‘ میں جگہ پا رہا تھا۔ وزیر آغا، اکثر اوقات راولپنڈی آیا کرتے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات احمد داؤد کی وساطت سے وہیں ہوئی۔ اور ایک ہی ملاقات میں میرے ان سے روابط استوار ہو گئے۔ اس لیے میری ابتدائی نظمیں ’اوراق‘ ہی میں شائع ہوئیں۔ اور تا دیر باقاعدگی سے

تقریباً ہر شمارے میں میری کوئی نہ کوئی تحریر ضرور شامل رہی۔

وزیر آغا کا گاؤں وزیر کوٹ، میرے آبائی قصبے چنیوٹ کے بہت قریب تھا۔ والدین حیات تھے اور میں ہر عید بقرعید پر چنیوٹ ہی جایا کرتا تھا۔ وزیر آغا کی کمال محبت تھی کہ ہر مرتبہ وہ مجھے وزیر کوٹ آنے اور ایک وقت کا کھانا ان کے ساتھ کھانے کی دعوت ضرور دیتے۔ میں بھی باقاعدگی سے وزیر کوٹ جا کر ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے اور طویل نشست سے ہمیشہ محظوظ ہوا کرتا۔

وزیر آغا نہایت خوش دلی سے استقبال کرتے۔ وہ مزاجاً خاموش طبع، خود میں گم، تخلیقی وفور کی پکڑ میں رہنے والے علم سے مالا مال شخص تھے۔ ان سے میری ون ٹو ون ملاقات کا رنگ ہی کچھ اور ہوا کرتا۔ میں تا دیر اس ملاقات کے سحر میں مبتلا رہا کرتا۔ اور میں گواہ ہوں کہ میں نے ان طویل نشستوں میں کبھی ایک مرتبہ بھی وزیر آغا کو قاسمی صاحب کے خلاف بات تو رہی ایک طرف، کوئی اشارہ بھی اس حوالے سے کرتے نہیں دیکھا سُنا۔ خیر ایک روز قاسمی صاحب کا ایک خط موصول ہوا کہ کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کسی روز ملنے آؤ اور فنون کے لیے کوئی چیز بھی لیتے آنا۔ قاسمی صاحب گویا بے خبر آدمی نہیں تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جس شخصیت کو بچپن سے پسند کرتے، Idealize کرتے آئے ہیں، ان سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ میں اگلے ہی روز ان کے مجلس ترقی ادب کے دفتر پہنچا۔ ملاقات میں محبت بھی تھی۔ کشادہ دلی بھی لیکن تنہائی نہیں تھی اور نہ ہی وہ یکسوئی جو اچھی ملاقاتوں کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ بہر حال اس ملاقات کے بعد میرا 'فنون' سے رابطہ استوار رہا اور میری چیزیں کبھی کبھار 'فنون' کے صفحات پر بھی جگہ پانے لگیں۔ گویا انھوں نے میرا 'اوراق' میں چھپنا نہ صرف گوارا کیا بل کہ غالباً اس کو بہت اہمیت بھی نہیں دی۔

۱۹۹۷ء کے آخر میں میری نظموں کی کتاب 'آخری دن سے پہلے' شائع ہوئی۔ میں قاسمی صاحب اور منصورہ کے لیے اعزازی کاپیاں لے کر ان کے دفتر پر حاضر ہوا۔ میری کتاب کی ابتدائی ۵۵ کے قریب نظمیں آزاد جبکہ ۲۰۔۲۲ نظمیں نثری تھیں۔ ندیم نے کتاب پکڑتے ہی اسے کھول کر دیکھنا شروع کر دیا اور کہا کہ تمھاری کتاب پر میں خود تبصرہ کروں گا۔ اس جملے کی ادائیگی کے چند لمحوں بعد ہی کہنے لگے ”لیکن اس میں تو نثری نظمیں بھی ہیں!“ گویا انھوں نے اپنے پہلے الفاظ واپس لے لیے۔ اور بات میری سمجھ میں بھی آ گئی۔ قاسمی دراصل نثری نظم کو شاعری تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے اور نہ تیار ہوئے۔

ایک اور مرتبہ 'فنون' میں میری غزلیں شائع ہوئیں تو میں اعزازی پرچہ وصول کرنے مجلس کے دفتر چلا گیا۔ قاسمی صاحب خود اٹھے اور الماری سے پرچہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے پرچہ کھولا تو حیران ہوا کہ میری

غزلیں بالکل مبتدی شعرا کے انبوہ میں کہیں گم کر کے لگائی گئیں تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے فہرست پر نظر ڈالی وہاں بھی یہی صورت تھی۔ میں بدل تو ہوا لیکن خاموش رہا۔ قاسمی صاحب لیکن بھانپ گئے اور کہنے لگے ”پرچہ مجھے دیں۔“ ”ان غزلوں کو تو شائع ہونا تھا، یہ ادھر کیسے چلی گئیں منصورہ؟“ اس ایک جملے نے میری تسلی بھی کرادی اور میں قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کر کے اٹھ آیا۔

قاسمی صاحب سے میرا آخری رابطہ میری نظم ”سارہ کی پوٹلی“ کے حوالے سے ہوا۔ جو میں نے یہ سوچ کر بیک وقت شب خون انڈیا اور فنون کو ارسال کردی کہ انڈیا میں شائع ہونے کا مطلب پاکستان میں مطبوعہ نہیں لیا جاسکتا۔ یہ بات اسی برس کے اوائل کی ہے جب غالباً ’فنون‘ کا آخری شمارہ مرتب ہو رہا ہوگا۔ نظم کے ارسال کیے جانے کے بعد کچھ عرصہ بعد مجھے قاسمی صاحب کا خط موصول ہوا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپکی یہ نظم مجھے خاص طور پر بہت پسند آئی تھی، کمپوزنگ ہو چکی تھی۔ اور میں اسے اہتمام سے شائع کرنے والا تھا کہ انڈیا سے ’شب خون‘ موصول ہوگیا جس میں آپ کی یہ نظم شامل اشاعت ہے۔ ’فنون‘ میں شائع ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تخلیق دنیا کے کسی بھی حصے میں شائع نہ ہوئی ہو۔ اور مجھے اس اصولی مؤقف کے سبب آپکی نظم شامل نہ کرنے کا دکھ ہوا ہے۔ اور افسوس کہ میری محنت رائیگاں گئی۔

ظاہر ہے مجھے شرمندگی ہوئی۔ اور سوچا کہ خود کسی دن جا کر معذرت بھی کرلوں گا اور وضاحت بھی پیش کردوں گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن افسوس۔ وہ رخصت ہوگئے، میری معذرت اور وضاحت قبول کیے بغیر۔

قاسمی صاحب دل کش آدمی تھے۔ محبت کرنے والے، دوسروں کے کام آنے والے، مجالس کی رونق اور چھوٹے بڑوں سے یکساں نیک نیتی اور خلوص سے ملنے والے۔ میری بڑی خواہش رہی کہ ان کے عہد میں زندہ رہتے ہوئے، ان سے کوئی ایک تو تفصیلی ملاقات ہوسکتی۔ کوئی ایک مکالمہ تو کھل کر بھی ہو پاتا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ان کی بطور شاعر، افسانہ نگار، صحافی اور مدیر حیثیت ایسی ہے کہ ہم کسی ایک کو کسی دوسرے پہلو پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ ہمارے نئے مدیران کے لیے ان کے بطور مدیر طویل کیریئر کے گہرے مطالعے میں بہت سے اسباق مضمر ہیں جن سے استفادہ کر کے، وہ اپنا کردار بہتر اور زیادہ تعمیری انداز سے ادا کرسکتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی وفات نے ایک پورے دور کے خاتمے کا اعلان کردیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میرؔ سے صُحبت نہیں رہی

☆☆☆☆

سید ضیاالدین نعیم

بَین

قاسمی صاحب سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے صرف پندرہ دن پہلے ان کے آفس میں ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر بظاہر علالت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ طبیعت میں شگفتگی حسبِ معمول تھی۔ حیدرآباد دکن کے ذکر پر انھوں نے ابراہیم جلیس کا قاسمی صاحب کے بجائے؛ خاسمی صاحب، کہہ کر پکارنے کا واقعہ قہقہوں کے درمیان بتایا۔ ہم نے چائے پی، تصویریں بنوائیں۔

گفتگو کے دوران ان کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے مَیں نے ان کے افسانے “بَین” کے بارے میں اپنی بے طرح پسندیدگی کا اظہار اس گزارش کے ساتھ کیا کہ اس میں انھوں نے یکسر مختلف تیکنیک استعمال کی ہے اور اس تیکنیک نے افسانے “بَین” کو بے پناہ تاثیر کا حامل بنا دیا ہے۔ میری گزارش پر ان کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک اطمینان بھری چمک نمودار ہوئی --- انھوں نے کہا کہ ہاں --- لیکن ابھی بہت کم لوگوں نے اس افسانے کو توجہ کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

صورتِ حال اب بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ قاسمی صاحب کے افسانوں پر گفتگو ہو تو ان کا معرکہ آرا افسانہ “بَین” تذکرے میں آتا ہی نہیں۔ پہلے سے ان کے جو افسانے بہترین قرار دیے گئے ہیں، یارانِ نکتہ داں انھی کا ذکر کر کے اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہونا کافی سمجھتے ہیں۔

ان کا افسانہ ’بَین‘، محض ایک بَین ہے --- بَین کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں --- لیکن یہ “بَین” ہماری سوسائٹی کی اتنی جہتوں پر محیط ہے کہ یہاں قاسمی صاحب کی وسعتِ نظر اور احساس کی ڈیلیکسی اپنے کلائی میکس پر دکھائی دیتی ہے --- ورڈز ورتھ کی نظم “ڈیفاڈلز” کا آخری سٹینزا آپ میں سے اکثر کو ازبر ہوگا، میں اسے تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پڑھوں گا:

For oft when on my couch I lie
In vacant or in pensive mood
The "Ban" (lament) flash upon that inward eye

Which is the bliss of solitude

And them my heart with: Tears fills

and: LAMENTS; with the daffodils.

جی ہاں۔۔۔۔احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ”بَین“ اگر چشمِ دل وا کر کے پڑھا جائے تو ہر صاحبِ درد پر اسی درجے میں اثر انداز ہوتا ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا انگریزی کی نظم میں آیا ہے۔

یوں بھی ہم اگر قاسمی صاحب کے جملہ کام کے غالب حصے پر غور کریں تو وہ سب کا سب ایک حساس ترین دل سے نکلے ”بَین“ کے علاوہ کیا ہے؟

بَین۔۔۔۔دنیا کی بے ثباتی پر۔۔۔۔۔بَین۔۔۔۔لوگوں کی بے مروتی پر۔۔۔۔۔بَین۔۔۔۔۔ معاشرے کی سفاکی پر۔۔۔۔بَین۔۔۔۔انسانوں کی کم فہمی پر۔۔۔۔

☆☆☆☆

نوٹ: احمد ندیم قاسمی کے سلسلے میں اکادمی ادبیات کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں یہ مضمون پڑھا گیا۔

جاوید صدیق بھٹی

ترے بعد رہا کچھ بھی نہیں

احمد ندیم قاسمی صاحب سے میری ادبی تقریبات میں کئی ملاقاتیں ہوئیں، مگر ان سے تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ان سے اپنی کتاب ”روبرو“ کے لیے انٹرویو کرنے گیا۔ ان کے ساتھ بڑی اچھی گپ شپ ہوئی۔ انھوں نے مجھے بڑی محبت اور شفقت سے اتنا وقت دیا کہ میں اپنا انٹرویو مکمل کر کے لوٹا۔ اس وقت منصورہ احمد بھی وہاں موجود تھیں۔

احمد ندیم قاسمی انسان دوست اور عوام دوست شخصیت کے مالک تھے۔ خوش مزاجی اور شگفتہ پن ان کی شخصیت کی ایک خوبی تھی۔ ان کے پاس ادیبوں، شاعروں کی محفل لگی رہتی تھی، ان کے دفتر میں یہ رونق محض ان کی خوش اخلاقی اور ادیبوں، شاعروں سے محبت، اور شفقت کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے ملنے والوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے کہ ان کا یہ انداز لوگوں کو ان کا گرویدہ کرتا چلا جاتا تھا۔ گفتگو میں اتنی شائستہ زبان استعمال کرتے کہ کوئی بھی ملنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں ایک مرتبہ ان سے ملنے گیا تو میرا چھوٹا بھائی ندیم صدیق بھٹی میرے ساتھ تھا۔ قاسمی صاحب اتنی شفقت اور محبت سے ملے ہمیں چائے پلائی۔ ملاقات سے واپسی پر میرے بھائی ندیم صدیق بھٹی نے مجھ سے کہا کہ یقین نہیں آ رہا کہ ہم اتنے بڑے آدمی سے مل کر آ رہے ہیں۔ دوسری صفات کی طرح عاجزی اور انکساری بھی احمد ندیم قاسمی کا ایک خاص وصف تھا۔ احمد ندیم قاسمی جتنے بڑے آدمی تھے اتنے ہی حلیم اور عاجز تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی عاجزی اور اٹھ کر اور جھک کر ملتے۔ ہر ملنے والے سے بڑی نرم اور شائستہ گفتگو کرتے۔ ان سے ایک بار ملنے والا دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اچھے افسانہ نگار، شاعر، مدیر اور کالم نگار تھے، جس کا اعتراف پوری دنیا کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی بڑی خوبصورت باتیں کرتے تھے۔ جب وہ باتیں کرتے تو سننے والے کی خواہش طول پکڑتی جاتی کہ وہ باتیں کرتے جائیں اور وہ سنتا جائے۔ میں نے جب ”روبرو“ کے لیے ان سے انٹرویو کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ سچی خوشی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے فرمایا۔ سچی خوشی وہ ہے جو ایمان داری، دیانت داری، حق گوئی اور انصاف سے حاصل ہوئی۔ میں نے پوچھا آپ کا پسندیدہ لفظ کون سا ہے۔

انھوں نے فرمایا ''محبت''۔ ان کے انٹرویو کا ہر لفظ زندگی، محبت، ثقافت، ادب اور انسان کی وضاحت کرتا تھا۔ قارئین! کی دلچسپی کے لیے میں ان کے طویل انٹرویو سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں، جو میری کتاب ''روبرو'' میں شائع ہو چکا ہے۔

س: آپ سب سے زیادہ کس بات سے ڈرتے ہیں؟

ج: جس سے کسی دوسرے کو تکلیف ہو۔

س: آپ سب سے زیادہ کس شخصیت سے متاثر ہیں؟

ج: حضورﷺ کی بے مثال اور بے نظیر شخصیت سے۔

س: آپ کو دوسروں میں سب سے زیادہ کون سی چیز ناپسند ہے؟

ج: منافقت

س: آپ کو اپنی ذات میں کون سی چیز سب سے زیادہ بری لگتی ہے؟

ج: وعدہ کرتا ہوں مگر تاخیر سرزد ہو جاتی ہے۔

س: آپ کا سب سے قیمتی سرمایہ کیا ہے؟

ج: میرا ضمیر جسے میں نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

س: کون سی ایسی چیز ہے جسے آپ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں؟

ج: اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کو

س: آپ سب سے زیادہ کس بات سے رنجیدہ ہوتے ہیں؟

ج: بے انصافی، حق تلفی اور استحصال کے مناظر دیکھ کر۔

س: آپ نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت کس سے کی؟

ج: جس نے مجھ سے کی۔

س: آپ کی زندگی کا پر مسرت لمحہ؟

ج: جب میں نے بچپن میں پہلی بار اپنی امی کے پاؤں دبائے۔

احمد ندیم قاسمی جس سوال کا بھی جواب دیتے وہ قابل غور ہوتا۔ ان کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ سننے والوں کو غور اور فکر کی دعوت دیتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی بڑے مخلص انسان تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ادب کی

خدمت کی۔ زندگی کی آخری سانس تک ان کا قلم ادبی خدمت کے لیے رواں دواں رہا۔ اپنی اس خدمت کے سبب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کا ایک شعر ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی کے اس شعر کے بعد مجھے نذیر قیصر کا شعر یاد آرہا ہے جو قاسمی صاحب کے چلے جانے کے بعد میرے علاوہ ہزاروں لوگوں کے دلوں سے نکلتا ہوگا:

دیکھتا ہوں تو سبھی کچھ ہے سلامت گھر میں
سوچتا ہوں تو ترے بعد رہا کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆

محمد ظہیر بدر

ندیم۔۔۔سب کا ندیم

ابوظہبی بقول شخصے حضرت احمد ندیم قاسمی کا مفتوحہ علاقہ ہے۔ قاسمی صاحب کو ابوظہبی میں بلانے کا بہانہ شفیق سلیمی تھے۔ ابوظہبی میں جشن احمد ندیم قاسمی، سے امارات میں ادب دوستی اور ادیب پروری کی داغ بیل ڈالی گئی۔ قاسمی صاحب کو جب کبھی دعوت دی گئی وہ ناسازیِ طبع کو طرح دے کر بھی اماراتی اردو پیاروں کی دل جوئی کے لیے ضرور تشریف لائے اور لوگوں نے ان کی راہ میں پلکیں فرشِ راہ کیں۔ اس قحط الرجال کے دور میں خاص طور پر آج جب کہ ادیب کا ادب الیکٹرانک میڈیا اور حکومتی سرپرستی اور سرکاری عہدوں کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب کی ذات ان تمام پیمانوں سے بے پرواہ اور بے نیاز تھی۔ انھوں نے آدرشوں اور اصولوں پر قائم رہنے کے لیے ہر قسم کی منفعت قربان کی اور ہر طرح کی صعوبتیں اٹھائیں اور ان کا یہ وقار اور افتخار تا دمِ واپس قائم رہا۔ انھوں نے اپنے اصول مجلس ترقی ادب کی سربراہی کو ٹھوکر مار کر عملی طور پر اپنے ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں کو بتایا، ادیب عہدوں کے لیے نہیں، ادب کی تخلیق کا ذمہ دار ہے اور ادب آدرشوں سے نمو پاتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ابوظہبی سے منصورہ احمد کے ہاتھ ڈاکٹر ناہید شاہد کے لیے کوئی چیز بھیجی۔ منصورہ کسی مصروفیت کی وجہ سے ناہید شاہد سے رابطہ نہ کر پائی اور نجانے کس طرح وہ پیکٹ قاسمی صاحب کی نظر میں آگیا۔ میں پاکستان گیا تو ناہید نے بتایا کہ ایک صبح دروازے پر دستک ہوئی تو قاسمی صاحب۔ ’’یہ آپ کی امانت‘ ظہیر بدر نے کہا۔۔۔‘‘ میں نے کہا کہ قاسمی صاحب آپ نے کیوں تکلیف کی؟‘ فرمایا! میں دفتر کے لیے نکل رہا تھا، سوچا دیتا جاؤں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ (یاد رہے کہ قاسمی صاحب غالب کالونی سمن آباد میں رہتے تھے اور ناہید شاہد کا گھر پکی ٹھٹھی کی ایک تنگ سی گلی میں تھا۔ اسی علاقے میں محلوں میں گھرے ایک چھوٹے سے قبرستان میں آج وہ آسودۂ خاک ہیں)۔۔۔ اتنے بڑے بڑے ناموں میں بقول حالی۔۔۔ آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص۔

قاسمی صاحب کا تعلق مردم خیز اعوان قوم سے تھا۔ وہ دور افتادہ چھوٹے سے قصبہ انگہ، سون سکیسر میں

پیدا ہوئے۔ فقر کی فضا میں عام گھرانے میں آنکھ کھولی اور آنکھ بند ہونے تک اسی طبقے سے تعلق استوار رکھا۔

انھوں نے اشرافیہ طبقہ میں جگہ پانے کے لیے اپنا قلم، علم اور حلم کبھی استعمال کیا اور نہ ہی کبھی اپنے طبقے کو پھلانگنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اسی (متوسط) طبقے میں رہ کر ادب کی رفعتیں پائیں۔ ان کے افسانوں میں دیہی زندگی اور اس کے مسائل کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ بدیں وجہ انھیں پنجاب کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔

پاکستان میں ترقی پسند تحریک پر اپنے جملہ محاسن کے باوجود اگر لادینیت اور اخلاقی بے راہ روی کا الزام رہا تو اس میں غیروں کے ساتھ اپنوں کا بھی ہاتھ تھا۔ قاسمی صاحب نے پاکستان جو کہ ایک نظریاتی ملک ہے، ترقی پسندی کی غرض و غایت اور معاشرتی و اخلاقی حدود کا تعین کیا اور ترقی پسندی کا جو منفی اثر ''نگارے'' اور مابعد ادیبوں کے معاشرتی اور سماجی رویوں اور تحریروں نے چھوڑا تھا اسے یکسر زائل کر دیا اور بتایا کہ ترقی پسندی کے راستے میں اسلام اور پیغمر اسلام ﷺ سے محبت اور عقیدت کا اظہار مانع نہیں اور یہ کہ اظہار اور افکار کی آزادی کا مطلب مادر پدر آزادی اور اخلاق باختگی ہرگز نہیں۔ غالب خیال ہے کہ پاکستان کے بعد آنے والی دونوں نسلوں نے ترقی پسندی کے اسی رجحان کے تحت تربیت پائی۔ انھوں نے آدرشوں اور اصولوں پر قائم رہنے کے لیے ہر قسم کی منفعت قربان کی اور ہر طرح کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اور ان کا یہ وقار اور افتخار تا دمِ واپسیں قائم رہا۔ انھوں نے اپنے اصول پر مجلس ترقی ادب کی سربراہی کو ٹھوکر مار کر عملی طور پر اپنے ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں کو بتایا، ادیب عہدوں کے لیے نہیں، ادب کی تخلیق کا ذمہ دار ہے اور ادب آدرشوں سے نمو پاتا ہے۔ ان کا لہجہ متشدد نہیں بل کہ متوازن، ان کا موٌقف مدلل ہوتا تھا۔ مرتضیٰ برلاس کے بقول، قاسمی صاحب کی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کے شعر کا پہلا مصرعہ دعویٰ اور دوسرا اس کی دلیل لے کر آتا ہے۔ قاسمی صاحب اس عہد کے انتھک اور ہمہ جہت قلم قلندر تھے، جنھوں نے نعرے کے بجائے قلم سے ہر جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ ؏

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ان کی ذات نے نئی نسل کو قلم پکڑنا لکھنا اور کیسے لکھنا۔۔۔۔ سب کچھ سکھایا۔ بل کہ 'فنون' نے نئے لکھنے والوں کو تخلیقی توانائی عطا کی۔ میں نے انھیں ابوظہبی سے ''مائیں نی'' ارسال کیا اور ساتھ لکھ بھیجا کہ اگر فنون کے معیار پر پورا اترے تو چھاپ دیں۔۔۔۔ قاسمی صاحب کا خط آیا لکھا تھا 'مائیں' جمع ہے اس کا واحد 'مائے' ہے اگر آپ کہیں تو میں اسے 'مائے نی' کردوں (مجھ سے سہواً مائے کی بجائے مائیں لکھا گیا تھا) قاسمی

صاحب نے "مائے نی" کی تعریف کرتے ہوئے اسے قابلِ اشاعت قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ شخصیہ طویل ہے مالی مشکلات کے باعث فنون کے محدود صفحات میں فی الحال اشاعت ممکن نہیں۔ ہاں اگر مختصر کر سکوں ---- ورنہ انتظار کرو۔ میں نے جواب میں آئندہ خط میں درستی پر شکریہ کے ساتھ عرض کیا کہ آپ جہاں مناسب سمجھتے ہیں، کانٹ چھانٹ کر دیں۔ میرے لیے اس تحریر کی کانٹ چھانٹ محال ہے۔ آپ کا اعتبار چاہیے۔ سول گیا۔ مجھے جلدی چھپنے کی کوئی بے قراری نہیں۔ کوئی دو سال بعد "مائے نی" من و عن فنون میں چھپا۔ میں نے شکریہ بھجوایا۔ فرمایا، ظہیر بدر نے کہا تھا کہ میں خود اسے مختصر کر دوں مگر ماں پر لکھا گیا میں کیسے مختصر کروں ---- انسانی رشتوں کی اہمیت اور وقعت پہچاننے والا ہی انسانی عظمت کا گیت گا سکتا ہے ---- وہ اسم بامسمی تھے ---- وہ سب کے ندیم تھے اور ان کی آنکھ سے گرنے والا "قطرہ قطرہ متاعِ الفت" تھا اور وہ ہر آنے والے کی خوشبو کی طرح پذیرائی کرتے تھے۔

چند سال قبل قاسمی صاحب کے اعزاز میں ایک نشست رکھی جس میں ان کی غزلیں سر تال کے ساتھ پیش کر کے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ غزل سرا شاہجان کا تعلق سابقہ مشرقی پاکستان سے ہے۔ چناں چہ مشہور گلوکاروں کی گائی ہوئی قاسمی صاحب کی غزلوں کا انتخاب کیا۔ قاسمی صاحب نے اس کی گائیکی اور باریک جگہوں کی ادائیگی کی داد دی اور گائیک کے فن کو سراہا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا "لگتا ہے یہ انتخاب ظہیر بدر کا ہے" میں حیران ہوا کہ چنیدہ ملاقاتوں میں ان کو میرے مذاقِ ادب و فن کا پتہ تھا۔ اساطیر کے تحت یعقوب تصور کی "سیپیوں کی قید میں" چھپی اور اس کی تقریب رونمائی قاسمی صاحب کی صدارت میں لاہور میں ہوئی۔ منصورہ احمد اس کتاب اور تقریب کی منصرم تھی۔ انھوں نے مجھے اس تقریب کی نظامت کرنے کو کہا۔ تقریب ختم ہوئی تو قاسمی صاحب نے مجھے پاس بلایا اور میرا کندھا تھپتھپا کر کہا "بہت اچھی نظامت کی ہے آپ نے ----" ڈاکٹر سلیم اختر نے لقمہ دیا "اور الفاظ کی ادائیگی ----" قاسمی صاحب نے کہا "ہاں بالکل ---- بہت اچھے!" قاسمی صاحب کی شخصیت کا یہ بہت بڑا اور قابلِ ذکر پہلو تھا کہ ان کے پاس بیٹھ کر آدمی اپنے آپ کو ادنیٰ اور چھوٹا نہیں محسوس کرتا تھا۔ وہ ہر کہ ومہ کو اپنی محبت اور اعتماد سے باوقار بنا دیتے تھے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے کہ جس کی محفل میں ہر آدمی اسے تو بڑا سمجھے مگر خود کو کہتر محسوس نہ کرے۔

قاسمی صاحب کو محفل پر چھانے کی عادت نہ تھی، مگر محفل پر چھائے رہتے۔ البتہ محفل میں موجود ہر شخص کی بات غور سے اور دلچسپی لے کر سنتے تھے۔ گزرے ہوئے واقعات اس انداز سے بیان کرتے کہ تصویر کھینچ کر رکھ

دیتے تھے۔ ان کی تحریر میں منظر نگاری کا ہنر ان کی تقریر میں بھی پایا جاتا تھا۔ وہ گویا داستان نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے داستان گو بھی تھے۔ گفتگو کے دوران ان کے چہرے کے تاثرات اور آواز کا زیر و بم مذکورہ کردار کی تصویر آنکھوں کے سامنے لہرا دیتا۔ اکثر اوقات مختصر مسائل اور موضوعات پر دوران گفتگو منصورہ ڈ کیوڈ دے کر کہتی' بابا وہ واقعہ سنائیں اور قاسمی معمولی پس و پیش کے بعد گویا ہوتے اور محفل زعفران زار بنا دیتے۔ ایک دفعہ منصورہ احمد نے کہا، بابا پروین والا واقعہ سنائیں۔ قاسمی صاحب نے کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔
پروین ایک دفعہ اسلام آباد آئی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ تین لڑکیاں (غالباً ایم اے اردو کی طالبات تھیں) پروین کو دیکھ کر اس سے کلام کی فرمائش کی مگر پروین کو خاطر میں نہ لائی۔ میرے لیے اس کا یہ رویہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ لڑکیوں نے بہت اصرار کیا مگر پروین نے ان کی سنی ان سنی کر دی۔ جب پروین چلی گئی تو میں نے اسے اسلام آباد خط لکھا، جس میں اس کی سرزنش کی اور لکھا کہ بیٹی مجھے تمہارے اس رویے سے بہت دکھ ہوا ہے اور میں تم سے اس رویے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔۔۔۔۔ جب پروین کو خط ملا تو اگلی فلائٹ سے وہ لاہور آئی۔ میں نے بھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ آتے ہی جو رونا شروع کیا۔ بابا مجھے معاف کر دیں اور یہ خط پھاڑ دیں۔ میں نے کافی منتوں کے بعد وہ خط پھاڑا۔ تب کہیں وہ چپ ہوئی۔۔۔۔" تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد اس واقعے کی پنچ لائن کہی۔۔۔۔" ویسے اس خط کی کاپی میں نے پہلے ہی رکھ لی تھی۔" قاسمی صاحب کا انداز ایسا معصومانہ اور شگفتہ تھا کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں سمجھتا ہوں کہ عمر کا جو حصہ آنے والے وقتوں کے سہارے کا مقام ہوتا ہے، اس مقام کے لیے تگ و دو ہماری روزمرہ زندگی کے معمولات کے ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔۔۔۔ منصورہ احمد نے اپنے تئیں شاید اس مقام کی اہمیت کو کسی اہم تر مقام میں ضم کر دیا تھا مگر بابا کو بیٹی کے اس مقام کی ہمیشہ تلاش رہتی تھی۔ بہر حال سارے رشتے سلوک کے رشتے ہیں اور رشتوں کو یہی حسن زندگی کو برتر از اندیشہ سود و زیاں بناتا ہے۔ یعنی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی بناتا ہے۔ قتیل نے قاسمی صاحب کے لیے ایک شعر کہا تھا' آج یہ شعر بہت یاد آ رہا ہے:

زندگی جب کسی انساں کو ترس جاتی ہے
تیری صورت میری آنکھوں پہ برس جاتی ہے

قاسمی صاحب جب گفتگو کر رہے ہوتے تو ان کی محفل میں سے اٹھ کر جانے کو جی نہ چاہتا۔ مگر دنیا داری

تھی سوجھیلے ہوتے۔ جانا پڑتا۔ جاتے، یہ سوچ کر کہ پھر آئیں گے، مگر آج قاسمی صاحب محفل سے اٹھ گئے ہیں۔ دل بجھ بجھ جاتا ہے یہ سوچ کر کہ منصورہ تمہارے بابا اور ہمارے قاسمی صاحب اب کبھی نہ آئیں گے۔ کہ وہ وہاں گئے جہاں سے جا کر پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا۔ اب کیا کریں؟ روئیں، تعزیتی مجالس برپا کریں، شور مچائیں، سوگ منائیں۔۔۔ مگر تا بہ کے؟ کیا اس طرح وہ لوٹ آئیں گے، نہیں ہرگز نہیں!! آؤ ان کی مجبوری کا احترام کریں، اگر وہ نہیں آتے تو نہ سہی! ۔۔۔ ان کا فکروفن اور ان کی انسان دوستی کے واقعات اور نظائر ہماری یادوں کا قیمتی حصہ ہیں۔۔۔ آؤ! ہم بھی جانے کی تیاری کریں اور اپنی اپنی باری کا انتظار کریں۔

☆☆☆☆

رضوانہ سید علی

ادب کا ندیم۔۔۔۔احمد ندیم قاسمی

میں اپنی پرانی فائلیں دیکھ رہی تھی تو ان میں سے ایک میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا خط دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ “نوک قلم پہ خار” چھپا تو میں نے بہت چاؤ سے اپنے تمام پسندیدہ بڑے قلم کاروں کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ کسی ایک نے بھی کتاب کی رسید دینے کی زحمت گوارا نہ کی اور جواب آیا تو کہاں سے۔ ادب کے سایہ دار گھنے شجر احمد ندیم قاسمی صاحب کی طرف سے جو ان دنوں سخت علیل تھے۔ انھوں نے کمال شفقت سے انتہائی اچھے الفاظ میں میری حوصلہ افزائی کی اور فنون کے لیے لکھنے کی دعوت دی اور اس قول پہ صادق اترے کہ پھل دار ٹہنی ہمیشہ نیچے کو جھکتی ہے۔ میں ہمیشہ سے قاسمی صاحب کی فین تھی۔ ان کا ہر افسانہ میں نے پڑھ رکھا تھا۔ بے شمار اشعار ڈائری میں نوٹ کر رکھے تھے۔ نئے قلم کاروں کے سر پہ ہاتھ رکھنے کا حال احوال سن رکھا تھا۔ اس خط نے ان کے احترام میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ افسوس وہی علالت ان کی موت کی پیامبر ثابت ہوئی اور 20 نومبر 1916 میں آنکھ کھولنے والے اس نابغہ روزگار شخص نے 10 جولائی 2006ء میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

موت برحق ہے۔ ہر انسان جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہی ہوتا ہے۔ اس ابدی حقیقت کا ادراک رکھنے کے باوجود بیشتر انسان موت کے خوف سے لرزاں و ترساں ہی رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی موت سے ڈرتے ہیں بلکہ اپنے قریبی لوگوں کی موت بھی انھیں تڑپنے، سسکنے اور نوحہ کناں ہونے پہ مجبور کر دیتی ہے لیکن واقفان حال کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تخلیقی ارتقا سے باخبر لوگ ہمہ وقت موت کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ اسے نئی زندگی کا دروازہ اور حیات جاوداں کا پیامبر سمجھتے ہیں۔ خلیل جبران موت کو وہ ہوائے لطیف قرار دیتا ہے جو مادی جسم کو چھو کر روح انسانی کو الوہیت کی آغوش میں پہنچا دیتی ہے جبکہ واصف علی واصف کا خیال ہے کہ موت اپنے

بچوں سے بچھڑ کر ماں باپ سے ملنے کا نام ہے۔ شعرا حضرات نے بھی موت کا کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

کل رات سنا اک شاعر سے کہ موت بہت ہی دلکش ہے
دل میرا بھی یہی کہتا ہے کہ موت بہت رومینٹک ہے

خود قاسمی صاحب کا کہنا ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

بحر ادب کا یہ عظیم شناور ایسا ہمہ جہت اور گونا گوں خوبیوں کا انسان تھا کہ اس کی آن بان کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔ نثر و شاعری میں اس نے جو رنگ جمایا ہے وہ وقت کے ہاتھوں گہنانے والا نہیں بل کہ اس کی تخلیقات کے نت نئے رنگ یوں سامنے آتے رہیں گے جیسے بادلوں سے آفتاب کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ان کی زرخیزی ذہن قاری کو حیران پریشان کر دیتی ہے۔ نثر میں چوپال، بگولے، طلوع و غروب، گرداب، سیلاب، آنچل، آبلے، آس پاس، درو دیوار، سناٹا، بازارِ حیات، برگِ حنا، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول اور نیلا پتھر ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

رم جھم، جلال و جمال، شعلہ ء گل، دشتِ وفا، محیط، دوام اور لوح خاک شعری مجموعے۔ پاکستانی ثقافت وتہذیب کے حوالے سے مضامین کا مجموعہ "تہذیب وفن" کے نام سے موجود ہے۔ "تعلیم وفن کے رشتے" کے عنوان سے انھوں نے کالج اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تخلیقی ادب کی تعلیمی صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ انگڑائیاں کے عنوان سے ترتیب دی گئی کتاب میں اردو کے درجن بھر افسانہ نگاروں کے ایک افسانے کا انتخاب شامل ہے۔ نقوش لطیف: اس کتاب میں خواتین افسانہ نگاروں کی منتخب نگارشات جمع کی گئی ہیں۔ نذر حمید احمد خان: اس کتاب میں حمید احمد صاحب کے پسندیدہ موضوعات اسلام، پاکستان، غالب، اقبال اور اردو شاعری پہ اہلِ دانش کے مقالات شامل ہیں۔ قاسمی صاحب نے بچوں کے ادب پہ بھی کام کیا ہے اور دوستوں کی کہانیاں، نئی نویلی کہانیاں اور تین ناٹک کے نام سے تین کتابیں لکھی ہیں۔

ہمارے عجیب وغریب نظامِ تعلیم نے جہاں معاشرے کے دیگر شعبوں کو درجات اور خانہ بندیوں میں جکڑ رکھا ہے وہیں دنیائے ادب میں بھی ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ وجود میں آ چکا ہے جو آرام و آسائش کے ایسے کیپسول میں بند ہے جہاں کسی نووارد کے لیے قطعاً گنجائش نہیں۔ چنانچہ مراعات و نوازشات کی بارشوں میں بھیگتے یہ ادب کے ٹھیکے دار اپنی اس جنت میں کسی کو گھسنے کی اجازت نہیں دیتے۔ سو اب لفظوں کی حرمت باقی ہے نہ اہلِ فن کی قدر۔ اب ان زرنگار کرسیوں پہ وہی براجمان ہو سکتا ہے جو خاص جادوئی کلمات سے آگاہ ہو۔ کھل جا سم سم کے اس طلسماتی دور میں احمد ندیم قاسمی صاحب ایک حیران کن کردار تھے۔ ایک چھوٹے سے گھر میں سادگی سے زندگی گزارنے والا یہ شخص ایک ادبی دیو تھا مگر غرور و آہنکار اس کا چلن نہ تھا بلکہ عاجزی و فروتنی کو اس نے اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ وہ جو خود ادب کے بے شمار شعبوں کا بے تاج بادشاہ تھا ساتھ ہی نوآموزوں کے لیے ایسا پارس پتھر تھا کہ اس سے چھو جانے والا ہر زرہ ءخاک کندن کی طرح دمکنے لگتا تھا۔

تیرے لفظوں کی گھنی چھاؤں اک برگد کی طرح
خاک پہ پھیلی، فصیلوں پہ ہے چھائی ہوئی

ان گنت غنچے شگفتہ ہیں چمن میں ہر سو
ڈالی ڈالی ہے تیرے ہاتھوں کی مہکائی ہوئی

میں بہت دور اپنے بچپن میں کہیں جھانکتی ہوں تو ایک شعر چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس شعر نے احمد ندیم قاسمی کا مجھ سے تعارف ایک سچے اور کھرے شاعر کی حیثیت سے کروایا تھا۔

ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

ادبی ذوق بڑھا تو میں نے اپنی ڈائری میں ایک اور قطعہ نوٹ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی قاسمی صاحب کا ہے۔

ہم دن کے پیامی ہیں مگر کشتۂ شب ہیں
اس حال میں بھی رونق عالم کا سبب ہیں
ظاہر میں ہم انسان ہیں مٹی کے کھلونے
باطن میں مگر تند عناصر کا غضب ہیں

یوں ان کی انقلابی شاعری میرے ذہن پہ مرتسم ہوتی چلی گئی۔ پھر ان کے شاہ کار افسانے پڑھے۔ کپاس کا پھول، گھر سے گھر تک، برگ حنا، نیلا پتھر جیسے مجموعوں نے من موہ لیا۔ ''انسان عظیم ہے''، ''ریت سے بت نہ بنا''، ''خدا کرے کہ میری ارض پاک پہ اترے'' جیسی نظموں نے مبہوت کر دیا۔ دیہات کی سچی تصویر کشی کرنے والا یہ قلم کار جب کالم نگاری پہ اترتا تو معاشرے کے کریہہ چہرے پہ پڑے تہہ در تہہ دلکش نقابوں کو نوچتا چلا جاتا اور یوں ایک طویل ادبی وصحافتی زندگی گزارنے قید وبند کی صعوبتیں اور ذاتی غم جھیلنے کے باوجود لگ بھگ پچاس کے قریب فن پارے اور ان گنت صحافتی تحریریں دینے والا یہ شخص دنیا سے یوں رخصت ہوا کہ آخری وقت تک اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور شگفتگی قائم ودائم تھی۔ زندگی کے آخری ہفتے میں بھی ان کا کالم اخبار میں موجود تھا۔ بسترِ مرگ پہ، ربر کی نالیوں میں جکڑے بھی وہ لوگوں کو ان کی فرمائش پہ اشعار سنا رہے تھے۔ وہ ہر وقت ابدی زندگی کا حصہ بننے کو تیار تھے تا کہ روشنی کا تسلسل بن کر افق تا افق چھا جائیں۔

رتوں کے جبر سے آزاد ہو گیا ہوں ندیم
خزاں میں پھولتا ہوں، آندھیوں میں پھلتا ہوں

قاسمی صاحب چلے گئے مگر انھوں نے جو محبتیں بانٹی تھیں۔ ان کا خراج آج بھی وصول کر رہے ہیں۔ میں بھی خلوص کے ان پھولوں پہ اپنی تحریر ختم کرتی ہوں:

نگاہیں اشکبار ہیں۔ ہوائیں سوگوار ہیں
شمعیں ساری گل ہوئیں، فضائیں دل فگار ہیں
حشر سا بپا ہوا، سانحہ وہ ہو گیا
ادب کا جو ندیم تھا، راہی عدم ہوا
شہ سوار علم وفن، لعل و گہر سا بے مثل
جیا عجب ہی شان سے جوں چراغ بے بدل
اجالوں کا تھا ہمسفر، اجالوں میں ہی کھو گیا
ادب کا جو ندیم تھا، راہی عدم ہوا

☆☆☆☆

جیکب پال

خوشبو ابھی باقی ہے

احمد ندیم قاسمی، اردو ادب میں ایک عہد کا درجہ رکھتے ہیں، شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں اپنے مخصوص موضوعات اور اسالیب کے باعث انھوں نے ادب بل کہ ادب عالیہ میں اپنا منفرد اور جداگانہ مقام بنایا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک روزنامہ امروز لاہور، پھول، تہذیب نسواں، ادب لطیف، سویرا، ریڈیو پاکستان پشاور، فنون، مجلس ترقی ادب لاہور اور صحیفہ جیسے ادبی و ابلاغیاتی اداروں کو اپنا خون سینچ کر شاداب بنایا۔ ۳۰ سے زیادہ ادبی کتابوں اور سینکڑوں کالموں کے خالق احمد ندیم قاسمی نے جہاں نصف صدی تک دماغوں اور دلوں پر حکمرانی کی، وہاں حکمرانوں نے بھی آپ کی صلاحیتوں اور خدمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے، آپ کو پاکستان کے سب سے بڑے تمغۂ حسن کارکردگی، نشان امتیاز اور کمالِ فن سے نوازا۔ احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات کا مرکزی موضوع دیہاتی زندگی متوسط طبقہ اور محرومیوں کے مارے ہوئے گروہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں خلوص، سچائی، انصاف، مساوات، برداشت، معافی، انسان دوستی اور حب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں، نیز دولت کی غیر مساوی تقسیم، طبقاتی نظام، جبر، استحصال، لوٹ مار اور تنگ نظری و تعصب کی مخالفت ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ساری زندگی نئے لکھاریوں اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں ہمیشہ عزت بخشی۔ اس معاملے میں وہ مذہب، فرقہ، علاقہ، زبان اور دیگر امتیازات سے بالاتر تھے۔ اس کا تجربہ مجھے ذاتی طور پر کئی بار ہوا۔

۱۹۸۹ء ماہانہ ”شعور“ خوش پور (فیصل آباد) کے مدیر اعلیٰ قادر ایوب فرانس کی نگرانی و قیادت میں ہم نے پاکستان کی نامور اور معروف شخصیات کے انٹرویو شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں امجد اسلام امجد، قتیل شفائی، اداکار ندیم، اداکار محمد علی اور احمد ندیم قاسمی کے انٹرویو کرنا تھے۔ جولائی ۱۹۸۹ء کی دوپہر ادارہ ”شعور“ کی ٹیم مجلس ترقی ادب ۲۔ کلب روڈ لاہور کے دفتر میں پہنچی۔ قاسمی صاحب نے پوری ٹیم کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ رسمی تعارف کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم نے قاسمی صاحب سے علم، ادب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے بہت سے سوالات کیے۔ موصوف نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ

ہمیں جوابات دیے۔ احمد ندیم قاسمی کی بے تکلفی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ایک سوال کر دیا۔ سر، آپ نے پاکستانی پنجابی فلموں میں گنڈاسے کو متعارف کروایا ہے۔ قاسمی صاحب تھوڑے سے حیران اور تھوڑے سے ناراض ہوئے اور ایک دم بولے۔ پنجابی فلموں میں گنڈاسے کو میں نے نہیں، ناصر ادیب نے متعارف کروایا ہے۔ میں نے اپنا افسانہ گنڈاسا، مصنف ناصر ادیب، ہدایت حسن عسکری اور اداکار سلطان راہی کے لیے نہیں لکھا تھا۔ بہرحال بحث کافی طویل ہوگئی اور انھوں نے اس کی تفصیل سے ہمیں آگاہ کیا۔ میں نے پاکستان کی نصابی کتابوں میں شامل ان کے افسانہ سفارش اور گھر سے گھر تک کے بارے میں بھی کئی سوالات پوچھے۔ احمد ندیم قاسمی کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارا تعلق خوش پور (تحصیل سمندری، ضلع فیصل آباد کا ایک مشہور مسیحی گاؤں جو ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا) سے ہے، جو خوش پور کو ذاتی طور پر اور اپنی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی کی وساطت سے جانتے تھے۔ پرخلوص چائے کے بعد احمد ندیم قاسمی کے ساتھ چند یادگار گھنٹے اختتام پذیر ہوئے۔

۱۹۹۷ء میں گورنمنٹ PST کالج کمالیہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر مبنی میری دستاویز گئے دنوں کا تعاقب شائع ہوئی۔ میں نے دستاویز کے فلیپ کے لیے احمد ندیم قاسمی (اس وقت ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب لاہور) کا انتخاب کیا اور انھیں کتاب کا مسودہ ارسال کر دیا۔ ایک ہفتے بعد احمد ندیم قاسمی کا خط اور فلیپ مجھے موصول ہوا۔ قاسمی صاحب کے الفاظ اس قابل ہیں کہ انھیں لکھا جائے:

> ”کمالیہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کے سے دور افتادہ علاقے میں پروفیسر جیکب پال نے جس استقامت سے شعر و فن اور علم و ادب کی مشعل روشن کر رکھی ہے وہ تخلیقی ادب اور اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے نزدیک تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ پروفیسر جیکب پال گورنمنٹ PST کالج کمالیہ میں استاد ہیں اور طلبا ان سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ ادب کی تعلیم دینے کے علاوہ طلبا کو پاکستانیت، پاکستانی شناخت، بے تعصبی، وسیع القلبی اور برداشت کا درس بھی دیتے ہوں گے۔ یوں مستقبل کے ان وارثوں کے دلوں اور دماغوں کو روشن کرتے ہوں گے۔“

احمد ندیم قاسمی (۱۴ اگست ۱۹۹۷ء)

۲۰۰۱ء میں مجھے دوسری بار گورنمنٹ PST کمالیہ کے چند طلبا کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور کے دفتر میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ قاسمی صاحب ایک گھنٹہ ہمارے ساتھ محوِ گفتگو رہے۔

منصورہ احمد بھی شریکِ گفتگو رہیں۔ ہم نے قاسمی صاحب سے بہت سے سوالات کیے جن کے تسلی بخش جوابات دیے گئے۔ قاسمی صاحب اب اونچا سننے لگے تھے۔ انھوں نے کان میں آلہ سماعت لگایا ہوا تھا۔ لیکن ان کے لبوں پر وہی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ بہر حال یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے نظریے کے ساتھ مکمل طور پر مخلص رہے۔ ۲۰۰۱ء کو سرکاری اور قومی سطح پر سال قائداعظم کے طور پر منایا گیا۔ میں نے گورنمنٹ PST کالج کمالیہ میں اپنی سال قائداعظم ۲۰۰۱ء کے حوالے سے تقاریب کا ریکارڈ احمد ندیم قاسمی کو ارسال کیا تا کہ وہ اپنا پیغام ارسال کریں۔ چند دنوں بعد مجھے قاسمی صاحب کا خصوصی پیغام ملا۔ میں ان کے پیغام کو درج کر رہا ہوں تا کہ ان کے نظریے کی وضاحت ہو سکے۔

> ”حضرت قائداعظم محمد علی جناح بیسویں صدی کی چند گنی چنی عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ان کی شخصیت صحیح معنوں میں سربرآوردہ تھی کہ نہ انھیں انگریز کی سیاست کسی چکر میں ڈال سکی اور نہ جنوبی ایشیا کی اکثریتی جماعت کے ہتھکنڈے شکست دے سکے۔ نتیجتاً وہ ایک کامیاب اور بامراد شخصیت ٹھہرے اور جنوبی ایشاء میں ایک الگ اور منفرد ملک قائم کر کے ثابت کروایا کہ اگر نیت نیک ہو، عزم قوی ہو اور ضمیر صاف ہو تو انسان معجزہ تک دکھانے پر قادر ہے۔ میں قائداعظم کی اس تقریر کو پاکستان کے منشور کی اولین شک قرار دیتا ہوں کہ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں جو کروڑوں لوگ بستے ہیں وہ پاکستانی ہیں، وہ مسلمان ہوں، مسیح ہوں، بدھ ہوں، سکھ ہوں ان کا کوئی بھی مذہب ہو، سب کے سب پاکستانی ہیں اور پاکستان میں اس سلسلے میں کسی بھی قسم کا امتیازی سلوک سراسر ناروا ہوگا۔ میرے دل میں قائداعظم کے پیش کردہ اس منشور کا بڑا احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس منشور کو کما حقہ سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

احمد ندیم قاسمی (۱۲ دسمبر ۲۰۰۱)

مسیحی لوگوں اور خصوصاً مسیحی دانشوروں، لکھاریوں، شاعروں، ادیبوں اور استادوں کے لیے ان کے دل میں بڑا نرم گوشہ تھا۔ اس کا سبب ان کی قومی اور عالمگیر سوچ تھی۔ وہ پاکستان کے تمام شہروں کے لیے دل میں بے حد محبت اور عزت رکھتے تھے۔ وہ مسیحی لکھاریوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نامور مسیحی شعرا

کنول فیروز، نذیر قیصر اور پروفیسر گلزار وفا چودھری سے میری جب بھی ملاقات ہوئی وہ قاسمی صاحب کی طرف سے ملنے والی حوصلہ افزائی کا ذکر کرتے۔ احمد ندیم قاسمی نے نذیر قیصر کے بارے میں لکھا تھا ’’مجھے ڈر ہے کہیں اس حساس شاعر کے دماغ کی نسیں نہ پھٹ جائیں۔‘‘

گلزار وفا چوہدری کی وفات پر انھوں نے قومی پریس میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا تھا۔ وہ مسیحی قوم کے لیے فخر کا باعث ہیں۔ ۲۰۰۱ء کی ملاقات میں انھوں نے گلزار وفا چودھری سے متعلق مجھے بہت سے واقعات اور لطائف سنائے۔ قاسمی صاحب فرمانے لگے۔ ’’گلزار وفا میری بہت عزت کرتا تھا، مجھے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستان میں مسیحوں کی تعلیم، صحت، فلاح عامہ، ادب، فنونِ لطیفہ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں خدمات کی تعریف کی۔ انھوں نے تعلیم، ادب، یوتھ اور بین المذاہب، ہم آہنگی کے لیے میری خدمات کو سراہتے ہوئے تلقین کی کہ جیکب صاحب آپ کو ابھی اور محنت اور خدمت کرنا پڑے گی۔ پھر پاکستان ترقی کرے گا۔‘‘ میں نے کہا ’’سر، میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان قربانیوں سے بنا تھا اور قربانیوں سے قائم رہے گا۔‘‘ وہ میرے اس فلسفے اور ارادے پر بے حد خوش ہوئے اور متاثر ہوئے۔

احمد ندیم قاسمی جیسی قومی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت کا مجھے کمالیہ جیسے دور افتادہ علاقے میں دوبار تعلیم، ادب اور یوتھ کے حوالے سے تعریفی خط لکھنا، ان کی ادب نوازی اور انسان دوستی کا ثبوت ہے۔ ان کے دونوں خطوط میری کتاب ’’گئے دنوں کا تعاقب‘‘ اور خوشبو کی طرح پذیرائی‘‘ میں شائع ہو چکے ہیں اور میری فائل میں تبرک کے طور پر بھی ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ ان کے خطوط سے ان کے اندر کے انسان کا پتہ بھی چلتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے علم اور پیار کی خوشبو ابھی بھی میرے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں "People Die But love Never Dies" لوگ مر جاتے ہیں لیکن محبت کبھی نہیں مرتی۔‘‘ احمد ندیم قاسمی مر چکے ہیں لیکن ان کی محبت امر اور لافانی ہو چکی ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسد مصطفیٰ

نقش پا تھے، دشت تھے، امکان تھے۔۔۔احمد ندیم

قاسمی صاحب اتنی بڑی شخصیت تھے کہ ان کی باتیں، یادیں اور ملاقاتیں مدتوں یاد رہیں گی اور یاد رکھی جائیں گی۔ ان کے لکھے ہوئے ریختوں پر میر کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

قاسمی صاحب نے اپنی ایک غزل کے مطلع میں خود بھی کہا ہے کہ:

مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم
بن جائیں گے گرد کارواں ہم

لاہور میں اورینٹل کالج میں زمانہ طالب علمی، اور اس کے بعد میں قاسمی صاحب کے پاس لگا بندھا ہی گیا، لیکن ان کی شخصیت کی خوشبو ابھی تک محسوس ہوتی ہے۔ پہلی ملاقات عباس تابش کے ہمراہ ہوئی۔ منصور آفاق کی کتاب نیند کی نوٹ بک کے سلسلے میں ایک بار مجلس ترقی ادب گیا تو الماری کھولے اپنے کاغذات سمیٹ رہے تھے۔ منصورہ بھی ساتھ بیٹھی تھیں۔ میں قاسمی صاحب کو مجلس کی صدارت سے ہٹانے کی خبر سن آیا تھا۔ ان سے اظہار افسوس کیا تو یوں گویا ہوئے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تحمل اور بردباری کی مثال بنے بیٹھے، عمر بھر کا اثاثہ سمیٹنے میں مصروف تھے۔ اکثر ایک بڑا انسان جس کی ایک زمانہ قدر کر رہا ہوتا ہے، چند ایسے بے مراد افراد کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، جو کسی کے لیے مقام و مرتبے اور عز و شرف جیسے احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ ندیم صاحب کا رتبہ اس لحاظ سے بہت بلند تھا کہ اردو ادب کی جس صنف میں بھی ہاتھ ڈالا، ان کے قلم سے گوہر پارے بکھرنے لگے۔ انھوں نے ایک کہانی کار، شاعر، کالم نگار، انشائیہ نگار کی حیثیت سے اس دور میں اپنے آپ کو منوایا جب ایک طرف اقبال کی شاعری کے اثرات چھائے ہوئے تھے تو دوسری طرف فیض، ن م راشد، اختر شیرانی اور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا۔ افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو، پریم چند، اور کرشن چندر کی دھوم تھی۔ ان سب کی موجودگی میں ایک منفرد مقام پا لینا قاسمی صاحب کا بڑا اعجاز تھا۔ "فنون" کی

ادارت کے بعد تو وہ نئی نسل کے لیے ایک گھنے درخت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ میں ایسے بیسیوں نام گنوا سکتا ہوں جنھیں قاسمی صاحب ہی کے سایہ عاطفت میں پناہ ملی اور ان کے قد کاٹھ میں فنون نے بنیادی کردار ادا کیا۔ قاسمی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ اچھا لکھنے والوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اچھا لکھنے والے نوجوانوں کو خود ہی خط لکھ کر فنون کے لیے ان سے کلام طلب کرتے تھے۔ انھیں جہاں کہیں سے بھی کوئی ہیرا ملا اسے تراشنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ خورشید رضوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''قاسمی صاحب نے بہت سال پہلے مجھ سے میری ایک نظم پہلی مرتبہ "فنون'' میں اشاعت کے لیے طلب فرمائی اور ایسے لہجے میں، جیسے میں وقت کا بہت اہم شاعر ہوں"(۱)

گویا قاسمی صاحب نئی نسل کے لیے گھنے سایہ دار پیڑ تھے۔ مجید امجد نے شاید قاسمی صاحب جیسے لوگوں کے لیے کہا تھا کہ:

اس تیتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انھیں دے دوں جو بن پڑے

پروفیسر محمد اشفاق چغتائی مرحوم کا یہ شعر کتنا برمحل ہے جو انھوں نے قاسمی صاحب کی سترھویں سالگرہ پر کہا تھا:

شجر ستر برس کا ہو گیا ہے
گھنا کچھ اور سایہ ہو گیا ہے

قاسمی صاحب کی زندگی میں بھی ان پر بہت کچھ لکھا گیا اور اب موت کے بعد بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ بڑی شخصیت کے ایک نہیں ہزار پہلو ہوتے ہیں اور قاسمی صاحب تو اپنے عہد کا وہ سورج تھے، جس کرنیں اردو ادب کو تا دیر منور رکھیں گی۔ ایک سوال جو ہمارے اس مضمون میں نمایاں ہو کر سامنے آ رہا ہے، وہ یہ ہے کہ ندیم فنکار بڑے تھے یا انسان۔ میرے خیال میں بڑا انسان ہی بڑا فنکار ہو سکتا ہے۔ ندیم بڑے انسان تھے۔ وہ مذہب، سیاست، تعلیم، معیشت، معاشرت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اخلاقی اقدار کے معیار کو برقرار رکھنے والے تھے۔ ان کا تجربہ بھی بڑا تھا اور مشاہدہ بھی۔ مشاہیر ادب نے احمد ندیم قاسمی کو اپنے اپنے انداز میں سراہا ہے۔

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک ندیم آیندہ دور کا ممتاز ترین شاعر اور افسانہ نگار ہے“(۲)

سید امتیاز علی تاج لکھتے ہیں:

”احمد ندیم قاسمی کی ابتدائی تحریروں کو دیکھ کر ہی ہر پڑھنے والے کو بے اختیار اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اردو ادب مستقبل کے ایک بہت بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے“(۳)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر لکھتے ہیں:

”جو ادیب احمد ندیم قاسمی کی ادبی عظمت کا منکر ہے اس کا ادبی ذوق محل نظر ہے“(۴)

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

” لکھنے والے عموماً یک رخے ہوتے ہیں مگر قاسمی صاحب چومکھے فنکار ہیں۔ انھوں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے بل کہ قدر اول کی تخلیقات پیش کی ہیں۔“(۵)

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

”افسانہ نگاری اور شعر گوئی دونوں اصناف میں وہ زندہ رہیں گے۔ ان کی خدمات کا اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہے، گو وہ اس کے محتاج تھے، نہ ہیں“(۶)

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

”ندیم ایک ایسی فصل کی کاشت کا خواہاں ہے، جو روئے زمین کو بہشت بنا دے اور پوری کائنات انسانیت کے لیے راحت و اطمینان کامل کے سامان مہیا کرے“(۷)

اختر اورینوی لکھتے ہیں:

”منٹو، کرشن چندر، بیدی، اختر انصاری اور ممتاز مفتی کی صف میں احمد ندیم قاسمی کو بہت ہی منفرد جگہ حاصل ہے“(۸)

سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

”ندیم دل میں اتر جانے والا ادیب ہے تو روح میں سما جانے والا انسان بھی

ہے‘‘(۹)

عطالحق قاسمی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’جہاں تک احمد ندیم قاسمی کا تعلق ہے ان جیسا ہمہ جہت رائیٹر ہمارے پاس موجود تھا اور نہ ہے۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے اور اتنے ہی بڑے افسانہ نگار بھی تھے‘‘(۱۰)

ڈاکٹر انوار احمد ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> احمد ندیم قاسمی نے اپنی طویل زندگی میں جتنا تخلیق کیا، اس کا مقابلہ ان کا کوئی معاصر نہیں کر سکتا‘‘(۱۱)

ندیم کے شعر کو ہر دور کے افراد نے سراہا ہے۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

’’ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ ان کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بڑھ کر اہم چیز زندگی کی شکستیں، گہرے اور پرخلوص سوچ کے عناصر، سب مل کر ان کے اشعار میں تحلیل ہو گئے ہیں اور ان کے نغمے فضائے زندگی میں گونج رہے ہیں اور وہ جھنکاریں اٹھا رہے ہیں جو شاعری اور شاعر کو لازوال بنا دیتے ہیں (۱۲)

احسان دانش ان کی شعر گوئی پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ’’ندیم کی شاعری میں محذوفات کا ایک حسین امتزاج ہے، جو انھیں اردگرد کے دوسرے جھاڑ جھنکار سے بلند کرتا ہے لیکن وہ اخلاق اور نرم دلی کے باعث جھاڑ جھنکار کو بھی نہیں ہٹا سکتے۔ ان کی نظر میں کانٹا بھی پھول کی طرح خوش نما ہے اور وہ دونوں کی آبیاری کرتے ہیں۔‘‘(۱۳)

ان کی شاعری کے متعلق رشید قیصرانی کا یہ تبصرہ لائقِ تحسین ہے۔

> ’’شعر و ادب کی دنیا میں سب سے ممتاز وہ معدودے چند لوگ ہوتے ہیں، جن کی سوچ کی حدیں وقت سے کہیں آگے ہوتی ہیں۔ وہ صرف اپنے شہروں اور بستیوں میں نہیں بستے، بل کہ ان کے احساس کی آماجگاہ ساری دنیا، پوری انسانیت اور کل کائنات ہوتی ہے۔ ایسے شاعر اپنے ساتھ ہمیشہ زندہ رہنے والی زندگیاں لے کر آتے ہیں، اور انھیں اپنی لافانی قدروں کا ادراک بھی ہوتا ہے‘‘(۱۴)

رشید قیصرانی کے اس دعوے کی تصدیق میں قاسمی صاحب کے صرف یہ دو شعر ہی کافی ہیں کہ:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم کاش یہی ایک کام کر جاؤں

ندیم صاحب کی شاعری کی طرح ان کا افسانہ بھی انھیں اپنے عہد کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے حقائق کا مطالعہ معروضی اور سائنسی نقطۂ نظر سے کیا ہے، اور جزئیات نگاری کے لیے اس کی بہت اہمیت ہے۔ نتیجہ یہ کہ کردار نگاری، پلاٹ کی فنی بنت، اسلوب اور منظر نگاری کی سطح پر دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انکی شاعرانہ صلاحیتیں بہت خوبی سے استعمال ہوئی ہیں، جن سے پیدا ہونے والا رومانوی طرز اظہار بھی انھیں انفرادیت عطا کرتا ہے۔ قاسمی صاحب پنجابی دیہات کی منظر کشی اور اس کی ریتوں، روایتوں کا اظہار جس خوبصورتی اور چابکدستی سے کرتے ہیں، یہ بھی انھیں انفرادیت عطا کرتا ہے۔

قاسمی صاحب کا ایک اور امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر تحریروں میں حریت فکر کے داعی رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ایک فعال اور سرکردہ رہنما کی حیثیت سے انھوں نے ہمیشہ آزادی اظہار اور حق گوئی ہی کو آدرش بنائے رکھا۔ ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی آمریت کے ہاتھوں دبنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے لکھا تھا:

> ”ہم اہل قلم حق گوئی سے کبھی باز نہیں آسکتے۔ اور ہم اظہار پر عائد ہر پابندی کو بے خوفی سے توڑ دیں گے۔ گھروں میں گھس بیٹھنے سے حکومتوں کی دست درازیوں کے راز فاش نہیں کیے جاسکتے۔“(۱۵)

ضیاالحق کے دور میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ:

> ”ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ ہم صرف اپنی مملکت اور اہل مملکت کے ترجمان ہیں۔ ہم کسی حکومت کی مخالفت محض اس

لیے نہیں کرتے کہ وہ حکومت ہے۔ اگر کوئی حکومت اس مملکت کے کروڑوں عوام کو کچھ سہولت، کچھ سکون مہیا کرے گی تو ہم اس کی داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔ ادب اور بخل کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ البتہ کوئی حکومت جب بھی غلطی کرے گی ہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ٹوکیں گے۔ کیوں کہ مملکت کی قوت اور حشمت میں آزادیِ رائے ہی سے اضافہ ہوگا“(۱۶)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، خراجِ تحسین، معاصر اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۷
۲۔ مشاہیر ادب کے تاثرات، معاصر، لاہور، معاصر اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۸۲۲
۳۔ ایضاً　۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً　۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً　۸۔ ایضاً
۹۔ ایضاً
۱۰۔ عطاالحق قاسمی، اداریہ، معاصر لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
۱۱۔ انوار احمد (ڈاکٹر) احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری یا خود نوشت کے اوراق، معاصر ص ۹۸
۱۲۔ بحوالہ احمد ندیم قاسمی اور ادب برائے مقصدیت، از خورشید بیگ میلسوی، لاہور، معاصر اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۴۲۲
۱۳۔ مشاہیر ادب کے تاثرات، معاصر، لاہور، معاصر اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۸۲۲
۱۴۔ رشید قیصرانی، ہمیشہ زندہ رہنے والا شاعر (مضمون) مطبوعہ معاصر لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۸۷
۱۵۔ سلیم اختر ڈاکٹر، حریت فکر کا داعی، احمد ندیم قاسمی، معاصر، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۶
۱۶۔ ایضاً

☆☆☆☆

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

پہلا خط

محترم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب!

السلام علیکم!

مزاج بخیر! ابھی آپ کو اس نئی دنیا میں آئے تھوڑا عرصہ گزرا ہے، اس لیے اس میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش میں ہوں گے۔ یہاں تو ابھی آپکو علم نہیں ہوگا کہ علامہ محمد اقبال کا گھر کس طرف ہے یا پھر چراغ حسن حسرت کہاں رہتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے آپ مولانا ظفر علی خان کی تلاش میں ہوں کہ مل جل کر کوئی اخبار یا رسالہ نکال لیتے ہیں۔ آپ کو اپنے پرانے دوستوں کی رہائش کے بارے میں تجسس رہتا ہوگا۔

اس نئی دنیا میں تو آفسٹ پریس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی۔ ادھر آپ اپنی کہانی، افسانہ یا شعر کسی فرشتے کو ڈکٹیٹ کروا دیتے ہوں گے تو خواہش کے مطابق اچھے سے اچھے کاغذ پر چھپ کر سامنے آ جاتا ہوگا اور یوں حکومت سے اخباری کاغذ کا کوٹہ لینے کا جھنجھٹ بھی نہیں ہوگا۔ لگتا یوں ہے کہ اس نئی دنیا سے عنقریب ‘‘فنون’’ کا پہلا شمارہ آنے والا ہوگا۔ یوں اس نئی دنیا میں ادیب شاعر پھر سے اکٹھے ہو جائیں گے۔ اکٹھے کا مطلب دنیا میں تو یہی ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر اکٹھے ہو جاتے ہیں، چاہے ذہنی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوں۔ تاہم ہمیں یقین ہے کہ اب حساب کتاب کے بعد ان کا یہ ‘‘ڈنگ’’ نکل چکا ہوگا اور وہ شیر و شکر ہوں گے اور اس شیر و شکر ہونے کو ٹیسٹ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر شعرا کی غزلیں بے ترتیبی سے بھی لگ جائیں، مقام ذرا آگے پیچھے بھی ہو جائے اور کوئی اعتراض نہ ہو تو سمجھ لیں Acid fast test یعنی پکا پکا ثبوت ہے کہ اب ان کے دل واقعی ولایتی شیشے کی طرح صاف ہو گئے ہیں۔

آپ کے اس جہان پر پردہ کرنے کے بعد ہم سب لوگ آپ کی کمی بہت زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ عطا الحق قاسمی بہت افسردہ ہیں۔ پہلے جب پاکستان ٹیلی ویژن پر قاسمی کہانی چلتی تھی تو وہ لوگوں سے غلط فہمی میں ہی سہی ہنس ہنس مبارکبادیں وصول کرتے تھے (اور آپ نے بھی انھیں ہنس کر اجازت دی تھی کہ وہ بے شک ایسا

کرتے رہیں .... یہ آپ کا بڑا پن تھا جس کا عطاالحق قاسمی اکثر ذکر کیا کرتے تھے) اب کوئی مبارک دے گا تو وہ یقیناً آپ کو یاد کر کے اداس ہو جائیں گے۔ امجد اسلام امجد کا حال بھی ان سے مختلف نہیں، وہ بھی آپ کی سرپرستی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ بل کہ یاد آیا پروین شاکر بھی تو وہیں اس نئے جہاں میں ہوں گی۔ وہ تو اس جہان میں بھی بہت آپ کی تابع فرمان تھیں۔ اب تو نئے فنون کے پہلے شمارے میں ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں چھپیں گی مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہم تک کیسے پہنچیں گی۔ اگر ان کے لیے یہ جہان چھوڑنا ضروری ہے تو فی الحال ایسا کرنے کا نہیں ہے، کیوں کہ ابھی ہمیں یہاں بہت سے کام کرنے ہیں۔ ابھی جبران اور سارہ نے میڈیکل کالجوں میں داخلہ لینا ہے اور ملائیکہ بیٹی تو محض ڈھائی سال کی ہے سو فی الحال ہم تصور ہی تصور میں فنون کا اس جہان کا نیا شمارہ دیکھ لیں گے۔ یہاں نجیب احمد اور خالد احمد بھی ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں اور یقیناً منصورہ اور پھر ناہید قاسمی بھی ایسا ہی چاہے گی۔

'ہاں یاد آیا وہاں اشفاق احمد ملیں تو ہمارا اسلام کہیے گا' ہم ان کی رخصتی کے بعد اب سرائے گئے تھے مگر بانو آپا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خاص طور پر اشفاق احمد جب پی ایم اے فیصل آباد کی سالانہ کانفرنس میں تشریف لاتے تھے تو خوب ملاقات رہتی تھی۔ ممتاز مفتی جی بھی تو وہیں قریب ہی ہوں گے کیوں کہ یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے ملے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ممتاز مفتی صاحب سے تو ابدال بیلا نے ہمارا تعارف کروایا تھا اور جاتے جاتے ہم نے ان سے مل لیا تھا۔

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب! آپ کو یاد کرنے کے تو ہمارے پاس کئی بہانے ہیں، جتنا طویل عرصہ آپ نے ادب کی خدمت کی، شاید ہی کسی کو اتنا موقع ملا ہو۔ ہمیں یاد ہے کہ ڈاکٹر اور پھر سپیشلسٹ سرجن بننے کے بعد جب ہم واپس جھنگ آئے اور اپنی یادداشتوں پر مبنی پہلی کتاب ''انوکھا لاڈلا'' کا مسودہ بغیر کسی سفارش کے آپ کو بھیجا تو آپ نے خصوصی شفقت فرماتے ہوئے لکھا تھا:

> ''ان صفحات کے مطالعے کے بعد میں اردو ادب کے مزاح کے مستقبل کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہو گیا، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، ابن انشا، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، منو بھائی اور عطاالحق قاسمی کے دور میں اگر کچھ عرصہ قبل محمد کبیر خان نے اور ڈاکٹر نیاز علی محسن مگھیانہ نے اپنے اعلیٰ معیار کی مزاح نگاری کا لوہا منوا لیا ہے تو یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔''

ہم یقیناً آپ کی طرف سے اتنے حوصلہ افزا تاثرات ملنے پر پھولے نہیں سمائے تھے۔ لگتا ہے ہم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پھول گئے ہیں۔ کہ ادھر دور سے دبستان کے سربراہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ہماری حوصلہ افزائی کردی اور لکھا:

> ''معاشرے کے ناسوروں کو کاٹ پھینکنے کے عمل میں نیاز علی محسن مگھیانہ جس صفائی،
> برجستگی اور مہارت کو بروئے کار لائے ہیں، وہ قابل تعریف ہے''

یہ شاید پہلی بار ہوا تھا کہ ہم نے آپ دونوں ہستیوں کے تاثرات آمنے سامنے لگا دیے تھے کہ ہم آپ دونوں کا بہت احترام کرتے تھے اور ہیں۔ ہم اسی پھولی ہوئی کیفیت میں یہ بھی سوچنے لگے کہ ہم آپ دونوں کے درمیان پیدا ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے مگر تب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ محاورے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ کا کیا مطلب ہے؟

ہمیں آپ کی شفقت اور ستائش ابھی تک یاد ہے جب ہم نے بھی واہ کینٹ اور بعد میں اسلام آباد کے ایک گھریلو مشاعرے میں آپ اور احمد فراز کے سامنے اپنی غزل پڑھ ڈالی۔ تب واہ میں آپ کے کمرے میں ہی محترمہ منصورہ احمد نے اپنا مجموعہ کلام 'مطلوع'' عطا کیا تھا۔ پھر شبنم شکیل کی بیٹی کی شادی پر بھی آپ سے اور احمد فراز، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سلیم اختر، کشور ناہید، مشتاق احمد یوسفی، منشا یاد، افتخار عارف کی معیت میں آشیر باد لیا تھا۔

ادبی ماحول میں دبستان تو ہر دور میں رہے ہیں مگر فضا بہتر رہے تو بہتر ہوتا ہے۔ ادبی نوکشیں اچھی بات ہے مگر کہیں کج بحثی نہیں ہونی چاہیے۔ یہی محمود شام جی بھی ہمیں سبق دیتے رہتے ہیں۔ ایک بار ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بھی ہم پر مہربانی کی تھی اور ہمارے گھر جھنگ تشریف لائے تھے۔ چھوٹی سی مگر یادگار ادبی نشست بھی ہوئی تھی۔ ہمیں ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید صاحب سے تعلقات کا بھی کچھ مان تھا۔ سوچا کبھی آپ سب کو جھنگ آنے کی دعوت دیں گے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی جھنگ آمد کے بعد ہماری کوشش تھی کہ آپ بھی جھنگ تشریف لائیں اور پھر یوں ایک بڑی نشست کی راہ ہموار ہو۔ اس سلسلے میں صفدر سلیم سیال نے آپ سے لاہور میں ملاقات بھی کی تھی، تب ہم روٹری کلب جھنگ کے صدر تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ آپ جھنگ کے مشاعرے کی صدارت فرمائیں۔ مگر آپ کی صحت کی خرابی کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

بس یہ اللہ کو منظور نہیں تھا کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لا سکتے۔ بہر طور اس بات کی حسرت ہمیشہ دل میں

رہے گی کہ آپ جیسے شفیق انسان کی قربت میں کچھ لمحے گزار لیتے۔ آپ جو ہمیں دکھ سکھ میں یاد رکھتے تھے وہ مہربانیاں ہم کہاں بھول سکتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں جب ہمارے چھوٹے بھائی ڈاکٹر فیصل مگھیانہ کا کینسر کے باعث ماسکو میں انتقال ہوا تو آپ نے اپنے خط کے ذریعے جس طرح دلی صدمے کا اظہار کیا۔ اس سے ہمارے پورے خاندان کی ڈھارس بندھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ اپنے چاہنے والوں کے ذاتی دکھ سکھ کا بھی کتنا خیال رکھتے ہیں اور یہی عظیم انسان کی نشانی ہوتی ہے۔

محترم احمد ندیم قاسمی صاحب آپ بہت عرصہ تک ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے لیکن آپ نے اپنی اسلامی روایات کو بھی زندہ رکھا۔ یقیناً ترقی پسند ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انسان اسلام سے دور ہو جائے۔ بل کہ حقیقتاً تو اسلام سے زیادہ ترقی پسند مذہب ہی کوئی نہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اس کی اپنی وضاحت Interpertation کرتا ہے۔ آپ نے جو نعتیں لکھیں وہ آپ کی مغفرت کا وسیلہ بنیں گی۔ آپ اپنی شاعری، اپنی کہانیوں، اپنے کالموں اور فنون کی وجہ سے ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ آپ نے پاک وطن کی مٹی کے لیے جو دعا لکھی ہے وہ بھی ہر پاکستانی کے دل میں ایسی اتری ہے کہ آپ ہمیشہ یاد رہیں گے۔

لکھنے کو تو پہلے خط میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں لیکن پھر کبھی موقع ملا تو آئندہ خط میں ملاقات ہوگی۔ اس نئی دنیا کے باسیوں کو میرا اسلام عرض کریں۔ انھیں بتائیں کہ ہم دعا کرتے ہیں کہ دنیاوی حساب کتاب کا معاملہ آسانی سے طے ہو جائے اور آپ سب سکھی رہیں۔

خیر اندیش

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

ندیم کا تنقیدی شعور

کسی بھی ادبی فن پارے کی خوبیوں کو سراہنا اور خامیوں کی طرف اشارہ کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ تنقید اصل میں فلسفے کی ایک شاخ جمالیات سے تعلق رکھتی ہے۔ جمالیاتی ذوق ہی کسی چیز کی خامیوں اور خوبیوں کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم اصطلاحی طور پر جمالیاتی ذوق اور فنی ذوق کو آمیز کر کے ادب کی تنقید کا کام لیا جاتا ہے۔ محض جمالیاتی ذوق میں بہت سے عوامل پوشیدہ رہتے ہیں کیوں کہ زندگی میں بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں، جن سے ذوقِ جمال رکھنے والے افراد گریز کرتے ہیں مثلاً عریانی، گندگی، بداخلاقی اور بے غیرتی وغیرہ جمالیات کے فلسفہ میں جگہ نہیں پا سکتیں۔ ہمارے اکثر نقاد صرف ذوقِ جمال کے تحت تنقید کا فرض ادا کرتے ہیں جب کہ اکثر دیگر کو ایک طرف رکھتے ہوئے سراسر تنقید برائے تنقید کے نظریے پر عمل کرتے ہیں۔ تنقید کے ان دونوں طریقوں سے حقیقی نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

احمد ندیم قاسمی ایک ایسے نقاد ہیں جنھوں نے دونوں طریقوں کو یک جا کرتے ہوئے حقیقی شعورِ تنقید کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے فنون اور جمالیات دونوں کو تنقیدی عمل میں اہم قرار دیا۔ وہ تنقید کو تخلیق و تفریح سے علیحدہ چیز سمجھتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ادب پارے کو پرکھنے کے لیے عقل مندانہ طور پر سوال و جواب کیے جاتے ہیں۔ نقاد خود سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کا جواب ادب پارے میں تلاش کر کے اسے مناسب یا غیر مناسب قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تنقیدی اصول جامد و ساکت نہیں ہو سکتے۔ گزرتے وقت کے تقاضے ان اصولوں میں رد و بدل کا سبب بنتے ہیں اور یہ رد و بدل ضروری بھی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے خیال میں تنقید نگاری ہر قسم کے تعصب اور انتقامی جذبے سے ماورا ہونی چاہیے۔ وہ اس رویے کو تنقید نگاری کی بجائے بیماری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تنقیدی رویے تعصب اور انتقام کی بنیاد پر استوار ہوں تو ایک خطرناک رجحان کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں اپنی کتاب ‘‘معنی کی تلاش میں’ حرف کی حرمت کی پاسداری میں رہنے والے اور کسی مصلحت، خوف یا لالچ سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے والے اہل قلم کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اور اپنے ادبی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''تنقید انتقامی جذبے کے تحت یا نفرت کے احساس کے ساتھ لکھی جائے تو تنقید نہیں
> رہتی تنقیص بن جاتی ہے۔ ''

ان کی تحریروں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ادب، معاشرے یا حکومت میں انہیں اگر کوئی بھی چیز کھٹکتی محسوس ہوئی تو وہ احتیاط اور اعتدال کے تحت لگی لپٹی رکھے بغیر صاف طور پر اس خامی کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیے۔

احمد ندیم قاسمی تنقید کے اس رویے پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں جس میں ذاتی تعلقات اور شخصی خوبیوں یا خامیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اس روش کو تنقیدی اصولوں کے تحت خلاف سمجھتے ہیں کیوں کہ اس سے شاعر یا نثر نگار کے فکر و فن کو قارئین سے مخفی رکھا جاتا ہے۔ قاسمی یہ سمجھتے ہیں کہ آج کل جو تنقید کی جا رہی ہے وہ محض لکیر کے فقیر ہونے والی روش کا نام ہے۔ قاسمی اگرچہ خود کو باقاعدہ نقاد نہیں سمجھتے۔ ان کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ انھیں اولاً شاعر اور بعد افسانہ نگار سمجھا جائے۔ اپنے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب میں اس امر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

> ''مجھے باقاعدہ تنقید نگار ہونے کا دعویٰ نہیں، ان مضامین کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے مفید
> رہے گا کہ یہ ایک ایسے تخلیقی فنکار کے تاثرات ہیں جس کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے
> وطن اور قوم سے محبت نہیں کر سکتا وہ کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا، اسے حسن و خیر اور
> عدل و توازن کا شعور ہی حاصل نہیں ہوتا۔ ''

گویا ان کی تنقید محبت کا درس ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس سے محبت کے فروغ کا کام لیا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک سب سے افضل محبت وطن اور قوم سے محبت ہے لہٰذا وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تنقید سے بھی یہی کام لیا جائے۔ اس سے دشمنی تعصب اور منافرت پھیلانے کی بجائے محبت اور خلوص کے جذبے پروان چڑھائے جائیں۔

احمد ندیم قاسمی کے تنقیدی مضامین پر مشتمل چھ کتابیں ہیں۔ جن میں ''ادب اور تعلیم کے رشتے''، ''پسِ الفاظ''، ''تہذیب و فن''، ''ثقافت کیا ہے''، ''علامہ محمد اقبال'' اور ''معنی کی تلاش'' شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے تحریر کردہ سینکڑوں مضامین ایسے بھی ہیں جو تا حال کتابی شکل میں شائع ہونا باقی ہیں۔ ان تمام مضامین میں علم و فکر، مطالعہ محنت لگن، سنجیدگی اور توازن قابلِ قدر حد تک موجود ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شروع سے آخر تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور وفاداری میں استواری رکھی مگر انھوں نے ترقی پسند

تحریک کے نظریات سے وابستہ نظریاتی تنقید نگاری کے اصولوں کو مکمل طور پر اپنانے سے بہر حال گریز کیا۔

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ضرور تھے مگر تنقید برائے حوصلہ شکنی کے قائل ہرگز نہیں تھے۔ اس نظریے کا ثبوت ان کے سینکڑوں دیباچوں میں ملتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب جب ان کے پاس اپنی شعری یا نثری تصنیف پر رائے لکھوانے آتا اسے کبھی بھی ناکام نہ لوٹاتے، اسے ایسے جملے لکھ کر دیتے جن سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی، اس حوالے سے ان کا نظریہ یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں کی اگر حوصلہ شکنی کی گئی تو ان میں بڑے ادیب اور شاعر نظر نہیں آئیں گے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کسی فن پارے میں وہ غلطیوں اور خامیوں کی الگ سے نشاندہی بھی کر دیتے تھے۔ جس طرح ندیم کے افسانوں میں گہرا سماجی شعور پایا جاتا ہے اسی طرح ان کے تنقیدی اندازِ نظر میں بھی سماجیات اور سماجی رویے پائے جاتے ہیں۔ وہ اس صنفِ ادب کو بھی سماج سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی ادب کو سماج کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

قاسمی کی نگاہ دوررس، بیک وقت معاشرہ، تہذیب، سیاست اور مذہب پر ہے۔ وہ جمالیات اور فنون دونوں پہلوؤں سے ادب اور دیگر تمام شعبوں کی اقدار کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ اپنے عہد کے ادبی مسائل سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کا تنقیدی لب ولہجہ، احساس عزت، خودمختاری، خوش فکری، دیانت داری، کشادہ نظری اور بے باکی کی عکاس ہے۔ قاسمی کی تنقیدی تحریریں مایوسی اور بے بسی کے اثرات سے پاک ہیں اور قارئین کو ادبی مسرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں عصری شعور کی فراوانی ہے اور اس صنف کے باعث وہ اپنے قارئین کی بصیرت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ناقدانہ تحریروں کے ذریعے روشن خیالی، وطن دوستی، علم پرستی، اعلیٰ اقدار، آدمیت سے وابستگی اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگی کا درس دیتے ہیں وہ ابلاغ اور تفہیم کی سہولت کے پیشِ نظر اور موقع کی مناسبت سے ضرورت کے مطابق ہندی اور انگریزی لفظیات کا استعمال بھی جائز سمجھتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے عملی تنقید کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نظریے کو قاسمی بھی قابلِ عمل سمجھتے ہوئے اپنی ناقدانہ تحریروں میں استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم قاسمی کی تنقید چوں کہ مجموعی طور پر جمالیاتی اور فنی دونوں فلسفوں سے وجود میں آتی ہے لہٰذا وہ ادبی مباحث کے نظریاتی زاویوں سے حالی کے مکمل پیروکار نہیں سمجھے جاسکتے۔

وہ تنقید کو ایک ادبی صنف کے طور پر برتنے میں کمال رکھتے ہیں۔ تخلیقی فن پاروں کے باطنی گوشوں کی

تفہیم اور پھر ان کے سماجی شعورانہ ادراک کی باز آفرینی ان کے گہرے اور خالص دردمندانہ ادبی مزاج کی ترجمانی کا احساس دلاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا خلافِ صداقت نہیں لگتا کہ ان کی ناقدانہ تحریریں اپنی جگہ پر ادبی فن پارے کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کی کسی بھی تحریر سے کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے تحریر کردہ جملے سادگی کا وصف رکھنے کے باوجود معنوی حسن سے مالا مال ہوتے ہیں اور ان میں باقاعدہ ایک تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ علمی و ادبی پس منظر کو حوالہ بنانے والے اور دلائل سے سجائے جانے والے مضامین عام طور پر بہت خشک اور دلچسپی سے عاری ہوتے ہیں لیکن قاسمی کے ہاں عموماً اس نوع کے مضامین میں بھی ادبی چاشنی اور تازگی کا احساس ملتا ہے۔ اس مقام پر آتے آتے وہ اردو ادب کے عام نقادوں سے بڑی حد تک مختلف ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک استاد کی طرح سمجھانے کے انداز میں بات کرتے ہیں۔ بات اگرچہ دوٹوک ہوتی ہے مگر ڈنڈے کی طرح سر میں نہیں لگتی بل کہ ان کا مخلصانہ اور محبت بھرا انداز دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ چوں کہ بہت گہرا اور وسیع ہے اس لیے ان کی ناقدانہ تحریریں معلومات افزا اور تمام فنی خرابیوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔

ان کی ادارات میں ایک طویل زمانی مدت تک معیاری ادبی فن پاروں کی علامت سمجھے جانے والے تاریخ ساز ادبی جریدے فنون میں شامل اداریوں کی اپنی علمی و ادبی حیثیت ہے، جو تعداد اور معیار ہر دو کے اعتبار سے خصوصی تذکرے کے متقاضی ہیں۔ ان اداریوں میں ادبی اداریہ نویسی کے جو متنوع امکانات ابھرتے ہیں انہیں بجا طور پر جدید اداریہ نویسی کی ادبی روایت کا سنگ میل قرار دیا جانا چاہئے۔ ان اداریوں میں انھوں نے جہاں عصری تہذیبی زندگی کو تخلیقی تناظر میں دیکھتے ہوئے عہد بہ عہد تشکیل پانے والی شعری و نثری رجحانات اور میلانات پر ناقدانہ نگاہ کی ہے وہاں ارضی حقائق کی سماجی و سیاسی کیفیات کی ترجمانی میں فرد اور معاشرے کی داخلی اور لحہ بہ لحہ بولتی بگڑتی صورتوں کو بھی مصور کیا ہے۔

مختلف اداریوں کے موضوعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے جو خاص عنوانات درج کیے ہیں ان میں ان کے منجھے ہوئے تخلیقی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ معاصر مسائل اور زبان و ادب کے فکری و فنی مباحث کے بیان میں ان کے تحریر کردہ یہ معنی خیز اظہاریے ادب کے تازہ جہان کی خبر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ تنقیدی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے دیباچہ نویسی کے ضمن میں بھی ان کا تجزیاتی مطالعہ خرد افروزی کی ایک بلیغ مثال بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وہ مصنف، زیر بحث موضوعِ تصنیف، اس کی ادبی اہمیت یا فکری و فنی انفرادیت کو محض چند سطور میں یوں سمیٹ لیتے ہیں کہ گویا کوزے میں دریا سمٹ آیا ہے۔

متنوع موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید ادبی تحریکات اور علمی بحثوں کے بین السطور میں ہمیں کہیں بھی ان کا زاویہ نظر ایک سخت گیر نقاد کی صورت میں ابھرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ مزاجاً رجائیت پسندانہ اندازِ نظر کے قائل تھے لہٰذا ان کی تحریروں میں ایک ہمدردانہ مبصر کا سا تاثر ہی اپنی تنقیدی روش کا روپ اختیار کرتا، حوصلے بڑھاتا اور پذیرائی کے پھول نچھاور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی پہچان ایک شاعر اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے چاہتے تھے اور ادبی تاریخ میں یہی دوان کے مقام و مرتبے کے تعین کا امتیازی نشان بن کر ابھری ہیں۔ تاہم شعر اور نثر ہر دو اصناف کے حوالے سے ان کی تجزیاتی دوربینی کے متنوع اوصاف انہیں معاصر ادبی روایت میں، ایک متوازن ناقد کا درجہ بھی عطا کرتے ہیں۔ ایک ایسا ناقد جو اپنے اس شعر کی عملی تصویر بن کر آج بھی ہمارے دلوں پر راج کر رہا ہے۔

دروغ مصلحت آمیز جب عروج پہ ہو
تو آس پاس کہیں چیختی ہے سچائی

☆☆☆☆

سلمیٰ افتخار احمد

لانجائنس (Longinus) اور ندیم

لانجائنس مغربی نقادوں کے اس سلسلے کی کڑی ہے جس کا آغاز افلاطون سے اور اختتام ایلیٹ یا اس کے بعد کے تنقید نگاروں پر ہوتا ہے۔ تنقیدی مورخ لانجائنس کی کتاب "On the Sublime" سے بلند مقام صرف ارسطو کی کتاب "Poetics" ہی کو دیتا ہے۔ لانجائنس کا زمانہ ارسطو سے تقریباً دو صدی بعد کا زمانہ ہے۔ لانجائنس کے نام پر مورخین کو اختلاف ہے لیکن "On the Sublime" کو لانجائنس ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ادب کے معیار اور اس کی تعیینِ قدر پر مکالمہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ خط کے انداز میں لکھی گئی اس کتاب میں تقریباً پچاس بڑے مصنفین کی تحریروں کے حوالے ہیں جن کے ذریعے مصنف نے اچھی یا بری تحریر کا فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لفظ "Sublime" کے کئی ترجمے کیے گئے ہیں۔ یونانی زبان میں لکھی کتاب میں استعمال کیا گیا اصل لفظ "hypsos" ہے لہٰذا ممکن ہے کہ Sublime بھی اصل لفظ کی پوری طور پر تشریح نہ کرتا ہو۔ لانجائنس نے اپنی تحریر میں "Sublime (hypsos)" کو "روح کی شفافیت کا پرتو" کہا ہے۔

اردو میں Sublime کے لغوی معنی ہیں رفیع تر، پاکیزہ تر، برتر، لطیف تر، تہذیب میں گندھا ہوا، کسی چیز کا جوہر۔ Sublimation کے معنی ہیں تصعید، تہذیب، ارتقا۔ "Sublime" سے لانجائنس کی مراد ایسا اسلوب تھا جو تحریر کو عام سطح سے بلند کر کے اسے رفعت اور پاکیزگی عطا کرے۔ لانجائنس تحریر کی خوبیوں میں ترفع کا حامی ہے اور سادگی کو تحریر کا حسن سمجھتا ہے۔ اپنی کتاب میں لانجائنس اس ترفع یا پاکیزگی کے حصول کے لیے پانچ بنیادی اجزا کی نشاندہی کرتا ہے:

۱۔ خیال کی عظمت
۲۔ جذبے کی طاقت اور استحکام
۳۔ خیال کو متشکل کرنے کے تمام صنائع معنوی جن میں تشبیہ، استعارہ، تمثیل، کنایہ، منطق، حتیٰ کہ شاعری بھی شامل ہیں۔
۴۔ الفاظ کا عمدہ اور نفیس انتخاب
۵۔ لفظ کی تحریم کرتے ہوئے جملوں کی وجیہہ اور باوقار تشکیل

لانجائنس کے خیال میں ایک Sublime تحریر قاری کو قائل کرنے کی کوشش نہیں کرتی بل کہ اس کے ذہن کو رطب و یابس سے بلند کر کے ایک وجد کی سی کیفیت میں لے جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک Sublime خیال کی عظمت لکھنے والے کی عظیم روحانی کیفیت یا تجربے کا پرتو ہوتی ہے۔ نتیجتاً ایسی تحریر کو پڑھنے والا خود بھی اسی کیفیت یا تجربے سے گزرتا ہے۔ ایسی کیفیت کی تعریف کرتے ہوئے لانجائنس مصنف کی شخصیت کے غیر فانی عنصر کی نشوونما کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی ایسی تحریر کے لکھنے والے کی ظاہری شخصیت کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی باطنی شخصیت بھی ایک ایسی خاص قسم کی نشوونما سے گزرتی ہے جو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتی۔ یہ نشوونما اس کی باطنی شخصیت کو ایک برتر سطح عطا کرتی ہے۔ لہٰذا اس کی تحریر قاری کی باطنی شخصیت کو بھی اسی سطح تک بلند کرنے کا سبب بنتی ہے۔ یہاں لانجائنس کے خیالات سقراط اور افلاطون سے متاثر نظر آتے ہیں۔

لانجائنس کی تحریر نے جمالیات کے موجود نظام میں ایک بالکل جدید اور تر و تازہ تصور پیش کیا۔ لانجائنس کا Sublime کا تصور اپنے اندر عمدگی، شرف، نفاست، اعلیٰ ظرفی، جلال، شکوہ، وقار، تمکین اور عظمتِ نفس کی تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ Sublime تہذیبی اقدار کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتا ہے کیوں کہ تہذیب، وقت اور تاریخ کی چھلنی سے کشید کردہ اقدار کی پاسبان ہوتی ہے۔ لانجائنس کا کہنا ہے کہ الفاظ کی ماہرانہ، منظم، موزوں اور رواں ترتیب سماعت یا بصارت سے نہیں بل کہ براہ راست ذہن کے نہاں خانوں سے مخاطب ہوتی ہے اور بات کہنے والے کے احساس کو سیدھا قاری کے دل میں منتقل کر دیتی ہے۔ لانجائنس کی ادبی تنقید نے انیسویں اور بیسویں صدی تک کے تنقید نگاروں کے خیالات کو متاثر کیا ہے۔ میتھیو آرنلڈ "The Study of Poetry" میں اعلیٰ شاعری کے خصائص پر بات کرتے ہوئے انھیں لانجائنس کے بیان کردہ معیار پر پرکھتا نظر آتا ہے۔

لانجائنس یورپی نقادوں کے اس سلسلہ کی کڑی ہے جس کی تنقید شاعری کے حوالے سے ہے، چوں کہ یونان میں فکشن منظوم داستانوں یا ڈراموں کی شکل میں مروج تھا۔ اگرچہ ان نقادوں کے پیش کردہ بیشتر اصول فکشن کی تمام اصناف پر لاگو ہوتے ہیں۔ جن مغربی نقادوں نے شارٹ سٹوری، ناول وغیرہ پر تنقید لکھی، ممکن ہے انہوں نے اپنے بنیادی تصورات انہی نقادوں سے لیے ہوں لیکن ان کی تنقید زیادہ تر شارٹ سٹوری یا ناول کے مخصوص فن کا احاطہ کرتی ہے جو اعلیٰ ادب کے حوالے سے لانجائنس کے پیش کردہ پانچ بنیادی اجزا میں سے آخری تین اجزا پر مشتمل ہے اور جس کا تعلق خیال یا مواد سے نہیں، محض اسے پیش کرنے کے طریقۂ کار سے

ہے۔ جب ہمارے نقادوں نے اس مغربی تنقید سے استفادہ کیا تو ان کا فوکس بھی افسانے یا ناول میں مواد کی بجائے اسے پیش کرنے کی تکنیک پر زیادہ رہا۔ اس کے برعکس لانجائنس نے "On the Sublime" میں Sublime کے پانچ بنیادی اجزا میں سے شروع کے دو اجزا کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کی تنقید کے اعتبار سے اعلیٰ ادب پارے کی پہچان کا پہلا زینہ خیال کی عظمت ہے اور دوسرا جذبے کی طاقت اور استحکام۔ یہ دونوں اس کے خیال میں لکھنے والے کی روح کی شفافیت کا پرتو ہیں۔ یہ شفافیت اسے ابتداء ہی سے ودیعت ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک Sublime تحریر کا مطالعہ اس شفافیت کی پرورش کرے۔ لانجائنس پر تنقید کرنے والوں کا کہنا ہے کہ خیال کی عظمت پر اصرار تحریر کو حقیقت سے دور لے جاتا ہے۔ حالاں کہ آرٹ کی فہم رکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی بھی فن پارے کا حسن محض اس کی ظاہری خوبصورتی کا مرہون منت نہیں ہو سکتا۔ اس کے اندر کوئی ایسا معنیاتی نظام موجود ہوتا ہے جو ہمارے ذہن کے خلیوں کو انگیخت کرتا ہے اور ہم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لانجائنس کے خیال میں تحریر کی Sublimity کے زیر اثر تینوں کردار یعنی مصنف تحریر اور قاری ایک دوسرے کے لیے ترفع کا باعث بنتے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لانجائنس کا پیش کردہ تصورِ جمالیات احمد ندیم قاسمی کے معنیاتی نظام سے کیسے مماثلت رکھتا ہے۔

محمد حمید شاہد نے اپنی کتاب ”اردو فکشن، نئے مباحث“ میں فیض احمد فیض کا ایک جملہ quote کیا ہے ”موضوع بغیر خوبیِ اظہار کے ناقص اور اظہار بغیر خوبیِ موضوع کے بے معنی ہے“۔ فیض نے یہاں خوبیِ موضوع کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے۔ یقیناً دوسروں کو بھی اس کی اہمیت کا ادراک ہوگا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ خوبیِ اظہار کو جانچنے کے پیمانے تو وافر مقدار میں موجود ہیں۔ خوبیِ موضوع کو جانچنے کے پیمانوں کی تشکیل کی طرف شاید توجہ ہی نہیں کی گئی۔ وارث علوی نے افسانے کے مطالعے کے لیے چند پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

> ” کہانی، پلاٹ، کردار، تمثیل، علامات، اساطیر، تکنیک، تفہیم، امیج، استعارہ، مرقع، تصویر گری، منظر نگاری، مقام، ماحول، فضا، قدرتی اور تہذیبی پس منظر، موزونیت، آہنگ، تضاد، تصادم، معروضیت، ڈرامائیت، لب ولہجہ، اسلوب، بیانیہ، لسانی ساخت، نقطۂ نظر، جمالیاتی فاصلہ، طنز، ظرافت،، المیہ، طربیہ، نفسیاتی فلسفیانہ سماجی اخلاقی ڈائی مینشن اور پھر موضوعات کے ان گنت ذیلی مباحث اور نکات۔“

(افسانے کی تشریح: چند مسائل/ وارث علوی)

اگرچہ افسانے کی تکنیک یا ساخت کے اعتبار سے یہ نکات رہنمائی میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن غور کیجیے

کہ سارے کا سارا زور ان نکات پر ہے جو content کو پیش کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں، یعنی لانجائنس کے پیش کردہ آخری تین بنیادی اجزا پر۔ خیال کی عظمت (Great Thought) اور جذبے کی طاقت اور استحکام (Strong emotions) جن کو لانجائنس بنیادی اہمیت دیتا ہے، وہ یہاں کہیں نظر نہیں آتے۔ حالاں کہ یہ وہ اجزا ہیں جو مصنف کے باطنی احساس اور ذہنی کیفیت کو جذبے کی دانائی میں گوندھ کر ایک ایسے روحانی اجلال کو جنم دیتے ہیں جو باقی تین اجزائے ترکیبی کے ذریعے خوش نما اظہار میں ڈھل کر براہِ راست قاری کے دل و دماغ کو گرفت میں لیتا ہے اور اس کی ذہنی سطح کو اس رفعت کے تجربے سے گزارتا ہے جہاں مصنف خود موجود ہے۔ بظاہر وارث علوی کے پورے نظام میں اس خیال کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں جو کہانی کے ذریعے اپنا اظہار چاہتا ہے۔ محمد حمید شاہد، وارث علوی کے موضوعات کے بارے میں خود کہتے ہیں: ”افسانے کے مطالعے کے لیے جو نسخہ وارث علوی نے پیش کیا ہے، جب افسانے کی تعبیر کا معاملہ آتا ہے تو وہ خود بھی اس پر کامل یقین نہیں رکھ پاتا۔ کیوں کہ بقول اس کے تعبیر ایک خودسر، خود پسند، مغرور حسینہ ہے۔“ اگر ہماری تنقید شروع سے اس خودسر، خود پسند، مغرور حسینہ کو لانجائنس کی نظر سے دیکھتی تو شاید اس بارے میں اتنی بے بس اور لاعلم نہ ہوتی۔ لیکن ہم مصنف اور قاری کے درمیان رابطے کے اس وسیلے کو سمجھنے کی بجائے محض خوش نما لباس کی رنگینی اور حسن کی پرکھ میں لگے ہیں۔ جیسا کہ محمد حمید شاہد نے اپنے مضمون ”افسانے کی تنقید اور تعیینِ قدر کا مسئلہ“ میں لکھا ہے: ”نئے عصر کی تیز بوچھار میں بھیگتی ہوئی کہانی کو جانچنے والا جب تک یہ نہیں سمجھے گا کہ کسی بھی فن پارے میں جمالیاتی بُعد صرف اور صرف فاصلاتی بُعد نہیں ہوتا تو وہ فن کار کے باطن سے کشید ہو کر فن پارے کی روح ہو جانے والی اس مقناطیسیت کو گرفت میں نہ لے پائے گا جو اس تخلیق کا آہنگ بنا رہی ہوتی ہے۔ یاد رہے یہ آہنگ زبان کی سطح پر کام کر رہا ہوتا ہے اور اس کے باطن میں معنیاتی سطح پر بھی۔“ محمد حمید شاہد کی تحریر میں فنکار کے باطن سے کشید ہو کر فن پارے کی روح ہو جانے والی مقناطیسیت وہی Sublime ہے جسے لانجائنس "echo of a noble mind" کہتا ہے۔ لانجائنس کی تھیوری اور احمد ندیم قاسمی کے تحریری عمل میں نسبت کو سمجھنے کے لیے ہمیں احمد ندیم قاسمی کے افسانے کے معنیاتی نظام کو سمجھنا ہوگا۔ احمد ندیم قاسمی کا معنیاتی نظام دراصل وہ منفرد اور ممتاز جمالیاتی نظام ہے جس کے سوتے محبت کے ست رنگے جذبے میں گندھے، انسان دوستی کے لازوال وصف سے پھوٹتے ہیں اور جو اپنے اندر خیر، عالی ظرفی، نفاست، جلال، شکوہ، وقار، تمکین، پاکیزگی، لطافت، تہذیب اور عظمت نفس کی تمام صفات رکھتے ہوئے لانجائنس کے Sublime کے parameters پر پورا پورا اترتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں پر نظر ڈالیں تو پہلا دور وہ نظر آتا جب ان کے ہاں دوسرے مصنفین کے اثرات اور سیاسی مدوجزر کی آلودگی موجود تھی۔ یہ دور ‘‘چوپال’’: ‘‘بگولے’’، ‘‘سیلاب وگرداب’’، ‘‘آنچل’’، ‘‘درودیوار’’ اور ‘‘سناٹا’’ کے کچھ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس دور میں بھی بعض افسانے سیاسی پس منظر رکھنے کے باوجود احمد ندیم قاسمی کی مخصوص جمالیات اور فنی حسن سے مالامال ہیں۔ ایسے افسانوں میں ‘‘جب بادل اُمڈے’’، ‘‘کہانی لکھی جا رہی ہے’’ اور ‘‘مامتا’’ جیسے افسانے شامل ہیں جب کہ ‘‘پاؤں کا کانٹا’’، ‘‘چوری’’، ‘‘بڈھا’’ اور ‘‘خربوزہ’’ جیسے افسانے اپنے جذباتی وفور کے باعث، جو اس دور کے افسانوں کا خاصہ تھا، اس مقام تک نہیں پہنچ پاتے جہاں احمد ندیم قاسمی کے اگلے ادوار کے افسانے ایستادہ ہیں۔ سناٹا میں احمد ندیم قاسمی کی فنکارانہ مہارت تیزی سے اپنے عروج کی جانب سفر کر رہی ہے۔

دوسرے دور میں ‘‘بازارِ حیات’’، ‘‘برگِ حنا’’، ‘‘گھر سے گھر تک’’، ‘‘کپاس کا پھول’’، ‘‘نیلا پتھر’’ اور ‘‘کوہ پیما’’ کے افسانے شامل ہیں جہاں جمالیاتی پیکر پورے طور پر کھلتا، نکھرتا نظر آتا ہے۔ ‘‘کپاس کا پھول’’ کے بیشتر افسانے احمد ندیم قاسمی کے جمالیاتی نظام کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اجلال جو مصنف کو قدرت نے ودیعت کیا ہے، بالکل ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی اپنی جھلک دکھلا جاتا ہے۔ اس حوالے سے افسانہ ‘‘مسافر’’ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ننھا چرواہا جو ماں کے ہاتھ کے پراٹھے کی یاد میں گم ہے یک دم ہڑبڑا کر کہتا ہے ‘‘ٹگرنا رے کدھر بھاگ گئے’’۔ مسافر کی پکار سن کر اسے جھاڑی کی طرف لاتے ہوئے چرواہے کے بارے میں ایک چھوٹا سا فقرہ ہمارے پیر پکڑ لیتا ہے۔ ‘‘وہ کچھ دیکھ نہ سکا، اندھیرا تھا، اور پھر وہ ایک ننھا چرواہا تھا جس کے پاس دل کی دھڑکنوں کی اہمیت پر غور کرنے کا وقت نہ تھا’’۔ اس افسانے میں ایک رومانس ہے جو براہِ راست سامنے نہیں آتا اور جس کی جھلک مسافر کے کھائی میں گرنے کی خبر سن کر نمبردار کی بیٹی کے بے ہوش ہونے پر ہمیں نظر آتی ہے۔ ننھا چرواہا یہ معما نہیں سمجھ پاتا اور مسافر کی واپسی کا منتظر رہتا ہے۔ ہمیں ننھے چرواہے سے محبت ہو جاتی ہے، وہی محبت جو احمد ندیم قاسمی کو ننھے چرواہے سے ہے۔

میں ‘‘گنڈاسا’’ کو احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانوں میں شمار نہیں کرتی۔ غیرت کی ایک مخصوص تصریح پر مبنی اس افسانے میں ڈرامائیت ہے اور بنیادی کردار کی نفسیات کی مصوری بھی۔ لیکن مجھے اس میں کسی بڑی سوچ کی عکاسی نظر نہیں آتی۔ ‘‘پرمیشر سنگھ’’، ‘‘ست بھرائی’’، ‘‘وحشی’’، ‘‘گھر سے گھر تک’’، ‘‘سفارش’’، ‘‘پہاڑوں کی برف’’، ‘‘کپاس کا پھول’’، ‘‘لارنس آف تھلیبیا’’، ‘‘جوتا’’، ‘‘عالاں’’، ‘‘ایک یک لباس آدمی’’، ‘‘رئیس خانہ’’، ‘‘کونج’’، ‘‘الحمدللہ’’ اور ‘‘شعلۂ نیم خوردہ’’ احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانوں میں شامل ہیں۔

’’ست بھرائی‘‘ میں تمام غیر حقیقی جذبوں پر بالآخر محبت غالب آجاتی ہے۔

’’سنو‘‘ ایک رات عبداللہ نے بیوی کو پکارا۔

’’کیا ہے؟‘‘ نیکاں نے پوچھا۔

’’سوئی نہیں۔‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’اس کے اب تک کتنے خط آچکے ہیں۔‘‘

’’چار۔‘‘

’’تو ہم بھی اسے ایک خط نہ لکھ ڈالیں۔‘‘

’’کیسا خط؟‘‘

’’کہ ہم نے تم کو بخشا۔‘‘ (ست بھرائی)

مصنف کے ساتھ ساتھ قاری کے ذہن پر سے بھی سارا بوجھ اتر جاتا ہے اور وہ عبداللہ اور نیکاں کے ساتھ اس شاہراہ پر روانہ ہو جاتا ہے جو سیدھی تھلوں کو جاتی ہے۔ ’’بابا نور‘‘ میں بابا ابھی کھیت کے پرلے سرے تک پہنچا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ ’’لسی پیو گے بابا نور۔‘‘ بابا نور نے مڑ کر دیکھا اور گاؤں سے نکلنے کے بعد پہلی بار مسکرایا۔ ’’پی لوں گا بیٹا۔‘‘ پھر ذرا سا رک کر بولا ’’پر دیکھ ذرا جلدی سے لا دے۔ ڈاک خانے کا منشی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔ چلا نہ جائے۔‘‘ لڑکی نے گھاس کی لٹکتی ہوئی گٹھری کندھے سے اتار کر وہیں کھیت میں رکھی۔ پھر وہ دوڑ کر منڈیر پر اُگی ہوئی ایک بیری کے پاس آئی۔ تنے کی اوٹ میں پڑے ہوئے برتن کو خوب چھلکایا۔ ایلومینیم کا کٹورا بھرا اور لپک کر بابا نور کے پاس جا پہنچی۔ بابا نور نے ایک ہی سانس میں سارا کٹورا پی کر رومال سے ہونٹ صاف کیے اور بولا ’’تیرا نصیبہ اسی لسی کی طرح صاف ستھرا ہو بیٹا۔‘‘ قاری بھی لڑکی کو یہی دعا دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ ’’گھر سے گھر‘‘ تک میں نورالنساء اور عشرت خانم پہلی بار مصلحت سے نہیں مل کر دل سے گلے ملتی ہیں اور پڑھنے والے کا دل بھی بھید کھلنے کی ساری فکر سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ افسانہ ’’بین‘‘ کا ایک پیرا دیکھیے:

’’تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں۔ جیسے کوئی جھری، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر ہولے ہولے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں ...... مزار شریف ضرور کھلے

گا......دستِ مبارک ضرور نکلے گا......فیصلہ ضرور ہوگا......انصاف ضرور ہوگا۔ ......پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔"

معصوم لڑکی پر ہونے والے ظلم کی ساری اذیت سیدھی قاری کی رگوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ "ایک لباس آدمی" میں جب ندیم کہتے ہیں: "میں سوچ رہا تھا کہ اس اپنائیت اور محبت کی تمہید کے بعد کریم بخش مجھے وہ کام بتائے گا جس کے لیے اسے میرا اتنی شدت سے انتظار تھا۔ مگر وہ بولا "یہاں آدمی تو دن میں سیکڑوں ملتے ہیں صاحب جی، پر پیار سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے اس کھڑکی میں سے ہی دکھائی دیتی تھیں......اور آج کل کون کسی سے پیار کرتا ہے صاحب جی!" تو قاری پر پہلی بار انکشاف ہوتا ہے کہ دو اجنبی کسی اندرونی کشش کے تحت کیسے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ "کپاس کا پھول" میں مائی تاجو اپنی ساری عمر کی محنت سے کمایا کفن، جسے شاید وہ اپنے لیے نجات کا ذریعہ بھی سمجھتی ہے، راحتاں کے جسم پر ڈالتی ہے تو اس کی سفیدی سے سارا ماحول جگمگا اٹھتا ہے۔ "لارنس آف تھلیبیا" میں خدا بخش مسکرا کر دیکھتا ہے اور بولتا ہے "آ گئی شامت بے چارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔" خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ اس کا بولا ایک فقرہ ازلی زمین دار کی نہ بدل سکنے والی ذہنیت کا راز فاش کر دیتا ہے۔ "ماسی گل بانو" میں بھری چوپال کے قریب سے گزرتی ہوئی تاجو زور سے ہنسی تو ملک نورنگ خان کو میراثی کی ایک بچی کی یہ بے باکی بری لگی اس نے کڑک کر کہا: "اے تاجو لڑکی ہو کر مردوں کے سامنے مردوں کی طرح ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اور تاجو نے عجیب طرح سے معافی مانگی۔ وہ بولی "ملک جی! سرداریاں قائم! میری کیا حیثیت کہ میں ہنسوں۔ پیر دستگیر کی قسم! جب میں ہنستی ہوں تو میں نہیں ہنستی، میرے اندر کوئی چیز حرام زادی ہنستی ہے!" اس پر ملک نورنگ خان نے پہلے تو حیران ہو کر ادھر ادھر لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہنستے ہوئے کہا "بالکل بلھے شاہ کی کافی کہہ گئی میراثی کی لونڈیا۔" قاری بے اختیار بلھے شاہ کی کافی کی لذت میں گم ہو جاتا ہے۔ "عالاں" کا یہ پیرا دیکھیے:

"ٹھیک ہے میں نے سوچا۔ اچھی لڑکی ہے۔ پیاری بھی ہے۔ شوخ بھی۔ سب کچھ ہے لیکن آخر موچی کی لڑکی ہے اور خاندان کے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ بلندی پر کھڑے ہو کر گہرے کھڈ میں نہیں جھانکنا چاہیے۔ توازن بگڑ جاتا ہے اور آدمی گر جاتا ہے۔"

یہ دو فقرے ازلی طبقاتی المیے کی ساری کہانی کہہ جاتے ہیں۔

"پہاڑوں کی برف" کا تو ہر فقرہ ایک piece of art ہے۔

”بھکارن کے چہرے کی ایک رنجی جھلک نے مجھے افسانے سے ہٹا کر یونانی صمیات کی دنیا میں لا ڈالا تھا۔ وینس، سائیکی اور افروڈائیٹ ۔۔۔۔ ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ جو صرف ایک رخ سے میرے سامنے آیا تھا اور جتنی دیر میں 'سامنے' کا لفظ بولا جا سکتا تھا، غائب ہو گیا تھا۔۔۔“

”مگر جب دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔ آواز آئی 'بے تخی! خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے تیرا بچہ جیوے' اور میں نے سوچا کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟ عجیب بات ہے کہ نہ تو میں پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور نہ میں نے قلم کو قلم دان میں رکھا۔ میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا 'ارے آج تو پھر آ گئی۔۔۔“

”بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی، بھکارن کو بھیک سامنے آ کر مانگنی چاہیے۔ طوائفوں تک نے اپنے لیے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ بھکاریوں کو کم سے کم بھیک مانگنے کا سلیقہ تو آنا چاہیے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لیے یا گزشتہ آٹھ پہر کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے یوں ہی بے ارادہ میرے منہ سے نکلا۔ ”لے، لے جا۔“ ”لا“ وہ بولی۔ ”اللہ تجھے بہت دیوے تخی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے تخی۔“ ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آ گئی۔ میں اپنے حکم کی اتنی بھرپور تعمیل کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر میں اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی سے کود جاؤں گا“۔۔۔۔

”میں پھر کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا ”کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟“ وہ بولا ”آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب! کہ کوئی آتا اور میں آپ کو نہ بتاتا۔“

مزید کریدنے کے لیے مجھے کوئی دوسرا قرینے کا سوال نہ سوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔
”بس صبح ایک سبزی والا آیا تھا یا اخبار والا یا پھر ابھی ابھی وہ منگتی آئی تھی“ مجھے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا: ”کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب! کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟“ میں جواب دیے بغیر پلٹ آیا۔ ”تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی؟ وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔ کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں۔“

”تم اتنے دنوں کہاں تھی؟“ میں نے ڈانٹ کر پوچھا ”کیا تمھیں معلوم ہے کہ آج تم پورے ایک ہفتے کے بعد میرے پاس آئی ہو؟“ میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو کسی گلابی دوا کے حلقے میں تجی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار یا انتہائی غصے یا انتہائی ڈر کی حالت

میں پیدا ہوتی ہے۔"بولو کہاں تھیں تم؟" میں کڑ کا۔ "میں یہیں تھی بابو اور کہاں۔" وہ بچے کی طرح بولی۔ "تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟ میں نے اسی لہجے میں پوچھا اور وہ بولی "میں اٹھنی جو لے گئی تھی تجی۔ ایک آنہ اس دن کا۔ باقی سات آنے سات دنوں کے۔ آج آٹھواں دن تھا تو آ گئی۔" بھکارن کا چہرہ پھرکی کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ تڑاخ کر کے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے......وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس روپے کے جتنے نوٹ بھی رکھے تھے۔ اپنی مٹھی میں لے کر بھکارن کی طرف بڑھایا۔ اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیے اور چیخا۔"ان روپوں میں جتنے بھی آنے ہیں، اتنے دنوں سے اگر تم ایک دن پہلے بھی یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا دفع ہو جا۔"

اس افسانے کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے۔ یہ ایک پینٹنگ ہے دیکھیے اور لطف اٹھائیے۔

اب دیکھیے کہ ترفع کا عمل کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے جس کے بارے میں لانجائنس کہتا ہے کہ وہ قاری کو اٹھا کر کسی بلند تر سطح پر لے جاتا ہے۔ "سفارش" ہم سب کی کہانی ہے۔ مدد کے لیے بچھ جانے والے مجبور شخص سے وعدہ کر کے کام نہ کرنا اور پھر بے ایمانی سے شکریہ وصول کر لینا۔ یہ ایک منفی سوچ ہے۔ لیکن انسان اور جانور میں فرق صرف شعور کا ہے۔ اپنی 'منفیت" کے بارے میں ندیم کا دیا ہوا یہ شعور ہمارے اندر جو چبھن جگاتا ہے بس وہیں سے منفی کے مثبت ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ "رئیس خانہ" بھی ایک پینٹنگ ہے۔ سون سکیسر کی خوب صورت مریاں اور فضلو کی محبت کی، یوسف کی کمینگی کی، فضلو کی غربت اور معصومیت کی، مریاں کی وحشت کی پینٹنگ۔ یہ افسانہ کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ مریاں کو ہمیشہ کے لیے فضلو سے جدا کر کے افسانے کو امر کرنے کے بارے میں سوچتا۔ لیکن ندیم کے لیے افسانہ اہم نہیں۔ فضلو اور مریاں کی محبت اہم ہے۔ مریاں کے کردار میں جھلکنے والی عملی دانائی اہم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مریاں فضلو اور شیرو کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ "رئیس خانہ" مریاں کے واپس آنے کے باوجود امر ہو جاتا ہے۔ "گونج" میں گاؤں سے باہر آباد ہونے والی فیملی کی زندگی بھی ایک پینٹنگ ہے۔

"گاؤں کے چشمے تک براہ راست کوئی پگڈنڈی نہیں جاتی تھی اس لیے سب لوگ عمراں کے آنگن کے قریب سے گزر کر چشمے تک جاتے اور جب پلٹتے تو ان کے ہاں ٹھہرتے۔ بوڑھا گاؤں سے بہت سا تمبا کو خرید لایا۔ لوگوں کو کھاٹوں پر بٹھاتا۔ حقہ پلاتا۔ عمران اور محمد شاہ انھیں پنکھا جھلتے اور جب گاؤں والے اٹھتے تو راستے

میں کہتے ”بھئی یہ تو بڑے اللہ والے نکلے! انھیں گاؤں سے اتنی دور آباد ہوتا دیکھ کر ہم سب نے انھیں پاگل سمجھا، مگر ان کے دل کتنے صاف ہیں۔ ان کے بولوں میں کتنا رس ہے۔ سب کے سب کتنی خدمت کرتے ہیں ہماری! تمباکو، کھاٹیں، پنکھے! اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے لوگ بستے ہیں اور پھر بھی بارش نہیں ہوتی!“

پورا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ تمباکو، کھاٹیں، پنکھے، دنیا کی سب سے بڑی آسائشیں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ”شعلۂ نیم خوردہ“ میں مریاں اور نوجوان اپنی اپنی راہ جاتے ہوئے ملتے ہیں۔ کچھ دیر ساتھ چلتے ہیں۔ پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ دنوں کی متاع افسروں کے ہاتھوں لٹ جاتی ہے اور وہ اپنی منزلوں تک پہنچنے سے پہلے ہی واپس لوٹ کر دوبارہ ملتے ہیں لیکن زندگی صرف متاع کا لٹنا ہی نہیں۔ زندگی ان کا آپس میں ملنا، دکھ بانٹنا، انس بھری باتیں کرنا بھی ہے جو وہ شاید کبھی بھول نہ سکیں اور وہ شعلہ بھی جس نے نوجوان کی آنکھوں میں جنم لیا ہے۔ یہی احمد ندیم قاسمی کی جمالیات ہے۔ ہر لٹیرے اور ظالم کے ساتھ لٹنے والے یا مظلوم کی سادگی، بھولپن، معصومیت، نیکی، اچھائی اور ننھی ننھی خوشیوں کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کہیں بھی صرف دکھ اور اذیت نہیں نظر آتی۔ لانجائنس کے نزدیک اعلیٰ ادب کو جانچنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ کتنی جلدی قاری کی یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے۔ ندیم کے یہ افسانے نہ بھولنے والے افسانے ہیں جو مصنف کے تجربے کو ہمیشہ کے لیے قاری کا اپنا تجربہ بنا دیتے ہیں۔ ندیم کی انسان دوستی ہر منظر میں رس گھول دیتی ہے۔ زندگی کا ایک عام منظر بامعنی منظر بن کر ہمیشہ کے لیے یادداشت کے پردے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

ہم ہمیشہ سے سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی نے دیہات کے مناظر کی تصویر کشی کی چوں کہ ان کا تعلق دیہات سے تھا اور چوں کہ وہ چاہتے تھے کہ قاری دیہی زندگی کے مسائل سے روشناس ہو سکے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس میں کچھ اور بھی باتیں ہیں۔ ہر بڑا ادیب زندگی کے بارے میں اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے جس کے لیے اس کے پاس ایک مضبوط جواز ہوتا ہے۔ اس کی تحریر اس نظریے کی عکاس ہوتی ہے۔ فکشن لکھنے والے ادیب کی طاقت اس میں ہے کہ وہ براہِ راست اپنے نظریے کا پرچار نہ کرے بل کہ قاری اس کی تحریر سے اس کے نظریے کی ساختیات کو دریافت کرے۔ جدید تہذیب کے زیرِ اثر بنیادی انسانی قدروں کی پامالی پر دنیا میں بحث جاری ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نئی تہذیب انسان کی ذہانت کی ترقیِ معکوس کا سبب ہے کہ انسان کی ذہانت نے ترقی تب کی جب اسے اپنی بقا کے لیے براہِ راست فطرت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کسی بھی تہذیب کا عیش کوش طبقہ بدلتے زمانوں میں زیادہ اکھاڑ پچھاڑ کا شکار رہتا ہے۔ اس طبقہ کی بے عمل ذہانت، چمک دار مگر کھوکھلی اقدار کسی بھی نئے زمانے یا تبدیلی کے دور میں اپنے پیروں پر جمے رہنے میں ناکام ہوتی ہیں۔ اس

حقیقت کا قرۃالعین حیدر نے بغور مشاہدہ کیا اور اسے تاریخ کے تناظر میں پرکھ کر قاری کے لیے پیش کیا۔ اس حقیقت پر بات کرنے کی ایک صورت شاید یہ بھی ہے کہ شہری زندگی کی آلودگیوں نے جنھیں بے کار سمجھ کر پھینک دیا ہے، ان سنہری قدروں کو، ان روپہلے رشتوں کو وہاں سے کھوج کر نکالا جائے جہاں یہ ابھی اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ زندگی کا بھیدوں بھرا حسن، تاروں کے کھو جانے پر ہڑبڑا جانے والے ننھے گڈریے کے روپ میں، پرمیشر سنگھ، مائی تاجو، بھکارن، مریاں اور فیکے کی شکل میں۔ میں اسے مقصدیت نہیں کہوں گی۔ شاید صداقت پسندی سے بھی بہتر لفظ میرے نزدیک دیانت ہے کہ جس میں مشاہدے کی گہرائی اور جذبے کی صداقت کے ساتھ ایک قسم کی دانائی بھی شامل ہوتی ہے۔ وہ دانائی جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی، لانجائنس کے بقول باطنی شخصیت کی منفرد نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔

آخر میں، میں بھی محترمہ ناہید قاسمی کی طرح ڈاکٹر طاہرہ اقبال سے اس بات پر اتفاق کروں گی کہ
’’احمد ندیم قاسمی کے فن پر کچھ لکھنا ایک عمر کی ریاضت مانگتا ہے ......قاسمی صاحب اعتبار تھے ......نئے لکھنے والوں کا، انسانیت کا، ادب کا، فن کا۔ جویائے علم و فن اس شیش محل میں صدیوں محوِ سفر رہیں گے تو کہیں اس کے روزن وا کر پائیں گے۔‘‘

☆☆☆☆

ڈاکٹر فضل کریم

قاسمی صاحب کی سائنسی علوم میں دلچسپی

علمی، ادبی اور صحافتی تاریخ کی سب سے بزرگ اور بلند پایہ شخصیت جناب احمد ندیم قاسمی (مرحوم و مغفور) کے بارے میں عقیدت کا اظہار خیال کرنا میرے لیے باعث سعادت ہے۔ میں اپنی تعلیم اور پیشہ وارانہ تربیت کے لحاظ سے سائنس کا آدمی ہوں۔ خالصتاً سائنسی اور تیکنیکی موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں لیکن اب ایک احساس دل میں پیدا ہوا ہے کہ اتنے عظیم ادیب کے ساتھ عقیدت کے اظہار کے لیے شاید کوئی ادبیانہ شہ پارہ تخلیق نہ کر سکوں جیسا کہ آپ ادیب حضرت کر سکتے ہیں لہٰذا معذرت کے ساتھ میں نے مذکورہ بالا عنوان کا انتخاب کیا ہے تاکہ کچھ تو کہہ سکوں۔ اس مقصد کے لیے میں ان کے ایک اخباری کالم کا حوالہ دوں گا جس کے موضوع کا تعلق خلائی سائنس یا فلکیات سے تھا اور یہی کالم ان کے ساتھ میرے رابطے کا باعث بنا۔

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ وہ کئی سالوں سے روزنامہ جنگ میں مختلف موضوعات پر کالم لکھتے رہے (اپنی وفات سے غالباً ایک ہفتہ پہلے تک) میں ان کی فکر انگیز تحریروں سے بہت متاثر تھا خاص طور پر جب وہ کسی سائنسی موضوع پر لکھتے۔ جب بھی ان کا کالم چھپتا میں سب سے پہلے وہ پڑھتا اور بعد میں کسی اور لکھاری کا۔ اپنے ان کالموں میں وہ کبھی کبھار کائنات کے بارے میں ایسی باتیں لکھ جاتے جو میرے ایسے سائنس کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا باعث اور معلومات افزا ہوتیں۔ غالباً یہ ۲۰۰۴ء کے آخری مہینوں کی بات ہے (تاریخ اشاعت یاد نہیں) کہ انھوں نے روزنامہ جنگ میں ایک کالم جس کا عنوان تھا ـــــ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید! یعنی علامہ اقبال کے ذیل میں درج مشہور شعر کے پہلے مصرعے پر رکھا تھا:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

قاسمی صاحب کے مضمون کے مندرجات کا خلاصہ پیش کر دیتا ہوں، جس میں تین اہم کائناتی مظاہر کا ذکر کیا گیا تھا:

۱۔ مطالعہ کائنات کے نتائج کے پیش نظر کائنات مسلسل پھیلتی جا رہی ہے۔

۲۔ امریکہ کے خلائی تحقیقی ادارے ''ناسا'' (NASA) نے بتا دیا تھا کہ بین الاقوامی سائنس دانوں کی ایک ٹیم کے اعلان کے مطابق انھوں نے کہکشاؤں کے دو کلسٹر نیا جھرمٹوں میں ٹکراؤ کا مشاہدہ کیا ہے۔

ان کی رائے کے مطابق ہزاروں کہکشائیں اور کھربوں ستارے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں اور جس ٹکراؤ کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ اب تک مشاہدہ میں آنے والا سب سے بڑا فلکیاتی واقعہ ہے۔ توانائی کے اخراج کے لحاظ سے یہ واقعہ بگ بینگ (BIG BANG) نامی دھماکے کے بعد سب سے زیادہ طاقتور دھماکہ ہے۔ سائنس دان اس واقعے کو کائناتی طوفان قرار دے رہے ہیں کیوں کہ اس میں کہکشاؤں کے جھرمٹ آپس میں تصادم ہوتے ہیں اور اس سے سمندری طوفان کی سی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ یہ تصادم اور ادغام اس نظریے کی وضاحت کرتا ہے کہ کائنات میں اجرام فلکی کا عظیم الشان نظام چھوٹی چھوٹی کہکشاؤں اور ان کے جھرمٹوں کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے سے وجود میں آیا لہٰذا مشاہدے سے پتہ چلا ہے کہ کائنات کے عظیم ترین ڈھانچے اب بھی تشکیل پا رہے ہیں!

۳۔ ”ایک پراسرار سیاہ توانائی کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار بڑھا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اجرام فلکی ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی رفتار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ پھیلاؤ اتنا بڑھ جائے کہ آئندہ کلسٹر بھی کسی دوسرے کلسٹر سے نہ ٹکرائیں۔ اس سیاہ توانائی کی ابھی تشریح نہیں ہو سکی۔“

(اسی کالم میں قاسمی صاحب نے لکھا تھا) کہ ہمیں یہ معلومات امریکی شعبہ اطلاعات عامہ کے اخبار ”خبر و نظر“ سے حاصل ہوئی ہیں اور اسی اخبار نے اطلاع دی ہے کہ کائنات کے اس پہلو کے بارے میں مزید معلومات ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔)

قطع نظر اس بات کے کہ قاسمی صاحب نے مذکورہ بالا جدید معلومات ایک اخبار سے حاصل کیں۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ قاسمی صاحب کا کائنات کے بارے میں بھی گہرا مطالعہ ہے چوں کہ یہ نظریات علم فلکیات کے جدید ترین نظریات ہیں اور یہ ایسے موضوعات ہیں جنھیں ماسوائے ماہرین فلکیات کے دوسرے سائنس دان بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور ایک بلند پایہ ادیب بھی جب ان نظریات کا ادراک حاصل نہ کر لے تو وہ اپنی تحریر میں جذب نہیں کر سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی سائنسی علوم میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔

جناب قاسمی صاحب سے معذرت کے ساتھ یہاں قارئین کے لیے مزید چند باتوں کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں:

۱۔ جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے کہ خلاء میں کہکشائیں ہم زمین والوں سے اور ایک دوسرے سے بھی دور بھاگتی جا رہی ہیں۔ ایک امریکی سائنسدان ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے ۱۹۲۹ء میں یہ نظریہ پیش کیا تھا، بل کہ اس نے ایک قانون بھی دیا تھا جسے ہبل قانون (Hubble Law) کہتے ہیں جس کے مطابق یہ کائنات ہمارے چاروں اطراف میں پھیلتی جا رہی ہے اور کس رفتار سے پھیل رہی ہے یہ اسی

قانون سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ امریکہ یا یورپ میں علم فلکیات پر تمام لٹریچر اور کتابیں اس قانون کی تشریح و استعمال کے بغیر نامکمل ہوں گی۔ جب کائنات کا پھیلاؤ ختم ہوگیا تو وہ کائنات کی موت کا پیش خیمہ ہوگا۔ اور شاید وہی قیامت ہوگی۔

۲۔ جہاں تک اس مظہر کے مشاہدے کا تعلق ہے کہ کہکشاؤں اور ستاروں کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے، ایسا مظہر ہے جسے زمین سے انسانی آنکھ مشاہدہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ مشاہدہ نہایت ہی طاقتور دوربین (جیسا ہبل دوربین تھی) سے ممکن ہوا۔ چوں کہ ایسے تصادم اربوں کھربوں سال بعد ہوتے ہیں، ایک انسان اپنی مختصر زندگی کے دوران آسمان پر کوئی تبدیلی نہیں دیکھ سکتا۔ مزید ایسے تصادم خلا کی پہنائیوں اور بے پناہ دوری پر رونما ہوتے ہیں۔ ان کے تصادم (ٹکرانے) کی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ ان کا ملبہ زمین پر گرتا ہے۔ الغرض زمین پر ایسے تصادموں کے اثرات محسوس نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تصادم ایسے ہیں کہ ایک چھوٹی کہکشاں اربوں کھربوں سال بعد ایک بڑی کہکشاں میں مدغم ہو جاتی ہے یا ایک کہکشاں دوسری کہکشاں میں سے محض گزر جاتی ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ ان کہکشاؤں کے ستارے آپس میں نہیں ٹکراتے۔

۳۔ جہاں تک ”سیاہ توانائی“ کا تعلق ہے اسے عموماً ڈارک میٹر (Dark Matter) کے حوالہ سے دیکھا جاتا ہے جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ کائنات کا ایک پراسرار پہلو ہے جس پر کھوج اور تحقیق جاری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں ان مظاہر کی مزید تشریح کی گنجائش نہیں ہے۔

جناب قاسمی صاحب کے اخباری کالم سے متاثر ہو کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ میں قاسمی صاحب کو ٹیلیفون کر کے مبارکباد دے دوں اور انھیں اپنی کائنات کے موضوع پر ایک کتاب 'کائنات اور اس کا انجام' (پبلشر فیروزسنز) بھی پیش کروں، اس غرض سے نہیں کہ وہ اپنے کسی کالم میں تبصرہ نگاری کریں یا یہ کہ میں ان کے علم میں اضافے کی غرض سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم ایک دن ہمت باندھ کر ٹیلیفون کر ہی دیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر پر ہی تھے اور طبیعت ناساز ہونے کے باوجود میرا ٹیلی فون سنا اور کتاب بھیجنے کے بارے میں کہا کہ آپ مجھے پارسل کر دیں۔ کتاب کی وصولی پر انھوں نے ۲۸؍ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ایک خط لکھا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے:

محترم ڈاکٹر صاحب، سلام مسنون!

”کائنات اور اس کا انجام“ کی ایک جلد بھجوا کر مجھ پر آپ نے بڑا کرم کیا۔ میں اس کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔ علیل رہتا ہوں، اس کے باوجود آپ کی اس تصنیف کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔ ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کی طرح مجھے بھی کائناتی مسائل سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں نے مدتوں پہلے ایک قطعہ کہا تھا:

ان ستاروں سے پرے اور ستارے بھی تو ہیں
جن کے پرتو سے منور ہیں کئی اور جہاں
ان جہانوں سے پرے اور جہاں بھی ہوں گے
میرے سیارۂ رنگین کی طرح رقص کناں

ایک بار پھر عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مخلص

احمد ندیم

(میرے لیے قاسمی صاحب کی یہ عنایت یعنی یہ خط سرمایۂ حیات ہے)

شنید ہے کہ بعض ناقدین ان سے اختلاف رکھتے تھے اور ان سے ناراض بھی رہتے تھے مگر وہ ان کے جنازے میں بھی شریک ہوئے شاید ان کی قبر سے معافی کے لیے۔ ان کے مرنے کے بعد معافی کے لیے تو کیا آئے، وہ تو منہ دکھاوا ہوا، دنیا داری ہوئی۔ قاسمی صاحب کا ایک شعر جو آج کل ان کی شاعری کے حوالے سے اکثر لکھا اور پڑھا جاتا ہے، مجھے بھی بہت پسند ہے اور میں کئی سال پہلے اپنی تحریروں میں شامل کر چکا ہوں:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاوں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

اگرچہ قاسمی صاحب ایک ایسے سمندر میں اتر گئے ہیں جس سے واپسی ناممکن ہے لیکن وہ اس عہد کے عظیم دانشور، ادیب، نقاد اور اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ پون صدی پر محیط اپنی لافانی نگارشات کی بدولت اپنے قارئین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے اور پھر ادب کی تاریخ بھی انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اب آخر میں ان کی تازہ ترین غزل کے دو شعر آپ کی نذر کرتا ہوں:

اب ترے رخ پہ محبت کی شفق پھوٹی، تو کیا
حسن برحق ہے، مگر جب بجھ چکا ہو جی، تو کیا
دور کی آہٹ تو آپہنچی ہے اب سر پہ ندیم
آگہی نے مدتوں کے بعد کروٹ لی، تو کیا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆☆☆☆

محمد شعیب مرزا

بچوں کے احمد ندیم قاسمی

یہ 2003ء کے آخر کی بات ہے ماہنامہ ''پھول'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد سینئر ادیبوں اور شاعروں سے رابطے کر کے اُن سے بچوں کے لیے لکھوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان ہی دنوں میرے علم میں آیا کہ ''پھول'' کے پہلے دور میں احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر رہ چکے ہیں اور انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی ان دنوں مجلس ترقیِ ادب کے ناظم تھے۔ دفتر کا پتہ کروایا لیکن کئی دنوں تک ان کے دفتر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُس دور کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو انھوں نے انگلی پکڑ کر چلانا سکھایا تھا، نو آموز قلمکاروں کی صلاحیتوں کو جلا بخشی تھی۔ ''فنون'' میں ان کی تحریریں شائع کر کے انھیں ادبی دنیا میں متعارف کروایا تھا۔ ایک روز ہمت کر کے ان کے دفتر پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ قاسمی صاحب تک پہنچنے میں خاصے مراحل طے کرنا پڑیں گے۔ پی اے کے ذریعے اطلاع یا وزیٹنگ کارڈ اندر بھجوا کر انتظار کرنا پڑے گا۔ اِذنِ باریابی ملا تو شرفِ ملاقات حاصل ہو جائے گا ورنہ مایوس لوٹنا پڑے گا۔ لیکن اس وقت خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب مجلس ترقی ادب کے دفتر گیا اور ایک صاحب سے کہا کہ قاسمی صاحب سے ملنا ہے۔ انھوں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اندر چلے جائیں۔

دروازے کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی میں نے جھجکتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے باوقار مگر شفیق احمد ندیم قاسمی اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے منصورہ احمد بیٹھی تھیں۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو خوش ہو کر مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں ان کے سامنے خالی کرسی پر منصورہ احمد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے ''پھول'' کا تازہ شمارہ پیش کیا۔ ورق گردانی کرتے ہوئے میں ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور طمانیت ظاہر کر رہی تھی کہ جس ''پھول'' کی وہ آبیاری کرتے رہے تھے اس کو کھلا ہوا اور معطر دیکھ کر وہ مطمئن تھے۔ رسالے کا سرسری جائزہ لے کر تعریفی انداز میں بولے۔ ''آپ نے اس میں کافی جدت کی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ہونی بھی چاہیے۔ سائنس کے حوالے سے سلسلے شروع کر کے بھی آپ نے اچھا کیا''۔ مجھے لگا جیسے مجھے میری محنت کا پھل مل رہا ہے۔ ان کا مزاج بھی تو ایسا ہی تھا۔ وہ بڑے انسان تھے کہتے ہیں ''بڑا انسان وہ ہے جس کے پاس بیٹھ کر کوئی خود کو چھوٹا محسوس نہ

کرے۔'' وہ ایسے ہی عظیم انسان تھے دوسروں کو محبت اور عزت دینے والے بقول قاسمی صاحب …… ع

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا
ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

یوں اُن کی محفل میں ذرۂ ناچیز بھی توقیر پاتا تھا۔ میں نے ''پھول'' میں مختلف شخصیات کے آٹوگراف شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو اب تک جاری ہے۔ میں نے آٹوگراف کے لیے درخواست کی۔ انھوں نے آٹوگراف دیے۔ ان سے کہانی اور تفصیلی تعارف کی درخواست کی۔ اتنے میں منصورہ احمد بول اٹھیں کہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ پھر کسی دن آجائیں۔ ان کی ''مداخلت'' مجھے اچھی نہ لگی لیکن یہ سوچ کر کہ اس بہانے قاسمی صاحب جیسی شخصیت سے پھر ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اجازت چاہی۔ میں نے محسوس کیا کہ قاسمی صاحب بھی بچوں کے ادب کے حوالے سے مزید بات کرنا چاہتے تھے کیوں کہ طویل عرصے کے بعد ان کے اندر موجود بچوں کے ادیب کو کسی نے جگایا تھا۔ شاید انھوں نے بھی سوچا ہو گا کہ …… ع

پھر کسی وقت پہ یہ بات اٹھا رکھتے ہیں

انھوں نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ تعارف لکھا ہوا ہے میں کوئی کہانی تلاش کر کے آپ کو فون کر دوں گا۔ آپ لے جائیے گا۔ میں ان کے دفتر سے نکلا تو عجیب کیف سے سرشار تھا۔ پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے۔ (First Impression is Last Impression) لیکن بعد کی ملاقاتوں نے یہ مقولہ بھی غلط ثابت کر دیا۔ بعد میں ان سے جتنی ملاقاتیں ہوئیں وہ پہلے سے زیادہ محبت و شفقت سے پیش آئے۔ وہ جن سے ملنے کی خواہش کئی برسوں سے تھی۔ ان کو صرف ٹی وی کے مشاعروں یا پروگراموں میں دیکھا کرتے تھے ان سے ملاقات کا ہونا اور پھر ان کا التفات اس نے کئی دن مجھے مسحور رکھا۔ وہ ندیمؔ تخلص کرتے تھے۔ مجھے ان کا شعر یاد آرہا تھا: ع

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے ندیمؔ
مرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

کچھ دن کے بعد مجھے قاسمی صاحب کے دفتر سے فون آیا کہ قاسمی صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ خوشی ہوئی کہ انھوں نے یاد رکھا ورنہ ان کی مصروفیات اور شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم۔ پہلی ملاقات کے بعد میں جب بھی قاسمی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا یہی دعا مانگتے گیا کہ منصورہ احمد وہاں نہ ہوں، اور ملنے والے بھی کم ہی ہوں تاکہ میں ان سے بچوں کے ادب کے حوالے سے ڈھیروں باتیں کر سکوں۔ کبھی دعا قبول ہو جاتی کبھی فضا میں معلق رہ جاتی۔

میں جب پڑھتا تھا کہ احمد ندیم قاسمی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ مل کر روحِ رواں رہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی تھی کیوں کہ ہمارے ہاں ترقی پسندی سے مراد مذہب سے مبرا تحریک لی جاتی تھی۔ ایک عرصے تک ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے سروں پر سوشل ازم اور کیموزم سوار رہا۔ سوویت یونین سے آنے والے لٹریچر نے ہماری ادبی فضا کو بہت متاثر کیا۔ حالاں کہ اسلام ہی کیا دنیا کا کوئی بھی مذہب انسان کو ترقی سے نہیں روکتا لیکن مادر پدر آزادی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اخلاقی اقدار اور معاشرتی روایات کو اہمیت دیتا ہے۔ لیکن قاسمی صاحب سے مل کر، ان کے خیالات جان کر، ان کے افسانے اور شاعری پڑھ کر کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنی روایات سے تجاوز کیا ہو یا اخلاقی اقدار کو پامال کیا ہو۔ پروفیسر حمید احمد خان نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ''احمد ندیم قاسمی ......ایک ترقی پسند ادیب ضرور ہیں لیکن ان کی ترقی پسندی پاکستانی روایت کی ہمنوا ہے۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس کے لیے پاکستانی ادب کی تاریخ قاسمی صاحب کو شکریے سے یاد رکھے گی۔''

احمد ندیم قاسمی 1948ء سے 1954ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے پنجاب اور پھر پاکستان کے سیکرٹری جنرل رہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ 1947ء میں 14 اگست کو ریڈیو پاکستان پشاور سے اعلانِ آزادی کے موقع پر قاسمی صاحب کے تین قومی نغمے اور ملی ترانے نشر ہوئے۔ ان میں سے ایک قومی نغمہ ''پاکستان بنانے والے، پاکستان مبارک ہو'' تھا۔ وطن سے اپنی محبت کا اظہار وہ آخر عمر تک کرتے رہے۔ جنوری 1972ء میں یہ دعا:۔

یارب، مرے وطن کو اک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے
یہ خطۂ زمین معنون ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں، اور بے شمار دے

مارچ 1980ء میں لکھی وطن کے لیے ان کی یہ دعا تو بہت مقبول ہوئی جو وہ اکثر ٹی وی پر بھی پڑھا کرتے تھے۔

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل، جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی، روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حُسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

ان کی کہی ہوئی نعتیں ان کی اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے محبت کی علامت ہیں۔

جوش ملیح آبادی احمد ندیم قاسمی کے بارے میں لکھتے ہیں "اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں، احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے بہر حال بہتر سمجھتا ہوں۔ ندیم صاحب اچھے شاعر ہی نہیں، اچھے انسان بھی ہیں اور چوں کہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے، اس لیے میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے ان سے محبت ہے۔"

قاسمی صاحب سے چند ملاقاتوں کے بعد ان کے بارے میں میرے جذبات بھی ایسے ہی ہیں۔ وہ فراخدل انسان تھے۔ ان کے دور میں جو ادبی گروہ تھے، دونوں گروہوں کے درمیان نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ قاسمی صاحب وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے البتہ ان کے مداحین اعتراضات وتنقید کا جواب ضرور دیتے۔ یہ سلسلہ دونوں طرف سے جاری رہتا۔ اس تخریب سے بھی تعمیر کا یہ پہلو نکلتا کہ دونوں گروہوں سے وابستہ شاعر وادیب اپنی صلاحیتوں کو منوانے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ہمیشہ متحرک رہتے۔ قاسمی صاحب نے شاید ہی کبھی کسی اعتراض یا تنقید کا جواب دیا ہو۔ کرامت بخاری کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا تازہ "فنون" کے بارے میں آپ نے مطلع کیا ہے کہ لوگ مخالفت میں بول رہے ہیں مگر آپ کی اس اطلاع سے مجھے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں مخالفتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ یا یوں کہیے کہ "مخالفت پروف" ہو چکا ہوں۔ ان مخالفوں نے میری گزشتہ ساٹھ، پینسٹھ سال کی ادبی زندگی کا کیا بگاڑا ہے جو اب بگاڑ لیں گے۔ تیس، بتیس سال سے لوگ مجھ پر دشنام، بہتان کے طومار باندھ رہے ہیں مگر میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ یہ مخالفت کرنے والے بے شک مخالفت میں مصروف رہیں کہ ان بے چاروں کا یہی مقدر ہے۔ ہمارے تعمیری اور ارتقائی اور تخلیقی مشاغل ہیں۔ ہم ان میں مگن رہتے ہیں۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے مگر میں سیر چشمی سے کام لیتا ہوں کہ مجھے تو اور بھی بہت ضروری کام کرنے ہیں"۔

نوجوان ادیبوں کے لیے یہ ایک کارگر نسخہ ہے اگر وہ اس پر عمل کریں تو طنز و تنقید سے بے نیاز ہو کر اپنی منزل پا سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو شمع کی مانند ان کی زندگی سے روشنی حاصل کرنی چاہیے..... ع

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ ادب کے فروغ کے لیے وہ زندگی کے آخری سانس تک مصروف عمل رہے۔

احمد ندیمؔ قاسمی نے جہاں اتنی جہتوں میں کام کیا وہاں وہ بچوں کے لیے لکھنے سے بھی غافل نہیں رہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ ان کی ان ہی ہمہ جہت صفات کے پیش نظر حفیظ جالندھری نے ان کے بارے میں کہا تھا۔ ''ایک مدت سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا شعور اور حسن کا راز تخلیقات نظم و نثر میرے مطالعے میں ہیں۔ مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیمؔ قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''ساری عمر شعر و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ اس سطح پر انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انسان، انسان دوستی اور انسانیت کا احترام ساری عمر ان کا مسلک رہا۔ اسی اندازِ نظر نے انھیں تازہ دم رکھا۔ احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی بڑے تھے اور شاعر بھی بڑے تھے۔ تخلیقِ ادب کا یہ ایسا کرشمہ ہے کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے''۔

احمد ندیمؔ قاسمی کی انسان دوستی کا ہر کوئی قائل تھا۔ انسان دوستی اور احترام انسانیت کو انھوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا نیز وہ چاہتے تھے کہ انسان دوستی ہر انسان کے دل میں جاگزیں ہو۔

گُل ترے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں
اسی رشتے میں ہر انساں کو پرونا چاہتا ہوں

قاسمی صاحب کی شخصیت، کردار اور فن کو اندرون و بیرون ملک بہت سی شخصیات اور اداروں نے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے جو قاسمی صاحب کی عظمت کی دلیل ہے۔

2003ء سے 2006ء تک مجھے قاسمی صاحب سے چند ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ مجھے انھوں نے ''پھول'' کے لیے اپنی پاسپورٹ سائز تصویر، ٹائپ کیا ہوا اپنا تفصیلی تعارف، آٹوگراف اور ایک کہانی عنایت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نئی کہانی لکھ کر دینا چاہتا ہوں لیکن اب صحت اجازت نہیں دیتی۔

میں نے ''پھول'' میں ان کی ایک کہانی ''خربوزے'' شائع کی۔ یہ ایک ایسے بچے کی کہانی تھی جو خربوزہ

کھانا چاہتا تھا۔ لیکن غربت کی وجہ سے اس کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔ آخر وہ ایک دن مزدوری کر کے خربوزہ حاصل کر لیتا ہے لیکن ......۔

یہ کہانی چوں کہ ایک بچے اور اس کی خواہش کے گرد گھومتی تھی اس لیے یہ کہانی ''پھول'' میں شائع کی لیکن اس میں سے دو سطریں حذف کرنے کی جسارت کی۔ کہانی شائع کرنے کے بعد ''پھول'' میگزین قاسمی صاحب کو بذریعہ ڈاک بھجوایا اور ساتھ ایک خط میں دو سطریں حذف کرنے پر معذرت اور اس کی وجہ بیان کی تھی۔ مجھے علم نہیں کہ اس پر قاسمی صاحب کے کیا تاثرات تھے کیوں کہ انھوں نے اس حوالے سے مجھے کچھ نہیں لکھا اور نہ اس کے بعد ان سے ملاقات ہو سکی۔ ان سے ملاقاتوں کا خوشگوار تاثر آج بھی قائم ہے۔ میں آج بھی تصور میں ان کو مجلس ترقیِ ادب کے دفتر میں بیٹھا دیکھتا ہوں۔ وہ ایک آئیڈیل شخصیت تھے۔ بہت سی علمی ادبی شخصیات تو آج بھی موجود ہیں لیکن ......ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

اپنے ایک انٹرویو میں نئی نسل کے لیے پیغام دیتے ہوئے کہا۔ ''نئی نسل کے لیے میرا پیغام صرف یہ ہے کہ غیر متعصب اور فراخ دل بنیے تا کہ آپ کو حسن و خیر و برکت کی تجسیم کہا جا سکے۔'' وہ خود بھی ایسے ہی تھے اور نئی نسل کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی آخری عمر میں کچھ علیل رہنے لگے تھے۔ کبھی سانس کی تکلیف ہو جاتی۔ طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو دفتر سے ہی ہسپتال چلے جاتے۔ طبیعت سنبھلتی تو پھر دفتر آ جاتے۔ انھوں نے آخر وقت تک خود کو کام میں مصروف رکھا۔ جب نقاہت اور علالت ان کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تب بھی اگر کوئی ان کا حال احوال پوچھتا تو یہی جواب دیتے کہ ٹھیک ہوں۔ اچھے موڈ میں ہوتے تو محفل کو گرمائے اور مہکائے رکھتے۔

ایک طویل، بھرپور اور بامقصد زندگی گزار کر وہ 10 جولائی 2006ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ لاہور میں ان کی تدفین ہوئی۔ بظاہر آسمانِ ادب و صحافت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا لیکن اپنے کردار اور تخلیقات کے حوالے سے وہ ادب اور دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیوں کہ:

کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ

خود قاسمی صاحب کے بقول: ......ع

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆☆☆☆

محمود احمد قاضی

سناٹا

میرے سامنے اس وقت احمد ندیم قاسمی کا مکتبہ نیا ادارہ کے تحت 1969ء میں سناٹا کے نام سے چھپنے والا افسانوں کا مجموعہ موجود ہے۔ اس میں کل دس افسانے ہیں۔ اس کا دیباچہ داستان سے افسانے تک کے مصنف اور نقاد سید وقار عظیم کا لکھا ہوا ہے۔ جس طرح حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری، شاعری کی تنقید کا ایک اچھا آغاز تھا اسی طرح افسانے کی تنقید کے پلوں سے بہت سا پانی بہہ جانے کے باوجود وقار عظیم کی یہ کتاب افسانے کی تنقید میں اب بھی ایک مثبت آغاز یہ تصور کی جا سکتی ہے۔

وقار عظیم نے ندیم کے افسانوی ہنر پر بات کرتے ہوئے اس کے پانچ افسانے ''رئیس خانہ، کنجری، گنڈاسا، الحمدللہ اور آتشِ گُل'' کو منتخب کیا ہے۔ وقار عظیم نے ندیم کے فن کو سیاست، معیشت اور رومان کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے یہ بات صحیح بھی ہے کہ ندیم کے فنِ افسانہ کے یہ تین ابھار خاصے اہم قرار دیے جا سکتے ہیں۔ میں نے ندیم کے فنی پہلوؤں پر گفت گو کے لیے اس کا ایک افسانہ سناٹا چنا ہے جو کہ اس افسانوی مجموعے کا آخری افسانہ ہے اور اس مجموعے کا نام بھی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ خود افسانہ نگار کو شاید یہ افسانہ کچھ زیادہ ہی پسند تھا یا شاید اسے اس سے کسی قدر جذباتی لگاؤ تھا۔

میں نے ندیم کا یہ افسانہ اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس میں سیاست کا عنصر (وہ بھی تقسیم کے وقوعے کے حوالے سے) تو کم کم ہے لیکن موضوع کا بھاری بھر کم حصہ معیشت اور بقول وقار عظیم رومان (جسے میں زندگی کی ایک اٹوٹ حقیقت کہوں گا) پر مبنی ہے۔ یہاں معیشت رومان کو کھا گئی ہے کیوں کہ جب جب دمشق میں قحط پڑتا ہے تب تب لوگ عشق کرنا بھول جاتے ہیں۔ عشق اصل میں وہ زندگی ہے جس کا جتن ہم کرتے اکثر نظر آتے ہیں۔

کلثوم لوئر مڈل کلاس کے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی ہے جس کی تین بہنیں اور بھی ہیں۔ ان میں سے ایک شادی شدہ رہ چکی ہے۔ اب مرگی کی مریضہ ہے اور نیم پاگل ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں۔ باقی دو بہنیں کلثوم کی طرح کنواری ہیں۔ ایک ماں ہے، سٹھیائی ہوئی۔ جسے وقت اور حالات کی چکی نے پیس کر پاگل

سا بنا رکھا ہے۔ ایک بھائی تھا جو شادی کر کے اس کنبے سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اب وہ ان سب سے الگ تھلگ اپنی بنائی ہوئی تعمیر کی ہوئی دنیا میں مگن ہے۔ کلثوم اک اسکول میں استانی ہے اور اَسّی روپے ماہوار کے عوض بچوں کو حساب اور فارسی پڑھاتی ہے۔ وہاں وہ اسکول کے ایک کلرک جمال کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھ بیٹھتی ہے۔ یہی شہزادہ یا ایسا ہی کوئی ہیولہ وہ لاہور آنے سے پہلے انبالے میں رات کو سونے سے پہلے اپنے یاد کردہ عشقیہ شعروں کے حوالے سے اپنے سامنے پاتی تھی۔ تب وہ بھائی کی وساطت سے خریدے گئے ناول بھی پڑھتی تھی۔ اب یہ سب کچھ خاک تھا۔ خیال تھا مل کہ خیال کی خاکستر تھا کہ اب وہ اس کی ماں کے بقول اس کی مرد بیٹی تھی اور وہ خود بھی خیال کرتی تھی کہ دھیرے دھیرے اس کے اوپری ہونٹ کا رؤاں ایک مونچھ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ماں اس کی شادی تو کرنا چاہتی ہے لیکن گھر کی معیشت کے تندور میں اسے بطور ایندھن کے بدستور استعمال کرنے کے لیے ہر رشتہ بھیجنے والے پر گھر دامادی والی شرط عائد کرتی ہے جسے وہ لوگ نہیں مان رہے۔ یوں یہ واقعہ ٹلتا رہتا ہے۔

اس گھر کی جو لڑکیاں ہیں ان کی اپنی زندگی ہے، خواب ہیں۔ کرم خوردہ خواب۔ ایک لڑکی بیمار ہے۔ ویسے تو وہ سب کی سب بیمار ہیں کہ ان کے خیالات تک کو زنگ لگ چکا ہے۔ کلثوم اگر جمال الدین کلرک کی طرف کبھی ایک قدم بڑھی تھی تو وہ اپنی معاشرتی بزدلی کی بدولت دو قدم پیچھے ہٹ چکا ہے۔ گھریلو فضا ایک شدید تناؤ پر قائم ہے۔ یہاں کسی بھی وقت آگ بھڑک سکتی ہے۔ وقت کا خنجر چل سکتا ہے۔ کلثوم کے پاس گنگنانے کے لیے "زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا" جیسا ادھورا اور منفی مفہوم والا مصرع رہا جاتا ہے۔

میرے نزدیک ایک اچھا افسانہ وہ ہوتا ہے جو اپنی فضا فطری انداز میں تعمیر کرتا ہوا نظر آئے اور اس میں کسی قسم کی جھول نہ ہو۔ واقعات میں ایک طرح کی روانی اور بہاؤ ہو۔ کہانی زندگی سے جڑی ہو۔ وہ کہیں سے بھی Drag کرتی نظر نہ آئے۔ کچھ بھی خوامخواہ دھکیلا نہ جا رہا ہو اور کچھ بھی بغیر جواز کے نہ کہا جا رہا ہو۔ اس افسانے کی رفتار تو اچھی ہے۔ افسانہ نگار کی اپنی جمالیات کے عین مطابق ہے لیکن چند چیزوں کی تکرار بھی ہے۔ افسانے میں چوں کہ جنسی طور پر نا آسودہ چار جوان عورتیں موجود ہیں اس لیے خود کو خود پر عیاں کرنا، عریاں کرنا یا دیکھنا ایک عین فطری عمل ٹھہرتا ہے۔ لیکن ادھر ننگا ہونا، خود کو ننگا دیکھنا وغیرہ کی حالت کو کم از کم دس بار دہرایا گیا ہے اسی طرح کلثوم کا خود کو ایک مرد کے طور پر دیکھنا اس کے ہونٹ پر مونچھ کا اُگنا بھی صحیح نظر آتا ہے لیکن افسانہ نگار نے اس محل کو بھی تین چار مرتبہ اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے اور اسی طرح انگارہ نگلنے جیسے

استعارے کو بھی ایک سے زیادہ بار استعمال کیا ہے۔

اس ضمن میں انجذابی کیفیت زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتی تھی لیکن خیر ان سب باتوں کے باوجود ہم کسی بھی فن کار کو اپنی ڈگر پر کسی جبری انداز سے نہیں لا سکتے ہاں اس کے کسی بھی عمل کو اچھا یا کم اچھا ضرور کہہ سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس افسانے کی فضا جنسی گھٹن کے حوالے سے زندگی کرتی عورتوں کی عادات واطوار کو بہتر انداز میں بیان کرتی ہے۔ یہاں عورتوں کو انسان ظاہر کیا گیا ہے۔ روبوٹ نہیں۔ اسی لیے یہاں ہر عمل کا ردِ عمل موجود ہوتا ہے۔ بعض جگہوں پر جو بیان سامنے آیا ہے وہ بہت معنی خیز اور معصوم سا لگتا ہے جو کہ پڑھنے والے کو بھی بھلا لگتا ہے۔

کلثوم اپنی بڑی بہن رضیہ کو جو کسی حد تک دیوانی سی ہے، کہتی ہے:

''آپا، میں سوچتی ہوں یہ آسمان پر جو ابابیلیں اُڑ رہی ہیں، تو یہ کیوں اُڑ رہی ہیں؟''

رضیہ جواب دیتی ہے۔

''ابابیلیں اس لیے اُڑ رہی ہیں میری جان کہ ابابیلیں ہیں۔ کلثو (کلثوم) نہیں۔''

ایک اور جگہ پر کلثوم رضیہ سے کہتی ہے:

''فرض کیجیے آپا کہ دنیا اچانک بدل جاتی ہے، سب انسان ایک دم نیک ہو جاتے ہیں، کوئی کسی سے نفرت نہیں کرتا، پھر کیا ہوگا؟''

جواباً وہ کہتی ہے۔

''یہ ہوگا کہ جب کسی سے کوئی نفرت ہی نہیں کرے گا تو محبت کاہے کو کرے گا اور سب انسان نیک ہو جائیں گے تو ادھر دودھ ملائی والے کے ریڈیو میں ہیر وارث شاہ کی آواز کہاں سے آئے گی اور بادل امڈیں گے تو تم گنگنا کیسے سکو گی؟''

افسانہ اپنے اصل بہاؤ میں بہتا مختلف موڑ مڑتا اپنے خاص سنگِ میل کی طرف بڑھ آتا ہے یعنی کلثوم جو گھر کی ''کماؤ پوت'' ہے اور اپنے چہرے پر ایک مرد جیسی مونچھیں اُگی ہوئی محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنی ماں کی مرد بیٹی ہے کی شادی ہونا قرار پا جاتی ہے اور وہ بھی اسی جمال لیکن عرف جمال کلرک سے جس سے کہ ابتدا ہی میں اسے ایک اُنسیت محسوس ہوئی تھی۔ اگر یہ عمل مکمل ہوتا ہے تو اس طرح کلثوم کے رومان کا باب بھی مکمل ہو سکتا ہے اور گھر کی معیشت کی چکی بھی اسی روانی سے چل سکتی ہے کہ جمال نے گھر داماد کی شرط کو بہر حال قبول

کر لیا ہے۔ لیکن عین وقت پر کلثوم یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیتی ہے کہ میں جمال سے شادی نہیں کروں گی بلکہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی ۔

"کیوں؟" اماں نے اب غصے سے پوچھا۔

اور کلثوم نے اپنے اوپر والے ہونٹ کے روئیں کو چھو کر کہا۔ "میں مر دچکی ہوں۔"

یہاں افسانہ نگار سناٹے کی کیفیت کو اس کی منجمد حالت میں دکھاتا ہے۔ افسانہ اپنی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔ اب سناٹے نے اپنا حتمی جواز پا لیا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر گل عباس اعوان

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ”مامتا“ کا فنی وفکری تجزیہ

پنجاب کے دیہات کی مخصوص ثقافتی مہک ہمیں، احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات میں، ایک تسلسل سے نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں، شمالی مغربی پنجاب کے دیہات کی عکاسی کے ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا بچپن ”انگہ“ میں گزرا۔ ان کے ذہن پر پنجاب کے دیہات کی زندگی کی تصویریں نقش ہو گئیں۔ احمد ندیم قاسمی اپنی کتاب ”طلوع وغروب“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ”میں نے دیہاتی موضوع پر صرف اس لیے قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے والا مجھے نظر نہ آیا۔“

پنجاب ہمیشہ سے تہذیب وثقافت کا مرکز رہا ہے صدیوں سے اس میں ایک تہذیبی روایت موجود رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اسی پنجاب کی نمائندگی کی ہے جس میں متنوع قسم کی طرز معاشرت اور انداز فکر چلے آ رہے ہیں۔ یہاں مختلف سلسلہ ہائے تصوف کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ یہاں پر بہت بڑی تعداد میں لوگ، روایات کے پابند ہیں۔ رسوم اور رواجات کی پیروی کو اپنا شعار سمجھتے ہیں اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا قائل نہ ہونا، اپنے اوصاف میں شمار کرتے ہیں۔

محترم وقار عظیم احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعہ ”سناٹا“ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

> ”ندیم نے پنجاب کے دیہات کی کہانیاں لکھ کر ہمیں ان کے دلوں کا مکین اور ان کی دھڑکنوں کا ہمراز بنایا ہے“

حقیقت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں پنجاب کی روح بسی ہوئی ہے۔ پنجاب میں بسنے والے، کرداروں میں سے اکثر کردار، ان کے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ دیہی زندگی کی معاشرت عموماً یکساں ہوتی ہے۔ دیہات کا کوئی سا بھی علاقہ ہو وہاں کے مسائل، ترجیحات، تہذیب وثقافت، تمدن، عقائد اور توہمات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ مثلاً غربت، بھوک، بیماری، بے روزگاری، ناخواندگی، طبقاتی کشمکش، کمزور طبقوں کا استحصال، باوسائل طبقوں کے جابرانہ رویے، توہم پرستی، عقائد پرستی، بنیاد پرستی، رجعت پسندی اور

غیر لچک پسندانہ سوچ ۔۔۔۔۔ دیہی زندگی کے عمومی مسائل ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ، یہاں کی مثبت قدریں بھی عموماً یکساں ہیں ۔ یہاں کے لوگ آج بھی، مادی اشیا پر، انسان کو ترجیح دیتے ہیں ۔ رشتوں کا تقدس، آج بھی، دیہی زندگی کا بنیادی حوالہ ہے ۔ آج بھی اپنے گھر کا پانی اس لیے شربت لگتا ہے کہ اُس برتن کو ماں کے ہاتھ لگے ہیں، یا پھر، وہ پانی، ماں پلا رہی ہوتی ہے ۔

افسانہ مامتا کا واحد متکلم، پنجاب کے دیہات کا باشندہ ہے ۔ وہ برطانوی پولیس میں بھرتی ہوکر، ہانگ کانگ چلا آتا ہے ۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ ہانگ کانگ میں پولیس کے مزے ہوتے ہیں ۔ مگر، وہ تو، ہانگ کانگ آتے ہی، جاپانی فوج کے ہاتھوں قید ہو جاتا ہے ۔ جو اُسے ایک دن، مقامی بستی پر چھاپہ مارنے کے لیے لے جاتے ہیں ۔ وہاں وہ، ایک بے بس قیدی ہونے کے باوجود، قابض فوج کا سپاہی شمار ہوتا ہے ۔

جب وہ مقامی لوگوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے، تو جاپانی اُسے سزا دیتے ہیں، جس سے وہاں پر موجود خواتین کو اندازہ ہو جاتا ہے، کہ یہ نوجوان بھی قیدی ہے ۔ اُس لمحے، افسانے کا واحد متکلم، سردی سے کانپ رہا ہوتا ہے ۔ تیز ہوا، برمے کی طرح، اُس کے سینے میں گھسی جا رہی ہوتی ہے ۔ اس دوران میں، ایک عمر رسیدہ چینی خاتون، اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کی طرف بڑھتی ہے ۔ اُس کی قمیص میں بٹن لگاتی ہے ۔ افسانے کے واحد متکلم کے بقول، اُس لمحے اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ عورت اُس کی ماں ہو، یا، پھر، وہ اُڑ کر، اپنی ماں کی گود میں جا گرا ہو ۔

فکری طور پر، یہ احمد ندیم قاسمی کا ایک کامیاب افسانہ ہے ۔ اس میں افسانے کے سارے عناصرِ ترکیبی موجود ہیں ۔ وحدتِ تاثر جو افسانے کا اہم عنصر شمار ہوتا ہے ۔ یہاں مکمل طور پر موجود ہے ۔ اس میں زندگی کا ایک ہی پہلو " مامتا کی محبت " کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ مصنف نے اس موضوع کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔ ماں کی گفتگو سے، ہر لمحہ، مامتا، کا احساس ملتا ہے ۔ افسانے کے واحد متکلم (اپنے بیٹے) کی سفر پر روانی سے پہلے وہ اُسے کہتی ہے:

> "تُم ہانگ کانگ جا رہے ہو ۔ تمہارے درمیان پہاڑ اور سمندر کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لعل! لام اگر اُدھر بھی ہونے لگی اور تمہارے دُشمنوں پر بھی کوئی آنچ آ گئی تو بتاؤ، میں یہاں اُجڑے پُجڑے گاؤں میں، کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اُٹھوں گی ۔ نہ جاؤ، میرے بیٹے ۔۔۔۔ وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا ۔ تمہارے بالوں میں

> تیل کون ڈالے گا۔ تمہاری آنکھوں میں گری پلک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کا بٹن کون ٹانکے گا ـــــــــ؟''

افسانے کا ایک اور عنصر، وحدتِ زمان و مکان ہے۔ افسانے میں زمانی و مکانی پھیلاؤ دکھانا، اِس کی تاثیریت کو مجروح کرتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ہی زمانے میں شروع ہو کر، ایک ہی زمانے میں ختم ہو جاتی ہے۔ افسانے کی ایک خوبی اس کی اختصاریت بھی ہے۔ یہ افسانہ بھی ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں تمہید بھی ہے۔ ارتقا بھی ہے، عروج بھی ہے اور شاندار اختتام بھی۔ چینی عورت، جب افسانے کے واحد متکلم کی قمیص میں بٹن لگا چکتی ہے تو اُسے بتاتی ہے کہ:

> ''میرا بیٹا، جلدی میں تھا۔ میں پکارتی رہی، مگر اُس نے میری ایک نہ سُنی۔ اُسکی قمیص میں تمہاری قمیص کی طرح ایک بٹن نہ تھا۔''

یہ سب کچھ سننے کے بعد، فسانے کا واحد متکلم کہتا ہے کہ

> ''میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں اُبھر کر، اُلٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں۔''

بڑے افسانے کی کہانی میں تاریخ بھی بول رہی ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی قوتیں جہاں جہاں بھی ہوتی ہیں، مقامی لوگوں کا استحصال کرتی ہیں۔ پرانے ہانگ کانگ بھی فسانے کے واحد متکلم کو یہی بتاتے ہیں کہ ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ کولون اور اصلی چین کی سرحد پر، ہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اُس کا بوجھ ہلکا کر کے اُسے چین میں دھکا دے دو۔ یا، پھر کسی مقامی لڑکی کو اُٹھا کر بیرک میں لے جاؤ اور سارجنٹ کا چھاپہ پڑنے پر لڑکی کو سارجنٹ کے حوالے کر دو۔

افسانے میں کہانی پن بھی موجود ہے۔ دلچسپی شروع سے آخر تک موجود ہے۔ واحد متکلم کہانی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرہ دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب کے چہرے پر اس معصوم بچے کی سی لٹی لٹی کیفیت تھی جس کے منہ سے قبل از وقت دودھ کھینچ لیا جائے۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی۔''

اس افسانے کی ایک فنی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں پنجاب کی ثقافت بڑے بھرپور انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پنجاب کے لوگوں کو، اگر آج بھی سر، میں درد محسوس ہو تو سر، میں روغنِ بادام ڈلواتے ہیں۔ دُکھ اور مصیبت میں، بچے آج بھی ماں کے گُھٹنے سے ٹیک لگ کر بیٹھتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی ماں اپنے بیٹے کو روکتے ہوئے یہی کہتی ہے کہ:

> ''بھوکوں مریں گے، پرا کٹھے مریں گے۔ اور بیٹا، اگر تُم ہانگ کانگ میں ہوئے اور
> اِدھر میں، مرگئی تو میری قبر پر تمہارے حصے کی مٹی کون ڈالے گا۔ جو مولوی جی کہتے ہیں
> کہ ماں کی قبر کے اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی ہے۔''

جذباتیت افسانے کی روح ہوتی ہے۔ یہی جذباتیت تو قاری کو کہانی میں گُم (involve) کرتی ہے۔ اچھا افسانہ نگار، ایک اچھا جذبات نگار بھی ہوتا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم، جب جاپانی فوج کا قیدی بن جاتا ہے تو اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ قید ہونے سے پہلے بھی وہ ہانگ کانگ میں تھا، مگر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے، مگر قیدی بننے کے بعد، اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہے، اور اُس کی ماں کے نقوش بھی اب دُھندلا گئے ہیں۔ ادب، دراصل، انسانی محسوسات کے مطالعہ کا نام ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے یہ جُملے، احساسات کا خوبصورت اظہاریہ ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کو علمِ بیان پر بھی عبور حاصل ہے۔ وہ صنائع اور بدائع کے فن سے خوب واقف ہیں۔ افسانے میں روزمرہ کے ساتھ ساتھ تشبیہات و استعارات کا بھی بھرپور اور برمحل استعمال نظر آتا ہے۔ مثلاً:

> تمہارے دُشمنوں پر بھی کوئی آنچ آ گئی تو ۔۔۔۔
>
> تمہارے دُشمنوں کو نمونیا ہو گیا تو ۔۔۔۔
>
> پچھلے سال کی طرح، میری زبان کونلہ ہو جائے، اگر دُشمنوں کے آدھے سر میں درد اُٹھا تو ۔۔۔۔
>
> تیز ٹھنڈی ہوا، میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی ۔۔۔۔
>
> اور میری قمیص کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھرے گئے تھے ۔۔۔۔

یہ سب تشبیہات و استعارات افسانے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ افسانے میں منظر نگاری کے فن کو بھی خوب نبھایا گیا ہے۔ جہاں جہاں منظر نگاری کی گئی ہے، وہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم سا جاتا ہے۔

> ''اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی طرح نمودار ہو گئی۔ اُس کے عین وسط میں، چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی اَن گنت پگڈنڈیاں، ان کے قریب آ کر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ اُن کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ اور سب سے آخر میں، ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ۔ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا۔ بالکل کھلونا اور جب میں سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔''

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ماتا کی یہ تمام خوبیاں اُسے ایک کامیاب افسانہ بنا رہی ہیں اور افسانے کا دلچسپ اختتام تو ایک بھرپور تاثر چھوڑ رہا ہے۔

''وہ بولتی چلی گئی۔ تمہاری ماں ہے؟

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی، مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی۔ اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اُس نے جیسے چوری چوری، میرے ایک گال پر بوسہ دیا۔ میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں اُبھر کر اُلٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں۔''

مجھے کہانی پڑھنے کے بعد یقین ہو گیا کہ جذبے واقعی نور ہوتے ہیں، روشنی ہوتے ہیں، روشنی 1,86,000 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم بھی، جب ماں کی ممتا کے نور سے ہم کنار ہوتا ہے تو خود، نور (روشنی) بن کر ایک لمحے میں، پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں جا گرتا ہے۔

☆☆☆☆

لبنیٰ انصاری

''سناٹا'' ہماری قومی انفعالیت کا استعارہ

تمام اصناف ادب میں افسانہ وہ صنف ہے جو نثر کی فارم میں زندگی کے حقیقی رنگوں کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئے انداز سے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چوں کہ ایک افسانہ نگار اپنے فن پارے کے موضوع، پلاٹ اور کردار کی تشکیل میں بڑی حد تک شعوری کوشش بھی کرتا ہے اس لحاظ سے یہ نسبتاً کم تخلیقیت کی حامل صنف سمجھی جاتی ہے۔ ایک افسانہ نگار اپنے فن کی آبیاری کے لیے نہ صرف اپنے آس پاس کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے بل کہ انسانوں کے نفسیاتی تجزیے کا شعور بھی حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی اسی ژرف بینی اور طباعی کی بدولت اپنے فن پارے میں معنی خیز الفاظ اور ندرتِ اظہار سے حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک اچھا افسانہ نگار زندگی کی تمام بے رحم صداقتوں اور انسانی فکر کے تضادات کو اس طرح انسانی زنجیر میں پروتا ہے کہ قاری فن پارے سے محظوظ بھی ہو اور زندگی کی ہمہ گیر ترقی کے پردے میں لپٹے تمام منفی اور مثبت امکانات کا شعور بھی حاصل کر لے۔ اس لحاظ سے فن افسانہ نگاری ایک نہایت اہم ذمہ داری ہے اور اس سے وہی شخص بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس نے زندگی کو اس کے سیاسی، سماجی، معاشی غرض ہر پہلو سے پرکھا اور محسوس کیا ہو۔

اردو ادب میں پریم چند کے دور سے شروع ہونے والے افسانے کی روایت کو جن لوگوں نے اپنے فکر و فن سے اعتبار بخشا اور ان میں سے ایک نام محترم احمد شاہ ندیم قاسمی کا بھی ہے جو ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو نوے برس کی عمر میں شیدایانِ ادب کو افسردہ و ملول چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے، انا للہ و انا الیہ راجعون!

قاسمی صاحب کی موت ادب و صحافت کی دنیا کا ایک عظیم خسارہ ہے اور ایک طویل عرصے تک اس کمی کو محسوس کیا جاتا رہے گا۔ وہ محض ایک ادیب ہی نہ تھے بل کہ ایک پوری ادبی تحریک کا درجہ رکھتے تھے اور اپنی عمر بھر کی محنت سے جو قلمی اثاثہ وہ اپنی قوم کے لیے چھوڑ گئے ہیں وہ یقیناً آئندہ کئی نسلوں کے لیے مشعل راہ رہے گا۔

قاسمی صاحب نے ایک بھرپور تخلیقی زندگی گزاری، وہ ایک عمدہ نثر نگار، نقاد و مبصر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی اور اپنے ذاتی جریدے سہ ماہی ''فنون'' کے گزشتہ پچاس سال سے ادارتی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ دیگر مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات سے بھی منسلک رہے۔ وہ ایک بہترین استاد، محبِ وطن پاکستانی اور

ادب دوست انسان تھے۔ ادب وصحافت کے میدان میں انھوں نے بے مثال خدمات انجام دیں ان کا دل جذبۂ قومی ہمدردی سے سرشار تھے، اسی لیے ملک میں پھیلی سیاسی ابتری، معاشی ناآسودگی اورعوام کے استحصال کے خلاف اپنے زورقلم سے ہمیشہ جہاد کرتے رہے۔ آپ ترقی پسند تحریک کے بانیان میں سے تھے بل کہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ قیام پاکستان کے بعد اس تحریک کے مقاصد کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے والے آپ ''آخری آدمی'' تھے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک وہ اسی کی آبیاری میں مصروف رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے قویٰ سلامت ہیں۔ میں بحیثیت فنکار رخصت ہونے کی اجازت طلب نہیں کروں گا۔ چناں چہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے ذرائع طباعت واشاعت گواہ ہیں کہ انھوں نے اپنا یہ قول زندگی کی آخری سانس تک نبھایا۔ ادب وصحافت کے میدان میں قاسمی صاحب کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان کا فن برصغیر کی تاریخی، تہذیبی اور معاشی صورت حال کا آئینہ دار ہونے کے باعث قومی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔

قاسمی صاحب نے جس وقت ادب کی دنیا میں قدم رکھا، یہ دور ہندوستان میں سیاسی ابتری کا دور تھا۔ آزادی کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں اور ترقی پسند تحریک نے ادب میں شخصی آزادی، معاشی مساوات، اور جمہوری نظام عدل کے قیام کا نعرہ بلند کر رکھا تھا۔ چناں چہ قاسمی صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس میں فوری شمولیت اختیار کی کیوں کہ وہ ایک حساس انسان تھے اور انسانیت کے ہر دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے اور اس کے درماں کے متلاشی بھی رہتے۔ لیکن جب قیام پاکستان کے بعد اس تحریک نے ایک سیاسی پروپیگنڈے کی صورت اختیار کی تو آپ نظریہ فن کی بنیاد پر اس کے دل سے حامی نہ رہے تھے۔ گو آپ خود بھی سیاست کو ادب کی روح قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ ادب میں سیاست کو براہ راست نہیں بل کہ ''ان ڈریکٹ'' کی صورت استعمال کیا جائے اور اپنے مقاصد کے حصول میں فن کو نظریے کی بھینٹ نہ چڑھلیا جائے جیسا کہ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا ''نظریہ کوئی بھی ہو فن کا لحاظ ضروری ہے۔'' چناں چہ اپنے اس نظریۂ فن کی بنیاد پر اپنی تخلیقات میں وہ ایک طرف تو رمزیہ اور علامتی پیرائیہ اظہار میں زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنے مسلک کے اظہار سے بھی غافل نہیں رہتے لیکن یہ دونوں کام وہ نہایت مہارت اور سلیقہ مندی سے یوں انجام دیتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں کلاسیکیت و جدیدیت کا حسین امتزاج ہونے کے ساتھ ان کے سیاسی وسماجی شعور کی بھی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

دیگر تمام ادبی خدمات سے قطع نظر قاسمی صاحب فن افسانہ نویسی میں اپنی متوازن شخصیت اور سیاسی نظریات کا مکمل اظہار کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جذبے اور احساس کی کثرت سے مالا مال ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا خاص موضوع بے جا سماجی پابندیوں، طبقاتی تضادات، مفلسی، ظلم و استحصال اور زمینداروں و وڈیروں کی عیش پرستی کے خلاف احتجاج تھا لہٰذا دیہات کے رومانی پس منظر میں لکھے گئے ان کے تمام افسانے کسانوں اور مزارعوں کی بے بسی کے گرد گھومتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان میں فطرت کی حسن کاریاں بھی جھلکتی ہیں۔ گاؤں کی زندگی کے تمام تلخ حقائق کو قاسمی صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا زہر قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارا تھا، اسی لیے ابتدائی دور کے ایسے بیشتر افسانوں میں شدید جذباتیت کا عنصر غالب ہے تاہم وقت کے ساتھ یہ جذباتیت معاملہ فہمی اور مصلحت کوشی میں تبدیل ہوتی چلی گئی ہے۔ گاؤں کی زندگی چوں کہ قاسمی صاحب کی اپنی زندگی تھی اس لیے ان کے فن کے حوالے سے نیک شگون رہی اور اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ میں انھیں کوئی وقت پیش نہ آئی تاہم انھوں نے شہری زندگی اور اس کے پیچیدہ مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں بڑی مہارت سے سمویا ہے۔ شہر کی چمکتی دمکتی زندگی میں خاص طور سے وہ خواتین کے مسائل کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ چوں کہ قاسمی بحیثیت مدیر رسالہ ”تہذیب نسواں“ سے بھی منسلک رہے تھے لہٰذا یہ امر بھی ان کے لیے خواتین کی نفسیاتی گرہ کشائی کے ضمن میں مد رہا۔ لیکن عورت قاسمی صاحب کے افسانوں میں صرف ایک عورت نہیں بل کہ بعض جگہ ایک علامت بن کر ابھری ہے۔ اور یہ علامت ہے انسانی بے بسی و بے چارگی کی۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ”سناٹا“ ایک بے مثال افسانہ ہے۔ یہ افسانہ قاسمی صاحب کی فنی زندگی کا بھی ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ قاسمی صاحب کا یہ افسانہ نہ صرف ان کے سیاسی نظریات کا کھلا اظہار کر رہا ہے بل کہ تکنیکی اعتبار سے بھی خاصا مضبوط ہے۔ بظاہر سادہ سے پلاٹ پر لکھے گئے اس طویل مختصر افسانے میں انھوں نے مشرق کے نظام معاشرت کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے ازلی بے بسی، لاچاری، اطاعت شعاری اور شرافت نفسی کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن بباطن ملک و قوم کی ترقی کے لیے مناسب معاشی منصوبہ بندی اور جمہوری نظام عدل کے قیام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار کلثوم ہے جو سات افراد پر مشتمل کنبے کی واحد کفیل ہے۔ اس کا بڑا بھائی جس سے ایک بہن ہونے کے ناطے وہ بہت محبت کرتی رہی ہے اپنے بہتر مستقبل کی خواہش میں اپنی بیوی سمیت ان سب سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ تقسیم سے قبل اپنی زندگی کے نسبتاً اچھے دنوں میں کلثوم کو عشقیہ ناولوں اور عشقیہ

اشعار کے مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور اپنے اسی ادبی ذوق کی بدولت اسے نہ صرف زندگی کا گہرا شعور حاصل ہوا تھا بلکہ اسی شوق نے اسے زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کا جذبہ بھی بخشا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کلثوم کا دل صرف دل نہ تھا بلکہ ارمانوں کا موجیں مارتا ایک سمندر تھا۔ جس میں اس کی روح دن رات ابھرتی ڈوبتی، تیرتی رہتی تھی۔ بھائی کی بے اعتنائی اور اس کی بے وقت جدائی کی خلش اپنے دل میں لیے کلثوم نے گو زندگی کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا تھا لیکن اس کی زندگی کے حسین خواب اور ان دیکھی خوشیوں کا تصور اکثر اسے اپنی جانب کھینچ لیا کرتا تھا۔ وہ ہر احساس اور ہر جذبے سے خود کو دور بھگائے لیے پھرتی کیوں کہ اپنے خوابوں کی حسین تعبیر پانا اس کے بس میں نہ تھا۔ ماں کی روک ٹوک اور بہنوں کی محرومیوں کا احساس اس کی ہر خواہش پر مقدم آ جاتا۔ اس تمام کشمکش میں وہ جس کرب و اذیت سے دوچار ہو رہی تھی، اس کی ماں کو اس کا یقیناً احساس تھا کیوں کہ وہ بھی ایک عورت تھی، شاید اسی لیے وہ اس کے نسائی جذبات کو دبانے میں اس کی غیر محسوس مدد کرتی رہتی ہے اور اسے اپنی "مرد بیٹی" کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ کلثوم کی تمام بہنیں بھی اس کے لیے نیک خواہشات رکھتی ہیں اور اس کے اچھے مستقبل کی آرزومند ہیں لیکن اس کی جدائی چوں کہ اس کے مستقبل کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے لہٰذا وہ خاموش تماشائی بنے رہنے اور وقت کی راہ تکنے پر مجبور ہیں۔ کلثوم کی ماں اس کا گھر بسانے کی بھی کوشش کرتی ہے لیکن یہاں بھی اس کی مجبوری اسے خودغرض بنائے رکھتی ہے اور وہ ایک گھر داماد کی تلاش میں رہتی ہے تاکہ کلثوم اسی گھر میں رہ کر اس کے اور دوسرے افراد خانہ کی کفالت کا ذریعہ بنی رہے۔ بالآخر کلثوم کے سکول کا ایک کلرک جمال جسے وہ پسند بھی کرتی ہے کلثوم کی محبت میں گھر داماد بننا قبول کر لیتا ہے لیکن یہاں مصنف نہایت ڈرامائی انداز سے کہانی کو اختتامی موڑ دیتے ہیں اور اب کلثوم شادی سے یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی کیوں کہ اب وہ مرد ہو چکی ہے۔

پلاٹ نگاری، کردار نگاری اور وحدت تاثر کے حوالے سے قاسمی صاحب کا یہ افسانہ ان کی فن سے بھرپور محبت اور زبان و بیاں پر مکمل دسترس رکھنے کا غماز ہے۔ پورے افسانے میں انھوں نے بھرپور رمزیہ انداز استعمال کیا ہے۔ برجستہ مکالموں اور روزمرہ محاورات کے استعمال اور تشبیہات و استعارات کے نگینوں نے اس افسانے کے اسلوب بیاں میں تازگی اور شاعرانہ حسن کاری سمودی ہے۔ کہانی کا آغاز ہی اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کی بھرپور توجہ سمیٹ لیتا ہے، لکھتے ہیں:

> "انبالے میں وہ عشق کرنے کی بجائے عشقیہ ناول پڑھتی تھی مگر آزادی کے اعلان کے

> ساتھ ہی وہاں سے کچھ اس طرح دامن جھاڑ کر بھاگنا پڑا کہ ناول کے ساتھ غزلوں کے وہ منتخب اشعار بھی وہیں رہ گئے جنھیں وہ سونے سے پہلے گنگنانے کی عادی تھی۔ گنگناتی تو وہ اب بھی تھی مگر یہ گنگناہٹ لفظوں سے بے نیاز تھی اور پھر چلتے ہوئے کنوئیں کی روں روں میں صرف رہٹ ہی کا نغمہ تو نہیں ہوتا۔ اس میں جُتے ہوئے بیل کی رماندگی اور گادی پر بیٹھے ہوئے کسان کے خوابوں کی الاپ بھی تو شامل ہوتی ہے۔ سو کلثوم کی یہ گنگناہٹ محض گنگناہٹ نہ تھی۔ اس میں اس کے شباب کی تھکن اور اس کے جذبات اچٹتی نیندوں کی پکار بھی تو شامل تھی۔“

بظاہر یہ اقتباس کسی الھڑ دوشیزہ کی امنگوں اور ارمانوں بھرے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے لیکن بباطن پوری قوم کے ٹوٹے بکھرے خوابوں کی کرچیاں اس میں پیوست ہیں۔ دراصل قاسمی صاحب کا یہ افسانہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں کلثوم کا کردار پاکستان کی استحصالی عوام کی علامت بن کر ابھرا ہے، جب کہ اس کی ماں وہ حاکم طبقہ ہے جو جمہوری اقدار کے منافی فیصلے کر کے عوام کو بے جا سماجی پابندیوں اور معاشی کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی خیال دراصل قیام پاکستان کی تاریخ سے مستعار ہے اور وہ جو شخص بھی تحریکِ پاکستان، قیام پاکستان اور اس کے بعد تنظیم پاکستان کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی کشمکش کے پس منظر سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے با آسانی اس افسانے کی بلیغ ایمائیت میں مخفی افسانے کی سیاسی جہتوں کو پہچان سکتا ہے۔

آزادی سے متعلق تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں نے جب قیامِ پاکستان کے مقاصد بیان کیے تھے تو مسلمانوں کی اکثریت نے اس کا خیر مقدم صرف اس لیے کیا کہ انھوں نے ایک ایسی آزاد ریاست کا خاکہ تصور میں بسا لیا تھا کہ جو سماجی مساوات اور جمہوری نظام اقدار کی پروردہ ایک ایسے معاشرتی ڈھانچے کی حامل ہو گی، جس میں انصاف، برابری، آزادی اور خوش حالی ہو گی، طبقاتی تضادات سے دور معاشرے کے تمام افراد کو ترقی کرنے، تعلیم پانے اور زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں چننے کے یکساں مواقع میسر آئیں گے۔ لیکن بد قسمتی سے ہوا اس کے برعکس یعنی آزادی کے ساتھ ہی لوٹ مار، سیاسی کشمکش اور اقتدار کی چھینا جھپٹی کا تماشا اس قوم کا مقدر بن گیا۔ حاکم طبقہ اپنی دولت اور طاقت کے بل پر عام آدمی کو اس کے جائز حق سے محروم کر کے اس مملکت کو اپنی ملکیت سمجھنے لگا اور ایسے لوگ اقتدار پر قابض ہو گئے جنھیں سیاسی، سماجی، معاملات کی الف ب سے بھی آگاہی نہ تھی، اس پر مستزاد مارشل لاء کے نفاذ نے شخصی آزادی کے تصور کو ایک دم ہی پارہ پارہ کر کے رکھ دیا،

یوں آزادی کے وہ تمام خواب جو تقسیم سے قبل دکھائے گئے تھے۔ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے اور پوری قوم مایوسی و دل شکستگی کا شکار ہوتی چلی گئی۔

اقتدار کے شائق سیاست داں ٹولے کے اسی شوقِ حکمرانی نے ملک کو آزادی کے صرف تیس سال بعد دولخت کر دیا اور بنگلہ دیش کی وہ عوام تحریکِ آزادی میں دیگر مسلمانوں کے ہمراہ شریک رہی تھی اسی ظلم و استحصال اور بے اعتدالی کے سبب علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ پاکستان کا یوں دولخت ہو جانا بھی ہماری تاریخ کا ایک دل دوز سانحہ تھا اور کوئی بھی حساس محبِّ وطن شہری اس سانحے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ چناں چہ اس دور کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس سانحے پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار بھی کیا۔ چوں کہ قاسمی صاحب ایک حساس اور محبِّ وطن انسان تھے اور اپنے ملک کے تمام لوگوں سے محبت کرتے تھے لہٰذا انھوں نے بھی اپنے افسانے میں بھیا اور بھابی کے کرداروں کو علامتی طور سے استعمال کرتے ہوئے اسی سانحے کے اہم محرکات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے فطری جذبہ حب الوطنی کے ہاتھوں مغلوب ہو کر وہ تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔

قاسمی صاحب اس افسانے میں سماجی انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں، ایک ایسا معاشرہ جہاں کسی پر ظلم نہ ہو اور عوام جمہوری فضاؤں میں سانس لیں اور ہر فرد کو اس کی فطری خواہشات کی تکمیل کا موقع بھی میسر آ سکے لہٰذا ماں کے کردار کی علامت کے ذریعے دراصل وہ مارشل لاء کی مذمت کرتے ہیں لیکن یہاں غالباً مصنف قصداً اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ کسی بھی ملک میں جمہوری عمل کی کامیابی کا دارومدار اس ملک کی سیاسی جماعتوں پر بھی ہوتا ہے جبکہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مقتدر سیاسی جماعتوں کے اپنے داخلی تنظیمی ڈھانچے ہی جمہوری روایات کے منافی رہے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام جماعتیں خود کو منظم کرنے کے ساتھ ملک کی آزادی اور خودمختاری قائم رکھنے کے سلسلے میں حکومت کی معاونت کرتیں اور بے جا محاذ آرائی کے بجائے باہمی مفاہمت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ملک میں امن و قیام کو یقینی بناتیں اور تحمل و برداشت اور بردباری کا مظاہرہ کرتیں۔ تو یہ عوام کو آزادی کی لذتوں سے حظ اٹھانے کا موقع فراہم کرتا اور ایک خوشحال پاکستان کی تعمیر میں بھی ممد رہتا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین اپنی اپنی جماعتوں کو موروثی جائیداد کے بطور استعمال کرتے رہے جبکہ مذہبی سیاسی جماعتوں نے انتہاپسندی کی راہ اختیار کرتے ہوئے مذہبی منافرت کو ہوا دی جس سے نہ صرف ان جماعتوں کا

سیاسی وقار مجروح ہوا مثلاً کہ کئی بار ملک میں داخلی انتشار اور دہشت گردی کی فضا بھی قائم ہوتی رہی۔ چناں چہ ملک کی سالمیت کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر فوج کو وقتاً فوقتاً انتظامی معاملات میں مداخلت کرنی پڑی اور ایک طرح سے آج بھی یہ صورتِ حال ہنوز برقرار ہے۔ بہر حال اس اطناب کلام سے قطع نظر حقیقتاً افسانہ ''سناٹا'' قاسمی صاحب کی شش جہاتی فکر کا آئینہ دار ہے، جس میں انھوں نے بیک وقت زندگی کے متضاد تجربات کو ایک وحدت بنا کر پیش کیا ہے۔ پورے افسانے کا ایک ایک مکالمہ بھرپور دلکشی اور تہہ در تہہ معنوی گہرائی کا حامل ہے جو مصنف کی زبان و بیاں پر قدرت کا ثبوت ہے، ساتھ ہی قومی و ملی مسائل کے حوالے سے ان کے پرخلوص جذبات فکری گہرائی اور اظہار کی بے ساختگی نے مل کر افسانے کو تزکیۂ زندگی کا وسیلہ بھی بنا دیا ہے۔ زندگی جو فن کا بنیادی موضوع ہے، اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ اس افسانے میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے لیکن چوں کہ تفسیرِ حیات کے ساتھ ساتھ تطہیرِ حیات بھی فن کا لازمہ ہے۔

چناں چہ افسانے میں کلثوم کی دیگر بہنوں کے انفعالی کرداروں کے ذریعے مصنف نے قوم کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ قومی زندگی کی بقاء اور ارتقاء کا دار و مدار قوم کی مشترکہ جد و جہد پر ہے، کسی ایک فرد یا ادارے پر سارا بوجھ ڈال کر خود کو بری الذمہ سمجھنا ایک منفی رویہ ہے۔ اگر کلثوم کی بہنیں چاہتیں تو معاشی جد و جہد میں اپنی بہن کا گھر بیٹھے بھی ہاتھ بٹا سکتی تھیں، اس طرح نہ صرف ان کی زندگی میں خوش حالی آتی بلکہ اپنی مدد آپ کا یہ اصول اپنا کر وہ اپنی ماں (حکومت) کو بے فکری سے مستقبل کی بہتر منصوبہ بندی کا موقع بھی فراہم کرتیں۔ لیکن اب اس کا کیا کیجیے کہ یہاں ساتھ ہی مصنف نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آزادیٔ اظہار رائے ہی انسانی فکر کی بالیدگی اور شعور کی پختگی کا ذریعہ ہے اور جب اسی پر پہرے بٹھا دیے جائیں تو قوم کا اجتماعی ذہنی ارتقاء کیوں کر ممکن ہو سکے گا؟ جیسا کہ افسانے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ کلثوم اور اس کی بہنوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر آزادانہ عام گھریلو معاملات پر بھی بحث کی کوئی اجازت نہیں اور اگر بھولے سے کسی نے ایسا کیا بھی تو والدہ صاحبہ نے اس کی اچھی خاصی خبر لے ڈالی، اسی لیے وہ سب کی سب بے معنی ہنسی مذاق کر کے وقت گزاری پر مجبور تھیں۔ اس طرح مصنف نے یہاں آمرانہ طرزِ حکومت کی ایک خامی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قومی زندگی پر طاری جمود کے اسباب بھی بیان کر دیے ہیں۔ ان سب حقائق کے ساتھ ساتھ مصنف نے اس افسانے میں معاشرے کے اس دہرے معیار پر بھی طنز کیا ہے جہاں خواتین گھر سے باہر تک مردانہ وار اپنی وہ ذمہ داریاں پوری کرنے پر تو مجبور کر دی جاتی ہیں جن سے دوسروں کو فیض پہنچے لیکن خود اپنی زندگی اور اپنی ذات کے حوالے

سے وہ کوئی فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہوتیں اور معاشرے کا یہی تضاد انھیں نفسیاتی دباؤ کا شکار کر کے ذہنی مریض بنا ڈالتا ہے۔

کسی مقصد کے حصول کے لیے فن کو آلہ کار بنانا وہ بھی اس طرح کہ فنکار کا اسلوب اس کے مقصد کا اظہار بھی کر دے اور فن کے جمالیاتی تقاضوں پر بھی حرف نہ آئے، تخلیقِ فن میں حد درجے خلوص اور ریاض کا متقاضی ہے، جس میں قاسمی صاحب ہر لحاظ سے کامیاب تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنی کلاسیکی ادبی روایت کو نئے دور کے سماجی تقاضوں سے یوں آہنگ کیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بحیثیت مجموعی قاسمی صاحب نے اس افسانے کے ذریعے عملاً ثابت کیا ہے کہ ادب اپنے قاری میں سیاسی سماجی شعور کی بیداری کا ذریعہ تو ہے لیکن سیاسی محاذ آرائی کا وسیلہ ہرگز نہیں۔

یوں تو قاسمی صاحب کی ادبی اور ادارتی خدمات کے حوالے سے بڑے بڑے نقادانِ علم و فن نے انھیں ان کی زندگی ہی میں خراجِ تحسین پیش کیا اور آج بھی کئی قلم ان سے محبت اور عقیدت کے اظہار میں یقیناً مصروف ہوں گی لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ نظر ان کے فن پاروں کا مثبت انداز سے تجزیہ کرتے ہوئے اس میں مخفی ان پیغامات کو سامنے لائیں جو ملک و ملت کی ترقی میں مددگار ہوں۔ چوں کہ وہ زندگی سے پیار کرنے والے انسان تھے اس لیے ان کے نوکِ قلم سے نکلا ایک ایک حرف زندگی کے ارتقا اور بقاء کا پیغام دے رہا ہے ان کا سب سے بڑا ادبی کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنا ایک مخصوص سیاسی اور سماجی نظریہ ہونے کے باوجود زندگی کی قطعی بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تنقید کرتے ہیں (یہ خوبی ان کے آخری دور کے فن پاروں میں خاص طور پر نمایاں ہے) اور زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ ڈالے بغیر اسے اس کے اصلی رنگوں میں مکمل توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو بڑے ظرف اور حوصلے کا کام ہے اور اپنے اس معجزہ فن کی نمود کے لیے انھوں نے جس وسیع النظری اور دردمندی سے اپنے قومی مسائل کا احاطہ کیا ہے اور پھر اسے متوازن انداز سے حیطۂ تحریر میں لاتے ہوئے وہ جس روحانی کرب سے دوچار ہوئے ہوں گے اس کے بعد اپنے رب سے ان کی یہ دعا یقیناً بجا ہے:

اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس عہد کی دوزخ میں جلایا ہے مجھے

پروردگارِ عالم ان کی یہ دعا قبول فرمائے۔ آمین!

اویس الحسن خان

‘‘کپاس کا پھول’’ کا تجزیاتی مطالعہ

احمد ندیم قاسمی بیسویں صدی کے بہت مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۶ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ لیکن اپنی بے پناہ تخلیقات کے سبب ان کا نام اردو علم و ادب کے جہان میں تا قیامت جگمگا تا رہے گا۔ قاسمی صاحب نے قریب قریب ہر صنفِ ادب میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تاہم زیرِ نظر تحریر میں ان کے افسانوں کے شہرہ آفاق مجموعہ ‘‘کپاس کا پھول’’ میں درج افسانوں کا جائزہ لینے کی کاوش کی گئی ہے۔

‘‘کپاس کا پھول’’ پہلی بار ۱۹۷۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں کل ۱۷ افسانے شامل ہیں جو ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۲ء کے درمیانی عرصہ میں ضبطِ تحریر میں آئے۔ قاسمی صاحب نے ان افسانوں میں اپنی اجتہادی فکر کے تحت کام کیا ہے کیوں کہ اس دور میں دیکھا جائے تو اردو افسانے پر علامت اور تجرید کا غلبہ تھا اور مقبول عام افسانے وہی ٹھہرے تھے جو متذکرہ بالا ہر دو صفات سے متصف تھے۔ تاہم قاسمی صاحب نے ان افسانوں میں سیدھا سادہ اور بیانیہ انداز اختیار کیا۔ لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہے کہ انھوں نے اپنے فکری اجتہاد سے کام لے کر بیانیہ انداز میں بھی افسانوی جہان میں نئے نئے افق دریافت کیے۔ یہاں پر ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک سے نہ صرف وابستہ رہے بل کہ وہ اس کے نمائندہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس تحریک سے وابستگی کے زیرِ اثر ان کے افسانوں میں خارجیت، حقیقت نگاری اور مقصدیت تو موجود ہے لیکن ان کے فکری و ذہنی اجتہاد کے تحت یہ سب خصوصیات نعرہ کا عنوان نہیں بنیں بل کہ یہ ادب اور فن کے درجہ پر ہی فائز ہوئیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے ہاں ایک اور وصف بھی قدم بہ قدم موجود رہا اور وہ وصف تھا خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت۔ یہ بات خالصتاً قاسمی صاحب کا ہی مخصوص اسلوب اور طرزِ نگارش سے منسوب ہے۔ قاسمی صاحب کے افسانوں کی زباں و بیاں کا انداز بڑا دلکش اور دلربا ہے۔ وہ تکلفات سے کام نہیں لیتے بل کہ ماحول سے مطابقت رکھنے والے الفاظ کو بڑی نرمی اور سلیقے کے ساتھ برتتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان اپنے افسانہ کی بنت سے بہت قریب قریب اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ ان کے مکالمے کرداروں

کی شخصیت کو ابھارتے ہیں۔ لیکن یہ ابھارنے کا عمل کسی فلسفے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ سیدھی سادی کہانیوں کو بیان کرنے کی قدرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کے ہاں بہت کم طنزیہ مکالمے ملتے ہیں۔ ''کپاس کا پھول'' میں بھی یہ خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ اگرچہ اس مجموعہ میں ان کے سبھی افسانے اپنی آن بان اور شان رکھتے ہیں تاہم 'تمر'، 'کپاس کا پھول'، 'فیشن'، 'ماسی گل بانو'، 'سفارش'، اور 'لارنس آف تھلیبا' اپنی کہانیوں اور زبان و بیان کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

''کپاس کا پھول'' کا پہلا افسانہ ''تمر'' ہے۔ اس افسانے میں دونوں خصوصیات یعنی خارجیت اور داخلیت کے حوالے موجود ہیں۔ قاسمی صاحب کے خاص انداز کی وہ خاصیت جو ان کو دھرتی سے جوڑے رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں دیہی معاشرے کی پوری پوری معاشرت منعکس ہوتی ہے۔ اس معاشرت میں یہ آشکار ہوتا ہے کہ کس طرح لڑکے بالے گاؤں کی الھڑ مٹیاروں پر اپنی دکان نچھاور کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس معاشرت کی منافقتیں، سازشیں، نفرتیں اور چاہتیں اپنے رنگ دکھاتی ہیں۔ اس افسانے میں خارجیت کے ساتھ داخلیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ شہباز کے کردار میں یہ دونوں وصف نظر آجاتے ہیں۔ دلیر نام کا کردار جنت نام کی عورت کو حاصل کرنے کے لیے شہباز کو اکساتا ہے اور وہ جنت کے خاوند کو قتل کر دیتا ہے۔ جنت دلیر کے ساتھ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہی جنت پھر شہباز کے خلاف بھی گواہی دے کر اسے پھانسی دلانا چاہتی ہے مگر شہباز کا باپ زمین بیچ کر اپنے بیٹے کو چھڑا لیتا ہے۔ داخلیت کے حوالے سے ہم دیکھیں تو شہباز ٹھگنے قد کا مالک ہے لیکن گاؤں کے لوگوں کے ہنسنے پر اپنے احساسِ کمتری کو مٹانے کے لیے بانکا سجیلا بنتا ہے۔ لیکن بات نہیں بنتی۔ پھر وہ تمرا اٹھا لیتا ہے اور دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پہلے محبوبہ کے خاوند کو قتل کرتا ہے پھر محبوبہ کے دوسرے عاشق کا بھی قتل کر دیتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ننگے جسم کو بھی حقارت سے دیکھتا ہے اور اس پر تھوک کر احساسِ کمتری کا ازالہ کرتا ہے۔ اس کردار میں گاؤں کے لوگوں کی نفسیات بھی جھلکتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس معاشرت کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔

اس مجموعہ کے دوسرے افسانے ''فیشن'' میں خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ کرداروں کی جنسی نفسیات کو بھی سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کا موضوع بڑے گھر کی ایک لڑکی کا جامد اور غیر متحرک کردار ہے جو اپنی ساکت زندگی سے اکتاہٹ کا شکار ہے اور اس کا حل یہ نکالتی ہے کہ فلرٹ کرے۔ نجمہ اپنی جنسی گھٹن کا علاج ایک نوجوان نوکرانی حلیمہ سے دوستی کر کے اور شیخ منصور سے خط و کتابت کے ذریعے عشق کر کے کرتی ہے۔ اس

عشق کے دوران منصور حلیمہ سے جنسی تعلق قائم کر لیتا ہے۔ اور جب آخر میں نجمہ اور منصور کی شادی ہو جاتی ہے تو حلیمہ ایک حرامی بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ اس افسانے کی مجموعی فضا شہروں کے پرانے محلوں کے ماحول کو تخلیق کرتی ہے جہاں نوکرانیاں خدمت گزاری میں محلے بھر کی خبریں بھی بہم پہنچانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کے عشقیہ معاملات میں بھی رازدار اور چٹھی رساں بنتی ہیں۔ اور جہاں بات کا بتنگڑ پل بھر میں بنا دیا جاتا ہے۔

تیسرا افسانہ ‘سفارش’ ہے۔ جو شہری ماحول میں موجود منافقتوں کا پردہ چاک کرتا ہے۔ اس کا مثالی کردار فیکا ہے جبکہ دوسرا کسری کردار افسانے کا واحد متکلم ہے۔ یہ دوسرا کردار ہمارے موجودہ معاشرے کا وہ کردار ہے جو اپنی نام نہاد مصروفیات پر مبنی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ کا ایک عکس ہے۔ فیکا سراپا محبت ہے۔ وہ جاہل ضرور ہے لیکن عقل سے پیدل نہیں۔ وہ مخلص ہے اور منافقت سے کوسوں دور ہے۔ یہ افسانہ ہمارے اس معاشرے کی ایک جیتی جاگتی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے اور محروم طبقہ کے ایک فرد ‘فیکا’ کے کردار کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

چوتھا افسانہ ‘مائیں’ ہے جس کا موضوع ممتا کی محبت ہے۔ اس افسانے میں یہ بات بہت خوبصورتی کے ساتھ نبھائی گئی ہے کہ ہمارے شہروں کے پرانے محلوں میں عورتیں اپنی لڑائیوں کے باوجود کس طرح متوازی لکیروں میں وضع داریاں نبھاتی ہیں۔ اس افسانے میں داخلیت اپنے ایک خاص رنگ میں رنگی ہوئی صاف نظر آتی ہے یہ رنگ پڑھ کر دل کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو خود ہماری اپنے آس پاس کی دنیا کی بات ہے۔

پانچواں افسانہ ‘پہاڑوں کی برف’ ہے۔ اس افسانہ میں ایک افسانہ نگار ایک بھکارن کے حسن پہ مرمٹتا ہے۔ وہ اس بھکارن کے اندر سے عورت کو باہر نکالنے کی پوری کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ تھک ہار کر وہ اسے بھگا دیتا ہے۔ اس افسانے میں قاسمی صاحب حسنِ نسوانی کی تصویر کشی خاصی چابک دستی سے کرتے ہیں اور اس میں کامیاب رہے ہیں۔ اس افسانے میں ندیم نے لاہور کے پرانے محلوں کا ماحول دکھایا ہے۔ جہاں اخبار مانگ کر پڑھا جاتا ہے۔ اور جہاں مکان تین تین منزلہ ہوا کرتے ہیں۔

چھٹے افسانے کا عنوان ‘گڑیا’ ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی فضا تخلیق کی گئی ہے جو باپ حیرت کو وا کرتی ہے۔ اس افسانے میں دو لڑکیاں ہیں جن کے نام بانو اور مہراں ہیں۔ مہراں گڑیا سے خوف کھاتی ہے۔ اور گڑیا کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔ اس کو یہ خیال دامن گیر ہو جاتا ہے کہ گڑیا کی موت مہراں کی موت ہوگی اور یہ بات درست بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن مہراں نے بانو سے یہ بات بھی کر رکھی ہوتی ہے کہ وہ اس کا پیچھا نہیں

چھوڑے گی۔ یہ بات اس حوالے سے سچ ہو جاتی ہے کہ بانو مہراں کی ہم شکل لڑکی کو جنم دیتی ہے۔ اس افسانے کا ماحول دیہی معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں زمیندار کی لڑکی کو مزارع کی لڑکی سے دوستی کرنے سے منع کیا جاتا ہے اور جہاں دلہنوں کو منہ دکھائی کے لیے دونیاں اور چونیاں دی جاتی ہیں۔ یہ افسانہ تاہم دو سادہ لڑکیوں کی اخلاص پر مبنی محبت کی ایک روداد سناتا ہے۔

'عقل' ساتواں افسانہ ہے۔ اس میں ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں معاشی ترقی اور ذہنی پسماندگی کے درمیان ایک کھچاؤ پایا جاتا ہے۔ اس کے مابین جو ایک خلا نظر آتا ہے اس کو پیر فقیر پر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں وادی سون سکیسر کا دیہی ماحول پیش کیا گیا ہے۔ جہاں کے لوگوں نے ریل گاڑی کی پٹڑی تو بچھائی مگر ریل گاڑی پر سفر کے لیے حضرت پیر کے مجاور سے تعویذ لینا ضروری ہو گیا۔ جب یہ بات آنے والے نسل نہیں مانتی تو اسے بے ادب اور بے لحاظ کہہ دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں مصری کا نشو کو اغواء کر کے شادی کرنے اور پھر اپنے بیٹے کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی بات کو بے لحاظی کہنا ایک خوبصورت فکری تضاد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جس کے ذریعے قدیم نسل کے رویے کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔

آٹھویں افسانے 'پاگل' کے اندر اس بات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح قومی کلچر بین الاقوامی کلچر کے ہاتھوں شکست و ریخت کا شکار رہوا ہے۔ افسانے کا کردار چودھری صاحب مقامی قومی کلچر سے وابستگی کے سبب اپنے بچوں کی آزادی اور جدید کلچر کو اپنانے کی کوشش کو پاگل پن کہتا ہے مگر بالآخر ہار ماننے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کو عروج اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنے بچوں کو ٹوسٹ کے مقابلے میں کامیابی پر سبحان اللہ کے لفظ بولتا ہے لیکن جواب میں رانا صاحب کا یہ کہنا کہ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! گرلز اینڈ بوائز! سبحان اللہ اردو کا ونڈر فل ہوتا ہے"۔ قاسمی صاحب نے اس افسانے کے ذریعے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جدید دور میں حرام طریقے سے مال کما کر خود کو معزز ظاہر کرنا اور پھر جدید دور کا نمائندہ بن کر سامنے آنا کس طرح ہمارے سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہے اور ہمارا معاشرہ کس طرح اس کو قبول کرتا چلا جا رہا ہے۔

'ماسی گل بانو' اس مجموعہ کا نواں افسانہ ہے جس میں دیہی ماحول کے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ایک کردار 'گل بانو' جب بیماری کے بعد بستر سے اٹھتی ہے تو اس کا حلیہ عجیب ہوتا ہے۔ لوگوں یہ سمجھتے ہیں کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ مگر پھر اسے جنات کی عامل سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور آخر میں وہ اپنی ناکام

خواہشوں کو لے کر مر جاتی ہے۔ اس افسانے میں ایک جرأت ہے جو شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔ افسانے میں ایک طلسماتی فضا بڑی کامیابی سے تخلیق کی گئی ہے۔ ایک درد سے چور چور لڑکی اور اس کے گاؤں کے باسیوں کے مابین جہالت کا دبیز پردہ حائل ہے۔ وہ اس پردے کے باہر سے جنات کو تو دیکھتے ہیں لیکن وہ اس لڑکی کی اذیت کو محسوس نہیں کر پاتے۔ یہی اس افسانے کا خلاصہ ہے۔

‘بے نام چہرے’ دسواں افسانہ ہے۔ اس میں شہروں کے نچلے درمیانے طبقے کا کلچر موجود ہے۔ جہاں شادیوں کے موقعوں پر لڑکیاں پردے کا خاص خیال نہیں رکھتیں اور نہ ہی انھیں اس بات پر ٹوکا جاتا ہے۔ ایک لڑکی نگہت ایک ایسی ہی شادی کے موقع پر سرفراز کو دیکھتی ہے اور اس سے پیار کرنے لگتی ہے۔ مگر اسے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔ سرفراز بھی اسے چاہنے لگتا ہے مگر وہ بھی اس کے نام سے بے خبر ہے۔ دونوں بے نام چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو پسند کر رہے ہیں۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ بالآخر ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اس افسانے میں بحیثیت مجموعی ایک سادگی کا ماحول ہے۔ اور بھولپن اور معصومیت کے رنگ موجود ہیں۔

مجموعہ کا نام جس افسانے کے عنوان سے منتخب کیا گیا ہے وہ گیارھواں افسانہ ہے یعنی ’’کپاس کا پھول‘‘۔ یہ افسانہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ افسانے کا کردار مائی تاجو ایک پٹواری سے شادی کے بعد دوسرے گاؤں آ جاتی ہے۔ پٹواری اسے چھوڑ جاتا ہے اور وہ لوگوں کے ہاں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی ہے۔ اسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ہر وقت اپنی موت کو یاد رکھتی ہے۔ اور کفن کے لیے کپڑا اکٹھا کرتی ہے۔ بڑھاپے میں جب وہ محنت کے قابل نہیں رہتی تو اس کی پڑوسن لڑکی راحتاں اسے کھانا فراہم کرتی ہے۔ ایک رات جبکہ راحتاں ایک شادی میں گئی ہوتی ہے تو تاجو اس کے گھر جا کر اس کی ماں سے کھانا مانگتی ہے تو وہ اسے ‘محتاج’’ کہہ دیتی ہے۔ جس پر تاجو اس سے کھانا نہیں لیتی۔ پھر راحتاں کے اصرار پر بھی وہ کھانے سے انکار کر دیتی ہے۔ دوسرے دن ہندوستان اس کے گاؤں پر حملہ کر دیتا ہے۔ راحتاں مائی تاجو کو گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کا کہتی ہے۔ وہ اپنا کفن لے کے باہر آتی ہے۔ وہ لاشوں کو دیکھتی ہے۔ وہ زخمی موذن کو بھی بھاگنے کا کہتی ہے لیکن وہ انکار کر دیتا ہے۔ وہ سب لاشوں کے جنازہ پڑھ کر ان کی تدفین میں مصروف ہوتے ہیں۔ تاجو بھاگتی ہے۔ اور وہ راحتاں کو تلاش کرتی ہے۔ آخر کار وہ راحتاں کے باپ فتح دین کے گنے کے کھیت میں پہنچتی ہے۔ اور راحتاں کو یاد کرتی ہے تو راحتاں اسے پکارتی ہے۔ راحتاں کے کپڑے ہندوستانی فوجیوں نے نوچ لیے تھے اور وہ برہنہ حالت میں تھی۔ وہ اپنا آپ مائی تاجو کے کفن میں چھپا لیتی

ہے۔ مائی کا کفن راحتاں کا جسم چھپا لیتا ہے۔ مائی یہ سمجھتی ہے کہ راحتاں نے جو وعدہ کیا تھا کہ وہ مائی کا شاندار جنازہ نکالے گی وہ اس نے سچ کر دکھایا۔ افسانے کے کردار اور اس کی فضا مثالی ہے۔ مائی تا جو سادگی، اخلاص، شرافت اور محبت کا پیکر ہے۔ یہ دیہی محنت کش عورت کی نمائندگی کرتی ہے اور راحتاں دیہات کی نوجوان لڑکی کی نمائندہ ہے۔ اس افسانے میں جنگ کی سفاکیت کا منظر بڑی کامیابی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

بارھواں افسانہ ''سفید گھوڑا'' اس المیاتی فضاء کی عکاسی کرتا ہے جہاں لوگ نئی لڑکی مانگتے ہیں لیکن ان کا جسم پرانا ہوتا ہے۔ تبھی وہ شہر کو چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ جسم فروش عورتیں جنسی لحاظ سے بے راہ روی کا شکار ہوتے ہوئے بھی مظلوم ہیں۔ ایک ماں ہے جو اپنی بیٹی کے جسم کا سودا کرتی ہے۔ وہ ان سارے حربوں سے لیس ہے جو اس پیشے کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کی بیٹی پہلے بلقیس بن کر آتی ہے اور اس طور پر شرماتی ہے کہ جیسے وہ پہلی مرتبہ اس دلدل میں اتر رہی ہو۔ دوسری مرتبہ وہی بلقیس رضیہ بن کر سامنے آتی ہے تب بھی اس کے شرمانے کا انداز وہی ہوتا ہے۔ دونوں عورتیں دو انتہاؤں کو پیش کر رہی ہیں۔ انہی انتہاؤں کے درمیان ان کا المیہ پوشیدہ ہے۔

تیرہویں افسانے 'سکوت وصدا' میں ایک لڑکا یوسف نجمہ نام کی لڑکی سے شادی رچانا چاہتا ہے۔ اسے اپنے پیار کا یقین دلاتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی سہیلی تبسم سے بھی شادی کے لیے تیار ہے۔ اسے بھی اپنی وفاؤں کا یقین دلاتا ہے۔ اور اسے لکھ بھیجتا ہے کہ وہ اس کا دو سال تک انتظار کرے۔ وہ اس سے دوسری شادی کرے گا۔ اس افسانے میں شہروں میں پائی جانے والی دہری روش اور منافقانہ چال کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو اب محبت جیسے پاکیزہ تعلق کو بھی داغدار کر رہی ہے۔

'آسیب' اس کتاب کا چودھواں افسانہ ہے جو اپنے عنوان کے اعتبار سے کوئی طلسمی افسانہ ہونے کا تاثر دیتا ہے لیکن اس میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ قدیم اقدار کی شکست و ریخت کی کہانی سناتا ہے۔ مرکزی کردار سید امجد حسین کو ایک برگد کے درخت سے گہرا لگاؤ ہے۔ اپنی کئی نسلوں سے نسبت کے سبب اسے وہ پہنچاتا ہے۔ یہی برگد اس کی جاگیردارانہ نسل کی جاگیردارانہ اقدار کی بھی علامت ہے اور اپنے اس گہرے تعلق کی وجہ سے وہ سید امجد حسین کا ہمزاد دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بہو کسی سبب اس برگد کے درخت کو کٹوا دیتی ہے تو امجد حسین اس بات کا انتقام اپنے بیٹے اور بہو کے لگائے ہوئے پودوں اور پھولوں کو تباہ کر کے لیتا ہے۔ اس افسانے کی فضا کچھ اس طرح ابھر کر سامنے آئی ہے کہ جہاں وہ قدیم جاگیردارانہ کلچر اور جدید کلچر کو ایک دوسرے کے سامنے لا

کھڑا کرتی ہے۔

پندرھویں افسانے ''لارنس آف تھیلیا'' میں بھی ایک انتقامی فضاء کے ساتھ ساتھ گاؤں کے جاگیردارانہ نظام پر بھرپور چوٹ کی گئی ہے۔ اس افسانے میں یہ دکھانے کی کاوش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک جاگیردار کے ڈیرے پر اپنی رعایا پر ظلم کیا جاتا ہے لیکن افسران کی کس طرح خوشامد، چاپلوسی اور ان سے وفاداری کی جاتی ہے۔ بعض جگہ طنز اپنی شدت کو چھو جاتا ہے۔ انتقامی رنگ یوں دکھائی دیتا ہے کہ ایک لڑکی جس کا نام رنگی ہے وہ اپنی عصمت دری کا بدلہ جاگیردار کا باز ہلاک کر لیتی ہے۔

سولہویں افسانے کا عنوان 'قرض' ہے۔ اس افسانے میں خارجیت کا عمل دخل ہے۔ کہانی یہ بیان ہوئی ہے کہ بھوکے مزدور کس طرح قرض لیتے ہیں مگر اس بات کی استطاعت نہیں رکھتے کہ اس کی ادائیگی کر سکیں۔ ان کی بھوک ان کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی بھوک ان کے وجود کو نگل جاتی ہے۔

آخری افسانے 'مشورہ' میں ایک سرمایہ دار کی الجھن پیش کی گئی ہے۔ الجھن یہ ہے کہ اس کے مالی کی تنخواہ ساٹھ روپے ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ مالی کی گزر اوقات ان روپوں میں مشکل سے ہوتی ہے مگر اس کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے مالی کی تنخواہ بڑھا دے تو دوسرے سرمایہ داروں کو بھی اپنے اپنے ملازمین کی تنخواہ بڑھانی پڑے گی۔ یوں بحیثیت مجموعی یہ مسئلہ انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہو جائے گا۔ برادری احتجاج کرے گی۔ وہ مشہور شاعر 'ندیم قاسمی' سے اس مشکل کا حل پوچھتا ہے لیکن اس کے پاس تنخواہ بڑھانے کے علاوہ کوئی دوسری تجویز نہیں ہے۔

ان تمام افسانوں میں دو طرح کے کردار سامنے آتے ہیں۔ ایک کسری کردار جو ہمارے معاشرے میں عام طور پر موجود ہیں اور دوسرے مثالی کردار جو معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کے سبب کہیں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ افسانوں کی فضاء کرداروں کے اعتبار سے دیہی یا شہری ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر دو معاشرتیں اپنے اندر الیے بھی رکھتی ہیں اور خلوص و ایثار و محبت کا سامان بھی۔ بہر حال قاسمی صاحب کے اس مجموعہ میں بڑے کامیاب افسانے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں زیادہ اہم افسانے جیسا کہ شروع کی سطور میں مذکور ہے، میں 'تمر'، 'کپاس کا پھول'، 'فیشن'، 'ماسی گل بانو'، 'سفارش'، اور 'لارنس آف تھلیبا'' شامل ہیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر پریشان خٹک

ایک واقعہ

یقین نہیں آتا کہ وہ ہنستا مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لیے زیرِ خاک ہو گیا۔ اس کے شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور کالم نویس کی حیثیت سے عہد ساز شخصیت ہونے میں نہ تو کوئی شک ہے اور نہ شبہ اور نہ کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ میں اس کے علاوہ ان کی شخصیت کا گرویدہ تھا۔ وہ جب بھی پشاور تشریف لاتے، میرے گھر کو رونق بخشتے۔ وہ لمحات آج بھی میرے لیے یادگار ہیں۔ میں جب لاہور جاتا تو اکثر سلام کے لیے ان کے دفتر میں حاضری لگایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار مواقع پر ہم اکٹھے رہے ہیں۔ بسا اوقات جناب عطاالحق قاسمی بھی ساتھ ہوا کرتے تھے۔ گاڑی میں بڑے لمبے لمبے سفر ساتھ طے کیے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنی طویل رفاقت میں احمد ندیم قاسمی کے ساتھ میری محبت اور عقیدت بڑھتی گئی۔ سب سے نمایاں بات جس نے ان کی موجودگی میں ہمیشہ میرے دل اور دماغ کو مسخر کیا وہ یہ تھی کہ عمر میں بہت زیادہ فرق ہونے کے باوجود ہم قاسمی صاحب کے سامنے نجی محافل میں ہر وہ ناگفتنی بات کرتے جو اپنے ہم عمروں کے سامنے بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ قاسمی صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ہماری ان حماقتوں اور شرارتوں کو برداشت کیا کرتے تھے۔ میں پوری ایمان داری سے کہتا ہوں کہ اتنا لطف زندگی میں اور کسی محفل میں نہیں آیا۔ جوانی میں ہنسنا اور ہنسانا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ پرائیویٹ محافل میں مذاق کرنا اور سنجیدہ گفتگو سے پہلو تہی کرنا میری فطرتِ ثانیہ تھی۔

جناب عطاالحق قاسمی تو خود اس قماش کے تھے بل کہ مجھ سے دو چار قدم آگے تھے جب کبھی امجد اسلام امجد بھی شریکِ محفل ہو جاتے تو سونے پر سہاگے کا کام ہو جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ تو ہم دونوں سے دس قدم آگے تھے۔ مگر مجال ہے کہ کبھی بھی احمد ندیم قاسمی کے ہنستے مسکراتے چہرے پر بل آتے۔ میں چاہوں تو اس عظیم شخص کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات پر کتابیں لکھ سکتا ہوں۔

اتنی لمبی رفاقت میں مجھے ایک دفعہ ان سے گلہ پیدا ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ جب میں اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین بنا تو پورے پاکستان کے لکھاریوں کی ایک بہت بڑی اہلِ قلم کانفرنس اسلام آباد میں بلائی۔ قاسمی صاحب کو خصوصی دعوت دی گئی مگر وہ اس میں شامل نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے آنے سے ایک سال پہلے میجر جنرل شفیق الرحمٰن صاحب نے ایک اہلِ قلم کانفرنس بلائی تھی۔ ملک کے صدر صاحب نے

افتتاحی تقریب میں بائیں بازو والوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ قاسمی صاحب موجود تھے، انھوں نے صدر صاحب کے خطاب کو بہت بری طرح محسوس کیا۔ جب میں نے میجر جنرل شفیق الرحمٰن صاحب سے چارج لیا تو یہ فیصلہ کیا کہ میں افتتاح کے لیے کسی ایسے شخص کو نہیں بلاؤں گا جو اہلِ قلم کے منہ پر ان کی برائی کرے۔ لہٰذا میں نے افتتاح کے لیے اس زمانے کے نہایت دیانت دار، وضع دار محبِّ وطن با اصول اور شریف النفس وزیرِاعظم محمد خان جونیجو صاحب کو بلایا تھا۔ مگر قاسمی صاحب یہ طے کر چکے تھے کہ اب وہ اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت نہیں کریں گے۔ ان کے اس فیصلے کو مجھ سے زیادہ عطاالحق قاسمی نے محسوس کیا تھا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس کا ازالہ یوں کیا کہ کانفرنس ختم ہونے کے چند دن بعد وہ عطاالحق قاسمی صاحب کی معیت میں میرے دفتر آئے۔ تا کہ یہ ثابت کریں کہ کانفرنس میں شمولیت نہ کرنا ایک اصولی فیصلہ تھا مگر میرے ساتھ ان کی محبت میں ذرا بھر فرق نہیں آیا تھا۔

جس واقعے کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یوں تھا کہ ایک دفعہ پاکستان ٹیلی ویژن پر جناب قاسمی صاحب پر ایک مذاکرہ تھا۔ قاسمی صاحب کے ساتھ میں بھی اس میں شریک تھا، تیسرا شخص یاد نہیں۔ مذاکرے کے دوران میں نے کہا، میرا ایک شعر ہے:

ترے کمالِ بلاغت سے ہم کو شکوہ ہے
جو گفتگو تیری آنکھیں کریں وہ لب نہ کرے

شعر پڑھتے وقت میں نے قاسمی صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ غصے اور حیرت سے ان کی حالت غیر ہو چکی ہوگی مگر مجال ہے کہ ان پر ذرا بھر فرق پڑا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے مجبوراً وضاحت کی کہ محترم قاسمی صاحب حیران ہوں گے کہ میری موجودگی میں پریشان خٹک نے ٹیلی ویژن پر میرے شعر کو اپنا شعر کہا۔ پورا ملک سن رہا ہے مگر بات یوں ہے کہ یہ شعر کبھی قاسمی صاحب کا تھا۔ مگر اردو کا شعر جب کسی پٹھان کے ہتھے چڑھ جائے، وہ اسے اپنے لہجے میں پڑھے تو وہ شعر پھر کسی اصلی شاعر کے کام کا نہیں رہتا۔ لامحالہ پٹھان کا ہو جاتا ہے۔ وضاحت کے بعد میں نے جناب قاسمی صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی تو بھی کوئی فرق نظر نہ آیا۔ بات یہ تھی کہ یہی شعر پشاور میں میرے گھر پر ایک دعوت میں قاسمی صاحب نے میری جوان طبیعت کا خیال رکھتے ہوئے کئی سال پہلے موزوں کیا تھا جو مجھے بہت زیادہ پسند آیا تھا۔ اس موقعہ پر یہ ڈرامہ رچانے کا مقصد محض قاسمی صاحب کو متحیر کرنا تھا، جس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تب مجھے خیال آیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی اس سے کہیں زیادہ عظیم شخص ہیں جتنا ہم سوچ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

منشا یاد

احمد ندیم قاسمی کی یادیں

پہلی ملاقات

یہ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں کا ذکر ہے جب جناب احمد ندیم قاسمی گڑھی شاہو میں رہتے تھے جسے ان کے قریبی احباب ان کے نام احمد شاہ کی مناسبت سے گڑی احمد شاہو بھی کہتے تھے۔ میری خالہ کا گھر قریب تھا۔ چوں کہ یہ میری سسرال بھی تھی اس لیے آنا جانا لگا رہتا تھا اور ہم عید، بقر عید تو اکثر ہی اسلام آباد کی بجائے لاہور میں مناتے تھے۔ میں طالب علمی کے زمانے سے ان کی نظموں اور افسانوں کا قاری اور مداح تھا اور مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ان دنوں عنایت اللہ (حکایت والے) نچلی منزل میں بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ انھی سے مجھے پتہ چلا تھا کہ احمد ندیم قاسمی قریب ہی رہتے ہیں۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ میں ملنا چاہتا ہوں میرے ساتھ چلیں مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے کیوں کہ وہ حال ہی میں سیاسی قیدی کے طور پر جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ایک روز میں ہمت کر کے بغیر کسی حوالے یا سفارش کے خود ہی ملنے چلا گیا۔ قاسمی صاحب میرا نام سن کر بہت خوش ہوئے۔ جس پر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیوں کہ میں افسانے ضرور لکھتا تھا مگر بطور افسانہ نگار ابھی گم نام تھا۔ میں ابھی بڑے ادبی پرچوں کی بجائے نیم ادبی مگر مشہور رسائل میں شائع ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ ادبی پرچوں کو کوئی پڑھے نہ پڑھے وہ ادبی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں اور ان میں شائع ہونا زیادہ ضروری ہے۔ بہر حال وہ خوش دلی اور محبت سے ملے اور خوب تواضع کی۔ پھر پوچھا کیا آپ شیخوپورہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ چوں کہ ابھی میں نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اس لیے اور حیران ہوا کہ انھیں کیسے پتہ چل گیا۔ کیا یہ اچھے شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ بھی ہیں؟ مگر انھوں نے میری حیرت بھانپتے ہوئے کہا کہ وہ شیخوپورہ کالج میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے ہیں جہاں اسی نام کا ان کا ایک دوست تھا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ شیخوپورہ میں یہ نام اتنا مقبول کیوں ہے؟ میں نے انھیں بتایا کہ ایک پنجابی شاعر مولوی عبدالستار کی وجہ سے۔ جو شیخوپورہ کے نواح میں پیدا ہوئے اور اس علاقے میں بہت پڑھے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے تفصیل پوچھی تو میں نے بتایا کہ مولوی عبدالستار نے اپنی کتاب قصص المحسنین (داستانِ یوسف) میں لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی دعا سے زلیخا پھر جوان ہو گئی تھی اور انھوں نے اس سے عقد کر لیا تھا۔ ان سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو حضرت یوسف ہی کی طرح خوبصورت تھا:

”بہت عجائب سندر سوہنا روشن چمک جمالوں۔ جدا کیتا رب یوسف دوجا حضرت

یوسف نالوں''

اب کون ایسے ماں باپ ہوں گے جو اپنے بچوں کا نام ایسے خوبصورت لوگوں کے نام پر نہ رکھنا چاہیں گے۔ چناں چہ اس پورے علاقے میں یہ نام خاصا مقبول ہوگیا۔ قاسمی صاحب نے میری بات دلچسپی سے سنی اور بہت خوش ہوئے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی مگر انھوں نے اس کے بعد بھی کئی بار اس بات کا ذکر کیا کہ مجھے دیکھ کر انھیں اپنا شیخو پورہ والا دوست اور کلاس فیلو یاد آجاتا ہے۔ اور میں اپنی اس خوش قسمتی پر فخر کرتا تھا۔

منشا ہی رہا یاد

نامور شاعر احمد فراز مجھے بہت عزیز جانتے ہیں اور میں بھی ایک بڑے شاعر اور دوست کی حیثیت سے ان سے محبت کرتا ہوں۔ ایک بار معروف افسانہ نگار نیلوفر اقبال کے ہاں ادبی محفل تھی۔ احمد ندیم قاسمی ان دنوں انہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ تقریب میں بہت سے احباب مدعو تھے۔ میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا تو علیک سلیک کے بعد احمد فراز نے مجھے دیکھ کر فی البدیہہ کہا:

''اللہ کی مرضی تھی کہ منشا نہ رہا یاد۔''

قریب ہی جناب احمد ندیم قاسمی بیٹھے تھے انھوں نے فوراً ترمیم یا تردید کی۔

''اللہ کی مرضی ہے کہ منشا ہی رہے یاد''

میں نے کہا ''فراز صاحب یہ فرق ہوتا ہے۔''

وہ ہنسنے لگے۔ مگر جس طرح انور مسعود کو دیکھ کر میں اسلام علیکم کہنے کی بجائے انہی کا ایک مصرعہ پڑھتا ہوں ''انورا یہہ کیہہ بدل بنیا؟'' اور جواب میں وہ وعلیکم السلام کہنے کی بجائے دوسرا مصرعہ پڑھتے ہیں ''نہ وسے نہ کھلے'' اور جس طرح زاہد ملک مجھ کو دیکھ کر کہتے ہیں ''منشا یاد صاحب آپ کا خون سفید ہوگیا ہے'' اسی طرح احمد فراز مجھے جہاں اور جب بھی ملیں آپ بھی اپنا ہی مصرعہ پڑھتے ہیں۔ مگر مجھے یاد رکھتے ہیں۔ بھولتے کبھی نہیں۔

نوعمر اسلام آباد کی سیر

اسلام آباد کی ابتدائی تعمیر کے دنوں میں غالباً یہ ۱۹۶۴ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ میری ابھی نقوش یا فنون جیسے ادبی پرچوں میں کوئی تخلیق نہیں چھپی تھی۔ کیوں کہ مجھے قاسمی صاحب کو کوئی افسانہ بھجواتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی تھی کہ پہلی ہی تخلیق سے وہ میرے بارے میں کوئی منفی رائے قائم نہ کرلیں۔ انہوں نے مجھے دو ایک بار کہا بھی کہ فنون کے لیے افسانہ بھیجوں مگر مجھے ہمت نہ ہوئی، یہ تو بہت بعد کہیں شاید ۱۹۷۲ء میں پروفیسر فتح محمد ملک نے راولپنڈی حلقے میں میرا ایک افسانہ درد کا پتھر (جو دوپہر اور جگنو کے نام سے میرے پہلے مجموعہ میں شامل ہے) سن کر مجھ سے فنون کے لیے تقریباً چھین لیا اور قاسمی صاحب نے اسے اس قدر اہتمام سے شائع کیا کہ میرے حاسد اور ان کے دشمن پیدا ہو گئے) بہر حال اسلام آباد میں ابھی کچھ زیادہ دیکھنے

دکھانے کو نہیں تھا مگر میں ان کی خواہش پر انھیں اپنے سائٹ آفس واقع سوک سنٹر (میلوڈی مارکیٹ) لے آیا جہاں سی ڈی اے کے آفس بلاکس اور مرکزی جامع مسجد (لال مسجد) زیر تعمیر تھے۔ میں نے انھیں نقشوں اور ماسٹر پلان کی مدد سے اسلام آباد کے بارے میں بریف کیا۔ میرا خیال ہے کہ پروفیسر فتح محمد ملک بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے سید پور کے چشمے، واٹر ورکس، آم اور لوکاٹ کے باغات اور گاؤں کے کمہار آرٹسٹ کی بنائی ہوئی مٹی کی مشہور ریل گاڑی دیکھی۔ پھر میں انھیں ان کی فرمائش پر ٹیلی فون ایکسچینج دکھانے لے گیا جو میرے پڑوسی اور کولیگ خالد وحید ایس ڈی او کی نگرانی میں مکمل ہو چکا تھا اور کام کر رہا تھا۔ قاسمی صاحب نہایت دلچسپی سے اس کی ٹیکنیکل تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ اور میں حیران ہوتا رہا کہ ایک شاعر اور افسانہ نگار ہو کر وہ ٹیکنیکل چیزوں میں ایسی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔

آرام دہ سفر

جناب احمد ندیم قاسمی شروع میں فتح محمد ملک کے ہاں قیام کرتے تھے پھر نیلوفر اقبال کے ہاں ٹھہرنے لگے۔ میری دعوت پر سی ڈی اے کے مشاعروں میں آتے تو ہم ان کی رہائش کا انتظام ایم این اے ہوسٹل میں کرتے۔ لیکن وہ جب بھی آتے میرے ہاں ضرور تشریف لاتے اور میزبانی کا موقع دیتے تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اسلام آباد کی سیر بھی کرائی لیکن یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سڑکوں پر جی ایس ٹی کا راج ہوتا تھا۔ وہ ریل کار سے آئے تھے اور اسی سے واپسی کا پروگرام تھا مجھے ان کی سیٹ بک کرانے کا موقع ملا تو میں نے ریل کار کی بجائے جی ٹی ایس کی اسٹیشن ویگن میں سیٹ بک کرادی۔ کیوں کہ ان دنوں اس کی بہت شہرت تھی۔ یہ ایک شیورلیٹ یا کوئی ایسی ہی کار تھی جو راولپنڈی اور لاہور کے درمیان چلائی گئی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف چار سواریاں ہوتیں۔ یہ ساڑھے تین گھنٹے میں پنڈی سے لاہور پہنچاتی تھی اور صرف پندرہ منٹوں کے لیے ایک جگہ گجرات میں رکتی تھی جہاں مسافروں کی چائے سے تواضع بھی کی جاتی۔ مگر اس کا کرایہ بہت زیادہ (اٹھارہ روپے) تھا اور اس پر صرف وی آئی پی لوگ ہی سفر کر سکتے تھے۔ قاسمی صاحب کو ریل کار پسند تھی مگر میں نے اصرار کر کے انھیں اس میں سوار کرایا اور رخصت کیا۔ لاہور پہنچ کر انھوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا کہ ان کا سفر اگرچہ زیادہ آرام سے گزرا ہے لیکن حادثے کا شکار ہوتے ہوئے بچی۔ میں انھیں موت کے منہ میں دھکیلنے پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

برسی

جن دنوں میں حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کا سیکرٹری تھا ہم نے اسلام آباد میں جناب احمد ندیم قاسمی کی پینسٹھ ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ اس میں دیگر احباب کے علاوہ مجھے خاص طور پر مظہر الاسلام اور کشور ناہید کا تعاون حاصل تھا۔ حلقہ کی تاریخ میں یہ وہ واحد تقریب تھی جس کی صدارت ایک وفاقی وزیر نے کی جوان

کے مداح بھی تھے۔ غالباً کشور ناہید کے ذریعے ایک دوسرے وفاقی وزیر نے جن کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا ان کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ رات کو جب ہم سب لوگ وزیر موصوف کے ہاں جمع ہوئے تو دوران گفتگو انھوں نے پوچھا "قاسمی صاحب کیا آپ اپنی برسی ہر سال مناتے ہیں؟" اس پر سب لوگ ہنسنے لگے اور تصحیح کی کہ برسی نہیں سالگرہ۔

شریر بچے

لاہور میں میری پہلی کتاب کی تعارفی تقریب کا موقع تھا جس کا انتظام عطاالحق قاسمی نے اپنے کالج میں کیا ہوا تھا۔ بڑے قاسمی صاحب کو صدارت کرنا تھی۔ میں ایک روز پہلے قاسمی صاحب کے دفتر مجلس ترقی ادب میں ملاقات کو حاضر ہوا۔ وہ کہیں سے آرہے تھے یا شاید کہیں جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے اور خیریت و عافیت دریافت کرنے لگے۔ سامنے لان میں امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ غالباً بقول سید ضمیر جعفری جملہ بازی کی نیٹ پریکٹس کرتے کرتے جب عطا کو کسی فقرے کا بروقت جواب نہ سوجھا تو اس نے امجد کی عینک اتار لی۔ امجد کو غالباً کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ فریاد کر رہے تھے "سر اس کو کہیں عینک واپس کردے۔ یہ کیا مذاق ہوا"

قاسمی صاحب کچھ دیر انھیں یوں دیکھتے اور ہنستے رہے جیسے ایک شفیق باپ اپنے شریر بچوں کو لڑتے اور شکایتیں "لگاتے" دیکھتا ہے پھر کہا "عطا صاحب"۔ چشمہ واپس کر دیجیے۔ عطا نے کہا۔ "سر چشمہ پہن کر یہ بھیگی بلی پھر شیر بن جائے گی" لیکن ساتھ ہی اس نے تعمیل کی اور عینک واپس کر دی اور امجد واقعی پھر سے شیر بن گئے۔ مجھے ان دونوں کی خوش قسمتی پر بہت رشک آیا۔

سبحان اللہ

چھوٹے قاسمی یعنی عطاالحق قاسمی سے روایت ہے کہ وہ بڑے قاسمی صاحب (احمد ندیم قاسمی) کے ساتھ انارکلی بازار میں جا رہا تھا کہ ایک نہایت حسین چہرہ دیکھ کر قاسمی صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا "سبحان اللہ" چھوٹے قاسمی نے فوراً کہا "انشا اللہ"

ڈیڑھ آنہ

غلام رسول طارق ایک اچھا استاد قسم کے شاعر مگر سخت اکھڑ اور اوکھے آدمی تھے۔ پنڈی میں وہ رشید امجد سمیت بہت سے نئے لکھنے والوں کے استاد تھے اور استاد غلام رسول طارق کہلاتے تھے۔ ایک بار لاہور گئے تو جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کو ملنے انارکلی والے نقوش کے دفتر میں پہنچے۔ وہاں احباب کی محفل جمی ہوئی تھی۔ استاد نے اپنا تعارف کرایا تو قاسمی صاحب اچھی طرح پیش آئے اور تشریف رکھنے اور چائے پینے کو کہا مگر وہ خفا تھے کھڑے کھڑے کہا کہ شکریہ۔ میں بیٹھنے یا چائے پینے نہیں آیا۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے ڈاک سے ایک غزل

بھیجی تھی ۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ آنے (چھ پیسے) کا جوابی لفافہ بھی تھا ۔ آپ نے غزل شائع کی نہ خط کا جواب دیا ۔ غزل تو مجھے زبانی یاد ہے میں دوبارہ لکھ لوں گا مگر آپ میرا ڈیڑھ آنے کا جوابی لفافہ واپس کر دیں ۔ میں غریب شاعر ہوں اتنا نقصان برداشت نہیں کر سکتا ۔ اب قاسمی صاحب اور حاضرینِ مجلس ان کی منتیں کر رہے ہیں کہ وہ تشریف رکھیں مگر استاد کی ایک ہی رٹ کہ میں بیٹھوں گا نہیں آپ میرا نقصان پورا کیجیے ۔ قاسمی صاحب نے بتایا کہ گزشتہ شمارے میں غزل اس لیے شامل نہ ہو سکی کہ دیر سے ملی تھی اب کتابت ہو چکی ہے اور اگلے شمارے میں آ رہی ہے ۔ جواب میں تاخیر کے لیے وہ معذرت خواہ ہیں ۔ قاسمی صاحب کی اس وضاحت، حسنِ سلوک اور اظہارِ محبت کے سامنے وہ زیادہ دیر اپنی ضد پر قائم نہ رہ سکے اور بیٹھ گئے ۔

کمپیوٹر نے بچالیا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اکادمی ادبیات کی طرف سے ایک ساتھ قاسمی صاحب کو کمالِ فن اور منصورہ احمد کو کتاب پر ایوارڈز ملے تھے اور اس پر کچھ لوگوں نے تنقید شروع کر دی تھی ۔ ان دنوں اسلام آباد حلقہ کے اجلاس اقبال ہال میں ہوتے تھے ۔ جلسہ ختم ہوا اور میں باہر نکلا تو اخبار کا ایک رپورٹر میری دیگر اہلِ قلم کی آرا جاننے کا منتظر تھا ۔ میں نے ابھی یہ خبر نہ سنی تھی اس لیے کہا کہ مجھے تفصیل معلوم نہیں اور قاسمی صاحب کو اگر ایوارڈ ملا ہے تو وہ اس سے بھی بڑے ایوارڈ کے حق دار ہیں ۔ وہ ہمارے ادب کی سب سے بڑی شخصیت ہیں ۔ لیکن رپورٹر ان سے کچھ ناراض معلوم ہوتا تھا اس نے میرا بیان تھوڑا تبدیل کر کے چھاپ دیا ۔ اس نے وہ حصہ حذف کر دیا جس میں ایوارڈ کی حمایت کی گئی تھی اور وہ حصہ رہنے دیا تھا جس سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ میں حق میں ہوں یا خلاف ۔ مگر جب بیان چھپ گیا تو میں نے رپورٹر کو خط لکھا کہ آپ نے میرا پورا بیان نہیں چھاپا اور اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے ۔ مگر جب کئی روز بعد بھی وضاحت شائع نہ ہوئی نہ اس کا فون آیا تو میں نے ایڈیٹر کو خط لکھ دیا ۔ مگر اس نے مجھے اطلاع دی کہ متعلقہ رپورٹر نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے اخبار میں چلا گیا ہے ۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی ۔ کچھ عرصہ بعد قاسمی صاحب جو ملک سے باہر گئے ہوئے تھے، واپس آئے اور انھوں نے سارے اخبارات وغیرہ دیکھے تو مجھے خط لکھا اور کہا کہ آپ مجھے اتنے عزیز ہیں مگر اس مسئلہ پر آپ کا بیان کوئی تقویت نہیں پہنچاتا جس کا مجھے افسوس ہے ۔ میری خوش قسمتی کہ سارا ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ تھا میں نے اپنی وضاحت کے ساتھ خطوط کی نقلیں بھجوا دیں ۔ جس سے وہ مطمئن ہو گئے اور لکھا کہ آپ نے اپنی صفائی میں بہت کمال دکھایا ہے ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ میرا نہیں کمپیوٹر کا کمال تھا جس نے مجھے بچالیا ۔

☆☆☆☆

اسد محمد خان

ایک واقعہ

احمد ندیم قاسمی صاحب بارہا کراچی تشریف لائے ہیں اور ان سے محبت کرنے والوں نے اس شہر کے حوالے سے بہت کچھ اپنی یادوں میں بسا رکھا ہے۔ میرے پاس بھی دہرانے کو سن ستر، اکہتر کی ایک مہکتی ہوئی یاد محفوظ ہے۔

میں نے سن اٹھاون، ساٹھ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ کراچی، لاہور، بنگلور اور آلہ آباد کے معتبر اور محترم ادبی جریدے میرے لکھے گئے گیتوں، نظموں کو گویا پہلے ہی دن سے چھاپنے لگے تھے۔ تو سن ستر سے میں نے کہانیاں بھی لکھنی شروع کر دیں۔

میری پہلی کہانی، 'باسودے کی مریم'، لکھی گئی تھی، دوستوں کو سنا دی گئی تھی۔ دوستوں کے سرخیل سید سلیم احمد سے اور جمال پانی پتی، جون ایلیا اور بھائی اطہر نفیس سے، ان کے برادر بزرگ کنور اصغر علی خان صاحب (علیگ) سے، ان کے عزیز ببر بھائی، علی گیرین، نواب راحت سعید خان صاحب چھتاری سے --- اس کہانی کے کھاتے میں، میں ڈھیروں داد بھی وصول کر چکا تھا --- تاہم اس وقت تک کہانی کو چھپوانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وجہ بہت دلچسپ مگر Intriguing تھی:

کہانی کی خواندگی کی کسی 'روٹین' نشست میں بھائی اطہر نفیس، شہر کے ایک جانے والے مدیر کو "قول ہار چکے تھے" کہ اسد کی یہ کہانی اسی کے جریدے میں چھاپی جائے گی۔

اس راج پوت دوست کا کسی بھی سلسلے میں قول ہار دینا ہم سب کے لیے "جان جائے پر وچن نہ جائے" ہونا چاہیے تھا --- اور فی الحقیقت ایسا تھا بھی۔ مگر میرے اندر کوئی گڑبڑ چل رہی تھی۔ میں اسے وہاں چھپوانا نہیں چاہتا تھا، جہاں کے لیے اطہر بھائی کسی سے وعدہ کر بیٹھے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے یہ کہانی --- اپنی پہلی کہانی --- 'فنون' میں چھپوانی چاہیے۔ اس وقت تک قاسمی صاحب میری کتنی ہی نظمیں 'فنون' میں درج کر چکے تھے جو میرے لیے خوشی اور خوش بختی کی بات تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر یہ کہانی 'فنون' کو بھیجنے، یعنی وعدے سے پھر جانے والی بات تو نہ میں قول ہارنے والے اس راج پوت سے کہہ سکتا تھا، نہ کسی اور سے۔ اس لیے کہ جس سے بھی کہتا وہ اطہر نفیس سے جا لگاتا۔ مجھ سمیت سب ان صاحب کے گرفتار تھے۔

خیر شہر کی خوش نصیبی، جو ہم نے سنا کہ قاسمی صاحب آنے والے ہیں اور اطہر نفیس نے برادر بزرگ اصغر بھائی کے گھر ایک نشست کا اہتمام کیا ہے۔

تو میرے چالاک، چابک دست، منصوبہ کار ذہن نے بالا ہی بالا ایک حکمتِ عملی تیار کر کے فوری استعمال کے لیے فائل کر لی۔ اور کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔

قاسمی صاحب کے کراچی آنے تک میں نے دو کہانیاں اور لکھ لی تھیں۔ تاہم منصوبے کے مطابق میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ تو نشست کی شام آئی۔ میں گیتوں، نظموں کی اپنی بیاض اٹھائے اور کرتے کی جیب میں 'باسودے کی مریم' سمیت دو کہانیوں کے مینو اسکرپٹ دھرے اصغر بھائی کے گھر جا پہنچا۔ سبھی لوگ آ چکے تھے یا آنے والے تھے، قاسمی صاحب کا اور اطہر بھائی کا انتظار تھا۔ وہ آئے۔ اطہر بھائی، قاسمی صاحب کو بھائی کے گھر پہلی بار لا رہے تھے۔۔۔ سو کھلے پڑتے تھے۔ قاسمی صاحب ہم سب نیاز مندوں، شاعروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ نشست کی صدارت انھیں کو کرنی تھی۔

بھائی اطہر کیوں کہ میزبان تھے تو انھوں نے نشست کا آغاز اپنی غزل سے کرنا چاہا۔ ہم جونیئر شاعروں نے کہا، ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' ''آپ ابھی بیٹھیے، ہمیں سنیے''۔ غرض کہ شعر خوانی ہوتی رہی۔ ایک سے ایک اچھا کلام سننے کو ملا۔ پھر قاسمی صاحب نے اپنی تازہ نظمیں عطا کیں اور سب کو پرمایہ کیا۔ اصغر بھائی کے اشارے پر ڈنر شروع ہوا۔

میزبانی کی مصروفیت کہیے یا اس نشست کا لطف اور سرشاری کہ اصغر بھائی وہ سب کچھ بھول گئے جو انھیں ڈنر ختم ہوتے ہوتے کہنا تھا اور جس کے لیے میں نے ان سے رازدارانہ درخواست کی تھی۔ شعر سن کے، سنا کے اور قاسمی صاحب کو اپنے درمیان پا کے سبھی مگن تھے۔ ڈنر ختم ہونے پر قاسمی صاحب چلے جائیں گے۔۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے منہ لٹکا لیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے اس طرح دیکھ کر دوستوں میں سے کسی نے ضرور کچھ کہا ہو گا اور میں نے ہوں ہاں کر دی ہو گی۔

آخر ڈنر ختم ہونے پر جب کہ سب لوگ بڑے کمرے کی طرف آ رہے تھے، اصغر بھائی کو وہ سب یاد آ گیا جو انھیں میری فرمائش پر اپنے معزز مہماں سے کہنا تھا۔ انھوں نے اپنے پرشوق انداز میں قاسمی صاحب سے کہا کہ حضرت! شعری نشست تمام ہوئی، کھانا بھی ہو گیا۔۔۔ اب کافی پی جائے گی پھر ہم آپ سے افسانہ سنانے کی درخواست کریں گے۔۔۔ کیوں اسد!؟ ٹھیک ہے نا؟ قاسمی صاحب تشریف لائیں اور ان سے افسانہ نہ سنا جائے۔۔۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اطہر! بچوں سے کہو قاسمی صاحب کے سب مجموعے یہاں پہنچا

دیں۔ میں جیسے جی اٹھا۔ اپنے جوش میں تقریباً ہکلاتے ہوئے میں نے تائید میں کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیا۔ وہ سب بھول گیا جو اس موقع پر کہنے کے لیے سوچ رکھا تھا۔

کسی نے کہا، ”زبردست تجویز ہے! شعر و افسانہ دونوں آپ کی مملکتیں ہیں، جناب والا! افسانہ عطا ہو“۔

قاسمی صاحب مسکرائے، کہنے لگے کہ اچھی بات ہے۔ ایک افسانہ بھی سن لیجیے۔ اب صحیح وقت تھا۔ میں نے اطہر نفیس کو سرگوشی میں یہ بتا دیا کہ بھائی! میں نے دو کہانیاں اور لکھ لی ہیں۔ وہ خوش ہو گئے، لپک کے قاسمی صاحب سے کہنے لگے کہ ٹھیریے گا جناب! پہلے اسد سے اس کی تازہ کہانی سن لیجیے۔

قاسمی صاحب کے لیے تو یہ خبر تھی کہ میں ناچیز افسانہ بھی لکھنے لگا ہوں، خوش ہو گئے، مسکرا کے بولے، ”سبحان اللہ! اچھی بات سننے کو ملی! جی اسد! بسم اللہ!۔

میں نے کہا کہ میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہو گی اور میں سنبھل کے دوزانو ہو بیٹھا، جیب سے دونوں مینواسکرپٹ نکال لیے۔

اصغر بھائی بولے، ”اوہو! بھئی کیا وہ کہانی بھی لائے ہو؟ ---مریم والی؟“ اس وقت تک میں اطہر نفیس کی طرف سے گھوم چکا تھا، عرض کیا کہ جی اصغر بھائی! لایا ہوں کہیے تو وہی سنا دوں ---- ویسے ایک اور کہانی بھی لکھ لی ہے ---- مختصری۔ عنوان ہے Yom Kippur۔

چھتاری صاحب ان دنوں اردن میں پاکستان کے سفیر تھے، کہانی کا عنوان سن کے تجسس کے ساتھ بولے، ”خوب!“ ”یوم کپور؟ ---بھئی یہ سناؤ“۔ قاسمی صاحب نے فیصلہ دیا کہ جی ہاں اسد محمد خاں سے دونوں کہانیاں سنیں گے۔

میں تو انتظار ہی میں تھا، یوم کپور پھر 'باسودے کی مریم' سنا دی۔ بعد میں اطہر بھائی نے بتایا کہ مریم کی کہانی ختم ہوئی تو قاسمی صاحب آبدیدہ تھے۔ میرا کام ہو چکا تھا۔ قاسمی صاحب نے مجھے دیکھا، ہلکے سے مسکرائے اور کہنے لگے۔ ”یہ دونوں کہانیاں ادھر دیجیے“ -----یہ 'فنون' کی کہانیاں ہیں“۔

اطہر نفیس نے کہانیاں میرے ہاتھ سے لے کر قاسمی صاحب کو پیش کر دیں۔ اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کتنے ہی برس گزر گئے۔ میری بہت سی کہانیاں 'فنون' میں درج ہونے کے بعد قاسمی صاحب نے کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے مریم کی کہانی کے بارے میں وہ کچھ فرمایا جو اب تاریخ کا حصہ ہے اور جو مجھے تاعمر گرم سرشار رکھے گا۔

خدا ان کی یاد کو جگمگاتا رکھے (آمین)۔

☆☆☆☆

سرفراز شاہد

ایک واقعہ

یہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے لاہور کے ایک پبلشر نے میری مزاحیہ شاعری کی دو کتابیں "ہیرا پھیری" اور "کچھ تو کہیے" شائع کیں۔ اس سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ میں نے پبلشر سے چند کتابیں لیں اور لاہور کے اہل قلم دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ اچانک خیال آیا کہ ادب کی اہم ترین شخصیت یعنی احمد ندیم قاسمی صاحب کو اپنی کتابیں پیش کرنا بھول گیا ہوں۔

قاسمی صاحب سے میرے کوئی ذاتی مراسم نہیں تھے۔ چناں چہ اگلے روز میں اپنے پبلشر جناب طاہر گورا کو ساتھ لے کر احمد ندیم قاسمی صاحب کے دفتر میں حاضر ہوا، انھیں اپنی دونوں کتابیں پیش کیں اور ان کی رائے کا طالب ہوا۔ جب قاسمی صاحب میری کتابوں کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے تو مجھے ان کے چہرے پر ایک خوشگوار حیرت کی جھلک نظر آئی۔ پھر سر اٹھا کر بولے۔

"سرفراز صاحب! آپ اتنی اچھی مزاحیہ شاعری کرتے ہیں!
آپ فنون کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔ آئندہ اپنا تازہ کلام ضرور بھیجئے گا۔"

پھر گردن گھما کر طاہر گورا کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

"گورا صاحب! آپ فوری طور پر ان کتابوں کی تقریب رونمائی کا اہتمام کریں۔ میں اس تقریب میں سرفراز شاہد کی شاعری پر مضمون پڑھوں گا۔" میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ناچیز کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

طاہر گورا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اسی ہفتے ہمارے اس پبلشر دوست نے "شیزان" لاہور میں ایک مختصر لیکن باوقار تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی نے فرمائی۔ اس تقریب میں ناصر نقوی، زاہد مسعود اور چند دوسرے اہل قلم نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں محفل کے صدر جناب احمد ندیم قاسمی نے میری شاعری کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا ادبی اعزاز تھا۔

میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ قاسمی صاحب جیسی عظیم شخصیت میری شاعری کو اتنا پسند فرمائے گی۔ بعد ازاں یہ مضمون جریدہ ''چارسُو'' اور میری نئی کتاب ''چوکے'' میں شائع ہوا۔

قاسمی صاحب کی اس تحریر کو میں آج بھی اپنے لیے بہت بڑی ادبی سند سمجھتا ہوں۔ ان کی حوصلہ افزائی نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ یہ ان کا بڑا پن تھا۔ فکاہی ادب میں آج میں جس مقام پر کھڑا ہوں وہ میرے پیر و مرشد سید ضمیر جعفری کی رہنمائی اور جناب احمد ندیم قاسمی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔

ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆☆☆☆

خاور نقوی

لوحِ دل پر نقش ایک واقعہ

میں "پوٹھوہار میں افسانہ نگار" کے عنوان سے تحقیقی و تنقیدی مقالہ کا مسودہ لے کر جناب احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کچھ تاثرات لکھنے کی گزارش کی۔ میرا خیال تھا کہ اگر انھوں نے ہامی بھر لی تو کم از کم ایک ہفتہ اسے رکھیں گے اور اگر انھیں اپنی وقیع مصروفیات سے کچھ وقت ملا تو اس کے بارے میں رائے تحریر فرمائیں گے۔

جب میں ان کے دفتر میں حاضر ہوا تو وہ حسب معمول کام میں مصروف تھے۔ مجھ سے مسودہ لے کر ورق گردانی کی اور مجھے مسودہ دیتے ہوئے کہا "دو تین دن میں آپ کو رائے مل جائے گی"۔

چوتھے دن ندیم صاحب کا خط ملا۔ تاثرات لکھنے کے ساتھ انھوں نے ایک دن کی تاخیر پر معذرت بھی کی۔ ان کی ادب پروری، احساس ذمہ داری اور ایفائے عہد کا یہ واقعہ یادوں کی دنیا میں انمٹ نقش بن کر محفوظ ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆☆

پروفیسر سیف اللہ خالد

ایک واقعہ

خدا جانے، قاسمی صاحب اپنے معاصر انجینئر ڈاکٹر کے متعلق سخت ترین الفاظ لکھنے پر کیوں مجبور ہو گئے تھے۔ میرے لیے تو مرحوم نے شائستگی کی سطح سے نیچے اترنا کبھی گوارا نہ کیا، حالاں کہ میں اپنی دو کتب ""اردو ادب کے پچاس سال' اور "دیباچے سے فلیپ تک" کے علاوہ دو مضامین "حضرت احمد ندیم قاسمی اور فرقہ فنونیہ" نیز "ندیم کی غزل کا علمی وفنی تجزیہ' میں ان پر کڑی تنقید کر چکا تھا۔ یہ ۲ستمبر ۲۰۰۰ء کی رات تھی۔ روزنامہ "انصاف' کی پہلی سالگرہ کی تقریبات کے حوالے سے ہمدرد سنٹر لاہور میں منعقد ہونے والے نعتیہ مشاعرے کے شرکا، ہال سے ملحق کمرے میں جمع تھے کہ حضرت احمد ندیم قاسمی تشریف لائے۔ انھوں نے سب سے مصافحہ کیا مگر میں ہاتھ ملانے لگا تو انھوں نے بازو پھیلا کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ سچ پوچھیے کہ ان کی سینے کی گرمی جس میں شفقت بھری مقناطیسی لہریں دوڑ رہی تھیں، میں آج بھی اپنے وجود میں سرایت محسوس کرتا ہوں۔

یہ معاملہ، معانقے ہی پر ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے میری جارحانہ تنقید کو جواز فراہم کرتے ہوئے کہا کہ ہم بھی ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے ایسی ہی "جرأتوں' کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہونٹوں پر سجی مسکراہٹ کے جلو میں جب یہ جملہ کہا کہ "آپ تو تحقیق کا تڑکا لگا کر تنقید کو عالمِ بالا تک پہنچا دیتے ہیں!' تو مجھے ان الفاظ میں مدح وذم کے اشتراک کا گمان ہوا۔ میں ابھی اس فقرے کی کاٹ کا تجزیہ کر ہی رہا تھا کہ منتظمین نے شعرا کو مشاہرہ گاہ میں چلنے کی دعوت دی۔ ندیم صاحب صوفے سے اٹھے اور میرا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ روانہ ہوئے۔ سٹیج پر جب وہ مسندِ صدارت کو رونق بخشنے لگے تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں شعرا کی صف میں بیٹھنے کے ارادے سے مڑا تو انھوں نے مجھے فی الفور اپنی دائیں جانب بٹھا لیا۔

بائیں جانب عطاالحق قاسمی تشریف فرما تھے) یوں بار دگر عزت افزائی پر نازاں، دو گھنٹے تک میں ان کی مصاحبت اور مکالمات سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

صاحبو! تالیفِ قلب کی یہ معمولی سی مگر کتنی بلیغ مثالیں ہیں! انھی کیفیات کا ثمرہ تھا کہ میں نے ایک نظم "سنو بابا!" کے زیرِ عنوان لکھی جو 'بجنگ آمد" یکم تا ۱۵ اپریل ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر ڈاکٹر خالق تنویر راوی ہیں کہ قاسمی صاحب نے اس نظم کو بے حد سراہا اور دیر تک میری جرأتوں کی داد دیتے رہے۔

کرنل ناز سرحدی

ایک واقعہ

جناب احمد ندیم قاسمی کی رحلت پر سہ ماہی ’ادبیات‘ کا خصوصی شمارہ ترتیب دینے سے متعلق آپ کا خط پشاور سے ہوتا ہوا مجھے آج برطانیہ میں موصول ہوا۔ شکریہ! سب سے پہلے ہماری یہ دعا ہے کہ خداوندِ عالم مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آپ کے خط کے مندرجات پڑھ کر یک گونہ تسلی ہوئی کہ مرحوم کی یاد میں سہ ماہی ’ادبیات‘ کا ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا جا رہا ہے، جس میں ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے نثری اور منظوم خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا۔

مجھے احمد ندیم قاسمی مرحوم سے ملنے کا اتفاق صرف ایک بار رہا۔ یقین جانیے اس ایک ملاقات میں مرحوم کی شخصیت اور فن دونوں کا دل آویز مظاہرہ میرے دل و دماغ پر ایک انمٹ احساس نقش کر گیا جو مجھے تا زیست یاد بھی رہے گا اور میرے لیے باعثِ فخر بھی ہو گا۔

ہوا یوں کہ میری اولین منظوم تصنیف ’’دریچہ دل‘‘ کا مسودہ جب برسوں کی ریاضت کے بعد ۱۹۸۵ء میں تیار ہوا تو استادِ محترم جناب بیرا کرم کے مشورہ سے طے پایا کہ اس کتاب کا تعارف احمد ندیم قاسمی سے لکھوایا جائے۔

اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ہم تین حضرات یعنی جناب بیرا کرم، جناب ڈاکٹر نوید شبلی اور میں لاہور میں اکٹھے ہوئے اور پی اے ایف آفیسرز میس میں مقیم ہو گئے۔ چوں کہ جناب قاسمی مرحوم سے جناب بیرا کرم کا پہلے ہی رابطہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اگلے دن جناب بیرا کرم ’’دریچہ دل‘‘ کا مسودہ لے کر قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور میں ڈاکٹر نوید شبلی کے ہمراہ فنون پریس کی طرف گئے کہ کتاب چھاپنے سے متعلق معاملات طے ہو سکیں۔ ادھر قاسمی صاحب نے کمال مہربانی فرما کر مسودہ مطالعہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا اور دو دن بعد ہم تینوں کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ ہم حاضر ہوئے تو مرحوم تپاک سے ملے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک خوشگوار موڈ میں تھے۔ انھوں نے ہمارے لیے چائے منگوائی اور پھر اپنی میز کی دراز سے ’’دریچۂ دل‘‘ کا مسودہ نکال کر اپنے سامنے رکھا اور ایک کاغذ پر کتاب سے اپنے تاثرات قلم بند کرنے

لگے۔ اس دوران میں میرا دل دھک دھک کرتا رہا کہ میری زندگی کی پہلی تصنیف کے متعلق ہمارے ملک کے نامور ترین شاعر اور ادیب اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جو "ناز سرحدی، فن اور اسلوب" کے عنوان سے "دریچۂ دل" کا تعارف بنتے جا رہے تھے۔

میں نے دیکھا قاسمی صاحب روانی سے لکھتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور اپنا لکھا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا کر فرمایا۔ "لیجیے کرنل صاحب!" "آپ ایک عدد کتاب کے مصنف ہو گئے ہیں"۔ اس کاغذ پر جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ میں نے اس وقت نہیں پڑھا اور نہ پڑھنے کی ہمت تھی۔ لیکن قاسمی صاحب کی مسکراہٹ اور ان کے حرکات و سکنات سے مجھے تسلی ہو رہی تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ یہ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کا دن تھا۔

قاسمی صاحب نے اتنے قلیل نوٹس پر میری کتاب کا جو تعارف لکھا وہ میرے لیے تا زیست ایک خوش کن یادگار کے طور پر زندہ رہے گا۔ یہ نہ صرف ایک باعثِ صد افتخار واقعہ ہے بلکہ قاسمی صاحب کی مہربان شفقت پر بھی دلالت ہے۔

آخر میں دُعا کہ اللہ پاک قاسمی صاحب مرحوم کو کروٹ کروٹ جنتِ نعیم عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆

محسن احسان

نذرِ ندیم

وہ تو اک گہرا سمندر تھا کہ جس کی تہ میں
درد کی لہر بھی ہے شوق کا طوفان بھی ہے
اس کے سینے پہ سفینے ہیں کئی رقص کناں
جن کی ساحل پہ رسائی کا نگہبان بھی ہے
اس کی اک ذات میں ہیں قوسِ قزح کے کئی رنگ
جن کو پہچاننا مشکل بھی ہے آسان بھی ہے
اس کے زخموں میں ہے آفاق کے زخموں کی نمود
وہ جہاں دار بھی ہے بے سروسامان بھی ہے
افقِ فنِ صداقت پہ چمکنے والا
اک قلم کار نہیں اک بڑ انسان بھی ہے
وہ تو ہے حسنِ اخوت کا وہ تاریخ نگار
جس نے آزادیِ افکار کی تعبیر لکھی
جس نے جمہور کے آئینوں کے ریزے چُن کر
اس کے مٹی میں ملے خوابوں کی تعبیر لکھی
جس نے گرتی ہوئی دیوار کو کاندھا دے کر
شہرِ تخریب میں رعنائیِ تعمیر لکھی
سرخیِ چہرۂ انساں نکھر آئی جس سے
نوکِ مژگاں سے سرِ عرش وہ تحریر لکھی
جس کے ہر لفظ میں ہے نور جہاں کا پرتَو
جس نے جو بات بھی لکھی وہ جہانگیر لکھی

(احمد ندیم قاسمی کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی، اسے قاسمی صاحب نے بے حد سراہا تھا)

غوث متھراوی

بحضور احمد ندیم قاسمی

کیسے یقین آئے کہ وہ شخص مر گیا
حدِ سوادِ زیست سے کیونکر گزر گیا

تنہا لڑا وہ جنگ ادب کے مفاد کی
اور سرخرو رہا وہ جہاں اور جدھر گیا

کرنے سے جس کے نام و نسب کو ملے دوام
’’احمد ندیم قاسمیؔ‘‘ وہ کام کر گیا

سکتے میں آگئے سبھی دیدہ ورانِ فن
اس بزمِ فن سے ایک بڑا دیدہ ور گیا

وہ موج مست خرامی کے ساتھ ساتھ
دریا تھا، بہہ رہا تھا اچانک اتر گیا

میّت کو دفن کر کے تری تھا بہت اداس
اس روز غوثؔ لوٹ کے جب اپنے گھر گیا

☆☆☆☆

ظفر اکبرآبادی

احمد ندیم قاسمی

عجز اور انکسار کا حامل ندیمؔ تھا
جھک کر ہر اک سے ملنے کا قائل ندیمؔ تھا

شاعر بھی تھا ادیب بھی کالم نگار بھی
ہر رخ سے ایک جوہرِ قابل ندیمؔ تھا

خوش خلق و خوش مزاج و خوش اطوار و خوش نہاد
انسانیت کے حسن میں کامل ندیمؔ تھا

دنیائے فن میں اس کا نہ تھا کوئی بھی حریف
خود آپ اپنا مدِ مقابل ندیمؔ تھا

اس دور میں جو ملتی ہیں لوگوں میں کم ظفرؔ
ایسی خصوصیات کا حامل ندیمؔ تھا

☆☆☆☆

ذوقی مظفر نگری

احمد ندیم قاسمی

بے زبانوں کی زباں، احمد ندیم قاسمی
غم زدوں کا ترجماں، احمد ندیم قاسمی
کہہ دیا لبیک تو نے موت کی آواز پر
زندگی کے رازداں، احمد ندیم قاسمی
شاعرانِ حال کو غم دے کے رخصت ہو گیا
فیضِ بے حد کا جہاں، احمد ندیم قاسمی
تیری یادوں میں فسردہ ہے فنونِ صد بہار
اے ادب کے باغباں، احمد ندیم قاسمی
آنکھ میں آنسو، جگر میں سوزِ غم، لب پر فغاں
فکر و فن ہے نیم جاں، احمد ندیم قاسمی
اک نشاطِ روح پرور، اک بساطِ کارساز
اک محبت کا جہاں، احمد ندیم قاسمی
اُڑ گئی ہیں نکہتیں غارت ہوا کیفِ بہار
مضطرب ہے گلستاں، احمد ندیم قاسمی
ماتمی راہوں میں دل کی دھڑکنوں کے ہم قدم
درد بن کر ہے رواں، احمد ندیم قاسمی
کس سے ایسے میں کریں جبرِ مشقت کا گلہ
اب ہے نظروں سے نہاں، احمد ندیم قاسمی

لائقِ تعظیم بھی ہے، قابلِ تکریم بھی
عظمتوں کا آسماں ، احمد ندیم قاسمی
نثر ہی کیا، نظم بھی ہے تیرے مسکن کی کنیز
اے غزل کے نکتہ داں، احمد ندیم قاسمی
خلد میں جانے سے پہلے دے گیا ہے بافراغ
گونگے حرفوں کو زباں، احمد ندیم قاسمی
اب نہ گھر میں ہے، نہ دفتر میں، نہ بزمِ شعر میں
اب تجھے ڈھونڈیں کہاں، احمد ندیم قاسمی
سُونے سُونے ہیں ادب کے راستے تیرے بغیر
اے امیرِ کارواں، احمد ندیم قاسمی
تا ابد زندہ رہے گا علم و فن کے شہر میں
یہ ترا حسنِ بیاں، احمد ندیم قاسمی
یاد اے ذوقیؔ تجھے تنہائیوں میں آئے گا
ہم خیال و ہم زباں، احمد ندیم قاسمی

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان

سخن کدہ ترے طرزِ سخن کو ترسے گا

وہ لفظ جس سے ادا ہو تری جدائی کا کرب
وہ لفظ جو مری چاہت کا ترجماں ہو جائے
جو میری بات بنائے مرا بیاں ہو جائے
وہ لفظ مجھ کو کسی بھی لغت میں مل نہ سکا
بجھا یہ غنچۂ دل اس طرح کہ کِھل نہ سکا
پکارتے تھے، پکاریں گے تجھ کو کر کے ندیم!
یہی دلیل ہے تُو اسم بامسمّٰی تھا
یہ آنکھ نورِ سحر سے مُکر نہیں سکتی
نگاہ سے تری صورت اُتر نہیں سکتی
رہے گا دل میں تُو جیسے نظر میں رہتا تھا
ترے رفیق دعاؤں کی ڈالیاں لے کر
بصد خلوص وفاؤں کا عہد کرتے ہیں
نکھر نکھر کے تری راہ میں بکھرتے ہیں
وہ اشک، جن پہ جواہر نثار ہوتے ہیں
محبتوں کے سمندر شمار ہوتے ہیں
مرا یہ عجزِ بیاں، کم زبانیاں، قائم
ترے خلوص، تری مہربانیوں کو دوام
عقیدتوں کے یہ قلزم ہیں تیرے نام تمام
”سخن کدہ ترے طرزِ سخن کو ترسے گا
زباں سُخن کو سُخن بانکپن کو ترسے گا“

اسلم فیضی

احمد ندیم قاسمی کی وفات پر لکھی گئی نظم

کہاں یہ حوصلہ مجھ میں کہ اُس کا مرثیہ لکھوں
کہ جس کا ہاتھ رہتا تھا ہمیشہ نبضِ ہستی پر
وہ جس کو زندہ رہنے کے قرینے خوب آتے تھے
سمندر میں اُتر کر خود سمندر ہو گیا ہے اب
اُسے سچ نے اُجالا تھا۔ اُسے کیوں موت مارے گی
وہ اپنے لفظ کی حرمت میں یارو! کل بھی زندہ تھا
وہ اپنے لفظ کی حرمت میں یارو! اب بھی زندہ ہے
کہاں کا حوصلہ مجھ میں کہ اُس کا مرثیہ لکھوں
وہ جس نے کہکشاں کی روشنی سے زندگی کے خواب لکھے تھے
وہ جس نے عظمتِ نوعِ بشر کے باب لکھے تھے
وہ اپنے دیس کی مٹی کا عاشق تھا
شرافت اور محبت کی علامت تھا
وہ دنیا بھر کے مظلوموں کے حق میں اک صدائے درد رکھتا تھا
کسی جابر کسی ظالم کے آگے وہ کبھی جھکنے نہیں پایا
یزیدوں کے مقابل اُسوۂ شبیرؓ پر ایمان رکھتا تھا
وہ ایسی نعت لکھتا تھا
جسے پڑھ کر شہِ کونینؐ سے اُس کی عقیدت کا پتہ معلوم ہوتا ہے
وہ جس نے ہر نفس کو پیار کی مہکار بخشی تھی

وہ جس کی گفتگو میں چاندنی کا نرم لہجہ تھا
کبھی دشمن سے بھی وہ تلخ لہجے میں نہیں بولا
اگر اُس کو کبھی احباب کے چبھتے رویوں پر گلہ ہوتا
تو وہ اندر ہی اندر اپنے سارے کرب سہ لیتا تحمل سے
مگر خاموش رہتا تھا
عجب سیرت کا مالک تھا عجب کردار تھا اُس کا
کہاں یہ حوصلہ مجھ میں کہ اُس کا مرثیہ لکھوں

☆☆☆☆

عزیز اعجاز

عہد ساز شخصیت

تو کیا یہ سچ ہے
کہ وہ زمانہ گزر گیا ہے
تو کیا یہ سچ ہے
وہ عہد ہم سے بچھڑ گیا ہے
کہ جس میں ہم اور
ہم سے پہلے کے ان گنت لوگ
جی رہی تھے ----
مگر میں کیسے یقین کر لوں
مجھے خبر ہے
کہ عہد لمحوں کا اک بہاؤ ہے
جیسے دریا
زمین کی وسعتوں کو
سیراب کرتے کرتے
کسی سمندر میں جا اُترتا ہے

☆☆☆☆

محمد آصف مرزا

یہاں سے اڑ کے میں جب آسماں پہ جاؤں گا

سنو
اے مرے چشمِ تر، غم اثر ساتھیو!
مضمحل شام ڈھلنے لگی
یہ زمیں، آسماں جیسے رک سے گئے
تا بہ حدِ نظر
جلتے بجھتے چراغوں کی لو تھرتھرانے لگی
ایسا محسوس ہونے لگا ہے
زماں و مکاں کی حدیں روبرو آ گئیں
ہاں یہیں
سرِ حدِ وقت کے آخری موڑ پر
آسماں کی طرف جست بھرنے کو
بس رات بھر کے لیے
کچھ زمیں چاہیے

☆☆☆☆

سید ضیاالدین نعیم

امر جُملے

عنایت کیجیے
آپ اپنی اک تخلیق ازراہِ نوازش
فنون: اس کو محبت سے، بڑے اکرام سے
شائع کرے گا،
یہ جملہ، یہ حیات افروز جملہ
ادب کی راہ میں لرزیدہ قدموں سے رواں
کتنے ادیبوں کی سماعت میں
گُھلا اور شہد سا ٹپکا گیا تھا
نہیں موصول ہوگی آپ کی تخلیق جب تک
فنون: اپنی اشاعت
روکے رکھے گا:
یہ جملہ جانے کتنے سربہ زانو لکھنے والوں کو
خود آگاہی کی سرشاری سے
مالامال کر کے
نیا اک راستہ دکھلا گیا تھا
یہ جو ہے بیگ میرا
جس کو ازراہِ محبت
آپ پہنچا دیتے ہیں میری سواری تک

یہ میں آج آپ کو ہرگز نہ دوں گا
کہ مضمون آپ نے اپنا
نہیں پہنچایا، چھپنے کو ابھی تک،،
یہ جملے، پیار سے معمور جملے
فروزاں کر گیے تھے کتنے سینوں میں
دیا تخلیق کاری کا-----
یہ جملے سوچنے والا
یہ جملے بولنے والا
اَمر ہے
مَر نہیں سکتا

☆☆☆☆

اکرم سحر فارانی

آہ میرے غمگسار

عنصری پنجرے میں ہے اک بندشوں کے گھر میں ہے
زندگی کا ہر پرندہ موت کے محور میں ہے

زندگی ہو کر رہا کرتی ہے مرکز پر خرام
زندگی مجبور کتنی ذات کے پیکر میں ہے

میری نظروں سے کوئی دیکھے نظامِ کائنات
مرنے جینے کا بھیانک کھیل ہر منظر میں ہے

سانحہ اس کی جدائی کا کروں کیسے رقم
اک ہجومِ درد و غم میرے دلِ مضطر میں ہے

رات دن تڑپا رہا ہے اس کا حسنِ التفات
اس کی یادوں کا سمندر میری چشمِ تر میں ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو اب محبانِ ادب
دل میں اس کی آرزو ہے اور سودا سر میں ہے

اب کوئی ملتا نہیں احمد ندیم قاسمی
وہ سحر بزمِ سخن میں ہے نہ اپنے گھر میں ہے

☆☆☆☆

نسیمِ سحر

تہذیبِ شہرِ دِل کا نمایندہ کیا گیا
اقدار مِٹ گئیں، سبھی معیار گِر گئے

رفعت سب اُس کے ساتھ زمیں بوس ہو گئی
عظمت کے ترجماں تھے جو مینار، گِر گئے

دربارِ شہ میں اُس نے جھکایا نہ سر کبھی
سجدے میں لوگ جب سرِ دربار گِر گئے

دُنیا سے ایک شخص اُٹھا، پھر بھی یوں لگا
جتنے بھی تھے درخت ثمر دار، گِر گئے

اِک قاسمی کے جانے سے محسوس یوں ہوا
قصرِ سُخن کے سب در و دیوار گِر گئے

محوِ سفر ہم اب بھی انہی پانیوں میں ہیں
پر یُوں کہ جیسے ناؤ کے پتوار گِر گئے!

بے سایا اُس کے جانے سے ہم ہو گئے نسیمؔ
صحنِ چمن کے سارے ہی اشجار گِر گئے

☆☆☆☆

ڈاکٹر شاہین مفتی

ندیم صاحب کے لیے

سب کا ندیم سب کا وہ غم خوار اٹھ گیا
آخر برس کے ابرِ گہر بار اٹھ گیا
جب سے وہ اپنا قافلہ سالار اٹھ گیا
سمجھو کہ سر سے سایۂ دیوار اٹھ گیا
سود و زیاں کے کھیل سے رغبت نہ تھی جسے
کیسا وہ اک تونگر و زردار اٹھ گیا
وہ بے نیازِ اہلِ جفا، صاحبِ انا
محفل سے لے کر دولتِ پندار اٹھ گیا
جس کی وفا پہ اہلِ محبت کو ناز ہے
وہ شاکر و حلیم وہ خوددار اٹھ گیا
جس کا کلام عظمتِ انساں کا ہے کلام
وہ خالقِ ازل کا گنہگار اٹھ گیا
باغِ سخن کا وہ گلِ معنی پھر ایک دن
دامن میں لے کر رونقِ گلزار اٹھ گیا
دل پہ ملالِ فرقتِ پیہم کا بوجھ ہے
لوٹا نہیں جہاں سے جو اک بار اٹھ گیا

☆☆☆☆

حکیم خان حکیم

بیادِ احمد ندیم قاسمی

شعر و ادب کی آن تھا جو، وہ چلا گیا
اردو کا پاسبان تھا جو، وہ چلا گیا

علم و ہنر میں اس نے نئے تجربے کیے
اہلِ زباں کی جان تھا جو، وہ چلا گیا

باغِ سخن میں آج بھی خوشبو اسی کی ہے
پھولوں کا گلستان تھا جو وہ چلا گیا

اس نے کسی بھی موڑ پہ ہارا نہ حوصلہ
ہمت کا آسمان تھا جو، وہ چلا گیا

ہر آن محوِ فکر تھا اس قوم کے لیے
ملت کا پاسبان تھا جو، وہ چلا گیا

ڈوبا ہوا ہے اشکِ رواں میں مرا قلم
ہر دل پہ حکمران تھا جو، وہ چلا گیا

دھرتی کو میری اس پہ بڑا فخر تھا حکیم
میرے وطن کی شان تھا جو، وہ چلا گیا

☆☆☆☆

جاوید احمد

رہو سدا سرِ محفل، بصد کمال جیو
خدا کرے کہ ابھی تم ہزار سال جیو

نہ آ سکو گے مہ و سال کے شمار میں تم
سو کم ہے یہ بھی اگر تم ہزار سال جیو

ادب کی اوٹ سے خورشید بن کے روز ابھرو
غروب جس کا نہ ہو ایسا لازوال جیو

یوں ہی صریرِ صبا بھی، شگفتِ گُل بھی لکھو
لہو کی لے میں ملا کر سُخن کی تال جیو

تمھارا رنگ ہی آئندہ موسموں پہ رہے
بہت دلوں میں بسو اور بہت وصال جیو

مثالِ شبنم و گُل دوستوں کے دل میں رہو
کہ دشمنوں کے لیے بن کے اک سوال جیو

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی کی 81 ویں سالگرہ پر پیش کیا گیا خراجِ تحسین

احمد حسین مجاہد

بابا کے نام

(احمد ندیم قاسمی کے لیے)

وہ کہ پتھر تھے
تو نے انھیں اپنے ہاتھوں سے ایسے تراشا
کہ وہ اپنے ہی عشق میں مبتلا ہو گئے
وہ جنھیں بولنے کا قرینہ نہ آتا تھا
تُو نے انھیں اپنے شعری وسائل سے
خیرات دی
جن کے لفظوں میں
تیری دعاؤں سے تاثیر آئی
وہی ایک دن
حرفِ دشنام لے کر ترے سامنے آ گئے
تُو نے اُن کا ہر اک وار دل پر سہا
آنسوؤں کو پسِ چشم کر کے
بھڑکتی ہوئی آگ کو تُو نے ٹھنڈا کیا
درگزر کرنے والے سخی! تُو نہیں جانتا
تیرا انکار جس نے کیا
اُس کے لفظوں سے تاثیر جاتی رہی
تیرا انکار جس نے کیا
جیتے جی مر گیا

امتیاز الحق امتیاز

کاغذ فلک بنا دیا

تصویر تو وہ ایک تھی
موجود اُس میں جابجا
لیکن بہت سے شیڈ تھے
ہر نقش بولتا ہوا
اسرار کھولتا ہوا
پاتال سے نکال کر
ہر لفظ کو اُجال کر
اُس میں ستارے ٹانک کر
کاغذ فلک بنا دیا
وہ روشنی مثال تھا
اُس کا یہی کمال تھا
اُس کے خلاف عمر بھر
کیا کیا لکھا گیا، مگر
تاریخ کر گیا رقم
احمد ندیم قاسمی

☆☆☆☆

سلطان کھاروی

نذرِ قاسمی

وہ شاعری میں نام وَر
مُدیر کام یاب بھی
تھی علم جس کی جُست جُو
کہانیاں زمین کی
وہ قاسمی کہانیاں
اسی سبب سے آج بھی ہیں
ادب میں حُکم رانیاں
وہ کالموں کی آبرو
وہ شاعروں کی آرزو
وہ ہم نوا!
وہ مہرباں
زمانہ اُس کی داستاں
کبھی بھلا نہ پائے گا
سدا وہ یاد آئے گا
وہ باخبر وہ باہُنر
وہ شاعری میں نام وَر

☆☆☆☆

تابش کمال

خوش نظر

اسے خاک میں گھر بنانے کی دُھن تھی
زمیں قرن ہا قرن سے اس کی مقروض تھی
آدمی کا چلن اس کا فن،
یار کے لہجۂ گمشدہ کی تھکن اس کا اصلِ سخن
اس کا دل پھول کی نکہتوں میں دھڑکتا
پرند اس کی آواز پر چہچہاتے
ندیم ایک برگد، ندیم اک لگن
گرتے لوگوں کی لاٹھی
ہوا جب کبھی گدگدائے
تو ہم اس کے لہجے کی اوس اوڑھتے ہیں
ہنسی اور نمی کی حدیں ایک ہیں
جب تلک خاک پر ایک بھی خوش نظر دیکھتا ہے
ندیمؔ عشقِ انسان کا استعارہ رہے گا
زمیں سے فلک تک ہنر کا اجارہ رہے گا

☆☆☆☆

رانا سعید دوشی

سمندر

(احمد ندیم قاسمی کے لیے)

وہ اک سمندر
جو انکساری میں
خود کو دریا کہا کِیا تھا،

جو جھیلوں، چشموں سے بھی
بہت ہی محبتوں اور شفقتوں سے
ملا کِیا تھا،
گزر گیا ہے
دلوں کے ڈوہنگے
سمندروں میں اتر گیا ہے۔

وہ ایک مہتاب،
آسمانوں کی وسعتوں میں
زمیں کے ذرّے،
"فنون" کی قدرتوں سے اختر بنا رہا تھا
جو ایک مدت سے آنسوؤں کو ہنسا رہا تھا،

فضا کے جھرنوں کو،
قہقہوں کو،
وہ جھیل چشموں کو،
نیل آنکھوں کو،
سوگواری کے آنسوؤں سے
بھرے سمندر بنا گیا ہے
کہ میرے جیسے کئی ہزاروں، جو تھے تہی دست
اس کے بحرِ فنون کے ساحلوں سے گوہر چنا کیے تھے،
اب اپنی آنکھوں سے سچے موتی
بہا رہے ہیں

یہ ابر پارہ---
جو سطحِ آبِ رواں سے اُڑ کر
اسی سمندر کی تعزیت کو
ہمارے خطے میں آ رہا ہے----
اگر میں اس سے گلے ملوں گا
مرے دوآبے چھلک پڑیں گے

☆☆☆☆

جاوید فیروز

ماتم کرتی نظم

مجھے اس بین کرتی شام کی دہلیز پر رک کر
تمہاری موت کے اس سانحے کو نظم کرنا ہے
ک جس نے لفظ کی تکریم کے سب پاسبانوں کو
محبت داستانوں کو، کہانی کو، فسانوں کو،
زمینوں اور زمانوں کو
کسی بے سمت دریا کے
کسی بے انت صحرا کے
حوالے کر دیا ہے
مری آنکھوں پہ سکتہ ہے
مرے ہر خواب کی شریان پھٹتی ہے
مری آواز میں لرزش نمایاں ہے
سبھی آنسو کہیں اندر کی کھائی میں
بس اک تیری جدائی میں
دکھوں کی آبشاروں کی طرح سے گر رہے ہیں
ہمارے قاسمی!
تم چاند ہو اور بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر کہیں اپنے عزیزوں سے، دلاروں سے
بس ایک پل چھپ تو سکتے ہو
مگر تم مر نہیں سکتے ـــــ مگر تم مر نہیں سکتے !!

☆☆☆☆

شہزاد بیگ

نذرِ احمد ندیم قاسمی

تو نے ہر عہد کو اجالا ہے
روشنی ہی ترا حوالہ ہے

اہلِ شعر و سخن یہ مانتے ہیں
کام سب سے ترا نرالا ہے

جو چلا اس پہ پا گیا منزل
تو نے وہ راستا نکالا ہے

آج اہلِ ادب کی محفل میں
ہر طرف تیرا بول بالا ہے

لوگ کرتے ہیں پیروی تیری
تُو نے اسلوب جو نکالا ہے

☆☆☆☆

علی یاسر

روشن ستارہ

سالہا سال تک جگمگاتا رہا
ٹمٹماتا رہا
ایک روشن ستارہ
جو رخصت ہوا
تیرگی چھا گئی
اور گریہ کناں کاروانِ ادب
اپنی محرومی پر
اک ادب پرور اور محسنِ شعر و فن
کی جدائی پہ
آنسو بہاتا رہا
ڈگمگاتا رہا

☆☆☆☆

اسداعوان

بیادِ احمد ندیم قاسمی

فسردہ ہیں سبھی تیرے عقیدت مند گاؤں میں
محبت کے مسافر بیٹھتے تھے تیری چھاؤں میں

جناب قاسمی داغِ جدائی دے گئے ہم کو
سخن ور آب دیدہ ہیں اداسی ہے فضاؤں میں

کہاں جائیں تجھے یہ صدقِ دل سے چاہنے والے
تیری مقبولیت چھم رہی ہے مہ لقاؤں میں

ابھی تک عالمِ شعر و سخن میں اضطرابی ہے
ہمیشہ یاد رکھتے ہیں تجھے اپنی دعاؤں میں

پنبہ در گوش تھے اہلِ ہنر شہرِ تمنا کے
”کوئی سنتا تو اک کہرام برپا تھا ہواؤں میں“

یہ شوریدہ نصیبی ہے کہیں نہ مل سکے لیکن
تجھے شامل کیا ہم نے اپنے آشناؤں میں

ترے اشعار بکتے ہیں ترے مضمون بکتے ہیں
ترے افسانے بھی بیچے گئے ہیں دل رُباؤں میں

☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی

احمد ندیم قاسمی کی نذر

دکھ ہے کچھ اتنا زیادہ نہیں لکھا جاتا
ہم سے ہرگز ترا نوحہ، نہیں لکھا جاتا
ہم کہاں اور کہاں اس کے سخن کا ادراک
اُس کے شعروں کا خلاصہ نہیں لکھا جاتا
اُن کی تقلید تو کرتے ہیں بہر طور، مگر
جیسا وہ لکھتے تھے ویسا نہیں لکھا جاتا
تیری قامت کو بیاں کیسے کروں میں "بابا"
تیرا لفظوں میں سراپا نہیں لکھا جاتا
اُس کی فطرت میں محبت کا تھا عنصر شامل
اُس کی الفت کا فسانہ، نہیں لکھا جاتا
اُس کی قامت کو رقم نوکِ قلم کیا کرتی
حرف سے اُس کا سراپا نہیں لکھا جاتا
جیسے دل چاہتا ہے تیری وفائیں لکھنا
سچ تو یہ بات ہے ویسا نہیں لکھا جاتا
تیری یادیں ہیں کسی بحرِ معانی کی طرح
تیری یادوں کا خلاصہ نہیں لکھا جاتا
یوں بچھڑ جائیں گے اک روز ندیمؔ، اپنے ندیمؔ
اب تو آئینے میں چہرہ نہیں لکھا جاتا

☆☆☆☆

سیدہ توقیر نقوی

آہ……احمد ندیم قاسمی

نہ مقیم ارض و سما میں ہے نہ وہ اب دیارِ وطن میں ہے
وہ نفاستوں کا امین تھا وہ فضائے زمزمہ زن میں ہے

یہی حکمِ ربِ جلیل تھا، کہ وہ چاہتوں کا کفیل تھا
وہ جو تابِ نارِ خلیل تھا، وہ ہجوم شعلہ فگن میں ہے

وہ جو روئے گل کا نکھار تھا، جو نفس نفس میں بہار تھا
دلِ عندلیب میں جا گزیں، وہ سرودِ سرو و سمن میں ہے

یہی زندگی ہے فنا نہیں، مرے لب پہ کوئی گلہ نہیں
وہ خلوصِ شعر میں خیمہ زن، وہ ہماری بزمِ سخن میں ہے

نہ مقیم ارض و سما میں ہے نہ وہ اب دیارِ وطن میں ہے
وہ نفاستوں کا امین تھا وہ فضائے زمزمہ زن میں ہے

☆☆☆☆

انیل چوہان

بے خواب قلم

میری دھرتی کے کسانوں سے مشقت لے کر
ذرۂ ریگ میں تو نے جو ستارے بوئے
اپنی پلکوں کے جو اشکوں کے اشارے بوئے
استعاروں میں حوالوں کے شمارے بوئے
تیرے اشکوں کا وہی بیج ثمر آور ہے
آج ماحول میں بکھری ہوئی گل پاش سحر
تیری سسکی، تیری ہچکی کا پتہ دیتی ہے
تجھ کو شبنم کے نگر میں بھی تو ڈھونڈا اکثر
چاندنی بھی تیرے خوابوں کو صدا دیتی ہے
آ ک اب شہرِ شفق کی یہ ترستی باہیں
خیر مقدم کے لیے ایسے کھلی ہیں جیسے
کاسنی پھول درخشندہ بہاریں لے کر
آنے والوں کے قدم چوم لیا کرتے ہیں

☆☆☆☆

محمد جنید اکرم

قاسمی صاحب اور پنجابی زبان و ادب

۱۹۷۹ء میں لاہور بورڈ سے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد نتائج کے انتظار میں غالباً تین مہینے فارغ رہا۔ اِنھی ایام فرصت میں مَیں نے بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے حالات زندگی اور علمی و ادبی کارناموں کے موضوع پر پہلا ادبی مضمون لکھا جو روزنامہ نوائے وقت کے رنگین صفحات پر ''خصوصی اشاعت'' کے عنوان تلے شائع ہوا۔ یہ میرا ادبی جنم تھا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالا فرسٹ اِیر کلاس میں داخلہ لے لیا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں کی دُنیا میں کھیل کود کے علاوہ دُنیائے علم و ادب کی سیاحت کا آغاز بھی کر دیا۔ گوجرانوالا سے لاہور، اسلام آباد، کراچی اور دوسرے شہروں میں مقیم نامور شاعروں ادیبوں کو خط لکھنا میرے ابتدائی ادبی مشاغل میں شامل تھا۔ اِنڈیا کے سکھ پنجابی قلم کاروں سے خط کتابت بھی اُنھی اَیام میں شروع کی۔ احمد ندیم قاسمی اُس زمانے کے ادبی قافلے کے قافلہ سالار تھے اُن کی ایک جھلک دیکھنے کو دِل مچل مچل جاتا تو اُن کی خدمت میں خط لکھا اور حضرت بابائے پنجابیؒ سے اپنے حسبی اور نسبی تعلق کو حوالہ بنا کر بات آگے بڑھانے کی کوشش کی جو نہایت کامیاب رہی۔

ندیم صاحب نے جواباً بابائے پنجابی کے ساتھ اپنی مُلاقاتوں کے حوالے سے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا اور بذریعہ خط یا ٹیلی فون ٹائم مقرر کر کے لاہور آتے جاتے کسی وقت مُلاقات کا شرف حاصل کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میرا بالکل ہی لڑکپن کا زمانۂ حیات تھا۔ طبیعت میں عدم پختگی، غیر سنجیدگی اور لااُبالی پن کی کثرت تھی۔ شخصیات کی شہرت نظر آتی تھی مگر مقام و مرتبے کا تعین کرنے کا نہ ابھی شعور تھا اور نہ ہی تمیز تھی۔ جس وجہ سے مشاہیر کے ساتھ خط کتابت کر کے اُن کے لکھے جوابی خط اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اور اپنی آنکھوں سے پڑھ کر دِلی تسکین تو ہو جاتی تھی مگر اُنھیں محفوظ رکھنے کا شعور اور سلیقہ بالکل ہی نہیں تھا۔ اسی طرز زندگی میں دِن گذرتے رہے اور ۱۹۸۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کر کے لاہور آ کر پنجاب یونی ورسٹی، لا کالج میں قانون دان بننے کے لیے داخلہ لے لیا۔

جن دِنوں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے گوجرانوالا ضلع کچہری میں وکالت کی پریکٹس کا آغاز کرنے

کے لیے پر تول رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ پنجابی میں ایم پنجابی کرنے کی خاطر داخلہ بھی لے رکھا تھا۔ انھی ایام میں اپنے محبوب اساتذہ کرام پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم رانا اور مجددِ نعت حضرت حفیظ تائب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی سے پنجابی زبان کے سربرآوردہ شاعر، محقق، نقاد، ادیب اور سیوک بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ جو کہ میرے رُوحانی مرشد اور رہنما بھی ہیں، اُن کی یاد میں ''بزمِ فقیر، پاکستان'' کی طرح ڈالی اور اُن کے بے شمار غیر مطبوعہ ادبی مسودات کی اشاعت کا پروگرام ترتیب دینا شروع کیا۔ اس ادبی تنظیم کی ترتیبِ نو کے ابتدائی مراحل میں میرے عزیز دوست اور ماہر قانون دان بابر جاوو ڈار میرے شانہ بشانہ چلتے رہے بعد ازاں پروفیسر غلام محی الدین شیخ اہم دست و بازو بنے۔ بزمِ فقیر پاکستان کے زیرِ اہتمام جو ادبی معرکے سرانجام دینے کا پروگرام بنایا گیا اُن میں پہلا کام یہ طے کیا گیا کہ بابائے پنجابی کے ہم عصر شعرا، ادبا، محققین، نقادوں، تذکرہ نگاروں، صحافیوں اور دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کی قابلِ ذکر شخصیات سے بابائے پنجابی کی شخصیت، علمی، ادبی خدمات اور فکر و فن کے موضوعات پر مضامین لکھوائے جائیں۔ اسی سلسلے میں تمام شعبہ جات کی سینئر شخصیات اور بزرگوں سے رُوبرو اور بذریعہ خط مُلاقاتوں کا آغاز کیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے میرے لکھے ایک خط کا جواب ۲۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کو لکھے اپنے ایک خط میں یوں لکھا:

> ''جنید میاں صاحب! سلام مسنون۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے بارے میں مضمون لکھنے کا وعدہ مَیں نے یقیناً کیا تھا مگر اِس دوران میں تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے اپنی لائبریری میں اُن کی کوئی تصنیف ہی دستیاب نہیں ہوئی۔ چناں چہ سوچا کہ اُن کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر دوں اور وہ اِن شاءاللہ ضرور کروں گا۔ مفصل مضمون کا وعدہ وفا نہیں کر سکوں گا، کیوں کہ اس کے لیے بہت وقت درکار ہے اور بڑھاپے میں وقت نجانے کہاں غائب ہو جاتا ہے''۔

''بزمِ فقیر، پاکستان'' کی اَز سرِ نو بنیاد تو رکھ دی گئی اور کام کا آغاز بھی کر دیا گیا مگر فنڈز کہاں سے آئیں گے یہ تو سوچا ہی نہ تھا لہٰذا وہی ہوا جو ایسے اچھے کاموں کی ابتدا میں ہوتا ہے یعنی بزم کو چلانے کے لیے شدید مالی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ دوستوں نے حکومت پنجاب سے سالانہ گرانٹ طلب کرنے کا مشورہ دیا۔ جب دفتری کارروائی کا آغاز کیا تو مجلس ترقیِ ادب کے دفتر میں حاضری ہوئی اور قاسمی صاحب سے بھی ذکر کیا۔ قاسمی صاحب اُن دِنوں مجلس ترقیِ ادب کے ناظم تھے اور اکثر اوقات علم و ادب کے اسی مرکز میں اُن کے درشن

کے لیے حاضری ہوا کرتی تھی۔ میری گفتگو اور بزمِ فقیر کے مالی مشکلات کا احوال سُن کر انھوں نے پہلی فرصت میں سیکرٹری، محکمہ اطلاعات وثقافت حکومت پنجاب، کو ایک خط ارسال کیا اور اُس کی کاپی مجھے بجھوا دی۔ خط کا مضمون اِس طرح تھا۔

مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، مورخہ ۹ مئی ۱۹۹۶ء

جناب سیکرٹری صاحب اطلاعات وثقافت حکومت پنجاب، لاہور

محترم ڈاکٹر فقیر محمد فقیر پنجابی زبان، ادب، شاعری اور صحافت کا ایک بڑا اور محترم نام ہیں جنھیں اہل پنجاب نے "بابائے پنجابی" کا معتبر اور محترم مقام و مرتبہ عطا کر رکھا ہے۔ اُن کے معتقدین نے اُن کی یاد میں "بزمِ فقیر" قائم کر رکھی ہے مگر اِس ادارے کے ذرائع بالکل محدود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ ہیں وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے، محقق، مورخ اور نقاد بھی تھے۔ چناں چہ اُن کے جملہ غیر مطبوعہ مسودات کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لیے حکومت پنجاب کا عملی تعاون نہایت ضروری ہے۔ اگر آپ کے توسط سے حکومت پنجاب کی طرف سے، پنجابی زبان کے اس نہایت اہم ادارے کی معقول سالانہ گرانٹ مقرر ہو جائے تو مرحوم کی وہ تمام تحریریں شائع ہو سکیں گی، جو پنجابی ادب اور پنجابی کلچر کی بلیغ ترجمان ہیں۔

پنجابی زبان کے حقوق کا تحفظ حکومت پنجاب کا فرض ہے۔ اس لیے میں حکومت سے پر زور مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ "بزمِ فقیر" کی سالانہ گرانٹ مقرر کر کے اپنا مبارک فرض پورا کرے۔

احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور
مدیر سہ ماہی "فنون"، لاہور

قاسمی صاحب کے اِس خط سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مگر پاکستانی کلچر کو جانتے ہوئے اس سوچ کا شکار ہو گیا کہ محکمہ اطلاعات کے سکریٹری کو ملنے کے لیے حوالہ کسے بنایا جائے۔ مجھے پریشان دیکھ کر میرے بڑے ہی عزیز دوست خواجہ خورشید انور جو اُن دِنوں صوبائی وزیر ثقافت کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے پوچھنے لگے کیا ماجرا ہے چُپ چُپ کیوں ہو ؟ مَیں نے ساری کہانی کہہ سُنائی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر محکمہ اطلاعات وثقافت کے ایڈیشنل سیکریٹری منصور سہیل کے دفتر میں آ گئے۔ میرا تعارف کروایا اور خود چلے گئے۔ منصور صاحب کے ساتھ محبت چند دنوں میں سر سے منصور بھائی تک آ گئی۔ وہ پڑھے لکھے گھرانے کے فقیر مزاج افسر

تھے۔ اُن کی محبت اُس دِن سے آج تک میرے ہر کام میں میری رہنمائی کرتی رہی ہے۔ وہ کام جو مَیں اکیلا لے کر چلا تھا وہ اب قافلے کی صورت بنتا چلا جا رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بزمِ فقیر، پاکستان کی ادبی محفلیں اور مشاعروں کا آغاز ہو چکا تھا۔ میرے ارادوں میں ایک اہم پروگرام یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ کی کوششوں سے جاری ہونے والا اولین ادبی ماہوار ”پنجابی“ لاہور اَز سرِ نو جاری کیا جائے۔ اس خواب کو تعبیر کی صورت دیکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑا یہ ایک الگ داستان ہے۔ یہاں صرف یہ بتاتا چلوں کہ یہ رسالہ سہ ماہی دورانیے کے ساتھ شروع کیا گیا اور اپنے ہم عصر اور سب سے سینئر اور معتبر ادبی شخصیت اور عالمی شہرت یافتہ ادبی جریدے ”فنون“ کے بانی ایڈیٹر ہونے کے ناتے قاسمی صاحب سے رہنمائی لینے کی خاطر مَیں اکثر وقت بے وقت اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ آفرین ہے اُن کی اعلیٰ ظرفی پر کہ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ کبھی بے زاری کا اظہار نہیں کیا بل کہ ہمیشہ چائے پلاتا اور بڑے تحمل سے میرے ذہن میں موجود مسائل کو سُلجھاتا جیسے وہ اپنا فرض منصبی سمجھ رہے ہوتے تھے۔ جب تماہی ”پنجابی“ لاہور کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو مُلکی اور غیر مُلکی ادبی اداروں اور شخصیات کی جانب سے مبارک باد اور حوصلہ افزائی کے پیغامات موصول ہوئے۔ پہلا شمارہ پیش کرنے کی خاطر مَیں خود مٹھائی لے کر جب احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے نہایت محبت اور گرمجوشی کے عالم میں مبارک باد بھی دی اور بعد ازاں خط بھی تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا جو چند ہی دِنوں میں پورا بھی کیا۔ تماہی ”پنجابی“ لاہور، شمارہ، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۵۷ پر مطبوعہ خط میں رقم طراز ہیں۔

> ”تماہی پنجابی دا تازہ شمارہ ملیا۔ ایہہ رسالہ ایسے ٹھاٹھ باٹھ نال چھپدا رہیا تاں پنجابی زبان تے ادب دی خوش نصیبی ہووے گی۔ مَیں تہانوں ایہناں سوہنا پرچہ مرتب تے شائع کرن اُتے مبارک باد دیندا ہاں۔ تہانوں خبر اے مَیں اَج کل بیمار آں۔ لکھنا پڑھنا چُھٹ گیا اے۔ تُساں تے فرمائش کر دِتی اے پر مَیں معافی چاہندا ہاں۔ جے مَیں ایہہ فرمائش پوری نہیں کر سکاں گا۔ میرے لئی دُعا کردے رہو۔ ٹھیک ہون نال ای مَیں ”پنجابی“ لئی کجھ نذر کراں گا۔“

ندیم صاحب نے زندگی بھر اُردو ہی میں لکھا۔ بابائے پنجابی نے ایسے پنجابیوں سے جو پنجابی ہوتے ہوئے بھی پنجابی نہیں لکھتے تھے، پنجابی لکھوانے کا نہ صرف رواج شروع کیا بل کہ حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد

اقبال سمیت بعض دوسرے ہم عصر اور مشہورِ زمانہ قلم کاروں کے پنجابی لکھنے کی جانب مائل نہ ہونے پر گلے شکوے بھی رقم کیے۔ مَیں نے جب بابائے پنجابی کے ماہوار ''پنجابی'' لاہور کی ادارت کا قلم دان سنبھالنے کا اعزاز حاصل کیا تو اُن کی سُنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہم عصر سینئر لکھاریوں، جو پنجابی ہوتے ہوئے پنجابی نہیں لکھتے تھے، اُن کی خدمت میں خود بھی حاضر ہوتا رہا اور بذریعہ خط بھی گذارشات بھجواتا رہا کہ وہ ''پنجابی'' کے لیے پنجابی میں لکھیں۔ ہمارے ہم عصروں میں احمد ندیم قاسمی ، ڈاکٹر وزیر آغا، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، پروفیسر جیلانی کامران، اور امجد اسلام امجد صاحبان جیسے قابلِ احترام اور معتبر قلم کاروں سے ''پنجابی'' میں لکھوانے میں کامیاب بھی ہوا۔

ندیم صاحب سے پنجابی لکھوانے کا خیال تب ذہن میں آیا جب مَیں نے اپنی تحقیق کے دوران میں ماہوار ''پنجابی'' لاہور کے پرانے شماروں میں (جب اس رسالے کی ایڈیٹری بابائے پنجابیؒ خود کر رہے تھے) ندیم صاحب کی پنجابی شاعری پڑھی تو یہ میرے لیے ایک حیرت سے کم نہیں تھا۔ یقیناً یہ وجہ تھی کہ مَیں نے ہمیشہ اُنھیں پنجابی زبان و ادب اور رسالہ ''پنجابی'' کا خیر خواہ پایا۔ وہ پنجابی تھے، پنجابی سے محبت فرماتے تھے اور ہمیشہ پنجابی کی حمایت میں بات کرتے تھے۔ ایک دفعہ سعادت حسن منٹو کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ایک واقعہ سنایا کہ دہلی میں کسی ادبی تقریب میں ہم اکٹھے تھے تو باہمی گفتگو پنجابی میں کر رہے تھے۔ پاس بیٹھے کسی ہندوستانی ادیب (جس کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا) نے پنجابی زبان سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''تم لوگ کیا یہ پنجابی بولتے رہتے ہو'' تو منٹو نے اُسے خوب سنائیں اور کہنے لگے کہ اگر کوئی برتن زمین پر گر جائے تو ہم اُسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اسے ''چِب' پڑ گیا ہے تم اِسے اُردو میں کہو کیا کہو گے؟ اور پھر پنجابی زبان کی بلاغت کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس کرنے لگے۔ اُنھوں نے پنجابی شعر و ادب کی کئی کتابوں کے دیباچے اور فلیپ بھی تحریر کیے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب بابائے پنجابی نے پنجابی زبان و ادب کے فروغ کی تحریک چلائی اور ستمبر ۱۹۵۱ء میں ماہوار ''پنجابی'' لاہور سے جاری کیا تو پنجابی لکھنے والے اُس اولین قلمی قافلے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ اُس زمانے کی اُن کی مطبوعہ پنجابی شاعری قارئین ادب کے مطالعہ کے لیے یہاں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ ماہنامہ پنجابی لاہور، سالانہ نمبر، شمارہ ۱، اگست ۱۹۵۲ء کے صفحہ نمبر ۳۴ پر بعنوان ''چار دوہڑے'' یہ شاعری شائع ہوئی ہے۔

پربت دی چوٹی تے چڑھ کے مَیں راہ سجناں دی تکاں
جنگلاں تے دریاواں وچوں لنگھ جاں مُول نہ تھکاں
ہنجو پیواں، جگر دُکھاواں، تپدیاں ریتاں پھکاں
سڑ بُجھ کے جد من ول ویکھاں وانگ انگاریاں بھکھاں

کئی دُھماں دیاں جنجاں چڑھیاں ایہہ کس دی ڈولی اُٹھی
چار طرف کرلاٹ سُنیوے کیے پُھل توں بُلبُل مُٹھی
دِل دیاں گلاں کوئی نہ سمجھے اِس جگ دی چال اپُٹھی
سونے دیاں پھندیاں وچ پھسی اِک بھکھی، دُکھی، گُٹھی

گُجدیاں، وجدیاں ہاٹھاں چڑھیاں، کِن کِن کَنیاں وَسیاں
پینگھاں تے چڑھ لین ہُلارے جو ساری عُمراں ہسیاں
گُھنڈ کڈھ کے پیاں شیشے ویکھن، جو نویاں نویاں پھسیاں
مینوں وی لکھ سُنیہڑے آئے، اِک پُنوں، سَے سسیاں

غم دے کالے طوفان اُٹھے تے من دا دیوا بُجھا
پربت ویکھے، بیلے چھانے پر گھر دا راہ نہ سُجھا
مَیں کیہ جاناں کرم تُساڈا، کس کم وچ ونج رُجھا
قدم قدم تے نظریں آویں پر تیر چلاویں گُجھا

اسی طرح ماہوار ”پنجابی“ لاہور، شمارہ، مارچ/اپریل ۱۹۵۳ء کے صفحہ نمبر ۲۷ پر بعنوان ”مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں“ یہ نظم شائع ہوئی ہے۔

نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

لے بُلارے پُٹ کے سُٹیا
مُنہ تے اُڈن ہوائیاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

وَٹ پٹ دی ری دے ٹُٹ گئے
پیر وی اُکھڑے، ہتھ وی چُھٹ گئے
رب دیاں بے پرواہیاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

چار چوفیر اندھیرا دِسدا
جا ہنجوواں دی، لہو پیا رِسدا
کِس دیاں کراں بُرایاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

دِل درداں دی خیر منائے
اپنے وی اَج ہوئے پرائے
لُٹیاں سب کمائیاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

لے بُلارے پُٹ کے سُٹیا
مُنہ تے اُڈن ہوائیاں
نی مَیں اُچیاں پینگھاں پائیاں

یہی وہ شاعری تھی جسے تلاش کرنے اور پڑھنے کے بعد میرے دِل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قاسمی صاحب

سے بھی ''پنجابی'' کے لیے پنجابی میں شاعری تخلیق کروائی جائے۔ ویسے ''پنجابی'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے میری پالیسی یہ تھی کہ'' آپ پنجابی زبان وادب کے موضوع پر کسی بھی زبان (پنجابی/اُردو یا انگریزی) میں لکھیں تو میں وہ مضمون شائع کروں گا اور زندگی کے کسی بھی پہلو پر پنجابی زبان میں مضمون لکھیں تو میں شائع کروں گا'' مگر شاعری کے شعبہ میں صرف پنجابی شاعری شائع ہو گی۔ لہٰذا قاسمی صاحب سے بھی پنجابی میں شاعری کرنے کی فرمائش کی جاتی رہی۔ جواباً وہ بڑھاپے اور کمزوری کا عذر پیش کرتے مگر وعدہ بھی کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں دیے گئے ایک خط کے اقتباس میں فرماتے ہیں :

> '' تُساں تے فرمائش کر دِتی اے پر مَیں معافی چاہنداہاں جے مَیں ایہہ فرمائش پوری نہیں کر سکاں گا۔ میرے لئی دُعا کردے رہو۔ ٹھیک ہون نال ای مَیں ''پنجابی'' لئی کجھ نذر کراں گا۔''

مَیں طبعاً ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مسلسل حاضری اور گزارشات سے اُن کے ساتھ محبت روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ اُن کا صرف ادبی قد کاٹھ ہی مہان نہیں تھا بلکہ وہ اپنی عادات واطوار اور دوسروں سے محبت کرنے کے معاملات میں بھی اعلیٰ ظرفی سے کام لیتے تھے۔ اُن کے ساتھ میری عقیدت اور محبت کے کئی پہلو تھے۔ اُن کے شعروادب کو ماننے والے تو مجھ جیسے لاکھوں ہوں گے مگر ایک دو تعلق جو روحانی حوالے سے میرے اُن کے ساتھ عقیدت کی وجہ تھے وہ کسی دوسرے کو میسر نہ تھے۔ مثلاً پہلا یہ کہ میرے مرشد حضرت بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر رحمتہ اللہ علیہ کا اُردو کے نامور ادیب کالم نگار اور صحافی مولانا عبدالمجید سالک سے گہرا دوستی اور محبت کا رشتہ تھا اور قاسمی صاحب بھی مولانا سالک سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ دوسرا تعلق میرے اُستادِ محترم حضرت حفیظ تائب رحمتہ اللہ علیہ کی قاسمی صاحب سے محبت اور قاسمی صاحب کی تائب صاحب کے لیے عقیدت تھی۔ گویا انہی مناسبتوں سے مجھ حقیر کو بھی قاسمی صاحب جیسے بے مثال افسانہ نگار اور لاجواب شاعر کی بارگاہ میں دسترس حاصل تھی۔

ایک روز میں گھر سے نکل کر کالج کی جانب جا رہا تھا تو میرے موبائل فون پر اُن کا فون آیا۔ کہاں ہو؟ آپ کے قدموں میں، مَیں نے جواباً عرض کیا۔ آج میرے پاس چکر لگا سکو گے۔ مَیں نے کہا حضور یہ آپ نے حکم دے دیا ہے مَیں حاضر ہو جاؤں گا۔ کالج پہنچ کر دو پیریڈ پڑھائے تو پرنسپل صاحب سے اجازت لے کر مجلس ترقیِ ادب کے دفتر پہنچ گیا۔ اُن کی مجلس میں چائے تو لازماً پینا پڑتی تھی۔ اُس روز چائے کا لطف دوبالا ہو گیا۔

فرمانے لگے آج رات ایک پنجابی غزل کے چند شعر ہو گئے۔ اُسی وقت تمھیں یاد کیا کہ صبح تمھیں پہنچاؤں گا۔ میری خوشی دیکھ کر اور بھی خوش ہونے لگے۔ میں نے کاغذ پکڑا سینے سے لگایا جیب میں ڈالا اور سیدھا "پنجابی" کے دفتر اچھرے پہنچ گیا۔ وہ غزل مہینہ وار "پنجابی" لاہور، شمارہ اپریل جون ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۴۵ پر شائع ہوئی۔

اپنا بھلا ای ہووے گا جد مراں گے
جگراتیاں دی کسراں پوریاں کراں گے
ہڑ دا پانی نک نک تک آ پہنچا اے
کجھ نہیں سُجھدا ڈُباں گے یا تراں گے
آپے اِک ککھ توڑ کے دو نہیں کر سکدے
قسمت تے الزام ہزاراں دھراں گے
جد ایس دیس چ کوئی محتاج نہ رہوے گا
جنجاں چاڑھاں گے تے گھڑولیاں بھراں گے
اسیں جد تک ویریاں کولوں ڈردے رہے
اِک نہ اِک دِن اپنے آپ توں ڈراں گے

اس غزل کی اشاعت ہوئی تو مَیں نے کہا حضور کام چل پڑا ہے اب اِن شاءاللہ ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ شائع ہو گا۔ نہایت خوش ہو کر قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے فرمانے لگے اب یہ ممکن نہیں ہے۔ مَیں نے جواباً عرض کیا مَیں تو آپ کا پنجابی شعری مجموعہ بزمِ فقیر پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ فرمانے لگے اگر یہ کام کچھ برس پہلے شروع ہو جاتا تو ممکن تھا مگر اب ممکن نہیں۔ مَیں نے اُن کے چہرے پر عجیب طرح کی اُداسی محسوس کی۔ اُن کی ساحرانہ شخصیت ٹوٹ کر چاہے جانے کے قابل تھی۔ اپنے جونیئرز سے اُن کی محبت شفقت بھری ہوتی تھی۔ مَیں نے اُستادِ محترم حضرت حفیظ تائبؔ سے اُنھیں ادب و احترام اور عقیدت بھری محبت سے پیش آتے ہوئے دیکھا ہے۔ "پنجابی" کے لیے لکھنے کے میرے بار بار تقاضے اور نہ لکھ سکنے کی وجہ سے بعض اوقات نادم ہوتے اور مجھے تقاضا کرنے سے منع فرماتے تھے۔ اِس غزل کے بعد میری خواہش کے باوجود اُن کی شاعری ایک ہی دفعہ مہینہ وار "پنجابی" لاہور کے شمارہ نومبر / دسمبر ۲۰۰۲ء کے صفحہ ۱۶ کی زینت بن سکی جو ان بولیوں کی صورت تھی۔

جہناں کنکاں دی فصلاں گڈیاں
اوہی پے بُھکھے مردے
لکھاں ریشمی پوشاکاں واراں
کھدردی پٹّی تے
ایس ریل نے جدائیاں پایاں
ہُن پئی کیوں کوکدی
نیلے چوچ اسمان تے کونجاں
بن کے کماناں اُڈیاں
میرے گھر دا دیواناں بُجھاؤ گے
چنے دا کیہ کرو گے

۵ جون ۲۰۰۰ء کو بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؔ کا ایک سوواں جنم دِن تھا۔ اِس موقع کی مناسبت سے ملک بھر میں تقاریب کا اہتمام بھی ہوا اور مختلف ادبی رسالوں نے بابا جی کی یاد میں مضامین، گوشے اور نمبر زشائع کیے۔ بزمِ فقیر پاکستان کی جانب سے لاہور اور گوجرانوالہ میں تقاریب کے اہتمام کے ساتھ ساتھ تماہی ''پنجابی'' لاہور کا ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ایک مجلد اور ضخیم یادگار ''بابائے پنجابی نمبر'' شائع کیا گیا جو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شمارے میں عہدِ حاضر کی بیشتر معروف اور معتبر ادبی شخصیات کی تحریریں شامل اشاعت کی گئیں۔ ہمارے عہد میں قلمی دُنیا کے سربرآوردہ قلم کاروں میں بلا شک و شبہ احمد ندیم قاسمی کا نام سرِفہرست تھا لہٰذا اُن سے بھی بابائے پنجابی کی یادوں کو تحریری صورت عنایت کرنے کی درخواست کی گئی۔ اُنھوں نے ایک مختصر مضمون کی صورت میں چند خوبصورت یادیں ''پنجابی'' کے لیے عنایت کیں:

> ''روزنامہ ''امروز'' کی ادارت کے دِنوں میں ڈاکٹر فقیر صاحب سے میری ہر ہفتے ملاقات ہوتی تھی۔ میں نے ''امروز'' میں پنجابی زبان کا ایک ہفتہ وار شروع کر رکھا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اسی صفحے کے لیے مجھے اپنا تازہ کلام عنایت کرنے تشریف لاتے تھے۔ وہ ایک وجیہ انسان تھے اور اُن کے باطن میں لہریں لیتی محبت اُن کے چہرے پر ایک مستقل میٹھی مسکراہٹ کی صورت میں موجود رہتی تھی۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ اپنا

کلام میرے حوالے کرنے سے پہلے مجھے یہ کلام سناتے تھے۔ اور جب میں اُن کی زبان سے اُن کا کلام سُنتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص کیسا ڈوب کر شعر کہتا ہے۔ اور اُس کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ مفاہم اور بلاغتوں کی شعاعیں سی بکھیرتا محسوس ہوتا ہے۔ پنجابی ہونے کے باوجود مجھے اُن کے اشعار کے بعض معنی سمجھنے میں دِقت ہوتی تھی اور میں برملا اپنی اِس مشکل کا اظہار کر دیتا تھا۔ وہ کھل کر مسکراتے تھے اور مجھے اُن الفاظ کے معنی بتاتے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ واضح کرتے چلے جاتے تھے کہ یہ لفظ گوجرانوالا کے علاقے میں تو اسی طرح بولا جاتا ہے جیسا میں نے استعمال کیا ہے، مگر شیخوپورہ، سیالکوٹ، گجرات، لائل پور، جھنگ، لاہور، منٹگمری، اور ملتان، میں اس کا تلفظ بھی مختلف ہے اور اس کے معانی میں بھی ہلکا پھلکا، پیاز کے چھلکے برابر اختلاف ہے۔ کسی ایک لفظ کے بارے میں میرا استفسار اُن سے پنجابی زبان اور روزمرہ سے متعلق باقاعدہ ایک بلیغ تقریر برآمد کر لیتا تھا۔ اور مجھے اپنی معلومات میں اِس اضافے سے تسکین محسوس ہوتی تھی۔

ڈاکٹر فقیر صاحب سے میری عقیدت کا ایک سبب حضرت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم و مغفور سے اُن کی دوستی بھی تھا۔ مولانا سالک سے میری بے پناہ عقیدت تھی اور مولانا سالک ڈاکٹر فقیر اور پنجابی زبان و ادب کے غیر مشروط خیر خواہ تھے۔ اور اُنھوں نے دِلاویز پنجابی میں چند مضامین بھی تحریر کیے تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اُردو زبان کے اِتنے بڑے ادیب اور اخبار نویس شاعر کی پنجابی دوستی کی اصل محرک ڈاکٹر فقیر کی شخصیت ہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے رسالہ ''پنجابی'' میں محترم سالک صاحب نے متعدد مضامین ٹھیٹھ پنجابی میں لکھے اور یوں دورِ حاضر میں پنجابی زبان و ادب کو بڑھاوا ملا۔

ڈاکٹر فقیر صاحب کے پاس پنجابی الفاظ کا بے حد و حساب ذخیرہ موجود تھا۔ وہ جب بھی کبھی پنجابی زبان اور ادب کے موضوع پر گفتگو فرماتے یا اپنا کلام سناتے تو مجھے سید وارث شاہ کا شاہکار یاد آ جاتا تھا۔ جس میں اُس عظیم شاعر نے پنجابی کے کسی خاص لہجے کی تخصیص اختیار نہیں کی بلکہ پنجابی کے گوجرانوالہ اور گجرات، سیالکوٹ اور

> چکوال، پنڈی اور گوجر خاں، شیخوپورہ اور لائل پور، جھنگ اور خوشاب، ملتان اور ڈیرہ غازی خان وغیرہ میں مستعمل الفاظ اور محاروں کا اتنے سلیقے سے اظہار کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہی حیرت مجھے ڈاکٹر فقیر صاحب کا کلام پڑھ کر ہوتی تھی۔ جس میں گوجرانوالہ اور وزیر آباد اور سیالکوٹ اور گجرات وغیرہ میں بولی جانے والی پنجابی چہکتی اور گنگناتی محسوس ہوتی ہے۔
>
> میں بے حد وحساب خوش ہوں کہ محمد جنید اکرم نے اپنے نانا ڈاکٹر فقیر کے کمالات علم و فن کی بازیافت کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اور رسالہ ''پنجابی'' کو نئے سرے سے شروع کر کے اپنی بے پناہ محبت اور محنت سے اسے اس قدر خوبصورت بنا دیا ہے کہ کسی بھی زبان میں شائع ہونے والے کسی رسالے کے سامنے ''پنجابی'' کو رکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فقیر کا رسالہ ''پنجابی'' جب ڈاکٹر فقیر کا رسالہ تھا تب بھی پہلے درجے کا رسالہ تھا۔ اور آج محمد جنید اکرم کا رسالہ ہے۔ تو آج بھی صف اول کا رسالہ ہے۔ میں اُس کی مزید کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں''۔

پنجابی شاعری میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''پتن جھناں دا'' اشاعت پذیر تھا۔ مَیں نے عرض کیا حضرت چند سطریں تحریر فرما دیں۔ فرمانے لگے پہلے اپنی شاعری میں سے اپنی پسند کی تین چیزیں سُناؤ۔ میں نے ایک نظم ایک غزل اور ایک کافی سنائی۔ نہ صرف داد دی بل کہ بے حد خوشی کا اظہار کیا اور مسودہ چھوڑ جانے کو کہا۔ تین چار دن گذرے کہ خود فون کر کے مجھے طلب کر لیا۔ مسودہ واپس کیا ایک کاغذ پر لکھا فلیپ عنایت کیا اور پوچھنے لگے ''تمہیں واقعی شوگر ہے؟'' مَیں نے ہنستے ہوئے ''جی الحمدللہ'' کہا تو بہت ہی زیادہ مُسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمانے لگے ''تم بہت اچھے انسان ہو جو اپنی بیماری پر بھی، الحمدللہ ہی کہتے ہو''۔ اِس شعری مجموعہ میں میری ایک نظم بعنوان ''شوگر دا مریض'' شامل ہے جو اِس سوال کا سبب بنی۔ اِس کتاب کا فلیپ لکھتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

> محمد جنید اکرم جس خانوادے نال تعلق رکھدا اے، اوہنوں لوکیں پنجابی شاعری تے پنجابی کلچر دا گڑھ کہندے نیں۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ایس گھرانے دا سب توں روشن ناں اے۔ محمد جنید اکرم، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ہوراں دی یادگار نیں۔ اوہناں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر دے رسالہ ''پنجابی'' نوں نویاں شاناں نال شائع کرنا شروع کیتا تے بڑی چھتی اپنے آپ نوں پہلی

صف دے ایڈیٹراں وچ شامل کرالیا۔ محمد جنید اکرم نے شاعری کیتی۔ تے اجہی نویں۔ تے نرول شاعری کیتی کہ پڑھیا سنو۔ تے رُوح شاداب ہوجاندی اے۔ جنید اکرم نے صرف نظماں، غزلاں نہیں لکھیاں بلکہ اوہناں نے حمداں، نعتاں، کافیاں، ابیات۔ تے ہائیکو وی تخلیق کیتے نیں۔ اوہناں دی شاعری وچ اپنی نرمی۔ تے رچاؤ اے کہ پنجابی شاعری دے آفاق پھیلدے نظر آندے نیں۔ جنید اکرم دی شاعری ساڈے آل دوالے دی شاعری اے۔ ایہدی شاعری پڑھدیاں بعضے ویلے۔ تے ایہہ سوچ کے حیران ہونا پیندا اے کہ ایس موضوع۔ تے وی شاعری ہوسکدی اے؟ تے فیر اپنی پیاری۔ تے ڈونگھی۔ تے سچی شاعری، جنید اکرم لئی میریاں ہزاراں دعاواں۔

وہ بڑے اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ اپنے جونیئرز کی حوصلہ افزائی کرنے کا اُن میں بڑا حوصلہ اور ظرف موجود تھا۔ کراچی سے آئے ہوئے میرے ایک عزیز دوست رفیع الدین راز نے اُن سے مُلاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو مَیں ٹیلی فون پر حاضری کی اجازت طلب کی اور گھر سے روانہ ہوگیا۔ مجلس ترقی ء ادب کے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ مَیں اور رفیع الدین راز پہنچ گئے پُرتکلف چائے کے ساتھ گپ شپ ہوئی۔ میرے مہمان کے سامنے میری خوب گڈی اُڑائی اور حد تو یہ کی کہ مجھے فرمانے لگے ذرا اپنی نظم ''شوگر دا مریض'' تو سُناؤ۔ پھر اُس پر داد بھی اور شاباش بھی۔ میری آنکھوں میں ممنونیت کی نمی دیکھ کر تھپکی دی اور روانہ ہوتے ہوئے مجھے فرمانے لگے'' تمہارے جیسا نواسہ خدا ہر نانے کو عطا کرے''۔

حوالہ جات

۱۔ ماہوار ''پنجابی'' لاہور، ایڈیٹر ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ، شمارہ، اگست ۱۹۵۲ء، ص ۴
۲۔ ماہوار ''پنجابی'' لاہور، ایڈیٹر ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ، شمارہ، مارچ/اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۲۷
۳۔ مہینہ وار ''پنجابی'' لاہور، ایڈیٹر محمد جنید اکرم، شمارہ، جولائی ۲۰۰۰/مارچ ۲۰۰۱ء
۴۔ مہینہ وار ''پنجابی'' لاہور، ایڈیٹر محمد جنید اکرم، شمارہ، اپریل/جون ۲۰۰۱ء، ص ۵۴
۵۔ مہینہ وار ''پنجابی'' لاہور، ایڈیٹر محمد جنید اکرم، شمارہ، نومبر/دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۶۱
۶۔ چنن چھناں دا، پنجابی شعری مجموعہ، محمد جنید اکرم، جنوری ۲۰۰۲ء/نومبر ۲۰۱۰ء
۷۔ آفس فائل، بزم فقیر پاکستان، 125/3-B2، ٹاؤن شپ، لاہور

احمد ندیم قاسمی

پنجابی زبان سے ترجمہ: سعدیہ ثمن

وارث شاہ کا کمالِ فن

جس طرح گزشتہ صدی میں اردو شاعری کی جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی وہ ''دیوانِ غالب'' ہے۔ بالکل اسی طرح پنجابی شاعری کی کتاب ''ہیر وارث شاہ'' ہے۔ پنجابی میں اس سے زیادہ مقبول کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ یقیناً کسی کتاب کی مقبولیت معیار کی بلندی کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ ہر زبان میں سینکڑوں ایسے مصنفین ہیں جن کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں بِک چکی ہیں مگر ادب کا کوئی سنجیدہ قاری اُن کا نام تک نہیں جانتا اور اگر جانتا بھی ہے تو محض پستیِ ذوق کے حوالے سے مگر جب کسی کتاب کا فنی معیار متفقہ طور پر اعلیٰ درجے کا ہو اور اس کی مقبولیت بھی، ہمہ گیر ہو تو معیار اور مقبولیت میں اس تضاد کو ختم کرنے کا سہرا کتاب کے مصنف کے سر ہے کہ اس کی فکر اتنی ہمہ گیر اور اس کا اسلوب اتنا موثر ہے کہ ہر ذی شعور بے ساختہ داد دیتا ہے مگر جو نہیں سمجھتا وہ بھی جھوم اُٹھتا ہے۔ اردو میں مرزا غالب اور پنجابی میں سید وارث شاہ کے فکر و اسلوب کو یہ ہمہ گیری اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے۔ ان دونوں شعرا کی بے پناہ مقبولیت کسی حادثے کا سبب نہیں۔ جو مقبولیت کسی حادثے کا نتیجہ ہوتی ہے وہ محض چند برسوں تک چلتی ہے یا شاعر کا اس کی موت تک ساتھ دیتی ہے۔ مقبولیت کی اصل کسوٹی وقت ہے اور وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ غالب اور وارث شاہ اس مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے یقیناً مستحق تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ لوگوں کی محبت اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہو گا کیوں کہ جیسے ان کے کلام کی تفہیم ہو رہی ہے، ان کی فنی شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔

زبان کے طبقے:

وارث شاہ کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو شاید دنیا بھر کے کسی بڑے شاعر میں موجود نہیں۔ بڑے شعرا ایک خاص طبقے کی زبان میں شعر کہتے ہیں اور وہ طبقہ دولت مندوں کا طبقہ ہے۔ چوں کہ یہ طبقہ دولت مند ہے اسی لیے تہذیب کی اجارہ داری بھی اُسی کے پاس ہے۔ اس طبقے کا روزمرہ اور محاورہ اُس روزمرہ اور محاورہ سے

بالکل مختلف ہے جس کو غریب یا کمزور طبقہ استعمال کرتا ہے اور غیر مہذب کہلاتا ہے۔ اس غیر مہذب طبقے کے روزمرہ اور محاورے میں معیاری اور آفاقی شاعری کرنا ناممکن قرار دیا جاتا ہے۔ میر تقی میر نے ایک لمبے سفر میں اپنے تنہا ہم سفر گاڑی بان سے گفت گو سے انکار کر دیا تھا کہ یوں ان کی اپنی زبان خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا مگر اس بات میں اتنا قصور میر صاحب کا نہیں جتنا اس مروجہ معیار اور تہذیب کا تھا جو غریب کو بدتہذیب یا بے تہذیب سمجھنے کو عین تہذیب قرار دیتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مروجہ اقدار کی گرفت سخت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے تقریباً سبھی بڑے شعرا اعلیٰ تہذیب کے نمائندوں کے لہجے میں شاعری کرتے رہے پھر بھی اُن میں اکثریت ایسے فن کاروں کی تھی جو تہذیب کے ان نمائندوں کے کھوکھلے پن پر ٹوٹ کر برسے اور یوں اُن کے افکار نے بڑے بڑے انقلاب بپا کیے مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کے فن کی اپیل خاصی محدود رہی۔ اُن سب کے برعکس وارث شاہ کے فن کا جہاں سے تعلق ہے وہ کسی بھی بڑے شاعر سے کم تر نہیں۔ اس کے باوجود اُس کی زبان، لہجہ، روزمرہ اور نکات کو سمجھنے سمجھانے اور مسائل سے نمٹنے کا انداز سب کچھ عوامی ہے۔

وارث شاہ کا اعجاز:

ممکن ہے اس موقع پر بعض ذہنوں میں یہ شُبہ پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے وارث شاہ کے زمانے میں ہر طبقہ ایک ہی انداز میں پنجابی بولتا ہے۔ یہ شک اس لیے بھی غلط ہے بل کہ خلافِ حقیقت ہے کہ آج ہم مطلق العنانی اور سلاطین کے زمانے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ہم سب جمہوری انداز میں سوچتے ہیں اور تمام ہم وطنوں کو ایک برادری کا نام دیتے ہیں مگر آج ہمارے مختلف طبقات کی پنجابی مختلف ہے۔ لاہور کی شاہراہِ قائدِ اعظم (مال روڈ) پر جو پنجابی بولی جاتی ہے وہ اس پنجابی سے مختلف ہے جو اس وقت گھکھڑ منڈی میں بولی جا رہی ہے۔ لاہور کے کسی بے حد ترقی یافتہ علاقے میں بیس کنال زمین کے رقبے میں پھیلے ہوئے بنگلے کا مالک اپنے اہلِ خانہ اور ہم مرتبہ دوستوں سے جس پنجابی میں گفت گو کرتا ہے وہ اس پنجابی سے کم از کم پچاس فی صد ضرور مختلف ہے جو میرے گاؤں کا ایک کسان بولتا ہے۔ ہم جب اس دور میں جسے ہم جمہوری اور عوامی کہتے نہیں تھکتے، آج بھی زبانوں کے شہری اور دیہاتی، امیرانہ اور غریبانہ، فیشن ایبل اور اکھڑ معیار موجود ہیں۔ آج سے دو سال پہلے جب معاشرہ دربار، متوسلین، دربار اور رعایا میں واضح طور پر منقسم تھا، پنجابی زبان کے طبقاتی اختلاف سے انکار کرنا خود فریبی کے مترادف تھا۔ ایسے دور میں وارث شاہ خالص عوامی ذہن سے سوچتا ہے اور عوامی لہجے میں شاعری کرتا ہے جب کہ وہ خود ایک پڑھے لکھے اور معزز خاندان کا فرد ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ

اُس نے یہ اعجاز کیوں کر دکھایا۔ اعجاز اس لیے کہ وارث شاہ کی پنجابی ہر طبقے کو اپنی زبان محسوس ہوتی ہے۔ یوں اس نے بالواسطہ طور پر پنجابی تہذیب میں وحدت پیدا کی اور مختلف تہذیبی گروہوں کو زبان کے حوالے سے ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں غیر ملکی حاکموں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ طبقات کا آپس میں میل جول اور روزمرہ اور محاورے کا نفوذ رک گیا یا پھر غیر محسوس حد تک سُست پڑ گیا۔

وارث شاہ کی زبان:

بڑے شعرا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ الفاظ اور اُن کے مروجہ مفہوم کے غلام نہیں ہوتے بل کہ الفاظ ان کے غلام ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ کے فن کارانہ استعمال سے اُن کے مفاہیم میں اضافہ کرتے ہیں۔ وارث شاہ کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ الفاظ اور اُن کے مروجہ مفہوم کے غلام نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے سامنے الفاظ کا خزانہ کھلا پڑا ہے مگر وہ اُن میں سے اپنی مرضی کے الفاظ چن کر انھیں یوں مصرع کی لڑی میں شامل کرتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے برمحل استعمال کے حُسن اور ندرت سے چمک اُٹھتے ہیں۔ وارث شاہ سے پہلے بھی استاد شعرا نے ہیر کہانی پر طبع آزمائی کی ہے مگر وارث شاہ کی ہیر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف احساسات اور جذبات کی ایک نئی شمع روشن کرنے آیا بل کہ اپنے بعد آنے والے شاعروں کے لیے اظہار کی بہت سی مشکلات کو آسان کر گیا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے فارسی، عربی اور ہندی کے الفاظ آزادی سے استعمال کیے اور پنجابی زبان کے علمی معیار کو عوامی سطح پر لے آیا۔ اُس نے پنجابی بولنے والے سادے علاقوں کے روزمرہ اور لہجوں پر بھی عبور حاصل کیا۔ پھر اسی کو یوں استعمال کیا کہ شمال میں پوٹھوہاری اور ہندکو بولنے والوں سے لے کر جنوب میں ملتانی بولنے والوں تک سبھی نے وارث شاہ کے کلام سے اپنائیت محسوس کی۔ یوں پنجابی بولنے والے مختلف لوگوں کے درمیان ”ہیر وارث شاہ“ نے رابطے کا کام کیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ”ہیر وارث شاہ“ کی پنجابی کو آج کی معیاری زبان تسلیم کر لیا جائے تو پھر دور دراز کے علاقے بھی بیگانگی محسوس نہیں کریں گے جیسا کہ بدقسمتی سے آج محسوس کیا جا رہا ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بعض پنجابی لکھنے والے صرف اپنے علاقائی روزمرہ کے استعمال تک محدود ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گوجراں والا یا گجرات میں تخلیق ہونے والی نظم جب جھنگ یا سرگودھا تک پہنچتی ہے تو اس کی براہِ راست اپیل ختم ہو جاتی ہے اور قاری یا سامع شاعری سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے الفاظ کے معانی پوچھنے لگتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کی تہذیب کی تاریخ:

اب تک ہم نے ہیر وارث شاہ سے صرف یہ استفادہ کیا ہے کہ اسے پڑھا یا سُنا ہے اور اُس سے لطف اندوز ہوئے ہیں مگر پنجابی کی اس عظیم تصنیف کے متعدد پہلو ہیں مثلاً ''ہیر وارث شاہ'' ایک با قاعدہ منظوم ڈرامہ ہے۔ اگر ''ہیر وارث شاہ'' میں وہ حصے کاٹ دیے جائیں جہاں اپنے زمانے کے رواج کے مطابق جہاں وارث شاہ نے راگ راگنیوں، برتنوں، کپڑوں اور مٹھائیوں وغیرہ کی تفصیل منظوم کی ہے۔ اگر کرداروں کی بات چیت میں سے بعض مصرعے حذف کردیے جائیں تو پنجابی کا ایسا شاہکار وجود میں آسکتا ہے جسے نہایت کامیابی سے سٹیج کیا جاسکتا ہے۔ (میں نے سُنا ہے کہ بھارت میں ہیر وارث شاہ کو اوپیرا کی صورت میں پیش کیا جاچکا ہے اور کئی ہفتے یہ کھیل دِلّی کے علاوہ مشرقی پنجاب کے مختلف شہروں میں کھیلا گیا) اس اوپیرا کی کامیابی کا ایک سبب تو اس کا سحر انگیز فن ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ ''وارث شاہ کی ہیر'' میں واقعات نہایت تیزی اور تسلسل سے چلتے ہیں اور کہانی کسی بھی مقام پر رُکتی نہیں۔ کامیاب ڈرامے کی یہی اہم ترین خصوصیت ہوتی ہے کہ اُس میں ٹھہراؤ نہ آئے۔ ممکن ہے میری اس تجویز سے وہ عناصر چونک اُٹھیں جو فنونِ لطیفہ کو عیاشی، بداخلاقی اور بدچلنی کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور یوں اُن لوگوں نے اپنے ذہنوں کو پتھر بنالیا ہے۔ یہ عناصر ''قصے'' کے لفظ سے چونک اٹھتے ہیں اور ہر قصے کو عشق یا عاشقی کی علامت تک محدود سمجھتے ہیں۔ یہ عشق و عاشقی زندگی کی بہت بڑی اور نا قابلِ اعتبار حقیقت ہے۔ مگر ''ہیر وارث شاہ'' میں شاعر نے رانجھا، ہیر، سہتی، کیدو، میدا، ملکی، جوگی، قاضی، رانجھے کے بھائیوں اور بھابھیوں وغیرہ کے کرداروں کی مدد سے محض ایک مقبول عام قصہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے معاشرے، تاریخ، دکھوں اور دلچسپیوں کو دھڑکن عطا کردی ہے۔ اُس نے اپنے قصے کے ہیرو، ہیروئن رانجھا اور ہیر کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا اور کرداروں کی خامیاں بیان کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ اسی طرح دوسرے حکمرانوں، منتظمین، مولوی، قاضی اور جوگی کو بھی کھری کھری سنائی ہیں۔ یوں نمائش اور ریا کاری کے پردے چاک کردیے ہیں۔ وارث شاہ نے اٹھارہویں صدی کے پنجاب کا مکمل نقشہ اتنے واضح رنگوں میں ہمارے سامنے پیش کردیا ہے کہ ہر بڑی تصنیف کی طرح ''ہیر وارث شاہ'' کو اس زمانے کی معاشرتی، تہذیبی اور عمرانی تاریخ کہا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت اُس وقت اور بھی اہمیت اختیار کرلیتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وارث شاہ نے عوامی زندگی میں ڈوب کر، اپنے آپ کو عوام کے تجربات میں سے گزار کر عوامی زبان اور عام لہجے میں اعلیٰ درجے کی شاعری کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال دنیا بھر کی زبانوں میں شاید ہی کہیں موجود ہو۔

احمد ندیم قاسمی

پنجابی زبان سے ترجمہ: زاہد حسن

کھواب کیا کریں

رمز رب کی جاننے چلے تھے
بھولی اپنی پہچان
کھواب کیا کریں
ہلکی سی کچھ رم جھم ہوئی
پھر گئے ایمان
کھواب کیا کریں
روحوں کو بہت چُپ لگی
جسم شور مچائیں
ہیریں بیٹھی بان بٹیں
رانجھے چُوری کھائیں
کھواب کیا کریں
بہن، بیٹی کے مُول لگے
ٹوٹے اپنے مان
کھواب کیا کریں

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

خطبہ

تقسیمِ انعامات کی اس تقریب کی صدارت ایک ایسے شخص کے سپرد کر کے آپ نے مروجہ روایات کی خلاف ورزی کی ہے، جو محض ایک اہلِ قلم ہے اور جس کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اس نے اپنے قلم کو ہمیشہ اپنے ضمیر اور اپنی قوم اور اپنی نوع کی امانت سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممکن ہے آج میں وہ سب کچھ نہ کہہ سکوں جو آپ اب تک سنتے آئے ہیں اور آپ کو بعض ایسی باتیں سننا پڑیں جنھیں سننے کے آپ عادی نہیں ہیں۔

مجھے جب بھی نوجوانوں کے کسی اجتماع سے مخاطب ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے، مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے مستقبل سے مخاطب ہوں۔ آپ کی سرگرمیاں، آپ کا ذوق وشوق، زندگی کے بارے میں آپ کے انداز اور نظریے، اپنے سے بڑوں اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ، اپنے ملک اور اپنی زمین کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر، یہ سب چیزیں مجھے اپنے مستقبل کے خدوخال کو واضح کرنے اور انھیں متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ پھر جب میں ''اپنے مستقبل'' کے الفاظ استعمال کرتا ہوں تو ان کا مطلب میری ذات کا مستقبل نہیں ہوتا کہ اس بارے میں تو مجھے یا کسی اور انسان کو کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ ہمیں تو ایک لمحہ یا ایک دن یا ایک برس یا چند برس کے بعد ہر انسان کی طرح پیوند زمین ہونا ہے سو ''اپنے مستقبل'' سے میری مراد ان امیدوں اور امنگوں اور خواہشوں اور ارادوں کا مستقبل ہے جن کا تعلق آپ سب سے، مل کہ پوری قوم سے مل کہ پوری بنی نوعِ انسانی سے ہے۔ اس طرح وقت نے ایک بہت بڑی امانت آپ کی تحویل میں دے دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ صحیح معنوں میں ذمہ دار، امین اور دیانتدار ثابت ہوں گے اور جب بھی کوئی فیصلہ کریں گے تو اس جذبے کے ساتھ کریں گے کہ یہ صرف آپ کا فیصلہ نہیں ہے۔ ہمارے پورے مستقبل کا فیصلہ ہے۔

جب میری عمر کے لوگوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی تھی تو یہ ملک اور یہ قوم تاجِ برطانیہ کے غلام تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نصابوں میں کوئی ایک بھی ایسا لفظ درج نہیں ہوتا تھا جو ہمیں اجتماعی، ملکی اور قومی نقطہ نظر سے سوچنا سکھاتا۔ ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے یہ اہتمام بطورِ خاص کر رکھا تھا کہ غلام اپنی غلامی پر رضامند رہیں، مگر بھلا ہو اس مقدس جذبے کا جو بنیادی طور پر ہر انسان کے دل میں موجزن ہوتا ہے اور جسے جذبۂ آزادی کہتے ہیں، اور پھر بھلا ہو ان نیک روحوں کا جنھوں نے اس جذبے میں تموج اور تلاطم پیدا کیا کہ ہم

ایک نہایت منفی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مثبت انداز میں سوچنے اور عمل کرنے کے قابل ہو سکے۔ مگر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آج کی نئی نسل، آپ کی نسل کتنی خوش نصیب ہے کہ اس نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب سب آزاد تھے۔ ایک خودمختار مملکت کے باشندے تھے اور اپنے برے بھلے کے بارے میں ہم خود ہی سوچتے اور عمل کرتے تھے۔ اپنے ذہنوں سے سوچنے والوں کے ہاں اختلاف رائے تو ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ مسائل پر مکمل اتفاق تو بے حسی اور جمود کی علامت ہے، اس لیے اختلاف رائے سے نہ تو گھبرانا چاہیے اور نہ غصہ میں آنا چاہیے کہ یہی دیانت دارانہ اختلاف ہی تو ہمیں خوب سے خوب تر کی طرف لے جاتا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نسل کے سپرد یہ کام تھا کہ ہم غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کریں۔ یہ کام ہم نے حسب استطاعت مکمل کر لیا۔ اب آپ کی نسل کے ذمہ اس آزادی کے تحفظ کا کام ہے اور یہ کام ہمارے کام سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اور یہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ آزادی کی حفاظت کرنا آزادی حاصل کرنے سے کہیں دشوار مرحلہ ہے مگر مجھے اعتماد ہے کہ آپ بھی ہماری طرح سرخرو ہوں گے۔ اس اعتماد کا اظہار میں نے محض ازراہ تکلف نہیں کیا۔ دراصل میں نے محسوس کیا ہے کہ قوم آپ پر اعتماد کر سکتی ہے کیوں کہ جب آپ قوم کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو اتنا بڑا اعزاز دینے لگیں جیسا آج آپ نے مجھے بخشا ہے تو یہ آپ کے باشعور ہونے کا ثبوت ہے اور اس امر کا بھی کہ آپ کو کھوٹے کھرے کی پہچان ہے۔

عزیزان گرامی! میں آخر میں ایک بار پھر آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس تقریب کی صدارت کی عزت بخشی۔ میری دعا ہے کہ آئندہ زندگی میں آپ کا طریق کار ایسا ہو کہ آپ میں سے ایک ایک فرد پر ہماری پوری تاریخ فخر کر سکے، اور آپ کی خدمت میں میرا مشورہ ہے کہ کرۂ ارض پر آج جو شکست خوردگی اور خوفزدگی سے پیدا ہونے والی تحریکیں چل رہی ہیں، ان سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھیے گا کیوں کہ آپ ایک ایسی قوم کے فرد ہیں جسے مایوس ہونا آتا ہی نہیں ہے اور جسے خوف و شکست کی عیاشی میں مبتلا ہونے کی بجائے زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنانا ہے ـــــ خدا حافظ

(یکم مئی ۱۹۶۷ء)

نوٹ: احمد ندیم قاسمی صاحب کی یہ غیر مطبوعہ تحریر ہمیں ڈاکٹر ناہید قاسمی کی وساطت سے ملی۔

احمد ندیم قاسمی

کنجری

سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی۔ گلے کی رگیں پھول رہی تھیں، جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہیں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کُھلے تھے کیوں کہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن میں حارج ہو سکتا تھا۔ "اماں!" وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا "وہ برساتی نالے سے پرلے محلے میں جولڑکی رہتی تھی نا بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے؟" ----- "ہاں ہاں، ہاں ہاں" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ "وہ جو تمھارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہُو بہُو ملتی ہے" اس نے کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولھے کے پاس اُپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی، اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پُر کیا---" "ہو بہو کہاں کہا تھا میں نے؟ ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور نوبہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت، چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے، پر ہماری کمالاں جیسا سبھاؤ کہاں اس میں" ---- بڑھیا کی باتوں کے دوران میں، سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلتے ہوئے اُپلوں میں اپنا دستپنا ٹھونس ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑ پن سے آگ بکھیرتی رہی اور جب بڑھیا ڈلی پھانکنے کے لیے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھُرتی سے جوڑا۔ "تو اماں، وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی! جس کے-----" بڑھیا پیڑھی سمیت اُچک کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔ "بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے کو، اور لعنت اس باپ پر جو سکول کے سوکھے سڑے، ٹوٹے جوتے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔

واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟'' ---- بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بُجھے بُجھے چولھے میں برابر پھونکیں مارے جا رہی تھی، اور کڑوا رُلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا۔ سرور بولا ''اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے!'' اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی ''معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیگماں نے۔ بھئی سرور بیٹے! ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے، ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں ---- ہاہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا۔ جیو میرے سُرُو، کیسی گھی میں تر تراتی خبر لائے ہو تم ---- کیوں کمالاں بیٹی! تمہارا کیا خیال ہے؟''

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولھے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا، اور سرور نے مسکرا کر کہا ''کچی ہے ابھی'' ---- کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی ''دال ناں؟'' اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے کھُکنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ''ہاں'' وہ بولی ''آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا۔''

یہ تر تراتی خبر کمالاں کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاتے تھے اور انھیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی ''پھر کیا ہوا بابا؟'' اور سرور جواب میں کہتا ''پھر کمال خاتون بٹیا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی۔ بھائیوں کا حلقہ توڑ کر بھاگی اور اپنے یار سے چٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے، میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا اماں کی قسم'' ---- کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی۔ پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولھا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خان گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکاندار تھا۔ کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خان نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنوئیں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خان صاحب کا خطاب پایا لیکن جانے اس پر کیا اُفتاد پڑی کہ یہ خاں صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں

کہ خان صاحب سہراب خان پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اڑا دی۔ یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خان کی نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔ ”میں نے تاجی کو رن مست خان کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!“ دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ ”اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خان صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری۔“

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا ”کنجری! کنجری!“ سہراب خان کی دکان اُجڑ گئی۔ وہ دکان کا سامان اُٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پائی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خاں صاحب سہراب خان اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی، مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے۔ کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص حرج نہیں ہے۔ گاؤں میں تاجی نے کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پُرامن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان دوستیوں کے تانے بانے بُنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لیے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی۔ بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ اُکھڑا اُکھڑا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں لیکن اس دوڑ دھوپ میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ تو اَب تک کنجری ہے۔ ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپٹا، گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسماعیل خان سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے، مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے

جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی ان کے ہتھے نہ چڑھی۔ آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رُک گیا اور وہ بولی "سرؤ بیٹے!!! وہ ہماری کمال خاتون زندہ ہوئی تو اب کے برس کی ہوگی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو ـــــ" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی۔ تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا ! افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مُصلّے بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک کھلکھلاتے رہے اور کہتے رہے "پیڑ کا رخ غلط ہے، تنے میں رسا ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رَسّا ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جُھک جاتا اور رسا تڑ سے ٹُوٹ جاتا۔ پیڑ کا رخ معین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ سرور بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو، قد کیسا سرو سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے۔ ہونٹ دیکھو، لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں، اور آنکھیں! یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا اس میں۔ اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی اور تمہارے سر کی قسم میں سمجھی کلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہو گئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مُرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو ابھی نہیں جاؤں گی ملتان۔ میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں ـــــ"

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ مُصلّے پھٹ جانے کے بعد دوسرا مُصلّے مہیا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دُھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار اس

نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا ''تم نہیں جانتیں بیٹا! جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤ گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی۔ پر اب تو نہیں کھیلتی نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنویں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھیں۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی لاتی ہو؟ تو یہ دِنوں کا پھیر ہے میری جان! پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ جاگنے میں تمہیں مزہ آئے گا اور اندھیرے میں تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی۔ میری رانی! بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔''

''بس اب چند مہینوں کی بات ہے!'' بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا ''یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس چند ہی مہینوں کی بات ہے۔ تم بھی کمال کرتی ہو اماں۔ ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں افیم بیچتا ہوں، وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے۔ مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پکیں اور اوڑھیں پہنیں۔ ویسے بھی دل کچھ ہولایا سا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں کملو چکلے کے لائق نہیں۔ اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں! وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نوبہار میں۔''

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی ''ارے پگلے! کہیں تُو بھی مولوی تو نہیں بنا جا رہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی۔ ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کر یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہو گا۔ پگلا، آج کی افیم لا۔''

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولھے پر رکھ کر پانی کے اُبلنے کا انتظار کیا جاتا ہے، اور یہ پانی اس روز اُبلا جب کنویں پر جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان قادر نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا وہ کہتا ''حسبی اللہ! حسبی اللہ'' کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی ''اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ'' نوجوان مسکرا کر بولا ''میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربانو۔'' کمالاں نے کڑک کر کہا ''تو پھر اپنی اماں سے عشق لڑا'' نوجوان ہنس کر بولا ''وہ تو مر چکی ہے پیارو'' کمالاں آپے سے باہر ہو گئی۔ قادرے کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنویں کی جگت خالی ہو گئی۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں۔ قادرا لپک کر دور نکل گیا

اور وہاں سے پکارا ”آخر کنجری ہونا کنجری!“ ۔۔۔ وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی تھیں ایک دوسری کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، ٹھٹکیں اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی۔ پہلے تو دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں، غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسا پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا ”چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے سرو بیٹے!“ تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

اس روز کمالاں ایک دم سے بدل گئی۔ کنویں پر جا کر گھر میں سنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نوعمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑھی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں، ”آخر کنجری ہے نا کنجری“ یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی۔ بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔ ”ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا“ بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی، ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی، اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی ”اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بیٹا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔“ وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آ کر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر پکارتی ”ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے! دیکھنا تو اپنی بیٹی کو، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی۔“ پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادرے نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک اور نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ ”تیرے نام پر لڑائی ہو گئی۔ قادرا تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دُھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو؟ اری یہی ابمو فوجی!“ تو کمالاں کو جھرجھری سی آ گئی اور اس کے بعد

وہ احساسِ جمال اور احساسِ محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی۔ افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہو گئی اور جماہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں اگر منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کُرید کُرید کر نہیں پوچھتی تھی تو گلی میں تڑتڑاتی خبریں سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آ گئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انھوں نے مدتوں بعد کمالاں کو ''رگی'' میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا ''چوٹ لگی ہے، صاف چوٹ لگی ہے۔ تمہاری ہی قسم بیٹا، چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا، یہ اُتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے۔ آہاہاہا، لطف آ گیا!'' امیدوں کے پھول جنھوں نے اب تک سر نہوڑا لیا تھا، تر و تازہ ہو کر سر بلند ہو گئے اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوتی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی، دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینک میں گم رہتی تھی، یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی اور سرور موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں میں بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معنی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہِ راست اور دوٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لیے کہتے۔ بس جال بچھاتے رہے، دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی۔ بعض وقت سرور تنگ آ کر کہتا ''اماں اس حرام زادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں۔ ایک بار شمشاد اور نوبہار اور میرو وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے۔'' مگر بڑھیا تاجی دور اندیشی سے کہتی ''نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا، پک جانے دو، آپی ٹپکنے دو، اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے۔ تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انھیں اگر پتہ چل گیا کہ

کمالاں پورے چودہ کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی۔ جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے وہیں چند مہینے اور سہی۔ آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے جائیں۔ بیٹھے بیٹھے، نہ بیٹھے نہ بیٹھے، یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال! ذرا سا اور دیکھ لو۔“

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا ”کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا۔“

بڑھیا بولی ”میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرو بیٹا خالی خالی سا آ رہا ہے۔“

سرو نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا ”گلابی اور نواز میں بڑی **مدت** سے یارانہ چل رہا تھا۔ میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کر چلتا ہے۔ میں کہتا تھا، بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کر چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کر چلو پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے۔ نظریں اٹھا کر چلا کرو۔ سو آج میں گُلے جولاہے کے ہاں افیم بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابو نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی، پر میں نے دیکھ لیا اور جو کھنڈر کے دیوار سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے اور پھر پلٹ کر دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا ”کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟“ مجھے من بھر کی گالی دے کر جیب سے چاقو نکال لیا اور بولا ’یہ کوئی تیرے باپ سہرابے کا کھنڈر ہے؟‘ پر اماں! جھینپ چھپائے سے چھپتی تو نہ ہیر بدنام ہوتی نہ سوہنی۔ خیر، میں نے واپس آ کر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا۔ میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے تو ایک دم جیسے دکان پر الو بول گیا۔ سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے ’اسے کل تک مرمت کر دو بھائی‘ اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوئی ہے اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔ بڑے آئے تچی یاری لگانے والے۔ چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور۔۔۔۔ حرامزادے!“

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چُھپ چُھپ کر ملنے سے کیا تکلیف ہوئی۔ وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے نا کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا۔ اور پھر۔۔۔۔

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں ماں کے لاڈلے۔ دشمن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا دنیا بھر کے سامنے۔ مزا آیا نا عشق کرنے کا۔"

"دادی!" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور بابا دونوں "جی، جی" کرتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہِ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی۔۔۔ سن، بات یہ۔۔۔"

مگر سرور نے بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بیٹی کمالاں خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بٹیا کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے؟" کمالاں نے پوچھا۔

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو، ملو گی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا بات سے بات پیدا کی ہے۔ اور وہ بھی سو بات کی ایک بات۔ ہاں تو بتاؤ بیٹی! جواب دو، ملو گی؟"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی۔ چکرا سی گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "ہاں! پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا!"

"بالکل۔۔۔۔ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی، صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں۔"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "حرامزادی۔"

اُس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات کو دونوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اُس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی۔ آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیے کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرزِ عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی اِدھر اُدھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا ’’کیا بات ہے دادی؟‘‘

’’ارے بیٹا! کوئی خاص بات نہیں، بڑھیا بولی ’’جوانی کم بخت یاد آ رہی ہے۔ ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو زمین سے کھینچ کر انھیں سرمہ بنا کر رکھ دوں۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی۔ تمھیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں، اسی لیے ذرا اداس ہو رہی ہوں۔‘‘

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا۔ ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا ’’کیا بات ہے بابا؟‘‘

’’آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹا‘‘ وہ بولا ’’ذرا سی افیم تھی، اُسے اِدھر اُدھر کیا ہے۔ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے۔ افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں کے تینوں فاقوں سے مر جائیں گے۔ بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی، نیچ سمجھتے ہیں ہمیں، اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خواہ مخواہ۔‘‘

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا نہیں ہوا پر کیسا اُجڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے کلّے، کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنویں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہوئے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتے ہیں تو کیا ہوا؟ ’’نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی۔ عبادت سے نصیبے بدلتے تو گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارا میرا بابا!۔۔۔۔ وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتے رہی۔

اور شام کو کھانا کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا ’’اماں، اماں!‘‘

’’دادی، دادی!‘‘ کمالاں چلائی۔

’’بیٹی، بیٹی‘‘ بڑھیا کراہی۔ ’’درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کرو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی، قلنج لگتی ہے۔ اے کسی سیانے کو بلواؤ بیٹا کسی سیانے کو بلواؤ۔‘‘

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا۔ قلنج ہے تو جیون بُوٹی سے یوں چٹکی بجاتے میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے ---- جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے پر جانے کہاں دیکھی ہے۔"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں۔"

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی، وہاں تو کنوار گندل ہے۔ میں جیون بُوٹی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے۔ "جلدی سے یاد کرو ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی۔"

سرور گھبراہٹ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

اچانک بڑھیا بولی "سلطانے کے کھنڈر میں۔"

اور سرور نے تالی بجا دی "جیو اماں، کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بُوٹی۔ میں ابھی لایا۔" اور باہر جانے کے لیے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کر دی۔

بڑھیا کراہی "تم میرے پاس رُکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی۔"

"میں چلی جاؤں گی بابا۔" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا "دیکھو بٹیا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے، ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مُولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بُوٹی اگ رہی ہے۔ ایک پتا بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"

"اچھا بابا! میں بس پلک جھپکنے میں آئی۔" کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دُم کو اُٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی، مگر صرف "ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آ رہی تھی، کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھڑی کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دُور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں

نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھسٹتے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے، خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکا یک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی "آ گئیں میری جان!" چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ "میں جانتا تھا کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی اور آخر آج ـــــ" کمالاں اتنی قوت سے جست لگا کر کوٹھری کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آ جانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی، اور کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور ـــــ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی!

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے۔ قادرے کے بس میں آ گئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چلی ہیں۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو سمجھو رات کبھی ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آ گئی، جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا "قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی۔ پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں، بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کمبخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو کر بھی نہیں گئی۔"

"پر بیٹا" دادی نے کہا "تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔"

کواڑوں کو جیسے کسی نے پیٹ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے

بعد انھوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی لیکن سرور توبُت ہو چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سے غیر قدرتی آواز میں پوچھا ''بوٹی لائیں بیٹا!'' ---۔ کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی ہے۔ سرور تک لرز گیا، مگر وہ دادی اور بابا کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کے بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بیوقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب ادھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رُکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اُٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر کو پھیلا کر لیٹ گیا۔

اُس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی۔ وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگی آتی۔ سونے کی کوشش کرتی مگر پھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی اور جب صبح سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا ''اماں سچ مچ کہ جھوٹ موٹ ----''

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی ''تم یوں نہ پوچھو گے تو کون پوچھے گا بیٹا؟''

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''نہیں اماں! معاف کر دو۔ تو کیا تُم سچ مچ بیمار ہو؟''

بڑھیا نے کہا ''پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا، پُھریاں چل رہی ہیں۔''

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا ''میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔''

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی رہی اور روتی رہی، کافی دیر کے بعد وہ پکاری، بٹیا! کمال خاتون!''

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ ہدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اُجڑے اُجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

''بیٹا! بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

''ایک پیالی چائے کی مل جائے گی؟'' اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکہ نکلا ہے بڑی زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے دوا تم منگا لو، ٹیکہ میں لگا دوں گا۔ تیس چالیس لگتے ہیں۔"

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکہ لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے، مگر شام کو جب ڈاکٹر، جو کمپاونڈری سے استعفا دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا، مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو بیخ بیخ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو۔ اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا۔ خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ، ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ ماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال اِدھر اُدھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا۔ سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ لگا دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لیے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی"۔۔۔۔۔ اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے، پگڑی بھدے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی

زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا کہ جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور پپوٹے ذرا سا اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورۂ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں ''دادی!'' وہ چیخ کی حد تک چلائی۔ ''بابا!'' وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی کی آواز آ رہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آ کر بیٹھ گیا۔ یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلمیں سی نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے۔ لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی-----نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا کہ دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں۔ ''دادی!'' وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا۔ ''اٹھو میری بیٹی! جاگو، آنکھیں کھولو۔ اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟''

''میں ڈر گئی تھی بابا۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مؤدبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا، مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انھوں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لیے کہا اور وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورۂ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں موچیوں، جُلاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ وہ چپکے سے کوٹھے میں چلا گیا، خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھے میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''بابا!''-----اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی، لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے

ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ ''بابا'' وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میں تو ڈر گئی تھی بابا!'' کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟'' سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی ''بابا!''

سرور بے اختیار رونے لگا، اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا ''بیٹی! دیکھو، مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں!'' اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ ''میں بڑا ذلیل، کتا، خبیث، کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو، اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔'' پھر اُس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انھیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ ''میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں، کتنا کمینہ، سچ مچ کنجر۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا پھسلا کر تھپکتی تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا، تم نے کون سی بُری بات کی ہے۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی ''تمھیں تو بخار ہے بابا!''

''ہاں بیٹی!'' وہ بولا ''اِدھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔''

کمالاں سناٹے میں آ گئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک وادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ چہرے پر مَیلی مَیلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی۔ وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی ''نہیں بابا! تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمھیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا ـــــ نہیں ـــــ نہیں!''

وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا

”نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو جیوں گا۔ پھر جینے پر حق ہو گا میرا۔“

کمالاں کے سُوجے سُوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چپٹ گئے تھے۔ وہ انھیں بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

”بخش دو بیٹا!“ سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انھیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اُٹھ بیٹھا۔ ”اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ۔۔۔ کہنا پسلی کا درد ہے، دونوں طرف۔ ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب آدمی ہیں۔ جاؤ میری بیٹی!۔۔۔۔۔ پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ لو، مسکرا کر۔“

کمالاں پھر مسکرائی۔ ”یوں“ اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر چھت کی طرف دیکھ کر بولا ”الٰہی تیرا شکر ہے۔“

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں۔ پر جو مریض ٹیکا لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کرو سمجھیں؟“

”کتنے میں آئے گا ٹیکا؟“ کمالاں نے پوچھا۔

”بس یہ کوئی چالیس پچاس میں“ ڈاکٹر بولا ”پنسلین نام ہے، قصبے میں مل جائے گا۔“

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر بابا کے پاس بیٹھی رہی۔ سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے۔ سرور منتیں کرتا رہا کہ اپنی چارپائی پر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی، سرخ سرخ آنکھیں، اجڑے بال، خشک ہونٹ، جیسے کہیں سے پِٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ ”تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے۔“ وہ بڑے غصے سے بولا ”ٹیکا لاؤ ٹیکا۔ سمجھیں؟ اب کے ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا۔“ اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا ”ٹیکا“ وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے، کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے، باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی۔ وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''ٹیکا! سرور پھر ہنسا۔'' کہتا ہے ٹیکا لاؤ۔ ڈاکٹر بنا پھرتا ہے۔ ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں اور بیٹی دیکھو، میری طرف دیکھو، میں مروں وروں گا نہیں۔''

''میں تمھیں نہیں مرنے دوں گی بابا۔'' کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا، اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ لفظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ ''تم تو ہم سے دور رہتے ہو ملتے ہی نہیں!''

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا ''تمہارے حکم کا انتظار تھا۔''

''تو پھر آج ملو۔'' وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کہاں؟''

''میرے گھر ہی میں۔'' پھر ذرا سا رک کر بولی ''میری دادی مر گئی ہے نا۔''

''کب آؤں؟''

''بس لوگ سوتے، آ جاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے۔ تم بے دھڑک چلے آنا، بابا بیمار ہے، بے ہوش پڑا ہے۔''

ابراہیم کے تو جیسے پَر لگ گئے۔ ادھر کمالاں بھی اُڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ ''پانی پانی'' پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دُکھ سے بولا ''اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کرو، بیٹی، ڈر لگتا ہے۔''

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دابنے لگی، اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھڑی میں آئی اور وہاں کے چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا

ایک دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی، اور ،لوگ سوتے، تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آ کر اس نے آہستہ سے کہا “کمالی!” اور پھر سرور “پانی پانی” کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

“پانی!” سرور دوسرے کوٹھے میں رو دیا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا “اب چلیں پیاری!”

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

“پانی” سرور اُدھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ “کل پھر ملیں گے میری جان!”

اور آخر کمالاں بولی “کل تو خیر ملیں گے، پر آج کی اُجرت کہاں ہے؟”

“اُجرت؟” ابراہیم غصے میں بولا “اُجرت مانگتی ہے؟ عاشق کی اُجرت مانگتی ہے؟ شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا، کنجری۔”

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کی جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ ''کہیں آ ہی رہا ہوگا۔'' کسی نے کہدیا۔ ''ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔'' اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ ''آ ہی رہا ہوگا۔'' وہ سوچتی۔ ''کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر ۔۔۔ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ۔۔۔۔''

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال وہ جب روتا چلاّتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا۔ ''میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا'' اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا۔ ''ہنسو نہیں یارو، اس بچے کو بھی تو اُسی واہگورو نے پیدا کیا ہے جس نے تمھیں اور تمھارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔''

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک اپنی کرپان نکال لی تھی، بولا۔ ''ذرا ٹھہر پرمیشرے'' کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔''

''مارو نہیں یارو'' پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ ''اسے مارو نہیں۔ اتنا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ جس نے ۔۔۔۔۔''

''پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔'' ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ ''بولو۔ تمھیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟''

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی

تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے، منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ ''پتہ نہیں۔''

''لو اور سنو'' کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ ''اماں تو کہتی ہے میں بُھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔''

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے، اور پرمیشر سنگھ روتی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ ''سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بُھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔''

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر گُھسر پُھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا ''لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ۔''

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنھوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا، مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگتا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے، دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی، اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ ''نام کیا ہے تمھارا؟''

''اختر'' اب کی اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

''اختر بیٹے۔'' پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''ذرا میری انگلیوں میں جھانکو تو''

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی ''آہا'' اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ ''تتلی!''

”لو گے؟“ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

”ہاں“ اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

”لو“ پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اُڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرّے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اُڑ جاتی تھی یوں ہی منھ لٹکا لیتا تھا۔“

”پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔“ نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا ”ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے“ پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ ”ہاں ہاں بیٹے تمھیں تمھاری اماں پاس لیے چلتا ہوں“ تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لُٹا پِٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چاردیواری میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں تھیں اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ ”یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!“

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انھیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ ”جانے کیا ہو گیا ہے اسے!“ اس نے کہا تھا۔ ”واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب سے کرتار سنگھ بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھولی، پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں ذرا بھی غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا، کہتا تھا، بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری۔ ہمارے گھروندے میں ستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی، ----- اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہاں تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتے سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اُٹھ جاتے ہیں۔“

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا، مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اُٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ ''سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!'' ۔۔۔ بیوی اسے محض ''اونہہ'' سے ٹال کر سوجاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کرکے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی اذان میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھی بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یوں ہی کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے وہ سوجاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پریشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا ''ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔''

پریشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پریشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ ''یہ کون ہے؟''

پریشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ڈرو نہیں بیوقوف، اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں، یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے۔''

''اختر!'' بیوی کے تیور بدل گئے۔

''تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔'' پریشر سنگھ نے وضاحت کی۔ ''اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔''

''پر یہ ہے کس کا؟'' بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

''کس کا ہے!'' پریشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''واہگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے، اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی دیکھ نہیں سکتی کہ اختر کے

ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں یہ ذرا پتلی ہیں، اور۔۔۔"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے، ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری لو۔ یہ اماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا تھا جسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی، ایک دو سو میں بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولہ بن جاتا۔ اور پھر۔۔۔ پگلے۔۔۔۔۔ تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟۔۔۔ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی "کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ "میں نہیں سمجھی اور نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات ہی رات میں جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔۔۔ لے جا اسے، پھینک دے باہر۔"

"تمھیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمھارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دوہتڑوں سے پیٹتی، چیختی، چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کا سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو دہلا دیا۔ "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا۔ "ارے وہ کدھر گیا گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر۔ اختر!" وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا

یارو۔ ارے وہ گیا کہاں؟ اختر۔ اے اختر!’’

‘‘میں تمھارے پاس نہیں آؤں گا۔’’ پگڈنڈی کے ایک موڑ پر، گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ ‘‘تم تو سکھ ہو۔’’

‘‘ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔’’ پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعترافِ جرم کر لیا۔

‘‘تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔’’ اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لیے راستہ صاف کیا۔

‘‘نہیں آؤ گے؟’’ پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

‘‘نہیں۔’’

‘‘نہیں آؤ گے؟’’

‘‘نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔’’

‘‘کیسے نہیں آؤ گے؟’’ پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ ‘‘چلو۔’’ وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے، پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ ‘‘نہیں چلتا، بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا، میں تمھیں مار دوں گا۔’’

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا۔ ‘‘مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمھارے خدا کی قسم۔ میں تمھارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمھیں کوئی مار دے گا پھر تمھاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمھیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں -----۔ اگر تمھیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا۔ تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا۔ اچھا؟’’

‘‘اچھا!’’ اختر نے اُلٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور

پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔

”روتے کیوں ہو پرمیشرے، کُل ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتا را لگے گا۔“

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتا را بناتے ہو اور ادھر اگر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا۔“ پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ ”یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سونہہ۔ میں کل ہی امرت سر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصہ ہوں۔ سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔“

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا۔ اور بولا۔ ”پرمیشر سنگھا!“

”جی۔“ پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔ ”دیکھو۔“ گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ ”کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا، اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی، چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو، سمجھے؟“

”جی!“ پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں!“ گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

”ایسا ہی ہو گا گرنتھی جی۔“ پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ ”پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے، لگتا ہے پہلے جنم میں مُسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ اس چھوکرے کو چاٹے، موا نکما۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔“

”واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی۔“ پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ زیرلب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا۔ ”اچھا جی اچھا۔“ اس نے کہا۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے الگ پہچانا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ ''ذرا ادھر تو آ امر کورے! یہ دیکھ۔ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جُوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔''

''نہیں ماں'' امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ ''جیسے واہگورو جی ایک ہیں، اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتارا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ ''میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مُسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مُسلا نہیں ہوتا۔''

''میں کب کہتی ہوں یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سالا ڈلا بچہ!'' پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لیے روتیں۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لیے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا۔ ''میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔''

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ ''یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات کبھی نہ ہوگی۔ وہ بات کبھی نہ ہوگی، وہ نہیں ہوگا مجھ سے، سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔''

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی، اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے جب بھی دیکھا ناک اچھال دیا۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا۔ ''الو کی پٹھی۔'' اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ ''سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی

ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو۔" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ "پانی۔" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھنویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جُٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ ماروں گا"۔۔۔ امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں، بولی۔ "مار تو سہی۔ تُو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی، میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اُس نے اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنالی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "کیوں پانی پلاؤں۔ کرتارا بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر۔ ہاں"۔

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی تو تمھاری ماں ہے بیٹے۔"

"نہیں۔" اختر بڑے غصے سے بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔ "تمھارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔ تم تو امر کور سؤر کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو مجھی سؤر کی بچی کا باپ ہے!" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا۔ "تمھیں اس سے کیا۔"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔

’’اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔‘‘

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے ہلا کر آہستہ سے بولی۔ ’’بیٹی۔‘‘

’’کیا ہے ماں۔‘‘ امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ ’’سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔‘‘

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوف ناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوف ناک تر تھی۔

’’کیا ہوا بیٹا؟‘‘ پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے چھاتی سے بھینچ لیا۔ ’’ڈر گئے بیٹا؟‘‘

’’ہاں‘‘ اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ ’’کوئی چیز چیخی تھی۔‘‘

’’امر کور چیخی تھی۔‘‘ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ’’ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔‘‘

’’میں پڑھ رہا تھا!‘‘ اختر بولا۔ اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔

’’میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔‘‘

’’کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟‘‘ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

’’پڑھوں؟‘‘ اختر نے پوچھا۔

’’ہاں ہاں‘‘ پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قُل ہواللّٰہُ اَحد پڑھنے لگا۔ کفواً اَحد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چُھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’تمھارے سینے پر بھی چُھو کر دوں؟‘‘

''ہاں ہاں۔'' پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھُو کر دی۔ اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا۔ ''کیا نیند نہیں آتی تھی؟''

''ہاں!'' اختر بولا۔ ''اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قُل ہو اللہ پڑھو نیند آ جائے گی، اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔''

''پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔'' پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ''روز پڑھا کرو۔ اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمھاری اماں تمھیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔'' اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھا تو امر کور پکاری۔

''نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر لگتا ہے؟'' پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کس سے ڈر لگتا ہے؟''

''جلتا رہے، کیا ہے؟'' بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بُجھا کر ہنس دیا ''پگلیاں'' وہ بولا۔ ''گدھیاں۔''

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ھو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں ''پڑوس'' کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جُوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی، مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی وہ پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قُل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''کون؟ امر کور؟''

''نہیں۔''

''کرتارا؟''

“نہیں۔” پھر کچھ سوچ کر بولا۔ “ہاں ہاں وہی، کرتا را۔”

“باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔”

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنوں کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھُوٹ رہا ہے، مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھُوٹا تو بولا۔

“کیوں بے کرتارو! تو نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا ہے؟”

“اچھا کیا جو مارا۔” اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

“تمھارے رسول نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟” لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر سوچ کر بولا۔ “اور کیا تمھارے گُرو نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟”

“مُسلا” لڑکے نے اسے گالی دی۔

“سِکھڑا” اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ “سنو بیٹے! میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟”

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا۔ “اماں کے پاس جاؤں گا۔”

“اور میرے پاس نہیں رہو گے؟” پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سُرخ ہوگیا جیسے وہ رو دے گا۔

“تمھارے پاس بھی رہوں گا؟” اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے، خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا۔ “دیکھو بیٹے! اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمھیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمھیں لے آؤں گا۔”

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دُور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولہ دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا۔

“فوجیوں کی لاری آ گئی۔” وہ مینڈھ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ “گیانے، او

گیان سنگھ!'' وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا۔ ''آؤ بھائی کرتارے تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ جتھیانے آئے ہیں۔ ہونہہ!''۔۔۔ پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی۔ ''جاؤں؟''

اوراختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔

ان سے بات کر کے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبر دار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں ''لڑکے کی بات دوسری ہے۔'' کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیرلب مسکرانے لگے، پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے ماستا پر بڑا زور دیا جوان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے جتھیالی گئی تھیں۔ ''اور مذہب کیا ہے دوستو۔'' اس نے کہا تھا۔ ''دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چُرا لیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں ۔۔۔۔۔ ہم مسلمان ہیں ۔۔۔ ہم واہگوروجی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔''

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور ۔۔۔۔ اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک بادیں دینے لگے لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک کھاٹ

پر بیٹھا رہا۔ کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر اُدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک اپنی ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے گود میں بٹھا لیا پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔ "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر بعد چونک کر بیوی سے پوچھا۔ "سنو۔ کیا تمھیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے۔"

"لو اور سنو۔" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔ "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے!"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں ہڑک کر جلدی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہو۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔ "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔

کھیتوں میں آ کر وہ بولا۔ "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمھاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمھاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"

اب کے اختر بولا "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "چلو گے اماں کے پاس؟"

"ہاں" اختر بولا۔ "پر تم لے تو جاتے نہیں۔ تم بہت برے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا۔ "نہیں بیٹے، آج تو تمھیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمھاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی

ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔ ''

''میں بھی تو اداس ہوں۔'' اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''میں تمھیں تمھاری اماں ہی کے پاس لیے جا رہا ہوں۔''

''سچ؟'' اختر پریمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا ''ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔''

پریمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔ ''گانا سنو گے؟''

''ہاں''

''پہلے تم قرآن سناؤ۔''

''اچھا۔'' اور اختر قُل ہو اللہ پڑھنے لگا۔ کفواً اَحد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر پُھو کی اور بولا۔

''لاؤ تمھارے سینے پر بھی پُھو کر دوں۔''

رک کر پریمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر پُھو کر دی اور بولا۔ ''اب تم سناؤ۔''

پریمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا جے
بنتو دا منہ چن ورگا جے
بنتو دا لک چترا جے
لوکو
بنتو دا لک چترا

''بنتو کون ہے؟'' اختر نے پریمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پریمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا۔ ''میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں، اس کا نام بنتو ہے امر کور کا نام بھی بنتو ہے تمھاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔''

''کیوں؟'' اختر خفا ہو گیا۔ ''وہ کوئی سکھ ہے؟''

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی، کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا۔ ”اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟“ پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گرو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر ”پھر؟ پھر؟“ کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی، جب اختر ایک دم بولا۔ ”ارے چاند تو سر پر آ گیا!“

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا۔ ”تمھاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔“

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا۔ جب اچانک کہیں دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ”جاؤ بیٹے، تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں۔۔۔“

”شش!“ اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔ ”اذان کے وقت نہیں بولتے۔“

”پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!“ پرمیشر سنگھ بولا۔

”شش“ اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم۔“

”کیوں؟ کیوں نہیں آؤ گے؟“ اختر نے پوچھا۔

”تمھاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔“ پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ ”بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتارا نہیں اختر۔ پھر اپنی ماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو۔ مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔“

”لکھوں گا۔“ اختر نے وعدہ کیا۔

”اور ہاں تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے تا۔ تو اُسے اِدھر بھیج دینا؟۔ اچھا؟“

“اچھا۔”

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔ “جاؤ!” اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔

“تم بھی آ جاؤ نا۔”

“نہیں بھئی!” پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ “تمھاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔”

“مجھے ڈر لگتا ہے۔” اختر بولا۔

“قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟” پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

“اچھا” بات اختر کی سمجھ میں آ گئی اور وہ قُل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

زرم زرم پو افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے۔ “کون ہو تم؟”

“اختر۔” وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

“اختر!” دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی سر سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا۔ “میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمھیں ماروں گا۔”

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھپ سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ “ہالٹ!” ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پٹی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔ “مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔”

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

احمد ندیم قاسمی

کپاس کا پُھول

مائی تاجو ہر رات کو ایک گھنٹہ تو ضرور سو لیتی تھی لیکن اس رات غصے نے اسے اتنا سا بھی سونے کی مہلت نہ دی۔

پو پھٹے جب وہ کھاٹ پر سے اُتر کر پانی پینے کے لیے گھڑے کی طرف جانے لگی تو دوسرے ہی قدم پر اسے چکر آ گیا تھا اور وہ گر پڑی تھی۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ رات کے اندھیرے میں صبح ہولے ہولے گُھل رہی تھی۔ چڑیاں ایک دوسرے کو رات کے خواب سنانے لگی تھیں۔ بعض پرندے پر ہلائے بغیر فضا میں یوں تیر رہے تھے جیسے مصنوعی ہیں اور کوک ختم ہو گئی تو گر پڑیں گے۔ ہوا بہت نرم تھی اور اس میں ہلکی ہلکی لطیف سی خنکی تھی۔ مسجد میں وارث علی اذان دے رہا تھا۔ یہ وہی سریلی اذان تھی جس کے بارے میں ایک سکھ سمگلر نے یہ کہہ کر پورے گاؤں کو ہنسا دیا تھا کہ اگر میں نے وارث علی کی تین چار اذانیں اور سن لیں تو واہگورو کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے مسلمان ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اذان کی آواز پر گھروں میں گھمر گھمر چلتی ہوئی مدھانیاں روک لی گئی تھیں۔ چاروں طرف صرف اذان حکمران تھی اور اس ماحول میں مائی تاجو اپنی کھاٹ کے پاس ڈھیر پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی کے پاس اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو رہے تھے۔

مگر یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، مائی تاجو کو تو جیسے بے ہوش ہونے کی عادت تھی۔ ہر آٹھویں دسویں روز وہ صبح کو کھاٹ سے اٹھتے ہی بے ہوش ہو جاتی تھی۔ ایک بار تو وہ صبح سے دوپہر تک بے ہوش پڑی رہی تھی اور چند چیونٹیاں بھی اسے مردہ سمجھ کر اس پر چڑھ آئی تھیں اور اس کی جُھریوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تب پڑوس سے چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر دیوار پر سے جھانکی تھی اور پوچھا تھا ''مائی! آج لسّی نہیں لوگی کیا؟'' پھر اس کی نظر بے ہوش مائی پر پڑی تھی اور اس کی چیخ سن کر اس کا باپ اور بھائی دیوار پھاند کر آئے تھے اور مائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور اس کے منہ میں شکر ڈال ڈال کر خاصی دیر کے بعد اسے ہوش میں لائے تھے۔ حکیم منور علی کی تشخیص یہ تھی کہ مائی خالی پیٹ سوتی ہے۔

اس دن سے راحتاں کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ شام کو ایک روٹی پر دال ترکاری رکھ کر لاتی اور جب تک مائی کھانے سے فارغ نہ ہو جاتی وہیں پر بیٹھی مائی کی باتیں سنتی رہتی۔ ایک دن مائی نے کہا تھا: ”میں تو ہر وقت تیار رہتی ہوں بیٹی کہ جانے کب اوپر سے بلاوا آ جائے۔ جس دن میں صبح کو تمھارے گھر لسی لینے نہ آئی تو سمجھ لینا میں چلی گئی۔ تب تم آنا اور اُدھر وہ چارپائی تلے صندوق رکھا ہے نا، اس میں سے میرا کفن نکال لینا۔ کبھی دکھاؤں گی تمھیں۔ وارث علی سے کہہ کہ مولوی عبدالمجید سے اس پر خاکِ پاک سے کلمہ شہادت بھی لکھوا لیا تھا۔ ڈرتی ہوں اسے بار بار نکالوں گی تو کہیں خاکِ پاک جھڑ ہی نہ جائے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ وہ لٹھا ہے جس سے بادشاہ زادیاں برقعے سلاتی ہوں گی۔ کپاس کے خاص پھولوں کی روئی سے تیار ہوتا ہے۔ یہ کپڑا، ٹین کے پترے کی طرح کھڑکھڑ بولتا ہے۔ چکی پیس پیس کر کمایا ہے۔ میں لوگوں کو عمر بھر آٹا دیتی رہی ہوں اور ان سے کفن لیتی رہی ہوں۔ کیوں بیٹی! یہ کوئی گھاٹے کا سودا تھا؟ نہیں تھا نا! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں کھدر کا کفن پہن کر جاؤں تو لوگ جنت میں بھی مجھ سے چکی ہی نہ پسوانے لگیں۔“ پھر اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر اس نے پوچھا تھا ”تمھیں دکھاؤں؟“

”نا مائی!“ راحتاں نے ڈر کر کہا تھا ”خاکِ پاک جھڑ گئی تو!“ پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی: ”ابھی تو تم بیس سال اور جیوگی، مائی تمھارے ماتھے پر تو پانچ لکیریں ہیں۔ پانچ بیسیاں سَو!“

مائی کا ہاتھ فوراً اپنے ماتھے کی طرف اٹھ گیا ”ہائے پانچ کہاں ہیں بیٹی، کل چار ہیں۔ پانچویں تو یہاں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ تُو چھری کی نوک سے دونوں ٹکڑوں کو ملا دے تو شاید ذرا سا اور جی لوں۔ تیرے گھر کی لسی تھوڑی سی اور پی لوں۔“ مائی کے پوپلے منہ پر ایک بار پھر گول سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

اس پر راحتاں نے زور سے ہنس کر آس پاس پھیلے ہوئے کفن اور کافور کی بُو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر کفن اور جنازے سے مفر نہ تھا۔ یہی تو مائی کے محبوب موضوع تھے۔

ویسے راحتاں کو مائی تا جو سے اُنس ہی اس لیے تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرنے ہی کی باتیں کرتی تھی جیسے مرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہو اور جب راحتاں نے ایک بار مذاق مذاق میں مائی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اسے یہی کفن پہنا کر اپنے باپ کی منت کرے گی کہ مائی کا بڑا ہی شاندار جنازہ نکالا جائے تو مائی اتنی خوش ہوئی تھی کہ جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہے۔ راحتاں سوچتی تھی کہ یہ کیسی بدنصیب ہے جس کا پوری دنیا میں کوئی بھی اپنا نہیں ہے اور جب یہ مری تو کسی آنکھ سے بھی تو آنسو نہیں ٹپکے گا۔ بعض موتیں کتنی آباد اور بعض کتنی ویران ہوتی ہیں۔ خود راحتاں کا ننھا بھائی کنوئیں میں گر کر مر گیا تھا تو کیا شاندار ماتم ہوا تھا۔ کئی دن تک

بین ہوتے رہے تھے اور گھر سے باہر چوپال پر دور دور سے فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے ٹھٹ لگے رہے تھے اور پھر انھی دنوں کریے مائی کا بچہ نمونیے سے مرا تو بس اتنا ہوا کہ اس روز کریے کے گھر کا چولھا ٹھنڈا رہا اور تیسرے ہی روز وہ چوپال پر بیٹھا چودھری فتح دین کا خط بنا رہا تھا۔ موت میں ایسا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مر کر تو سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب مٹی میں دفن ہوتے ہیں۔ امیروں کی قبروں کے لیے مٹی ولایت سے تو نہیں منگائی جاتی، سب کے لیے یہی پاکستان کی مٹی ہوتی ہے۔

"کیوں مائی؟" ایک دن راحتاں نے پوچھا تھا "کیا اس دنیا میں سچ مچ تمھارا کوئی نہیں ہے؟"

"واہ! کیوں نہیں ہے!" مائی مسکرائی۔

"اچھا!" راحتاں کو بڑی حیرت ہوئی۔

"ہاں ایک ہے۔" مائی بولی۔

راحتاں بہت خوش ہوئی کہ مائی نے اسے ایک ایسا راز بتا دیا جس کا گاؤں کے بڑے بوڑھوں تک کو علم نہیں "کہاں رہتا ہے وہ؟" اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"وہ؟" مائی مسکرائے جا رہی تھی "وہ یہاں بھی رہتا ہے وہاں بھی رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ نہ رہتا ہو۔ وہ بارڈر کے اُدھر بھی رہتا ہے بارڈر کے اِدھر بھی رہتا ہے۔ وہ تو..."

راحتاں نے بےقرار ہو کر مائی کی بات کاٹی "ہائے ایسا کون ہے وہ؟"

اور مائی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا "خدا بیٹی، اور کون ہے!"

☆

راحتاں کو اس کے باپ کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ آج سے کوئی آدھی صدی اُدھر کی بات ہے، گاؤں کا ایک نوجوان پٹواری مائی تاجو کو یہاں لے آیا تھا۔ کہتے ہیں مائی تاجو اُن دنوں اتنی خوبصورت تھی کہ اگر وہ بادشاہوں کا زمانہ ہوتا تو مائی ملکہ ہوتی۔ اُس کے حسن کا چرچا پھیلا تو اس گاؤں سے نکل کر پٹواری کے آبائی گاؤں تک جا پہنچا جہاں سے اس کی پہلی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں آدھمکی۔ پٹواری نے مائی تاجو کو دھوکا دیا تھا کہ وہ کنوارا ہے۔ تاجو نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف رو پیٹ کر اور نہر میں کود جانے کی دھمکی دے کر شادی کی تھی۔ اوپر سے پہلی بیوی نے جب اپنا سینہ دوہتڑوں سے پیٹنا شروع کیا اور ہر دوہتڑ پر تاجو کو ایک گندی بساندی گالی تھما دی تو تاجو چکنا چور ہو کر یہاں سے بھاگی اور اپنے گاؤں میں جا کر دم لیا۔ ماں نے تو اسے لپٹا لیا مگر باپ آیا تو اسے بازو سے پکڑ کر باہر صحن میں لے گیا اور بولا "چاہے پٹواری کی تین بیویاں اور

ہوں، تمھیں اُسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم نے اپنی مرضی کی شادی کی ہے، ہمارے لیے یہی بے عزتی بہت ہے۔ اب یہاں بیٹھنا ہے تو طلاق لے کر آؤ ورنہ وہیں رہو چاہے نوکرانی بن کر رہو۔ ہمارے لیے تو تم اُسی دن مر گئی تھیں جب تم نے پوری برادری کی عورتوں کے سامنے چھوکروں کی طرح اکڑ کر کہہ دیا تھا کہ شادی کروں گی تو پٹواری سے کروں گی ورنہ کنواری مروں گی۔ جاؤ ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔''

اس کی ماں روتی پیٹتی رہی مگر باپ نے ایک نہ مانی اور جب تا جو آدھی رات کو واپس اس گاؤں میں پہنچ کر پٹواری کے دروازے پر آئی تو اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ رات وہیں دروازے سے لگی بیٹھی رہی۔ صبح لوگوں نے اسے دیکھا تو پنچائت نے فیصلہ کیا کہ تا جو پٹواری کی با قاعدہ منکوحہ ہے اس لیے اس کا پٹواری کے گھر پر حق ہے اور اس لیے تالا توڑ دو۔

گاؤں والوں نے چند روز تک تو پٹواری کا انتظار کیا مگر اس کی جگہ ایک نیا پٹواری آنکلا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی اور گاؤں میں تبادلہ کرا لیا ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اسے ڈھونڈنے نکلے اور جب وہ مل گیا تو پٹواری نے انھیں بتایا کہ اس نے ان کے گاؤں کا رخ کیا تو اس کی پہلی بیوی کے چھ فٹے بھائی اسے قتل کر دیں گے۔ ''میں نے یہ بات اپنی پہلی بیوی کو بھی نہیں بتائی کہ میں تمھارے گاؤں کے جس مکان میں رہتا تھا وہ میں نے خرید لیا تھا اور وہ میری ملکیت ہے۔ یہ مکان میں اپنی دوسری بیوی تا جو کے نام لکھ دیتا ہوں۔ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ مجھے اس سے محبت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔

سو گاؤں والوں کی مہربانی سے پٹواری نے اسے طلاق کے بدلے مکان دے دیا اور وہ بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کیوں کہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ یہ بچہ جب پیدا ہوا تو اس کا نام اس نے حسن دین رکھا۔ محنت مزدوری کر کے اسے پالتی پوستی رہی۔ مڈل تک پڑھایا بھی مگر اس کے بعد ہمت نہ رہی۔

تا جو کے حُسن کی وجہ سے اس پر ترس تو سب کو آتا تھا مگر پٹواری سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنی جوانی پر سانپ بن کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک بھلے آدمی نے حسن دین کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا لالچ دے کر تا جو سے عقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تو تا جو نے اس کی سات پشتوں کو تُوم ڈالا اور حسن دین کلھاڑی لے کر اس خدا ترس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ حسن دین چند برس آوارہ پھرتا رہا۔ پھر جب اس کے عشق کرنے کا زمانہ آیا تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے بعد مائی تا جو کے چند برس اچھے گزرے۔ حسن دین حوالداری تک پہنچا۔ اس کے رشتے کی بھی بات ہوئی مگر پھر دوسری جنگ چھڑ گئی اور حسن دین اُدھر بن غازی

میں مارا گیا۔ تب مائی تاجو نے چکی پیسنی شروع کی اور اس وقت تک پیستی رہی جب وہ ایک دن چکی کے پاٹ پر سر رکھے بے ہوش پائی گئی۔ اس روز جب وہ ہوش میں آئی تھی تو حکیم کے ہاتھ کو چکی کی ہتھی سمجھ کر گھما دیا تھا۔

اگر اس کے پڑوس میں چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں نہ ہوتی تو وہ اپنی بار بار کی بے ہوشیوں میں سے کسی بے ہوشی کے دوران کوچ کر جاتی۔ وہ راحتاں سے کہا کرتی تھی کہ ”بیٹی اگر میرا حسن دین ہوتا تو میں تجھے تیری شادی پر سونے کا ست لڑا ہار دیتی۔ اسے خدا نے اپنے پاس بلا لیا۔ سو اب میں ہر وقت تیرے لیے دعا کرتی ہوں کہ تو جگ جگ جیے اور شادی کے بعد اسی طرح سکھی رہے جیسی اپنے باپ کے گھر سکھی ہے۔“

☆

اس رات مائی تاجو کو اس بات کا غصہ تھا کہ جب اندھیری شام تک راحتاں اس کی روزانہ کی روٹی نہ لائی تو وہ خود ہی لاٹھی ٹیکتی فتح دین کے گھر چلی گئی۔ فتح دین کی بیوی سے راحتاں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہے اور آدھی رات تک واپس آئے گی۔ پھر اس نے روٹی مانگی تو راحتاں کی ماں نے صرف اتنا کہا

”دیتی ہوں۔ پہلے گھر والے تو کھا لیں۔“

راحتاں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو فتح دین کے گھر والوں ہی میں شامل سمجھتی تھی۔ اس لیے ضبط نہ کر سکی۔ بولی ”تو بی بی، کیا میں بھکارن ہوں؟“

سونے کی بالیوں سے بھرے ہوئے کانوں والی کو بھی مائی تاجو کی سی مسکین عورت کے منہ سے یہ بات سن کر تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا ”نہیں مائی، بھکارن تو خیر نہیں ہو مگر محتاج تو ہو نا!“

اور مائی کو کپکپی سی چھوٹ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ ایک دو بار راحتاں کی ماں نے اسے پکارا بھی مگر اس کے کانوں میں تو شاں شاں ہو رہی تھی۔ گھر آ کر آنگن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر گر پڑی اور روتی رہی اور اپنی موت کو یوں پکارتی رہی جیسے وہ دیوار سے اُدھر بیٹھی ہوئی اس کی باتیں سن رہی ہے۔

آدھی رات کو جب چاند زرد پڑ گیا تھا تو دیوار سے راحتاں نے اُسے پکارا۔

”مائی جاگ رہی ہو؟“

”میں سوتی کب ہوں بیٹی۔“ اس نے کہا۔

”اِدھر آ کر روٹی لے لو دیوار پر سے۔“ راحتاں بولی۔

”نہیں بیٹی! اب نہیں لوں گی۔“ مائی کی آواز بھرانے لگی۔ ”آدمی زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے نا۔ تو میں کب تک زندہ رہوں گی، جب کہ میں جدھر جاتی ہوں میری قبر میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں کیوں تمھارا

اناج ضائع کروں بیٹی۔"

راحتاں دیوار کے پاس کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر پنجوں کے بل ہو کر بڑی منت سے کہا "لے لو مائی، میری خاطر اسے لے لو۔"

"نہیں بیٹی۔" مائی اب گُھل کر رو رہی تھی۔ "لے لیتی پر آج تمھاری ماں نے مجھے بتایا کہ میں محتاج ہوں اور چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں میں جو گٹھے پڑ گئے ہیں وہ مجھے کچھ اور بتاتے ہیں۔ سو بیٹی! یہ روٹی میں نہیں لوں گی۔ اب کبھی نہیں لوں گی۔ تمھاری لائی ہوئی کل شام والی روٹی میری آخری روٹی تھی۔ یہ روٹی اپنے کتے کے آگے ڈال دو۔"

اس کے بعد اس نے سنا کہ راحتاں اور اس کی ماں کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ پھر راحتاں رونے لگی اور ماں اسے ڈانٹنے لگی۔ اس کے بعد فتح دین کی آواز آئی۔

"سونے دو گی یا میں چوپال پر جا کر پڑ رہوں؟"

پھر جب سب خاموش ہو گئے تو مائی تاجو اُٹھ بیٹھی۔ اسے لگا کہ راحتاں اپنے بستر پر پڑی آنسو بہا رہی ہے۔ وہ دیوار تک گئی بھی مگر پھر فتح دین کے ڈر سے پلٹ آئی۔ گھڑے میں سے پانی پیا اور دیر تک ایلومینیم کا کٹورا اپنے چہرے پر پھیرتی رہی۔ آج وہ کتنی تپ رہی تھی اور یہ پیالہ کتنا ٹھنڈا تھا۔ اب گرمیاں ختم سمجھو۔ اسے اپنے لحاف کا خیال آیا جس کی رُوئی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ اب کے اسے دُھنواؤں گی۔ پر اللہ کرے دُھنوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اللہ کرے اب کے لحاف کی بجائے میں اپنا کفن اوڑھوں۔

وہ گھڑے کے پاس سے اُٹھ کر چارپائی پر آ گئی۔ کچھ دیر تک پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر اسے ایک لمبی سانس سنائی دی۔ یہ راحتاں کی سانس ہوگی۔۔۔۔ ہائے خدا کرے وہ سدا سُکھی رہے۔ ایسی پیاری بچی اس نک چڑھی کے ہاں کیسے پیدا ہو گئی! اسے تو میرے ہاں پیدا ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔ اسے اپنا حسن دین یاد آ گیا اور وہ رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر لیٹی تو آسمان پر سے ستارے جیسے نیچے لٹک آئے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنے لگے۔ فتح دین کا کتا غرا کر ایک بلی پر جھپٹا اور بلی دیوار پر سے پھاند کر اس کے سامنے سے گولی کی طرح نکل گئی۔ کسی گھر میں مرغے نے بانگ دی اور پھر بانگوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔

یکا یک سب مرغے ایک دم یوں خاموش ہو گئے جیسے ان کے گلے ایک ساتھ گھونٹ دیے گئے ہیں۔ پورے گاؤں کے کتے بھونکنے لگے۔ پھر مشرق کی طرف سے ایسی آوازیں آئیں جیسے قریب قریب ہر رات آتی تھیں۔ بارڈر پر رینجر سمگلروں کے تعاقب میں ہوں گے۔ پھر اس پر غنودگی سی چھانے لگی اور اس نے آنکھیں

بند کر لیں۔ پھر ایک دم کھول دیں۔۔۔۔۔ بڑی آئی وہاں سے مجھے محتاج کہنے والی۔ چکی پیتے پیتے ہاتھوں کی جلد ہڈی بن گئی ہے، اور مجھے محتاج کہتی ہے! قیامت کے دن شور مچاؤں گی کہ اسے پکڑو، اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے۔۔۔۔ مگر وہاں کہیں یہ میری راحتاں بیچ میں نہ بول پڑے!

اُٹھ کر اس نے پانی پیا اور واپس جا کر چارپائی پر پڑ رہی۔ پھر جب پو پھٹی تو اس کا حلق اس کے جوتے کے چمڑے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ پھر پانی پینے کے لیے اٹھی مگر دوسرے ہی قدم پر چکرا کر گر پڑی۔ سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو گئی۔

☆

جب مائی تاجو ہوش میں آئی تو اسے پہلا احساس یہ ہوا کہ نماز قضا ہو گئی ہے۔ پھر ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دیوار کی طرف بھاگی۔ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور عورتیں چیخ رہی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے اور دھوپ میں جیسے سوراخ ہو گئے تھے جن میں سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ دُور سے گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں اور گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

"راحتاں!۔۔۔۔۔ اے بیٹی راحتاں!!" وہ دیوار کے پاس سے پکاری۔

راحتاں اندر کوٹھے سے نکلی۔ اس کا سنہرا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کی آواز میں چیخیں اور آنسو اور کپکپی اور نہ جانے کیا کچھ تھا "جلدی سے نکل جاؤ مائی! گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ لاہور کی طرف بھاگو۔ ہم بھی لاہور جا رہے ہیں، تم بھی لاہور چلو۔ ہندوستان کی فوج آ گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر اندر بھاگ گئی۔

ہندوستان کی فوج آ گئی ہے! یہاں ہمارے گاؤں میں کیوں آ گئی ہے۔ بارڈر تو تین میل اُدھر ہے۔۔۔!

"یہ فوج یہاں کیوں آئی ہے۔ بیٹی؟" مائی حیران ہو کر پکاری "کہیں غلطی سے تو نہیں آ گئی! بھائی فتح دین کہاں ہے؟ اُسے بھیجو نا، وہ انھیں سمجھائے کہ یہ پاکستان ہے۔"

مگر راحتاں کا کوئی جواب نہ آیا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف کوئی گھر جلنے بھی لگا تھا۔ چند گولیاں اس کے کوٹھے کے دروازے کے اوپر والے حصے میں تڑاخ تڑاخ سے لگیں اور مٹی کی لپائی کے بڑے بڑے ٹکڑے زمین پر آ رہے۔ چند گولیاں ہوا کو چیر دینے والی سیٹیاں بجاتی چھت پر سے گزر گئیں۔ فتح دین کے صحن کی نالی پر سے پاگلوں کی طرح اڑتا ہوا ایک کوا اچانک ہوا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا آیا اور مائی تاجو کے گھڑے کے پاس

پتھر کی طرح گر پڑا۔

پھر زور کا ایک دھماکا ہوا اور مائی جو دیوار سے ہٹ آئی تھی، پھر دیوار کی طرف بڑھی۔ ایک دم چودھری فتح دین کے دروازے کو کسی نے توڑ ڈالا۔ پھر کواڑ دھڑام سے گرے۔ اکٹھی بہت سی گولیاں چلیں اور اکٹھی بہت سی چیخیں بلند ہوئیں۔ مائی نے ان میں سے راحتاں کی چیخ کو صاف پہچان لیا۔ ''راحتاں بیٹی!'' وہ چلائی۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی لپکی اور اپنے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔

گلی میں شہاب دین، نور اللہ، محمد بشیر، حیدر خاں اور جانے کس کس کی لاشیں پڑی تھیں۔ چودھری فتح دین کے گرے ہوئے دروازے کے پاس مولوی عبدالمجید مردہ پڑے تھے۔ ان کا آدھا چہرہ اُڑ گیا تھا۔ مائی نے مولوی صاحب کو ان کی نورانی داڑھی سے پہچانا۔

چودھری فتح دین کے صحن میں خود فتح دین اور اس کے بیٹے مرے پڑے تھے۔ فتح دین کی بیوی کے بالیوں بھرے کان غائب تھے۔ اندر کوٹھوں میں اتھا پتھل مچی ہوئی تھی اور باہر راحتاں فوجیوں میں گھری، خوف سے اپنی عمر سے چودہ پندرہ سال چھوٹے بچوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا تو کرتا پھٹ گیا اور وہ ننگی ہو گئی۔ فوراً ہی وہ گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی مگر پھر ایک سپاہی نے اس کے کرتے کا باقی حصہ بھی نوچ لیا اور قہقہے لگاتا ہوا اس سے اپنے جوتے پونچھنے لگا۔ پھر مائی تاجو آئی، راحتاں پر گر پڑی اور ایک عجیب سی آواز میں، جو اس کی اپنی نہ تھی، بولی ''اللہ تیرا پردہ رکھے بیٹی، اللہ تیری حیا قائم رکھے۔''

ایک سپاہی نے مائی کا سفید چونڈا پکڑ کر اسے راحتاں پر سے کھینچنا چاہا تو خون سے اس کا ہاتھ بھیگ گیا اور مائی، وہیں راحتاں کو ڈھانپے ہوئے بولی ''یہ لڑکی تم میں سے کسی کی بہن بیٹی ہوتی تو کیا تم جب بھی اس کے ساتھ یہی کرتے؟ یہ لڑکی تو ۔۔۔۔۔''

کسی نے یہ کہہ کر مائی تاجو کی پسلیوں میں زور کی ٹھوکر ماری کہ ''ہٹو یہاں سے، ہمیں دیر ہو رہی ہے اور ابھی دوپہر تک ہمیں لاہور پہنچنا ہے۔'' اور مائی یوں ایک طرف لڑھک گئی جیسے چیتھڑوں سے بنی ہوئی گڑیا تھی۔ پھر سب کے ہاتھ راحتاں کی طرف بڑھے جو اب چیخ نہیں رہی تھی۔ اب وہ ننگی کھڑی تھی اور یوں کھڑی تھی جیسے کپڑے پہنے کھڑی ہے۔ اس کا رنگ مائی تاجو کے کفن کے لٹھے کا سا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ان میں پتلیاں کبھی تھیں ہی نہیں۔

☆

مائی تا جو ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پاس وارث علی مؤذن کھڑا ہے۔ پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا، لاشوں کے چہرے ڈھپے ہوئے تھے۔ ”راحتاں کہاں ہے؟“ وہ یوں چیخ کر بولی جیسے اس کے جسم کی دھجیاں اُڑ گئی ہیں۔ وارث علی سر جھکائے ایک طرف جانے لگا ”میری راحتاں کہاں ہے؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وارث علی کی طرف یوں قدم اٹھایا جیسے اسے قتل کرنے چلی ہے۔ ”کہاں ہے وہ؟“

وارث علی کے پاس آ کر وہ جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔ وارث علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور اس کے بازو پر سے اُس کا گوشت ایک طرف کٹ کر لٹک رہا تھا۔ وہ بولا تو مائی تا جو نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ بھی کٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ میں بھی خون ہے۔

”کسی کو کچھ پتا نہیں مائی کہ کون کہاں گیا۔ بس اب تُو یہاں سے چلی جا۔ ہندوستانی فوج یہاں سے آگے نکل گئی ہے اور گاؤں کے گرد ان کے آدمی گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ تو کماد کے کھیتوں میں چھپتی چھپتی لاہور کی طرف جا سکتی ہے تو چلی جا۔ وہاں مرے گی تو کوئی تیرا جنازہ تو پڑھے گا۔ اب جا مجھے کام کرنے دے۔“

”دیکھ بیٹا!“ مائی بولی ”میں پانی لاتی ہوں، تو ذرا کلّی کر لے۔ تو مؤذن ہے اور منہ میں اتنا بہت سا خون لیے کھڑا ہے! خون تو حرام ہوتا ہے بیٹا۔“

”میں سب کر لوں گا۔“ وارث علی چلّایا مگر پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولا ”خدا کے لیے مائی، اب چلی جا یہاں سے۔ میں نے اتنے بہت سے لوگ مرتے دیکھے ہیں کہ اب تُو مرے گی تو میں سمجھوں گا پوری دنیا مر گئی۔ چلی جا خدا کے لیے۔“

”پہلے بتا میری راحتاں بیٹی کدھر گئی؟“ مائی نے ضد کی۔

وارث علی نے پوچھا ”تجھے یاد ہے نا اسے ننگا کر دیا گیا تھا؟“

”ہاں!“ مائی نے سر ہلایا۔ اور اس کی ایک خون آلود لٹ رسی کی طرح اس کے منہ پر لٹک آئی۔

”تو پھر تُو یہ کیوں پوچھتی ہے کہ وہ کدھر گئی۔“

اور مائی نے اپنے سینے پر اس زور کا دوہتڑ مارا جیسے چودھری فتح دین کی حویلی کا دروازہ ٹوٹا ہے۔ وہ دھپ سے بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

وارث علی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کسی نے سُن لیا تو آ جائے گا۔“ وہ بولا۔ پھر اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر اٹھایا۔ ”تُو میری حالت دیکھ رہی ہے مائی۔ میں صرف اپنے خدا کی قدرت اور اپنے ایمان کی

طاقت سے زندہ ہوں ورنہ میرے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں گلیوں میں سے لاشیں گھسیٹ کر ایک گڑھے میں جمع کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے فتح دین اور لال دین اور نورالدین اور ماسی جنت کی لاشیں وہاں پہنچانی ہیں۔ پھر میں ان پر مٹی ڈال کر ان کا جنازہ پڑھوں گا اور مر جاؤں گا۔ مائی بے جنازہ نہ مر۔ لاہور چلی جا۔۔۔۔۔ ہندوستانی فوج اُدھر سے آ گئی ہے۔ تو اِدھر کھیتوں میں چھپتی چھپاتی نکل جا میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیکھ لو میرے تو جوتے بھی خون سے بھر گئے ہیں۔''

ٹوٹے ہوئے دروازے پر سے گزرتے ہوئے وہ رک گئی۔ ''وارث بیٹا!'' وہ بولی۔ ''لاہور تُو چلا جا، جنازہ میں پڑھ دوں گی۔ میں بچ گئی تو یونہی کسی کو روز ایک روٹی حرام کرنی پڑے گی۔ تُو مر گیا تو تیرے ساتھ اذان بھی مر جائے گی۔''

''نہیں مائی۔'' وارث علی جلدی سے بولا۔ ''اذان بھی کبھی مری ہے۔ خدا کے لیے اب تُو چلی جا۔''

گلی میں قدم رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر پوچھا ''تیرا کیا خیال ہے بیٹا! راحتاں کو انھوں نے مار تو نہیں ڈالا ہوگا؟''

وارث علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی اور چودھری فتح دین کی لاش پر جُھک گیا۔

مائی تاجو گلی میں سے گزر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھام رکھی تھی۔ دوسرا ہاتھ پیٹھ پر تھا اور وہ یوں جُھکی ہوئی چل رہی تھی جیسے بُھوسے کے ڈھیر میں سے سُوئی ڈھونڈنے نکلی ہے۔

مائی تاجو گاؤں کی آخری گلی میں سے نکل کر کھیت میں قدم رکھنے لگی تھی کہ جیسے ہر طرف سے گولیاں چلنے لگیں اور وہ ایک کھالے میں لڑھک کر لیٹ گئی۔ ہائے کہیں وہ وارث علی کو نہ مار رہے ہوں! مگر کیا ایک آدمی کو مارنے کے لیے اتنی بہت سی گولیوں کی ضرورت ہوتی ہے! کھالے میں سے اس نے کھیت کے کئی گنے گولیوں کی زد میں آ کر ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔ اس نے یہ تک دیکھا کہ جہاں سے گنا ٹوٹتا ہے وہاں سے رس کی ایک دھار نکل کر جڑ کی طرف بہنے لگتی ہے۔۔۔۔۔ اور اسے راحتاں یاد آ گئی اور وہ کھالے میں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک گولا اس کے سر کے پاس سے گزر کر پیچھے ایک درخت کے تنے میں جا لگا اور پورا درخت جیسے جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ پھر کھالے میں لیٹ گئی اور اُسے ایسا لگا کہ وہ مر گئی ہے اور قبر میں پڑی ہے۔ تب اسے اپنا کفن یاد آیا اور وہ اتنی تیزی سے کھالے میں سے نکل کر گلی میں داخل ہوئی جیسے اس کے اندر کوئی مشین چلنے لگی ہے۔ اسے پہلی بار یاد آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ لاہور جا رہی تھی۔ وہ تو اپنی کمائی گھر ہی میں بھول آئی تھی۔ اس کا کفن تو وہیں بکسے میں رکھا رہ گیا تھا۔ زندگی سے اتنی محبت بھی کیا کہ انسان اُسے بچانے کے لیے بھاگے تو اپنا کفن ہی

بُھول جائے اور یہ کفن اس نے کتنی مشقت سے تیار کیا تھا اور اس پر کتنے چاؤ سے کلمہ شہادت لکھوایا تھا، خاکِ پاک سے۔ اچھے کفن اور اچھے جنازے ہی کے لیے تو وہ اب تک زندہ تھی۔

اب وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ جوانی میں بھی یوں نہیں چلی ہوگی۔ اس کے قد کا خم بھی ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا اور لاٹھی کو ٹیکنے کی بجائے اسے تلوار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ راحتاں کے گھر کے سامنے سے بھی وہ آگے نکلی چلی گئی، مگر پھر جیسے اس کے قدم جکڑے گئے۔ پلٹی، ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے جھانکا۔ وارث علی سب لاشیں سمیت لے گیا تھا۔ صرف راحتاں کے کرتے کی ایک دھجی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پورے صحن میں یہاں سے وہاں ایک بے چین روح کی طرح بھٹکتی پھرتی تھی۔

مائی تاجو کا جی چاہا کہ دوہتڑ مار کا اپنا سینہ ادھیڑ دے مگر ساتھ ہی اسے وارث علی یاد آ گیا جس نے کہا تھا۔۔۔۔۔ فوراً اسے اپنا کفن یاد آیا۔ اس کے کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا۔ گھڑے کے پاس کوا اسی طرح پڑا تھا۔ اس کا کھٹولا اُسی طرح بچھا تھا۔ اندر اس کا بکسا کھلا پڑا تھا مگر اس میں کفن موجود تھا۔ کیسی منہ کی کھائی ہوگی انھوں نے، جب بکسا کھولا ہوگا اور اس میں سے صرف کفن نکلا ہوگا!

مائی کفن کو سر کی چادر میں چھپا کر باہر آئی تو چوہدری فتح دین کا کتا بھاگتا ہوا آیا اور اُس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکتا ورنہ خوب ہنستا۔

''چل ہٹ۔'' مائی نے اسے ڈانٹا۔ ''میرے نمازی کپڑے پلید نہ کر۔''

کتا اٹھ کھڑا ہوا۔

مائی نے دوسری گلی میں مڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو کتا وہیں کھڑا تھا اور اس طرح کھڑا تھا جیسے لکڑی کا بن کر رہ گیا ہے۔ ''چچ چچ'' مائی نے کتے کو اپنی طرف بلانا چاہا مگر وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دیوار کے سائے میں ایک دم یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہے۔ ''ہائے بے چارہ۔'' مائی کا احساسِ جرم پکارا۔

مگر پھر اوپر فضا میں اس زور کے دو دھماکے ہوئے کہ مائی تاجو کو زمین اپنے قدموں تلے ٹکڑے ٹکڑے ہوتی محسوس ہوئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہ پھر سے کھالے میں جا گری۔ اب زمین ہل رہی تھی۔ فضا میں جیسے بہت سے شیر ایک ساتھ دہاڑے جا رہے تھے اور دھماکوں اور گولیوں اور گڑگڑاہٹوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ اب وہ کفن کو اپنے سینے سے چمٹائے کھالے میں رینگنے لگی۔ برسوں پہلے چراغوں کا میلہ دیکھنے کے لیے وہ گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ اسی کھالے کے کنارے کنارے چلتی ہوئی لاہور چھاؤنی میں جا نکلی تھی۔ اور وہاں کیسا غضب ہوا تھا۔ بے چاری شہابی ایک تانگے کے پہیے تلے آ کر وہیں شالامار کے دروازے پر ہی مر گئی

تھی۔۔۔۔۔تو کیا راحتاں مر گئی ہوگی؟ کیا راحتاں مرنے کے لائق تھی؟ لا بیٹی! میں تیرے ہاتھ کی روٹی واپس نہیں کروں گی۔ روٹھ مت مجھ سے راحتاں۔۔۔اے راحتاں بیٹی!"

اس نے سنا کہ وہ اونچی اونچی بول رہی ہے۔۔۔۔مگر اتنے شور میں اس کی آواز کون سنے گا۔۔۔۔۔

"راحتاں!۔۔۔۔۔اے میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں!"

ہائے یہ کپاس بھی عجیب پودا ہے۔ اس کے پھول کا رنگ کیسا الگ ہوتا ہے دوسرے پھولوں سے۔۔۔۔۔"راحتاں! اے راحتاں بیٹی!"

کھالے سے کپاس کے کھیت میں اور وہاں سے وہ گنّے کے کھیت میں گُھس گئی۔ دھماکے اتنے تیز ہو رہے تھے جیسے اس کے اندر ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں گولا لگے تو انسان گولے کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کون چُنتا پھرے گا میری ہڈیاں اور پھر میرا کفن جس پر خاکِ پاک سے کلمۂ شہادت لکھا ہے۔

کتنا گھنا ہے گنّے کا یہ کھیت! یہ چودھری فتح دین کا کھیت ہے۔ راحتاں اسی کھیت کے گنّے چوس چوس کر کہتی تھی کہ مائی مجھے بڑھاپے سے صرف اس لیے ڈر لگتا ہے کہ منہ پوپلا ہو جاتا ہے اور گنّا نہیں چُوسا جا سکتا۔

مائی تاجو مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔۔"راحتاں بیٹی!۔۔۔۔۔اے میری راحتاں بیٹی!"

☆

"مائی!" آواز جیسے پاتال سے آئی تھی۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ چاہے زمین اور آسمان بج رہے ہوں مگر اس کے کان بجنے سے باز نہیں آتے۔

"مائی!"

ہائے یہ آواز تو جیسے میری پسلی سے آئی ہے۔

وہ کفن کو سینے سے چمٹا کر دبک گئی۔ اس کی انگلیوں نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کے سینے سے نکل کر کفن میں آ گیا اور یوں دھڑک رہا ہے جیسے توپیں چل رہی ہیں۔

"مائی!" اس کے سر پر کوئی بولا۔

مائی ہڑبڑائی اور اوپر دیکھا۔

پھر وہ دیکھتی رہ گئی۔ کفن اس کی گرفت سے نکل کر گر گیا اور وہ دیکھتی چلی گئی۔

"مائی!" راحتاں کہہ رہی تھی "تم تو میری طرف بس دیکھے ہی جا رہی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو میں ننگی ہوں۔ مجھے کچھ دو۔"

مائی نے زور زور سے ہنستے ہوئے اور زور زور سے روتے ہوئے راحتاں کو یوں اپنی گود میں کھینچ لیا جیسے ننھے سے حسن دین کو دودھ پلانے چلی ہے۔

اب دھماکے جیسے کھیتوں کی چاروں مینڈوں پر ہو رہے تھے، مگر مائی ان سے بے نیاز راحتاں کا ماتھا چومے جا رہی تھی۔ "ہائے مجھے یہ اپنا کفن کیسا فالتو سا لگنے لگا ہے۔"

"کفن؟" راحتاں تڑپ کر مائی کی گود میں سے نکلی۔ کفن اٹھا کر اسے جلدی سے کھولا اور اپنے جسم پر لپیٹ کر یوں مسکرائی جیسے وہ دیوار پر سے مائی کو روٹی تھمانے آئی ہے۔

اور مائی نے دیکھا کہ راحتاں اس کے کفن میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔

"ہائے میری بیٹی! اللہ تیرا پردہ رکھے۔ اللہ تیری حیا قائم رکھے میری بیٹی۔"

پھر راحتاں نے مائی کو بتایا کہ جب وہ اُسے لے جا رہے تھے تو اوپر سے پاکستان کے ہوائی جہاز آئے اور وہ لوگ ادھر ادھر کھالوں اور گڑھوں میں جا دبکے۔۔۔ "اور میں بھاگ آئی۔ مجھے پتا تھا کہ میرے وطن کے جہاز مجھے پہچانتے ہیں، وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ تب میں گاؤں پار کر کے یہاں آ گئی۔ اور جب سے یہیں بیٹھی ہوں۔ اور جب سے میں یہاں بیٹھی ہوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مائی مجھے پکار رہی ہے۔۔۔ راحتاں۔۔۔ اے راحتاں بیٹی!"

کفن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں ہونے لگے تھے۔ نوچی کھسوٹی ہوئی راحتاں کا جسم اپنا کرب کفن کو منتقل کر رہا تھا اور خاکِ پاک نے اس خون کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔

اور لاہور کے کہیں آس پاس مائی نے کہا "راحتاں بیٹی! تو کیسی سچی ہے! تو نے میرا شاندار جنازہ نکلنے کا وعدہ کیا تھا۔ تو نے یہ وعدہ سچ مچ پورا کیا۔ تو میرے کفن میں کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں!!"

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

لارنس آف تھلیبیا

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں پلش کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، کمر، پیٹھ، کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لیے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اُڑ جانے سے روکنے کے لیے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا تو بڑے ملک صاحب بولے:

''آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے۔ آج اس کا یار آیا ہے لاہور سے۔'' انھوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سُوجے ہوئے گالوں اور گھنے گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دُور اس لیے بیٹھا تھا کہ میرے لیے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا تھا۔ بشکو، خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا، چناں چہ یہی اس کا نام پڑ گیا تھا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے، زکام اور بخار کی شکایت تھی، اس لیے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ''ان کا بخار تیز رہتا تو آج تمھیں باز کے شکار کا تماشا نہ دکھا سکتا۔'' وہ بولا۔ ''لارنس آف عربیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھیلیبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کو تھلیبیا میں بدلنے پر تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ ہنسا۔ ''ابھی چائے کے بعد تم، میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیس ہے۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھلیبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مٹھی پر بٹھائے گا اور ــــــ''

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے۔ دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک کے سامنے جُھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مکّوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک صاحب ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے۔ ''بھری مجلس میں کہتا ہے، ملک جی تہہ بند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو۔۔۔۔ اس حرامزادے سے کوئی پُوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا، تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔''

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا ''آ گئی شامت بیچارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔''

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا ''خدا بخش! تمہیں شرم نہیں آتی، تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔''

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا'' کیا کریں یار۔۔۔۔ ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔''

اتنے میں بشکو چائے لے آیا۔ طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جُھک کر خدا بخش کے کان میں کہا ''یہ سکین ایسا لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک! پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟''

''اچھا تو یہ سکین ہے!'' خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ''اس کے تو منہ میں زبان ہی نہیں ۔۔۔۔۔ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!''

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لیے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

''اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔'' ملک صاحب کڑکے اور سکین منہ کے بل پتھر کی طرح گر پڑا۔ ''اٹھا لے جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے اس یار کو۔۔۔۔''

ملک صاحب پھر گرجے اور ایک ہجوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے، اسے اٹھانے کے لیے جُھکے تو جُھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی

تشویش سے بولا ''سکین تو اذان پڑھ رہا ہے۔''

پھر سکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لیے بولا: ''سورج تو بہت ڈھل گیا، پیشی کی نماز تو ہو چکی ہو گی؟''

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اُتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں مسجد کا مینار اتر آیا ہے۔

''آ جاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے۔'' بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ ''چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو۔۔۔۔ بھئی میں ننگا ہو رہا ہوں تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لیے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو''۔۔۔۔ ''ذرا سا رک کر انھوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا'' کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟'' جواب کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور بولے۔۔۔۔ ''لو بھئی اسے دبا دو۔ دُکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر۔''

''یہ حرام زادہ کون تھا'' میں نے آہستہ آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

''اس کا نام سکین ہے۔'' خدا بخش بولا۔ ''ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو ابا کے پلنگ پر بچھا ہے اسی نے بُنا ہے۔ بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے مگر بھولا بہت ہے۔ نہ جانے ابا کو ٹو کنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔''

بشکو فوراً بولا ''اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔۔۔۔ محمد مسکین۔ سکین سکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں جیسے مجھے بشکو بشکو کہتے ہیں۔''

میں نے کہا ''یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔''

''آہستہ بولو یار!'' خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا ''انھوں نے سن لیا تو شاید تمھیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آ جائے گی۔''

''نہیں۔۔۔۔ اب کیا آفت آئے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دُکھ رہا ہے۔''

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا۔ اس نے جیسے ملامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا ''اصطبل میں جا کر دیکھو بیگے نے گھوڑے تیار کر لیے ہیں یا نہیں۔ زینیں کس لی ہوں تو تم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔''

بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا۔ ''دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے ابا پر۔۔۔ اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے دردِ سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ابا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں۔۔۔ نہ کریں تو زمینداره کیسے چلے۔'' وہ رُک گیا پھر بولا ''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔''

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا ''لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟''

میں نے کہا ''میں سمجھا یہ پائے نہیں بل کہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک مسکین کھڑا ہے۔''

''گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر اُلٹا اثر ہوا ہے۔'' خدا بخش بولا۔ ''تم چکرا گئے ہو۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور خدا بخش! میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔۔۔۔''

''گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک'' بشکو ہمارے سروں کے اوپر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر لارنس آف تھلیبیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا دستانے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ خدا بخش نے سر اُٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

''کیوں کیسا ہے میرا باز؟'' خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا ''بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔''

خدا بخش ہنس پڑا مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لیے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ ''اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔'' میں نے شبہ ظاہر کیا مگر اس نے مجھے بتایا ''اس کے اندر کا گھوڑا مار دیا گیا ہے۔ اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے۔ اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی

ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سوابا نے اس کام کے لیے یہ گھوڑا چنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چناں چہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔“

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پُھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اُڑ جانا چاہتا تھا مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا، جس کی کنوتیاں تو اُٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔

بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حدِ نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے مگر یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور ننگی تھیں۔ ”لالیاں شام سے پہلے انہی اکا دُکا کیکروں پر آ کر بیٹھتی ہیں۔“ خدا بخش نے مجھے بتایا ”اور لالی باز کا من بھاتا کھاجا ہے۔ میرا لارنس لالی کو دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آف تھلیپیا کی وسکی ہے۔“

میں نے کہا ”خدا بخش! لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پیلی پیلی، کچی کچی باچھیں اس پر کیسا بچپنا سا طاری کیے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟

خدا بخش بولا ”اگر تمھیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا۔ تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکو دست بستہ سُنیں گے مگر ابھی ذرا رک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو، بشکو کی مُٹھی پر کیسے بار بار پھڑ پھڑا جاتا ہے۔ اس نے ویرانے کی بُو سونگھ لی ہے۔“

”لالی“ بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چناں چہ وہ بھی رک گیا۔ خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپا اتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشا دیکھنے کی تلقین کی۔ ”یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بُھولنے والا تجربہ ہوگا۔“ اس نے کہا ”مزہ آ جائے گا۔ جب

باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے۔۔۔۔ دیکھو۔‘‘

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دور ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر جیسے وحشت طاری ہو گئی۔ ’’اس نے دیکھ لیا لالی کو۔‘‘ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کو کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اُڑ گئی مگر باز نے آن کی آن میں اسے جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا۔ تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مُڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی۔ پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔ ’’اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو، ہڈی پر سے گوشت کیسا تارتا ہے۔ انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے۔ تازہ اور وٹامن سے بھرپور۔‘‘

’’لعنت!‘‘ میں نے کہا ’’تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔‘‘

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا ’’لارنس آف تھلیبیا آؤٹ ہو گیا۔‘‘ پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رُک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا ’’کیوں بشکو یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارُو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں؟‘‘

بشکو بولا ’’بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں دیکھ ہی لیا ہو۔ ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔‘‘

’’ہاں ٹھیک ہے۔‘‘ خدا بخش میری طرف مڑا۔ ’’چلو تمہیں تھل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرہ ہے وہاں چلتے ہیں تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔‘‘

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا اس سے میری طبیعت ٹھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا ’’جہاں چاہو چلے چلو۔‘‘

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا ’’بڑا لطف آئے گا۔

ایک بار میں اور بھلکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارُو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا۔ مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہی اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا یارُو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپ پھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اس کی ہنسی نہ رکی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔''

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اُتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے۔ نیچے ایک گائے اور چند بھیڑ بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں کیوں کہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سائے سے بہت دور ہو چکے تھے۔ ان بھیڑوں بکریوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اون بٹ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر ابال رہی ہو۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انھیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگاں بولی ''ہائے مجھے تو بہت چنتا لگ رہی ہے۔ رنگی کو اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔''

''آ جائے گی۔'' بابا یارو بولا ''کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے۔ جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے تہہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا سا رہ گیا کہ تمہارے چھٹے کے چھلے میں آ گیا۔ سو روپے کا ہو گا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سے بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔''

خدا بخش نے آہستہ سے کہا ''میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھ لیا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔''

بھلکو بولا ''اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں، جوشاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔''

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رکنے، بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔

خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفل والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ ''تم تو جانتے ہو بابا یارو میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا دیں گے۔ ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا۔ سوچا تمہیں دیکھتے چلیں۔ ٹھیک ہو نا؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ اچھا اب تم بیٹھو، ہم چلے۔'' رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخش بولا۔ ''رنگی کی فکر نہ کرو اگر اسے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے روک لے گی ۔۔۔ اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔''

بابا یارو بولا ''آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اُگی ہوئی بہت سی چُونگلیں ملی ہیں۔ اس کی سہیلی کو چُونگلیں بہت پسند ہیں اس لیے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر پہنے اور دوپہر کو چُونگوں کی پوٹلی باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں اگر راستے میں شام پڑ گئی تو ۔۔۔ ویرانہ ہے ڈر لگتا ہے۔''

خدا بخش نے تسلی دی۔ ''ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے ۔۔۔ تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔''

☆

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب **معلومات** سے مجھے لاد ڈالا۔ میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خاں خٹک اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے بادشاہوں کے سکوں، تلواروں کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک ہی شاہی پرندہ ہے۔ آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی ''تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو!''

''غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر یکا یک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آئی ۔۔۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے ۔۔۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کے تہ بند، کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے پر

ٹھوڑی ٹیکے جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس پڑا تھا۔ اگر ایک بے رنگ چپلی سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لیے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حُسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

"دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں۔۔۔۔؟"

"چل واپس۔۔۔۔" خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔ "جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ چاند کی رات بھی نہیں ہے۔ اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت۔ چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟۔۔۔۔ چل رنگی۔"

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انھوں نے اس کے حُسن میں جیسے ایک چھناکا سا پیدا کر دیا۔

"بابا بے چارہ۔۔۔۔"

"ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔۔۔۔" خدا بخش فوراً بولا۔ "ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان! زمانہ بڑا خراب ہے۔ چل۔"

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ "تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ اِنسانوں کی نہیں ہوتیں؟"

"ارے چپکے رہو" اس نے آہستہ سے کہا "ورنہ بابا پکڑ کر سکین بنا ڈالیں گے۔"

بڑے ملک اُٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھلیبیا کی تعریف کرتا رہا۔۔۔ ایک بار شکو نے آ کر اس سے کوئی بات کی اور وہ رکا تو سننے والوں کو داد و تحسین کا موقع ملا ''بابا رحمٰن کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اُس نے اِس بلا کا باز نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ببر ہے۔''

☆

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا اور شکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لیے مُرغے تک سو گئے تھے۔ صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈ و۔۔۔ میں نے رنگی کے اس پیکر کو، جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا، ہر زاویے سے جانچا اور تب میں نے کہا۔۔۔ ''ہاں رنگی! تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔''

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا تو میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔ ''قد قامت الصلوۃ، قد قامت الصلوۃ!'' صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب ٹِک کر نہ بیٹھ سکی تو اُڑ گئی۔ منہ اندھیرے یہ چیل کہاں سے آ گئی؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا۔ ''جہاں سے یہ چڑیاں آئی ہیں۔''

سورج ابھی نہیں نکلا تھا جب شکو میرے لیے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو خدا بخش چوپال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔ اس نے کہا ''وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا۔''

''چلو۔۔۔'' میں نے کہا۔ پھر میں سیڑھیوں پر رُک گیا۔۔۔ ''سنو کیا رنگی چلی گئی؟'' دفعتاً خدا بخش کو اس

زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا۔ ‘‘آخر کار پتھر میں بھی جونک لگی تو۔’’ قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ پیٹ کر کہتا رہا۔۔۔ ‘‘برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو۔۔۔’’ پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ ‘‘یار! مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا تم اُلو کے الو ہی ہو۔۔۔’’ بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد وہ بولا ‘‘رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے؟ لسی پئے گی، پراٹھا کھائے گی۔ اس کی سہیلی اسے یونہی آسانی سے تھوڑی جانے دے گی۔ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سلاتی۔ ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔’’ پھر ذرا سا رُک کر بولا۔ ‘‘جانے لگی تو تمہیں دکھائیں گے، بل کہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے ہاں کیوں نہ پئیں؟’’

‘‘چھوٹے ملک!’’ بشکو چلّایا اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اُڑ گئیں۔

‘‘کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں؟’’ خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

‘‘جی وہ تو ٹھیک ہیں۔۔۔ پر۔۔۔’’ بشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، نتھنے پھُول رہے تھے اور منہ مسلسل کھُلا تھا۔

‘‘پر کیا؟۔۔۔ کچھ بکو’’ خدا بخش نے اسے ڈانٹا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی۔

‘‘کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس مرا پڑا ہے۔’’

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایک خاصے طویل وقفے کے بعد وہ بولا ‘‘رنگی کو یہاں لے آؤ۔’’

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا ‘‘رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟’’

‘‘ہے ایک مطلب۔’’ خدا بخش بولا۔ حادثہ شدید تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

فوراً بعد بشکو آیا۔ ‘‘رنگی منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک۔’’

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا ‘‘دیکھا؟ میں نہ کہتا تھا میرے باز کو اسی کمینی نے مارا ہے۔ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔۔۔ میں نے کہا ‘‘لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان۔۔۔’’ اُسی نے مارا ہے میرے لارنس کو۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ قتل اُسی بد ذات کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اُس کی۔۔۔’’

احمد ندیم قاسمی

نعتیں

(۱)

ہر ایک پھول نے مجھ کو جھلک دکھائی تری
ہوا جدھر سے بھی آئی، شمیم لائی تری
کبھی ہوا نہ مرا سامنا اندھیروں سے
جدھر بھی دیکھا، اُدھر روشنی ہی پائی تری
درونِ سینہ، مدینہ اُٹھائے پھرتا ہوں
کہ ایک پل بھی گوارا نہیں جدائی تری
مجھے تو اپنے کرم کی یہیں بشارت دے
کہ روزِ حشر نہ دیتا پھروں دُہائی تری
ندیمؔ کے سے کروڑوں کا ذکر کیا ہے کہ جب
بڑے بڑوں کو بھی تسلیم ہے بڑائی تری

☆☆

(۲)

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیراؐ
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیراؐ
تہ بہ تہ تیرگیاں ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیراؐ
کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے
چھلک اٹھتا ہے مری روح میں مینا تیرا
پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیراؐ ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیراؐ

دست گیری مری تنہائی کی توؔ نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیراً
لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترےؔ پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں، جہاں بھر پہ ہے سایا تیراً
تو بشر بھی ہے مگر فخرِ بشر بھی تو ہے
مجھ کو تو یاد ہے بس اتنا سراپا تیراً
میں تجھے عالمِ اشیا میں بھی پا لیتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالمِ بالا تیراً
مری آنکھوں سے جو ڈھونڈیں، تجھے ہر سو دیکھیں
صرف خلوت میں جو کرتے ہیں نظارا تیراً
وہ اندھیروں سے بھی درانہ گزر جاتے ہیں
جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیراً
ندیاں بن کے پہاڑوں میں تو سب گھومتے ہیں
ریگزاروں میں بھی بہتا رہا دریا تیراً
شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیراً
اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیراً
تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا، ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیراً
ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیراً

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

غزلیں

(۱)

ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئنہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں، یادوں کے خزانے میرے
زندہ رہنے کی ہو نیت تو شکایت کیسی
میرے لب پہ جو گِلے ہیں، وہ بہانے میرے
رخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف مَیں نے کبھی احکام نہ مانے میرے
میرے ہر درد کو اس نے ابدیت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھ کو، خدا نے میرے
میری آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا
اور ماضی کا ہیولیٰ ہے سرہانے میرے
تُو نے احسان کیا تھا، تو جتایا کیوں تھا
اس قدر بوجھ کے لائق نہیں شانے میرے
راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے
جو بھی چہرہ نظر آیا، تیرا چہرہ نکلا
تُو بصارت ہے مری، یار پرانے میرے!
سوچتا ہوں، مری مٹی کہاں اُڑتی ہوگی
اِک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے
صرف اک حسرتِ اظہار کے پرتو ہیں ندیمؔ
میری غزلیں ہوں کہ نظمیں کہ فسانے میرے

☆☆

(۲)

نہ سہی اور کہیں گھر میرا
دشت میرا ہے، سمندر میرا
اپنے کشکول میں اک پھول لیے
میرا ہمزاد ہے رہبر میرا
یہ زمیں ہے کہ فقط عکسِ زمیں
میرا سایہ ہے کہ پیکر میرا
یا تو چہرے ہی بدل کر بگڑے
یا ہے آئینہ مکدّر میرا
کٹ کے بھی، گر کے بھی، نیزے پہ بھی
میری گردن پہ رہا سر میرا
روز پرکھا ہے خُدا کو مَیں نے
روز برپا ہُوا محشر میرا
اپنے ماضی کے پرستاروں میں
رایگاں جائے گا جوہر میرا
اے مرے ذہن کے کھلتے ہوئے در
دل ہُوا جاتا ہے کافر میرا
جرأتِ فکر کی بحثوں میں ندیم
نام لیتے ہیں سخن ور میرا

☆☆

(۳)

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے، تو جھونکا ہَوا کا تھا
اس حُسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا
دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں!
تُو سامنے تھا، اور تصور خدا کا تھا
چھپ چھپ کے روؤں، اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا
اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پُجاری بقا کا تھا
ٹُوٹا تو کتنے آئنہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہُوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

☆☆

(۴)

احساس میں پھول کھل رہے ہیں
پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں
کچھ ایسی شدید تیرگی ہے
آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں
دیکھیں، تو ہُوا جمی ہوئی ہے
سوچیں، تو درخت جھومتے ہیں
سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دُکھ سہے ہیں
وہ غم تو ہمیں ہیں جاں سے پیارے
جو غم ترے پیار نے دِیے ہیں
ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے
پھر تیرے حضور آ گئے ہیں
ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا
چہرے یہ نہیں ہیں، آئنے ہیں

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
سورج نے گھنے صنوبروں میں
جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں
یکساں ہیں فراق و وصل دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں
جو دن ترے پیار میں کٹے تھے
ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں
جب تیرا جمال ڈھونڈتے تھے
اب تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں
ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں
لو دل کی خبر بھی، چارہ سازو
دامن کے تو چاک سی لیے ہیں
ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات
پیاری، ترے بال کیوں کھلے ہیں

☆☆

(۵)

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حُسنِ یزداں سے تجھے حُسنِ بُتاں تک دیکھوں
تُو نے یوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
مَیں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں
فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
مَیں ترا حُسن، ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں، ترے غم کے دم سے
پھول کھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں
وقت نے ذہن میں دھندلا دیے ترے خدوخال
یوں تو مَیں ٹوٹتے تاروں کا دُھواں تک دیکھوں
دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
مَیں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں
اک حقیقت سہی فردوس میں حُوروں کا وجود
حُسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

☆☆

(۶)

گُل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گُل زاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں
مجھ سے کترا کے نکل جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں، ترے رخساروں میں
حُسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غُنچے کِھلتے ہیں تو بِک جاتے ہیں بازاروں میں
ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے، بعنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں
زخم چھپ سکتے ہیں، لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہ کاروں میں
منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اُٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں
مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
مَیں تو شامل ہوں محبت کے گنہ گاروں میں

☆☆

(۷)

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی
یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی
چاند جب دُور اُفق پہ ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی
دن شعاعوں سے اُلجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

☆☆

(۸)

مَیں کب سے گوش بہ آواز ہُوں، پکارو بھی
زمیں پہ یہ ستارے کبھی اُتارو بھی
مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی
سفینۂ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی
مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداش نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی
بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی
مری تلاش کی معراج ہو تمھی لیکن
نقاب اٹھاؤ، نشانِ سفر اُبھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیمؔ! تم اس بوجھ کو سہارو بھی

☆☆

(۹)

بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاوے تو ابروؤں میں تناؤ
گجر بجا ہے سہانا، مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قمر نہ دکھاؤ، بجھا چراغ جلاؤ
اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دُور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ
اُجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں، دوانے، اُتار ہو کہ چڑھاؤ
خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے، مری حسین خطاؤ
اِدھر شباب کا مس ہے، اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے، ندیمؔ دیکھتے جاؤ

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

نظمیں

٦ ستمبر

چاند اُس رات بھی نکلا تھا، مگر اُس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا، جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اُس رات بھی چمکے تھے، مگر اس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسمِ حسیں، قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اُس رات، مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش
پیڑ چیخ اُٹھتے تھے امواجِ ہوا کی زد میں
نوکِ شمشیر کی مانند تھی جھونکوں کی تراش

اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اُتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاک سپاہ
دودھ پیتے ہوئے، بچوں کو پرو لائی تھی
گھر کے آنگن میں رواں خون تھا گھر والوں کا
اور ہر کھیت پہ شعلوں کی گھٹا چھائی تھی
راستے بند تھے لاشوں سے پٹی گلیوں میں
بھیڑ سی بھیڑ تھی، تنہائی سی تنہائی تھی

تب کراں تا بہ کراں صبح کی آہٹ گونجی
آفتاب ایک دھماکے سے اُفق پر آیا
اب نہ وہ رات کی ہیبت تھی، نہ ظلمت کا وہ ظلم
پرچمِ نُور یہاں اور وہاں لہرایا
جتنی کرنیں بھی اندھیرے میں اتر کر اُبھریں
نوک پر رات کا دامانِ دریدہ پایا
میری تاریخ کا وہ باب منور ہے یہ دن
جس نے اس قوم کو خود اُس کا پتہ بتلایا

آخری بار اندھیرے کے پجاری سُن لیں
مَیں سحر ہوں، مَیں اجالا ہوں، حقیقت ہوں مَیں
مَیں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں مَیں
امن میں موجۂ نکہت مرا کردار سہی
جنگ کے دور میں غیرت ہوں، حمیّت ہوں مَیں
میرے دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں مَیں

☆☆☆☆

پتھر

ریت سے بت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر، مَیں تجھے پتھر لا دُوں

مَیں ترے سامنے انبار لگا دوں۔۔۔ لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا؟؟

سُرخ پتھر؟ جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیّر کے پڑے ہوں ڈورے؟

کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے

اک وہ پتھر ہے، جسے کہتے ہیں تہذیبِ سفید
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے

ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے، مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے

جتنے معیار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں

شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام، ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زباں پتھر ہے

ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار

☆☆☆☆

گجردم

گجردم کے لمحے تھے
جب بند کھڑکی کے شیشے پہ دستک ہوئی!
کون ہے؟---مَیں نے پوچھا
تو ایک اور دستک ہوئی!
نیند کچی تھی
آنکھوں میں خوابوں کا نم تھا
مَیں کروٹ بدلنے کو تھا
جب یہ دستک تسلسل سے ہونے لگی!
کون گستاخ ہے؟---مَیں نے پوچھا
پلٹ کر جو دیکھا
تو وہ پھول تھا موتیے کا
جو خوشبو کا تحفہ لیے
مسکراتا ہوا
ایک معصوم بچے کی مانند
کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کھڑا تھا!

☆☆☆☆

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

جہاں سے پھول ٹوٹا تھا--- وہیں سے
کلی سی ایک نمایاں ہو رہی ہے
جہاں بجلی گری تھی--- اب وہی شاخ
نئے پتے پہن کر تن گئی ہے

خزاں سے رُک سکا کب موسمِ گُل
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

کھنڈر سے کل جہاں بکھرے پڑے تھے
وہیں سے آج ایواں اُٹھ رہے ہیں
جہاں کل زندگی مبہوت سی تھی
وہیں پر آج نغمے گونجتے ہیں

یہ سناٹے سے لے کی سمت ہجرت
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبہَ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

نہیں یخ بستگی کا خوف--- جب تک
شعاعیں برف پر لرزاں رہیں گی
اندھیرے جم نہیں پائیں گے--- جب تک
چراغوں کی لویں رقصاں رہیں گی

بشر کی، اپنی ہی تقدیر سے جنگ
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبہَ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

☆☆☆☆

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ کس نے جھانکا
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے
کس نے پائل کے مدھر تال پہ دوہے گائے

سوئی سوئی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کو فن کار
مرمریں گالوں پہ مدھم سے شفق رنگ دیے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر، جیسے
سیپی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کمانوں سی بھوؤں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی
مسکراہٹ میں گجر دم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں
جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا
وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادیِ خواب میں وہ صرصرِ دنیائے شعور
جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آ جائے

دھجیاں بن کے اُڑا رات کا پیراہنِ تار
تارے ٹکرائے خلاؤں میں، فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لیے صبح کی دیوی آئی

☆☆☆☆

فن

ایک رقاصہ تھی۔۔۔ کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا
ڈگمگائی، تو سب اطراف سے آواز آئی۔۔۔
”فن کے اس اوج پہ اک تیرے سوا کون گیا!“
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اٹھی، اٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا،
اوک اٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے۔۔۔
”رقص کا یہ بھی اک انداز ہے۔۔۔ اللہ! اللہ!“
ہاتھ پھیلے رہے، سِل سی گئی ہونٹوں سے زباں۔۔۔
ایک رقاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا،
پردہ سرکا، تو معاً فن کے پجاری گرجے۔۔۔
”رقص کیوں ختم ہوا؟ وقت ابھی باقی تھا!“

☆☆☆☆

انسان عظیم ہے!

اس نے تجھے عرش سے بُلایا
انسان عظیم ہے خُدایا!

تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا
تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر
پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خُدایا!

تُو نور ہی نُور بُن رہا تھا
وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم
لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایہ
انسان عظیم ہے خُدایا!

تُو سنگ ہے اور وہ شرر ہے
تُو آگ ہے اور وہ اُجالا
تُو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ
تُو دشت ہے، وہ چراغِ لالہ
اس نے ہی تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خُدایا!

تُو عینِ حیات ہے، مگر وہ
تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام
سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خُدایا!

تُو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حُسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تُو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خُدایا!

☆☆☆☆

مہاراج ادھیراج

(دُور اندیش مصاحبین کی درخواست)

مہاراج ادھیراج! خوابوں کی دنیا میں کب تک سنگھاسن اُڑاتے پھریں گے
حضور آپ کب تک گلستاں میں کانٹوں سے دامانِ زرّیں بچاتے پھریں گے
حضور آپ نیندوں میں سرشار ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے
حضور آپ شاید نہ مانیں مگر آدمیت مشیّت سے ٹکرا چکی ہے
حضور آپ نے خونِ انساں سے اپنے شبستاں کی تاریکیاں دُور کی تھیں
حضور آپ نے روٹیاں چھین لیں تھیں، حضور آپ نے عصمتیں چُور کی تھیں
حضور آج بھوکی رعایا نے ایوانِ مرمر پہ یلغار کر دی، سُنا ہے
حضور آپ کی خفتہ بختی نے اِک قوم کی قوم بیدار کر دی، سُنا ہے
حضور اب جھروکے سے پردہ اُٹھا کر غریبوں کی وحشت کا نظارہ کیجیے
ارادوں کی شدت کا اندازہ کیجیے، امنگوں کی عظمت کا نظارہ کیجیے
حضور آپ کیوں بوکھلانے لگے ہیں، مکافات پر جب مدارِ جہاں ہے
حضور آپ روپوش ہو جائیں، لیکن حضور آپ کے سر کی کلغی کہاں ہے

☆☆☆☆

آزادی کے بعد

کتنے خاکے مری امنگوں کے
پیچ کھاتے ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم
یک بیک اُڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتے
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں بوٹیوں سے تُلتی ہیں
عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے
اپنے بچپن کی رہگزاروں کو
جیسے معزول شہر یار تکے
اپنی عظمتوں کی یادگاروں کو

زندگی، عزمِ زندگی سے تہی
کارواں کے غبار میں گُم ہے
زاہدِ کُہنہ سال کی مانند
مقبروں کے شمار میں گُم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا
زندگی! زندگی! پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے، اپنے ہونٹوں سے
خُون کی پپڑیاں اُتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

☆☆☆☆

پیکر

جی نہیں، آپ نے بندے کو غلط سمجھا ہے!
حُسن توصیف کا محتاج نہیں، جانتا ہوں
شکر ہے، میرا تصور نہیں آوارہ مزاج
آج کیا، مَیں تو اسے دیر سے پہچانتا ہوں

آپ کے بال سیہ بھی ہیں، سنہرے بھی ہیں
اِک تجلّی ہے جو ظلمات پہ منڈ لاتی ہے
یہ حقیقت ہے، تو اخفائے حقیقت کیوں ہو؟
منہ سے حق بات بہرحال نکل جاتی ہے

آپ ماتھے سے دوپٹے کو ذرا سرکا کر
ایک لمحے کو فقط، آئینہ دیکھ آیئے گا
چاند پرایک تقابل کی نظر دوڑا کر
جو اثر پایئے گا، آپ ہی فرمایئے گا

جی نہیں، آپ کے ابرو ہیں، کمانیں تو نہیں
ہاں، مگر ان کے تناؤ کو ذرا کم کیجیے
ہر تناؤ میں ہیں تیروں کے تقاضے پنہاں
تیر چھوٹیں گے، کمانوں کو ذرا خم کیجیے

جی نہیں، آپ کی آنکھیں ہیں، کٹورے تو نہیں
دیکھیے، دیکھیے، پلکوں سے نہ چھلکیں نیندیں
آپ انگڑائی تو لیتے ہیں، مگر یاد رہے
اشک بن کر کہیں عارض پہ نہ ڈھلکیں نیندیں

شفق اُڈے ہوئے بادل میں بھی رچ سکتی ہے
آپ دامن میں چھپاتے رہیں رخساروں کو
رنگ غمّاز ہے، مستور نہیں رہ سکتا
کس نے پردوں میں لپیٹا ہے چمن زاروں کو

لب فقط لب ہیں، یہی عظمتِ فن ہے اب تک
حُسن تشبیہ کا منّت کشِ احسان نہیں
ہاں مگر یہ تو کہوں گا کہ لبوں کے دم سے
زندگی چشمۂ حیواں ہے بیابان نہیں

آپ ٹھوڑی کے لرزتے ہوئے مرمر کو کیوں
کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں چھپا لیتے ہیں
رات کے وقت بھی سوئی ہوئی لہروں پہ کنول
یوں مہکتے ہیں کہ بھونروں کو بلا لیتے ہیں

مَیں نے بانہوں میں شعاعوں کو مجسم دیکھا
ان کے ہالے میں تجلّی کے بھنور سے پائے
اور انگڑائی کی حالت میں لچکنا اُن کا
کوندا جس طرح لپکتے ہوئے خم کھا جائے

یہ کفِ دست نہیں، نجمِ سحر ہے شاید
اُنگلیاں نُور کے مچلے ہوئے فوارے ہیں
آپ اس بات کا اقرار کریں یا نہ کریں
آپ کے ہاتھ حقیقت میں قمر پارے ہیں

یہ کمر، اور یہ مڑتے سے، پلٹتے سے خطوط
جس طرح ریشمی ڈنٹھل پہ کلی اُگ آئے
آپ چلتے ہیں، کہ خوشبو سے لدا اک جھونکا
چمنستان کے سایوں میں بھٹکتا جائے

آپ کا پیکرِ رنگیں ہے شہاب ثاقب
یہ اگر صرف تصور ہے، حقیقت کیا ہے؟
عشق اور حُسن کی توصیف کرے؟ ناممکن؟
جی نہیں، آپ نے بندے کو غلط سمجھا ہے

☆☆☆☆

قطعات

قارئین سے

یہ زمرّد اَن گنت پہلو لیے
عکس افگن ہے مرے افکار پر
جیسے اک روزن سے چلتے پھرتے سائے
تیرتے ہیں مرمریں دیوار پر

فرطِ گریہ

آنسوؤں میں بھگو کے آنکھوں کو
دیکھتے ہو تو خاک دیکھو گے
آئنے کو ذرا سا نم کر دو
پیرہن چاک چاک دیکھو گے

پرتو

تیرے ہاتھوں کی حنا، تیرے لبوں کی سُرخی
تیرے عارض کے چمن، تیرے تبسم کے کنول
یوں مرے ذہن کو انوار سے بھر دیتے ہیں
جیسے سورج کی جھلک سے چمک اُٹھے بادل

☆☆

پنگھٹ کی رانی

وہ پانی بھرنے چلی اک جوان پنہاری
وہ گورے ٹخنوں پہ پازیب چھن چھناتی ہے
غضب غضب! کہ مرے دل کی سرد راکھ سے پھر
کسی کی تپتی جوانی کی آنچ آتی ہے

ساون کا سحر

برس کے چھٹ گئے بادل، ہوائیں گاتی ہیں
گرجتے نالوں میں چرواہیاں نہاتی ہیں
وہ نیلی، دھوئی ہوئی گھاٹیوں سے دو کونجیں
کسی کو دُکھ بھری آواز میں بلاتی ہیں

سانولا سلونا

ڈھول بجتے ہیں، دھما دھم کی صدا آتی ہے
فصل کٹتی ہے، لچکتی ہے، بچھی جاتی ہے
نوجواں گاتے ہیں جب سانولے محبوب کا گیت
ایک دوشیزہ ٹھٹک جاتی ہے، شرماتی ہے

اُمید کی کونپل

کرنوں کی تمازت میں دمکتے ہوئے بُندے
جھونکوں کے تھپیڑوں میں لہکتا ہُوا آنچل
ہر گام پہ چھاگل کا چھلکتا سا چھناکا
کیوں پھر سے ہری کرتی ہو، اُمید کی کونپل!

☆☆

برسات کے راز

گرتی ہوئی بُوندیں ہیں کہ پارے کی لکیریں
بادل ہے کہ بستی پہ گجردم کا دھواں ہے
مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہوا شاعر
جو پوچھتا پھرتا ہے: 'کہاں ہے، تُو کہاں ہے؟'

ایک آرزو

پھیکی پھیکی چاندنی ہو، ہلکا ہلکا ابر ہو
ایک گھاٹی میں ہوں بل کھاتے ہوئے جھرنے رواں
چار سُو پھولوں کی خوشبو سے غنودہ ہو فضا
اور اِکتارے پہ لہراتی ہوں تیری اُنگلیاں

لطفِ ناتمام

چھت سے یُوں آنچل ہلا دینا بھی کوئی بات ہے
آ کہ پھر تازہ کریں عیش و طرب کی محفلیں
سارا عالم دم بخود ہے، رات ہے برسات ہے
آ، اکٹھے طے کریں کون و مکاں کی منزلیں

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

میں تو دریا ہوں۔۔۔۔ (زندگی نامہ)

میری غزلیں ہوں کہ نظمیں ہوں کہ فسانے میرے

(فن و شخصیت)

کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

(احمد ندیم قاسمی بطور افسانہ نگار)

فکر کا شاعر ہوں، لیکن حُسن کا گھائل بھی ہوں

(احمد ندیم قاسمی بطور شاعر)

انسان عظیم ہے خدایا

(احمد ندیم قاسمی بطور ترقی پسند)

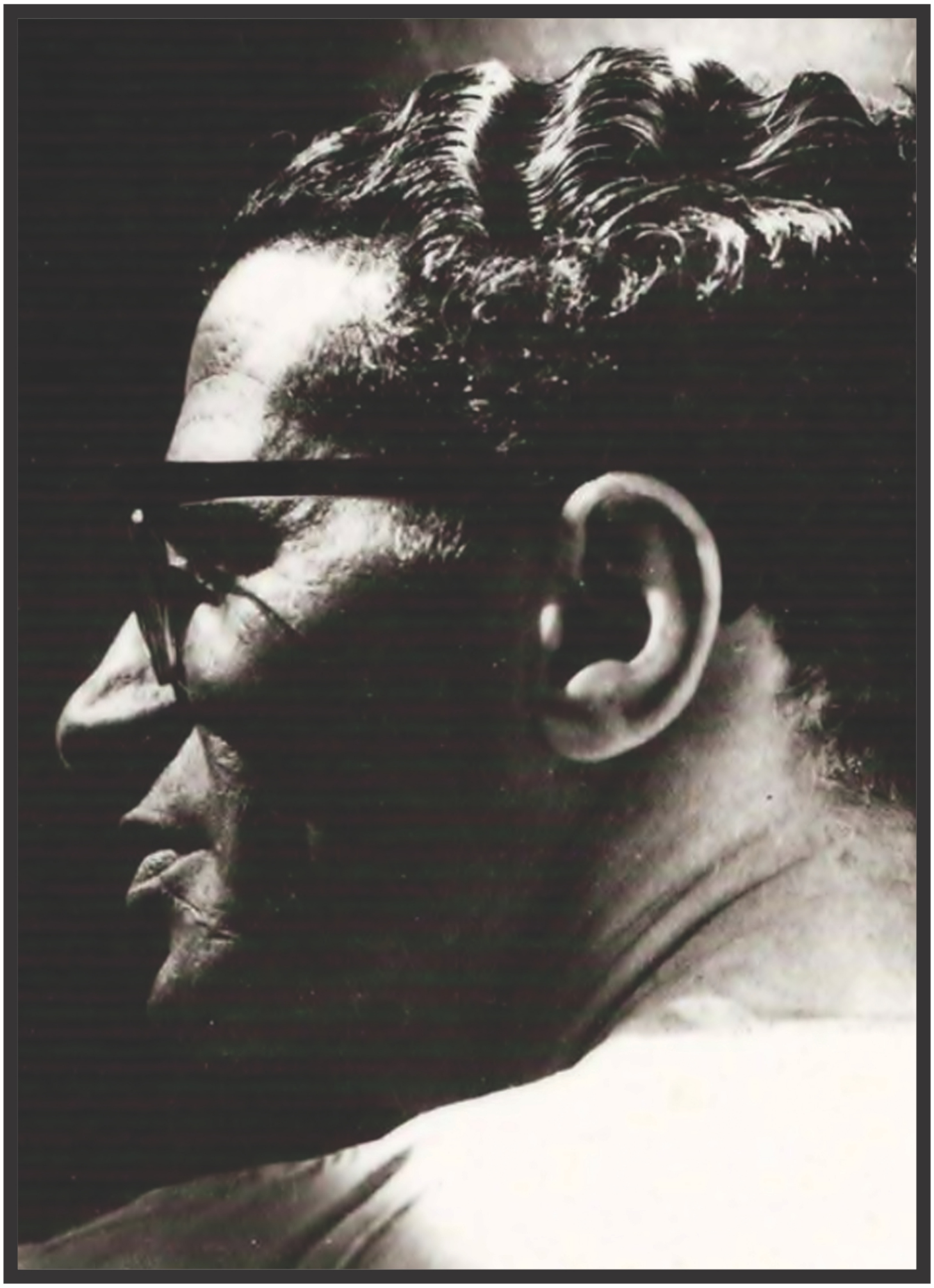

ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل

(احمد ندیم قاسمی بطور مدیر)

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط (یادیں)

کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے (متفرق)

ہر غروب کے پیچھے تھیں طلوع کی کرنیں (تجزیے)

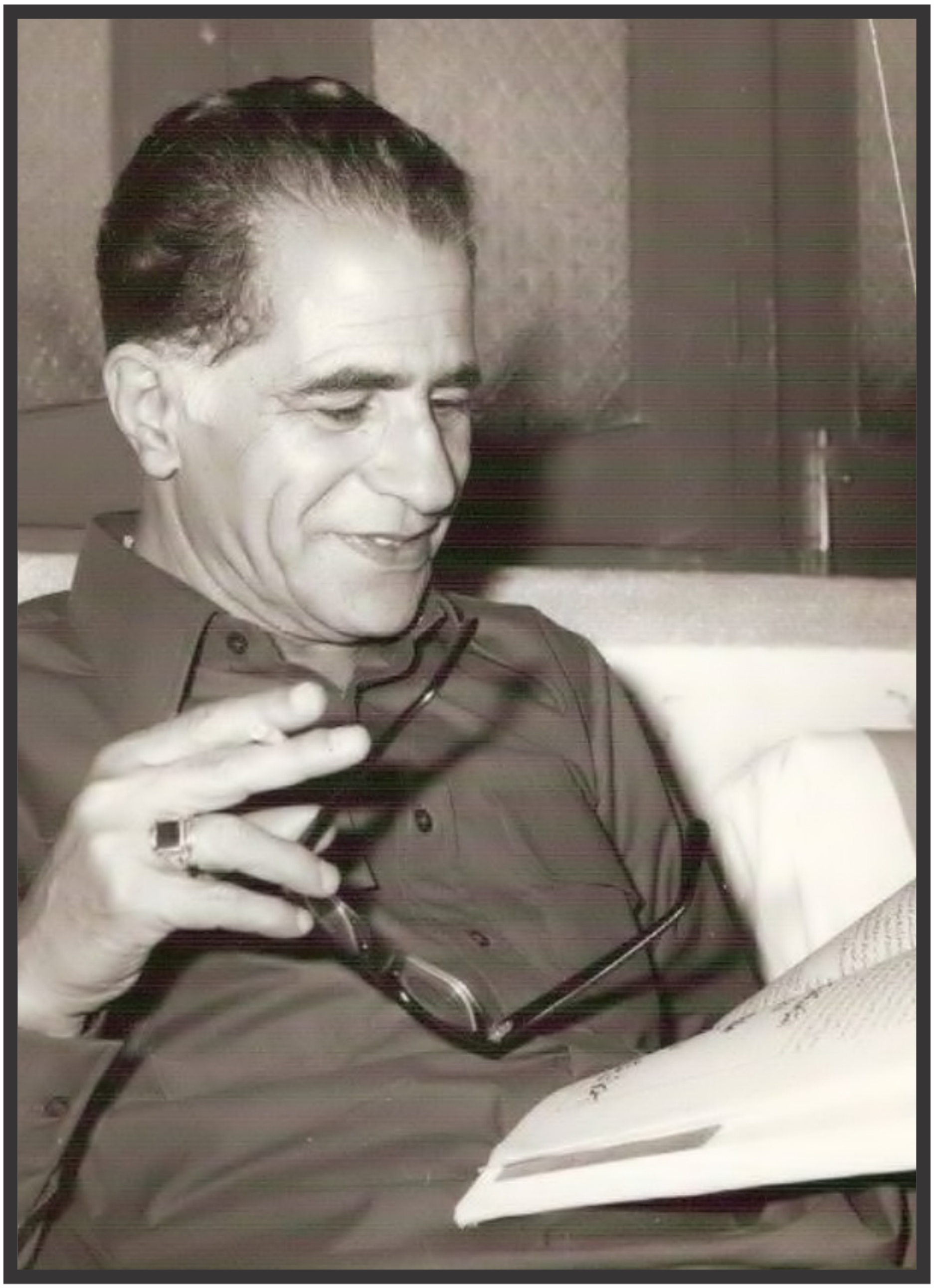

نام لیتے ہیں سخن ور میرا (ایک واقعہ)

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام

(منظوم عقیدت)

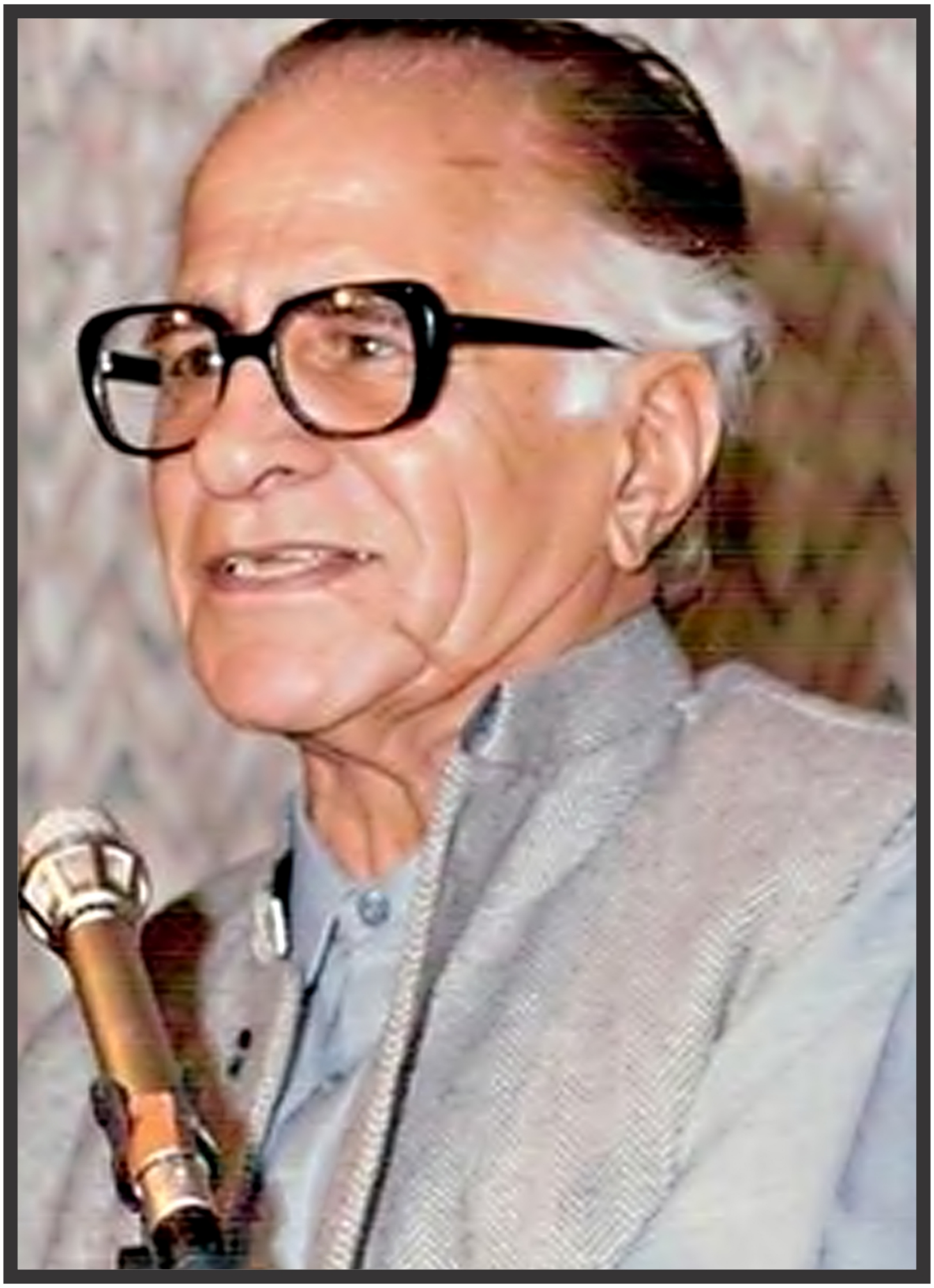

میں ترا حُسن ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

(انتخاب)

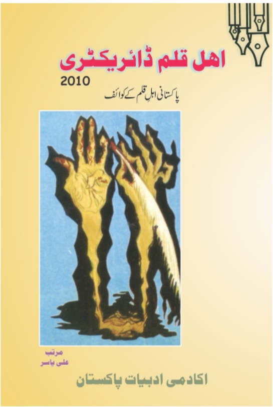
اہل قلم ڈائریکٹری
2010
پاکستانی اہل قلم کے کوائف
مرتب
علی یاسر
اکادمی ادبیات پاکستان

اہلِ قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۶ء

اکادمی ادبیات پاکستان ''اہلِ قلم ڈائریکٹری'' کا نیا ایڈیشن مرتب کررہی ہے۔ جس میں حسبِ روایت تمام پاکستانی زبانوں کے زندہ ادیبوں اور شاعروں کے کوائف شائع کیے جائیں گے۔ تمام پاکستانی اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ اپنے درج ذیل کوائف بذریعہ ڈاک یا ای میل فوراً ارسال کریں تاکہ اُنھیں اہلِ قلم ڈائریکٹری میں شائع کیا جاسکے۔

قلمی نام ____________ اصل نام ____________

تاریخ پیدائش ____________ مقام پیدائش ____________

صنفِ ادب ____________ زبان ____________

مطبوعات (بمعہ صنف، سالِ اشاعت، ایڈیشن) ____________

____

____

اعزازات ____________ پتا ____________

فون نمبر ____________ ای میل ____________

علی یاسر
انچارج: اہلِ قلم ڈائریکٹری
فون: 051-9269712
ای میل: directory@pal.gov.pk

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

January to June 2016

ISSN: 2077-0642

اکادمی ادبیات کی نئی مطبوعات

شاعری

پاکستانی ادب 2010

مرتب: ادریس بابر

نظرثانی: صابر ظفر

نثر

پاکستانی ادب 2010

مرتبین:

احمد جاوید

محمد حمید شاہد

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk